فیہا کتب قیمۃ

مقالاتِ شروانی

یعنے

مضامین نثر کا مجموعہ

جو

ڈاکٹر نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا الحاج محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی

نے

سنہ ۱۸۸۵ء تا جون ۱۹۴۷ء کے عرصہ میں لکھے اور اکثر اخباروں اور رسالوں اور کتابوں [illegible]ئے اور بعض اب صرف اس مجموعہ کے ذریعہ سے شائع ہو رہے ہیں

زیر ادارۃ و نگرانی

محمد مقتدیٰ خاں شروانی

(مالک و منیجر شروانی پرنٹنگ پریس علی گڑھ چھپے)

مختصر فہرست

دیگر تصنیفات نواب صدر یار جنگ بہادر

۱- سیرۃ نبوی صلعم

ذکر الحبیب — خصوصاً معجزات کے ذکر میں نہایت معتبر و مستند۔ ۲/

ذکر جمیل — حضور صلعم کی مقدس حیات و پاکیزہ اخلاق کا نہایت مؤثر مرقع۔ ۶/

شان رسالت — قرآن شریف کے لفظ "شاکلہ" کی تفسیر بیان کر کے حضور کی حیات مبارک کے چند مراتب کو اس پر منطبق کیا گیا ہے۔ ۴/

رسالۂ عامہ — ثابت کیا گیا ہے کہ حضور صلعم کی رسالت تا قیام قیامت تمام ملکوں، قوموں اور نسلوں کے لئے ہے۔ ۴/

شمع ہدایت — یہ کہ حضور کی تعلیم ایسی ہی ہدایت کن ہے جیسے تاریکی میں شمع۔ ۳/

ذکر شریف — حضور صلعم کے پاک حالات مبارک عادات اور نمونۃً چند معجزات کا بہترین بیان۔ ۴/

پیغام رحمت — خدا کی طرف سے حضور صلعم کے ذریعہ سے مخلوق کو توحید، امن، علم، مساوات، اخوت، حقوق، عدل، پارسائی و تقویٰ اور صفائی و پاکیزگی کیسے کیسے جان پرور پیغام ملے۔ ۴/

آفتاب رسالت — نہایت صاف اور دل نشین پیرایہ میں سیرۃ پاک کے متعلق نہایت صحیح حالات۔ عصر/

۲- سیرۃ اصحاب رضی

سیرۃ الصدیق — حضرت ابوبکر صدیق رضی کی مفصل مکمل، معتبر سوانح عمری۔ اپنے مضمون کی بہترین کتاب۔ عصر/

۳- سیرۃ صلحا و علما وغیرہ

ذکر محبوب — حضرت پیران پیر دستگیر رح کے پاکیزہ حالات۔ ۴/

قرۃ العین — حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رح کے برگزیدہ سوانح۔ ۳/

تبصرہ — حضرت امام ابو حنیفہ اور اساطین فقہ حنفی (مثلاً حضرات، علامہ ابن عبد اللہ

ملنے کا پتہ۔ محمد مقتدیٰ خاں شروانی، شروانی پریس و بک ڈپو، علی گڑھ

۷۸۶

مقالاتِ شروانی

فہرستِ مضامین

نوٹ: (۱) اس فہرست کی ترتیب یقیناً نامانوس نظر آئے گی۔ وجہ یہ کہ مضامین کی ترتیب بلحاظ زمانہ تحریر رکھی گئی ہے۔ مگر چند در چند ناگزیر وجوہ سے کتابت میں یہ اسلوب قائم نہ رہ سکا۔ لہٰذا یہ نقص بذریعہ موجودہ ترتیب فہرست کے رفع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

(۲) جن مضامین پر ستارہ (✻) کا نشان ہے وہ غیر شائع شدہ ہیں۔

محمد مقتدیٰ خاں شروانی
مرتب و طابع و ناشر

نمبر	مضمون	صفحہ
۱	پیش لفظ (نوشتۂ مصنف مدظلہٗ)	۱
۲	کتاب فیوچر آف اسلام	۶
۳	شحنۂ ہند کی خدائی فوجداری	۱۱
✻ ۴	ایک جواں مرگ عزیزہ کی یاد میں	۳
✻ ۵	گنج مراد آباد ضلع اُناؤ	۱۹
۶	آئینہ سکندری	۳۸۴
✻ ۷	نامۂ بے خبر الہ آبادی	۴۶۱
✻ ۸	وفات ہمشیرۂ خرد غفرلہا	۴۶۲
✻ ۹	بجلی	۲۱۴
✻ ۱۰	خاندان کی بی بیوں میں دو قابل نمونہ ہستیاں (۱)	۴۵۹
✻ ۱۱	اساتذۂ کرام	۲۲
✻ ۱۲	ایک شروانی	۲۵۱
✻ ۱۳	زلزلہ	۲۵۸
۱۴	سفرنامہ مصر و روم و شام	۳۰
✻ ۱۵	خاندان کی بی بیوں میں دو قابل نمونہ ہستیاں (۲)	۴۶۰
۱۶	تحریر (دربارۂ مدرسۂ قومی)	۴۵۰
۱۷	الفاروق	۳۳
۱۸	حیات جاوید	۴۷
۱۹	خازن الدولہ وضیاء السلطنۃ	۴۶۷
۲۰	امیر خسرو کا بچپن	۶۸
۲۱	غزل فارسی	۷۵
۲۲	ریڑھی ضلع مین پوری	۹۰
۲۳	اردو غزل	۸۵
۲۴	دیباچہ غرۃ الکمال امیر خسرو	۹۴
۲۵	اکبر کی جوہر پروری	۱۱۰
۲۶	راجہ کندن لال اشکی الٰہی	۱۱۶
۲۷	حضرت خضر علیہ السلام	۱۲۶
✻ ۲۸	خاندان	۲۵
✻ ۲۹	انتظام ریاست	۲۷
۳۰	شیخ محمد بن طاہر گجراتی	۳۹۵
۳۱	انا للہ وانا الیہ راجعون	۱۴۷
۳۲	جناب چودھری نور اللہ خاں صاحب مرحوم	۱۲۹

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۳۳	علامہ سید رشید رضا اور اخبارات مصر	۱۵۳
۳۴	مسلم یونیورسٹی	۱۵۴
۳۵	مرحومی علامہ شبلی نعمانی	۱۶۷
۳۶	علی گڑھ کالج میں تکبیر و تہلیل	۱۷۹
۳۷	زنانہ مسلم اسکول علی گڑھ میں تعلیم قرآن مجید	۱۸۱
۳۸	جناب خواجہ عزیز الدین صاحب عزیز لکھنوی	″
۳۹	مقدمۂ کلیات عزیز	۳۲۴
۴۰	کلام مجید کے دو نئے ترجمے	۱۸۵
۴۱	خطبۂ صدارت ندوۃ العلماء	۱۹۷
۴۲	آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس	۲۱۰
۴۳	شکریہ اور عرض حال	۲۱۱
۴۴	تعلق نامہ	۲۱۵
۴۵	مسلم یونیورسٹی	۲۱۷
۴۶	علمی خزانوں کی تباہی	۲۲۲
۴۷	جامعہ عثمانیہ کا خطبۂ افتتاحیہ	۳۸۸
۴۸	تقریر جلسۂ ٹرسٹیان	۴۱۹
۴۹	فارسی کے دو نایاب دیوان	
	(۱) دیوان عرفی شیرازی	۲۲۹
	(۲) دیوان طالب آملی	۲۴۰
۵۰	مقدمۂ دیوان درد (اردو)	۳۳۸
۵۱	تذکرۂ مخزن الغرائب	۲۴۷
۵۲	مقدمۂ خزینۃ المعانی	۴۳۰
۵۳	مسلم یونیورسٹی اور اسلامی آرٹ	۲۵۲
۵۴	مقدمۂ وقار حیات	۴۲۳
۵۵	گزارش	۴۳۹
۵۶	صحیح مسلم کا ایک قلمی نسخہ	۲۵۹
۵۷	مقدمہ وقائع عالمگیر	۴۴۸
۵۸	المبین	۲۶۳
۵۹	صحیح بخاری کا ایک عتیق نسخہ	۲۷۱
۶۰	ملّا سعد ٹنوی	۲۷۲
۶۱	عرب و ہند کے تعلقات	۲۷۳
۶۲	گوشوارۂ فہرست کتب خانۂ حبیب گنج	۲۸۹
۶۳	قاری عبدالرحمٰن صاحب محدث پانی پت	۲۷۹
۶۴	مثنویات سنروہ	۲۹۲
۶۵	مثنوی کرامات پیران پیر جہاں	۲۹۹
۶۶	ایک علوی منظر	۳۰۸
۶۷	مثنوی فتوح الحرمین	۳۰۵
۶۸	تاریخ اسلام ذہبی	۳۱۰
۶۹	تصانیف شیخ جمالی دہلوی	۳۱۲
۷۰	تعلیم و تربیت	۲۵۵
۷۱	برقی روشنی	۴۷۱
۷۲	قصائد مظہر	۳۵۲
۷۳	کلام خواجہ سنائی	۳۶۱
۷۴	مختصر خیال	۴۷۶
۷۵	چودھری عبدالحمید خاں مرحوم	۳۹۲
۷۶	شاہی کتاب خانوں کی کتابیں	۴۰۶
۷۷	تقسیم ترکہ کی برکت	۲۹
۷۸	تقریظ (مے دو آتشہ)	۴۱۵
۷۹	ایضاً (کلام محوی)	۴۱۲
۸۰	اتفاقات حسنہ	۴۴۵
۸۱	اصلاح معاشرت	۴۴۲
۸۲	منشی محمد احتشام علی صاحب مرحوم	۳۹۸
۸۳	جارج بی شور	۴۷۲
۸۴	کتاب خانۂ حبیب گنج کس طرح جمع ہوا	۲۸۳
۸۵	پیش لفظ (مکاتیب ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم)	۳۹۰
۸۶	دیوان عاشق دہلوی	۴۰۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقالاتِ شروانی

پیش لفظ

حامداً و مصلیاً

ایام طالب العلمی میں کتاب مختصر المعانی علامہ تفتازانی کی پڑھی۔ اُس میں علامہ کا یہ قول بلاغت کے بیان میں پڑھا:

"کمالِ بلاغت اس میں ہے کہ واقعات کے بیان میں جوہر بلاغت نمایاں ہوں، اس لئے کہ واقعہ نگاری میں بیان واقعات کے تابع ہے لہذا میدان بیان تنگ ہے۔ افسانہ وخیالی مضامین کی نگارش میں بیان آزاد ہے اور فسانہ و مضامین تابع، لہذا میدان وسیع۔"

اس قول کو دل نے لیا۔ لکھنے کا شوق واقعہ نگاری میں پورا ہوا۔ افسانہ وخیالی مضامین لکھنے سے طبیعت کنارہ کش رہی۔

خودستائی معیوب ہے تاہم بعض نکتہ سنج ارباب ذوق نے جو خیال میری تحریروں کی بابتہ ظاہر فرمایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میں بحمد اللہ کامیاب ہوا۔

اب نظر کو بڑھائیے۔ مقالات پڑھئے خود فیصلہ کیجئے۔

حبیب منزل علی گڑھ: ۱۷ شعبان المعظم ۱۳۶۵ھ

(۱۷ جولائی ۱۹۴۶ء)

محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی

(نواب صدر یار جنگ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ربِّ یسّر و تمّم بالخیر

سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم

لک الحمد و علیٰ نبیک الصلوٰۃ و علیٰ آلہ و اصحابہ اُولی الدرجات

ایک جوان مرگ عزیز کی یاد میں

اے ہمنفسانِ محفلِ ما
رفتید ولی نہ از دلِ ما

باغبانِ دہر کشتِ عمر را آبے نداد
کاشتن دانست و پروردن نمی داند کہ چیست

یہ بات کہہ دینا کہ فلاں نوجوان لائق دنیا سے اُٹھ گیا کہنے کو تو دو لفظ ہیں مگر کوئی اُن بیچاروں کے شکستہ دل سے پوچھے جن کو وہ دنیا سے جانے والا ہمیشہ کے لئے بیقرار کر گیا۔ وہ بوڑھا باپ جو اُس نوجوان کو عصائے پیری سمجھ کر بہت سی آرزوئیں اپنے دل میں لئے بیٹھا تھا خوب جانتا ہے کہ اس نوجوان کا عدم کو جانا اُس کے دل و جان کے ساتھ کیا کر گیا اس کے مایوس دل میں یہ بات کبھی نہ گزرتی ہو گی کہ ایک روز اُس کے لختِ جگر کو پیوند خاک کریں گے اور وہ صدمے اٹھانے کو جیتا رہے گا ہائے اُس نوجوان بیوہ کے دل پہ کیا گزری ہو گی جس کی صدہا آرزوئیں پانی ہو کر آنکھوں سے نکل گئیں۔ اور بیسیوں امیدیں حسرت بن کر دل میں رہ گئیں جو پانی اُس کے غم دیدہ آنکھوں سے نکلا وہ آنسو نہیں بلکہ وہ پانی ہے جو اُس کی تمام عمر کی امیدوں پر پھر گیا۔ الحق

ایں ماتم سخت ست کہ گویند جواں مرد

افسوس اُن بیچاروں پر کیسا صدمہ ہوا ہوگا جن کی بہت سی ضروریات کا وہ نوجوان کفیل تھا اور اب جو نگاہ اٹھا کر دیکھتے ہیں تو کوئی اُس کی نظیر نظر نہیں آتی جو اُن کے دُکھے ہوئے دل کو تسلی دے

جو حسرتناک واقعہ اور قابل افسوس حادثہ بہت سے دلوں کو سوگوار بنا گیا وہ اخی محمد[۱] عبدالجبار خاں صاحب مرحوم کا انتقال ہے۔ کل کی بات ہے کہ اُن سے بیٹھے باتیں کر رہے تھے اور آج اُن کے نام کے ساتھ مرحوم کا لفظ بیتاب کر رہا ہے۔

عبرت فزا مقام ہے دنیائے بے ثبات
کل جو محل تھا آج وہیں پر مزار ہے

جناب نے بعارضہ دق بعمر ستائیس[۲] سال عین شباب میں وفات پائی۔ فی الواقع اس مرض کی بنا اُس سال سے پڑی جس سال وبائے ہیضہ عام تھی۔ اُس سال سے تو ہمات فاسدہ ایسے پیچھے پڑے کہ آخر جان کے ساتھ گئے۔ موسم برسات میں فصلی بخار آیا اور وہی حرارت مزمنہ ہو کر مرض الموت بن گیا۔ اگرچہ ایک سال کے قریب حرارت نے ایک ساعت کو مفارقت نہیں کی مگر ضبط کو دیکھئے کہ وفات سے دو تین مہینہ پیشتر کے سوا کسی نے نہ جانا کہ یہ مرض مہلک جان کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ اوائل رجب میں معالجہ کے واسطے دہلی تشریف لے گئے۔ ابتداءً حکیم عبدالمجید خاں صاحب کا علاج رہا آخر میں حکیم محمود خاں صاحب اور محمد حسین خاں صاحب سے رجوع کیا۔ ایام حیات کم باقی تھے کوئی علاج کام نہ آیا۔ بدقسمتی سے جس زمانہ میں مرحوم دہلی تھے اُسی زمانہ میں یہاں[۳] بھی ایک مریضہ کی حالت خطرناک تھی۔ اس لئے یہاں کے صاحبوں کو مرحوم کی طبیعت کا حال ٹھیک نہیں معلوم ہو سکا۔ اور مرحوم نے بھی مرض کو اپنی تحریروں میں خفیف ہی بتایا تاکہ اُن کے بزرگوں اور عزیزوں کو دوہری تشویش نہ ہو جائے۔ آخر ایک[۴] صاحب نے حالت صحیحہ سے یہاں آکر مطلع کیا۔ اُس وقت اضطراب سخت ہوا[۵] اور حکیم صاحب بغرض دریافت حال

---

[۱] نواب صدر یار جنگ بہادر کے برادر عم زاد تھے اس طرح کہ مولوی حاجی عبدالشکور خاں صاحب کے منجھلے صاحبزادہ تھے۔ اور دوسرے نواب صاحب کی حقیقی بڑی ہمشیران سے منسوب تھیں۔ محمد مقتدیٰ خاں شروانی [۲] والدہ حاجی محمد صالح خاں صاحب مرحوم رئیس بھیکم پور ٹرسٹی و سنڈک مدرسۃ العلوم و ممبر کورٹ مسلم یونیورسٹی۔ محمد مقتدیٰ خاں شروانی۔ [۳] حاجی احمد سعید خاں صاحب رئیس بھیکم پور برادر اکبر نواب محمد مزمل اللہ خاں صاحب [۴] حکیم سعد الدین احمد صاحب مرحوم لکھنوی مولانا عبدالحلیم صاحب شرر مرحوم کے ماموں و خسر اور بھیکم پور رہیں...

مرتبہ محمد مقتدیٰ خاں شروانی

دہلی بھیجے گئے۔ انھوں نے جاکر دیکھا کہ مرض کام تمام کرچکا تھا اور وعدہ قریب آپہنچا تھا۔ انجام کار علاج دہلی کو بے سود سمجھ کر گھر لے آئے۔ یہاں حکیم اصغر حسین صاحب فرخ آبادی طلب کیے گئے انھوں نے مرض کو لاعلاج خیال کرکے دست اندازی نہیں کی اور ایک عذر معقول کرکے دوسرے روز ہی واپس تشریف لے گئے۔

مرحوم کے اخلاق وسیعہ اور لیاقت ذاتی جوق جوق آدمیوں کو عیادت کے واسطے کھینچ لاتی تھی اور جناب موصوف باآں ہمہ تکلیف و یاس ادنیٰ اعلیٰ سے بانبساط خاطر پیش آتے۔ استقلال کی تعریف جس قدر کی جائے بجا ہی۔ اس قدر مدت دراز میں کسی نے کبھی کوئی یاس کا کلمہ زبان سے نہیں سنا۔ بعضے صاحب مرض کا اشتداد دیکھ کر وفور شفقت سے ضبط نہ کرسکتے اور بے اختیار رو دیتے۔ اس رونے پر ہنسکر مرحوم پاس والوں سے پوچھتے کہ ان کو کیا ہوگیا ہی اور کیوں روتے ہیں۔ اللہ اکبر۔ آخر وقت اخیر آپہنچا۔ شعبان کی ۲۸ شب کو تین بجے سے حالت ردی طاری ہوگئی۔ سو تنفس شروع ہوگیا۔ ۸ بجے ماء اللحم پلایا گیا اس وقت امید تھی کہ اجل کچھ گھنٹوں کی مہلت دے گی۔ مگر اذا جاء اجلھم لا یستاخرون ساعۃً ولا یستقدمون۔ پہاڑ ٹل جائے مگر آئی ہوئی نہ ٹلے۔ ۲۸ شعبان ۱۳۰۳ھ چہار شنبہ کو نو بجے وہ لائق نوجوان فخر خاندان اپنے بزرگوں، عزیزوں، دوستوں کے دل کا چین و آرام لے کر ہمیشہ کے واسطے دنیا کو خیرباد کہہ گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون اللھم اغفر لہٗ۔

مرحوم کو جو شوق و رغبت کاروبار ریاست سے تھی وہ بالضرور قابل مدح و تحسین تھی۔ اگر سرور تھا تو یہ تھا اور جو مسرت تھی تو یہ تھی۔ جناب ممدوح میں ایک صفت نہایت اعلیٰ درجہ کی تھی اور اگر زمانہ کے لحاظ سے خرق عادت کہی جائے تو بیجا نہیں یعنی میں نے کبھی اُن کی زبان سے ابنائے جنس کی حاسدانہ برائی نہیں سنی۔ زمانہ موجودہ میں یہ مرض ایسا عام ہی کہ بہت کم لوگ اس مرضِ مہلک سے بچے ہیں۔

قریباً سب کا یہ برتاؤ ہی کہ جب کسی بھائی کی مدح کوئی زبان سے سنتے ہیں تو اُن کا باطن اُن کو مجبور کرتا ہی کہ کچھ زہر اُگلیں اور بالضرور دو چار سچے جھوٹے عیوب ممدوح کے بیان کردیتے ہیں۔ مرحوم کے اخلاق وسیعہ اور اوصاف ذاتیہ بہت روز تک اُن کی نیک یاد لوگوں کے دلوں میں قائم رکھیں گے

اور یہی نام نیک زندگی کے مقاصد علیہ میں سے خیال کیا گیا ہی۔ مبارک ہیں وہ خوش قسمت لوگ جو اپنے صفات نیک سے بہت سے دلوں کو مضطرب چھوڑ جائیں۔ اے خدا مجھ کو دنیا سے ایسا ہی اُٹھانا۔ آمین بجاہ سید المرسلین۔

(غیر شائع شدہ)

کتاب فیوچر آوف اسلام

(ریویو)

یہ ریویو شاید بعض آدمیوں کو بے وقت معلوم ہوگا کیوں کہ کتاب ہذا کی شیوع کو اس نواح میں قریب یک سال کے ہوا۔ مگر جب وہ اس امر پر خیال کریں گے کہ اس دیر سے کوئی حرج نہیں ہوا تو غالباً بے وقت خیال نہ فرمائیں گے۔ اس کتاب کے مصنف مسٹر ولفرڈ اسکاون بلنٹ ممبر پارلیمنٹ انگلستان ہیں۔ مسٹر بلنٹ (جیسا کہ اس کتاب اور نیز دیگر روایات سے معلوم ہوتا ہی) ادب عربی اور کسی قدر مسائل اسلامیہ سے واقف ہیں۔ اس کتاب کا ترجمہ منشی سید اکبر حسین صاحب الہ آبادی منصف حوالی علی گڑھ نے کیا ہی۔ منصف صاحب کی لیاقت اس ترجمہ سے معلوم ہوتی ہی اور چوں کہ مصنف کے خیالات زیادہ تر منصف صاحب کے سبب شائع ہوئے لہذا عام مسلمانوں پر اُن کا شکریہ واجب ہی۔

یہ کتاب دو دیباچوں اور پانچ باب پر منقسم ہی۔ دیباچۂ اول بمقام قاہرہ جنوری ۱۸۸۲ء میں لکھا گیا ہی۔ اور دوسرا بمقام کلکتہ' اجازت ترجمہ دیتے وقت جنوری ۱۸۸۴ء میں۔ دیباچۂ اول میں اس کتاب کے جلد شائع کرنے کی وجہ اور گورنمنٹ انگلشیہ کو صلاح تالیف قلوب مسلمانان ہند اور اپنے قاہرہ جانے اور سلطنت عثمانیہ کی اخیر ساعت کی ضرورت اور مسلمانوں سے عذر وغیرہ وغیرہ امور بیان کئے ہیں۔ دیباچہ ثانی میں ترجمہ کی اجازت' اور اُس کے ساتھ ہی اس کا ترجمہ ہونے سے مسرت' کچھ خیالات کا واپس لینا سلطنت عثمانیہ کے قیام کی نسبت ایک نہایت ضعیف سی امید اور بعض واقعات مصر پر افسوس ہی۔ باب اول میں مصنف کی سیر جدہ' وہاں کے مسلمانوں کے حالات' تمام دنیا کے مسلمانوں کی مردم شماری

اور فرقہاے اسلامیہ کا بیان ہی۔ باب دوم میں خلافت کی بحث ہی۔ باب سوم میں یہ ذکر ہی کہ صحیح اور اصلی دار الحکومت مکّہ ہی۔ باب چہارم کا یہ عنوان ہی "اسلام میں اصلاح"۔ باب پنجم میں اسلام کے ساتھ انگلستان کے تعلقات و اغراض ہیں۔ یہ کتاب بغرض اطلاع اپنے ہم ملکوں ور نیز مطالعہ مسلمانوں کے لکھی گئی ہی۔

چونکہ پولٹیکل وقعت مسٹر بلنٹ کے خیالات کی خود مدبّران انگلش یعنی انگریزی اخباروں میں کچھ نہیں، لہذا میرا ریویو اُن غلطیوں اور لغزشوں پر ہوگا جو مذہب اسلام کے بیان میں اُن سے ہوئی ہیں۔ باب اول صفحہ ۱۰ مسٹر بلنٹ کا یہ قول ہی کہ ہر فرقہ دوسرے فرقہ کو صاف صاف حدود اسلام میں داخل تسلیم کرتا ہی تحقیق سے خارج ہی۔ کیونکہ اہل سنت و جماعت شیعیان علی میں سے اُن اشخاص کو جو حضرت ابوبکرؓ کو غاصب کہتے ہیں اور اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تبرا جائز رکھتے ہیں (ان صفات سے شیعہ عاری شاذ بلکہ معدوم ہیں) کافر خیال کرتے ہیں۔ مسٹر بلنٹ نے مردم شماری مسلمانوں میں فرقہ وہابیہ کو اہل سنت و جماعت میں سے خارج کیا ہی۔ صفحہ ۱۴ میں مذہب حنفی کی نسبت لکھا ہی وہ زیادہ تر اُس کے مؤیدوں کے مذاق کے موافق موضوع ہی گویا بالفاظ دیگر یہ کہنا ہی کہ وہ اصول اسلام کے موافق نہیں مذہب حنفی میں کوئی بھی مسئلہ ایسا نہیں جس کی سند حدیث صحیح یا آیت قرآنی سے نہ لائی گئی ہو۔ اس صورت میں اُس قول کے کچھ معنی نہیں۔ اسی صفحہ میں امتناع اجتہاد سے جو علماء ترک کی تقسیم کی ہی وہ بھی بیجا ہی، کیونکہ تمام علماء حنفی کا عام اس سے کہ وہ ترکی ہوں یا مصری ہندی ہوں یا ایرانی یہ مسئلہ مسلمہ ہی کہ اجتہاد بعد چوتھی صدی ہجری کے موقوف ہوگیا۔ اسی صفحہ میں یہ بھی ہی کہ مذہب حنفی نے مشروبات منشّی کے استعمال اور ترکوں کی دیگر بداعمالیوں کو برداشت کرلیا ہی اگر اس کے یہ معنی ہیں کہ اس مذہب نے ان باتوں کے جواز کا فتوی دے دیا ہی تو یہ بالکل غلط ہی کیونکہ ان تمام باتوں کی حرمت آیات صریحہ سے اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہی اور کوئی اجتہاد ایسے امور کو جو آیات صریحہ اور احادیث صحیحہ سے حرام ہوگئی ہوں حلال قرار نہیں دے سکتا اور کسی دوسری صورت میں اس مذہب پر کچھ الزام نہیں۔ صفحہ ۲۲ میں یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ شافعیوں کے برتاؤ کی تعریف لکھی ہی یہ مسئلہ چونکہ اجتہاد کے[1]

---

[1] اس ناتمام فقرہ سے بعد کا جبیغہ گم تھا اور باوجود سعی بلیغ دست یاب نہ ہوا نہ اصل کتاب زیر ریویو مل سکی کہ جوڑ ملا دیا جاتا۔
محمد مقتدیٰ خاں

بیانِ آیندہ سے (صفحہ ۲۷) ہوتی ہی جس سے یہ ثابت ہی کہ سلطنت عثمانیہ کو ملک حجاز سے صرف چار لاکھ روپیہ سالانہ ملتا ہی۔ اگر اس رقم کا بار بالکل حاجیوں ہی کے سر پر ڈالا جائے تو اُس تعداد حجاج کے بموجب جو مسٹر بلنٹ نے اسی باب میں لکھی ہی فی کس چار روپیہ کچھ آنے پڑتے ہیں جو کوئی بڑی تعداد نہیں اور باقی اقوال کی غلطی وہی[1] لوگ خوب جانتے ہیں جو اُس پاک زمین کی زیارت کر آئے ہیں۔ علاوہ اس کے جتنے مسلمان اُس مقدس زمین سے پھر کر آئے ہیں اُن کو ہمیشہ یہی خواہش رہتی ہی کہ خدا پھر اُسی پاک زمین پر پہنچا دے۔ اگر اُن پر تمام یہ مصیبتیں پڑتیں تو کم سے کم عوام تو وہاں کا نام بھی کبھی نہ لیتے اور اگر شاذونادر کوئی قافلہ کا آدمی مدینہ کے راستہ میں لٹ بھی جائے اُس کو گورنمنٹ انگلشیہ کے انتظام اضلاع پشاور پر قیاس کر کے معاف رکھنا چاہیے (صفحہ ۲۶) جو تمہید سلطان سلیم خاں مرحوم کے لقب خلیفہ اختیار کرنے کی بیان کی گئی ہی اُس کی کوئی دلیل بیان نہیں کی گئی اور ایسا ہی وہ دعوی ہے جو صفحہ ۳۰ میں بابت مشابہت نام حضرت عثمان رضؓ خلیفہ ثالث اور سلطان عثمان خاں مرحوم بانی سلطنت عثمانیہ کے کیا گیا ہی۔ (صفحہ ۴۹) "معاویہؓ نے بمقابلہ خاندان علیؓ کے اپنا حق قائم کر لیا تھا" حضرت معاویہؓ نے بمقابلہ خاندان حضرت علی کے اپنا حق بزور شمشیر نہیں قائم کیا بلکہ حضرت امام حسنؓ نے بعد چھ مہینہ کی خلافت کے (صرف اس وجہ سے کہ بہ سبب اختتام تیس سال مدت خلافت کے اس کے بعد سلطنت شروع ہوتی تھی) اختیاراتِ حضرت معاویہ کو دیدیے اور جو حق حضرت معاویہؓ نے خود حضرت علی کے مقابلہ میں (جنگ صفین ہیں) بزور شمشیر حاصل کرنا چاہا تھا اُس میں وہ ناکامیاب رہی (صفحہ ۵۲) کے اس الزام کا جواب کہ سلطان نے علما

---

[1] اس فقرہ سے پہلے کا بعضہ کم تھا، اور باوجود سعی بلیغ دست یاب نہ ہوا۔ نہ اصل کتاب زیر ریویو مل سکی کہ جوڑ ملا دیا جاتا۔
محمد مقتدی خاں

کو اصول اسلام میں مشغول رہنے سے باز رکھا تھا ہم جواب لکھ چکے ہیں علمائے ترک پر یہ اعتراض ہو کہ وہ زبان عربی کو سمجھ نہیں سکتی ہو لہذا ہم چند علمائے ترک کے نام لکھتے ہیں اگرچہ اور بہت سے علمائے ترک کے نام (جن کی لیاقت قریباً تمام ممالک اسلام میں مسلّم ہی لکھ سکتے ہیں مگر بوجہ خوف طول صرف یہی لکھے۔ احمد بن سلیمان شہر ابن کمال پاشا شارح مصنف اصلاح و ایضاح استاد ابن حاجب صاحب کافیہ و شافیہ خضر بیگ ابن جلال رومی استاد خیالی صاحب حاشیہ شرح عقائد نسفی سلیمان چلپی بن وزیر خلیل پاشا عبد الکریم رومی مؤلف حواشی تلویح وغیرہ فقیہ ترسوں رومی سید ابراہیم رومی علاوہ اس کے دلائل ابتدائی سے استدلال نہ کرنا کبھی اس بات کا مؤید نہیں ہو سکتا کہ استدلال نہ کرنے والا علوم عربیہ سے ناواقف ہی کیونکہ فخر الدین رازی علامہ قطب رازی سید شریف جرجانی علامہ تفتازانی علامہ دوانی شیخ جلال الدین سیوطی و تمام مصنفین صحاح ستہ وغیرہ وہ لوگ تھے جن کا مثل اب مسلمانوں میں پیدا ہونا اگر محال نہیں تو قریب محال ضرور ہی۔ مگر پھر بھی ائمہ اربع میں سے کسی ایک کے ضرور مقلد تھے اور ابتدائی دلائل اور اصول سے استدلال نہیں کرتے تھے (صفحہ ۵) سلطان عبد المجید نے بہ سبب اپنے بے موقع ارادوں کے مسلمانوں سے کافر کا خطاب حاصل کیا اور سب کو معلوم ہی کہ اُس کا بیٹا مذہبی قانون کا توڑنے والا قرار پاکر تخت سے اُتار دیا گیا"۔ مجھ کو حیرت ہی کہ مسٹر بلنٹ نے سلطان عبد المجید خاں کا بیٹا کیسے قرار دیا ہی آیا سلطان عبد العزیز خاں معزول مرحوم کو یا کسی اور کسی کو سلطان عبد العزیز خاں مرحوم سلطان عبد المجید خاں مرحوم کے بھائی تھے نہ بیٹے۔ اور کوئی سلطان اس الزام سے معزول نہیں کئے گئے۔ ناظرین یہ نہ خیال کریں کہ میں بھی سلطان عبد العزیز خاں مرحوم کی معزولی اس باعث سے سمجھتا ہوں کہ وہ مذہبی قانون کے توڑنے والے تھے بلکہ یہ سمجھتا ہوں کہ مدحت پاشا و علمائے وقت نے اور وجوہ سے معزول کیا۔ (صفحہ ۶) اگرچہ دیندار مسلمانوں کو یہ (یعنی سلطان عبد الحمید خاں خلد اللہ ملکہ کی تخت نشینی) ایک نعمت غیبی معلوم ہوئی مگر سچے خیر خواہان اسلام خواہ مخواہ اُس کو ایک افسوسناک واقعہ سمجھتے ہیں...... لیکن سوء اتفاق سے سلطان عبد الحمید نہ تو ایک نرے دوست تھے اور نہ طبیعت کے کمزور" ناظرین خیال کریں کہ یہ خیالات کس قدر مسلمانوں کا دل

دکھانے والے اور مسٹر بلنٹ کی بدخواہی پر سلطنت ٹرکی کی نسبت دال ہیں یہ امر کہ سلطنت ٹرکی کے زوال سے مسلمانوں کا مذہبی نقصان بھی بہت بڑا ہوگا خلافت کے بیان میں ثابت ہو جاوے گا۔ (صفحہ ۶۳) "اور اس ارمنی خلیفہ کو ...... اپنا پیشوا تسلیم کر چکا ہے" اب تک تو مسٹر بلنٹ اس بات پر زور دے رہے تھے کہ سلاطین ترک قریشی نہیں لہذا قابل خلافت نہیں لیکن اب اُن کو بات بھی ناگوار ہو گئی کہ سلطان حال خلد اللہ ملکہ کو خلیفہ عثمانی لکھیں بلکہ ارمنی خلیفہ کہنے لگے (صفحہ ۶۶) میں مسٹر بلنٹ سلطان حال خلد اللہ ملکہ کی نسبت تحریر فرماتے ہیں "بلکہ یہ نسبت معلوم النسب ہونے کے زیادہ ترحرم سرا کی ایک پیداوار سمجھا جاتا ہے" یہ الفاظ ایسے ناشائستہ ہیں کہ کوئی تھوڑی سی تہذیب والا بھی کسی ہمسر کی نسبت زبان سے نکال نہیں سکتا چہ جائیکہ مسٹر بلنٹ اور سلطان (امیر المومنین) شاید مسٹر بلنٹ کو ہمدرد اسلام ہی نے (جس کے وہ مدعی ہیں) ان الفاظ کی تحریر پر مجبور کیا ناظرین اس دعوے اور ان الفاظ کو اپنے دل میں خیال فرمائیں۔ مسٹر بلنٹ نے اس بارہ میں کہ بعد زوال خلافت ٹرکی (خدا ایسا نہ کرے) خلافت کہاں ہوگی عجیب عجیب خیالات ظاہر کئے ہیں کبھی ہندوستان میں دہلی و حیدر آباد کو دارالخلافہ قرار دیا ہے کبھی محمد توفیق خدیو مصر کا استحقاق خلافت جتایا ہے کبھی ٹریپولی اور ٹونس میں خلافت کا امکان ظاہر کیا ہے اور آخر کار ان تمام منصوبوں کو توڑ کر اخیر بنیاد جس میں اسلام کی بہبودی بھی خیال کی ہے اس پر جمائی ہے کہ خلافت مکہ میں قائم رہے گی میری رائے میں جس طرح کہ دہلی و حیدر آباد میں خلافت کا قائم ہونا ممکن نہیں اسی طرح مکہ میں خلافت مکہ میں قائم نہیں رہ سکتی کیونکہ جس زمانہ میں کہ شرفائے مکہ خود مختار تھے اُس زمانہ میں بھی (جیسا کہ مسٹر بلنٹ کے اقوال سے بھی پایا جاتا ہے) بغیر امداد شاہان ہند مصر ترک ایران وغیرہ اُس زمانہ کی اسلامی سلطنتوں کے بسر نہیں کر سکتے تھے اب سلطنت ہند زوال میں آگئی زوال خلافت ترک (مسٹر بلنٹ کے فرمانے سے) اصول موضوعہ اقلیدس کی طرح مان لیا گیا مصری گورنمنٹ بھی بعد زوال خلافت ترک قائم نہیں رہ سکتی ایرانی سلطنت کو روس سے کب فرصت ملے گی جو وہ شریف مکہ کی دستگیری کرے اور کوئی سلطنت اسلامی قائم نہیں خود ملک حجاز ایسا زرخیز نہیں جس سے کافی آمدنی ہو سکے پس شریف مکہ کس طرح بعد خلیفہ ہونے کے ہماری اغراض کی حفاظت اُس وقت کر سکیں گے جبکہ ہم بوجہ پیدا

ہونے کسی مذہبی خطرہ کے اُن کی طرف رجوع کریں گے (مسٹر بلنٹ نے صفحہ ۶ میں لکھا ہی کہ اُس وقت بھی اگر کوئی عام اور سخت خطرہ مذہب کے لئے پیدا ہو تو مسلمان لوگ اپنی اغراض کی حفاظت کے لئے خلیفہ ہی سے رجوع لائیں گے) اور کس طرح شریف مکہ اپنی تئیں رقیبوں سے بچائیں گے اور اُن کو وہ کونسا حامی ملے گا جو اُن کو فرمانروایاں یمن اور نجد کے پنجہ سے چھڑا دے (صفحہ ۹۷) شریف مکہ کو اُس وقت تک کہ اُن کو کوئی حامی مل جائے اپنے تئیں فرماں روایاں نجد کے اور ائمہ یمن کے حوالہ کردینا پڑے گا) اور کیونکر شریف مکہ حاجیوں کے قافلوں کو ڈاکوا ور لوٹیروں سے محفوظ رکھیں گے اور کس قوت سے غیر مذہب والوں کی مداخلت سے ان پاک مقامات کو بچائیں گے اور بجز اس کے کچھ بھی نہ ہوگا کہ بہت جلد تباہ ہو جائیں اور نہ کوئی غیر جگہ کا آدمی بوجہ نہ ہونے امن کے حج کو جائیگا اور جس طرح ایام جاہلیت میں حجاز سب ملکوں سے بے تعلق تھا اُسی طرح پھر ہو جائے گا (یہ مضمون ۱۸ جمادی الآخر ۱۳۰۲ھ مطابق یکم فروری ۱۸۸۵ء کو لکھا گیا اور ۱۰ فروری اور ۱۴ اپریل کو شائع ہوا۔ اخبار مشیر قیصر لکھنؤ میں)۔

شحنۂ ہند کی خدائی فوجداری

تنگیٔ سینہ دلم را بہ فغاں می آرد
ورنہ با نازِ تو خاموشی و فریاد یکے است

اخبار شحنۂ ہند[۱] کے دو پرچے اتفاقاً میری نظر سے گزرے اُن میں ریویو چو مشاعرہ کے رسالوں پر دیکھا تو نہایت حیران رہ گیا۔ منجملہ اور اعتراضوں کے جو منشی امیر احمد صاحب امیرؔ اور نواب مرزا خاں صاحب داغؔ پر کئے ہیں ایک یہ اعتراض بھی ہی کہ دل سینہ میں نہیں ہوتا۔ خدا نے فرمایا ہی۔ ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور۔ مگر افسوس ہی کہ مرزا داغ محل اعتراض ہی رہے اگرچہ میں لسی بحثوں میں پڑنا

---

[۱] اخبار شحنۂ ہند ایک زمانہ میں میرٹھ سے ہفتہ وار نکلتا تھا۔ مولوی احمد حسین شوکت مرحوم اس کے اڈیٹر تھے۔ اور خود کو "مجدد السنۂ مشرقیہ" جانتے اور لکھتے تھے۔ محمد مقتدیٰ خاں شروانی۔

پسند نہیں کرتا مگر چونکہ اڈیٹر اخبار مذکور نے یہ دعوٰی کیا ہی کہ یہ اعتراض اُٹھ نہ سکے اور یہ بھی دعوی ہی کہ ہم اردو زبان کے مجتہد ہیں' ریفارمر ہیں' موجد ہیں' لہذا میں اُن کے جواب لکھتا ہوں' نہ اس غرض سے کہ مجھ کو شحنۂ ہند سے حسد ہی یا اس سبب سے کہ میں اُن اُستادوں کا شاگرد ہوں بلکہ محض اس غرض سے کہ اصلیت معلوم ہو جائے' ناظرین منصفانہ نظر ڈالیں۔

جناب امیر سلمہٗ ؎

در کریم پہ تا روز حشر راہ ملے
گناہ گاروں میں چھپ چھپ کے ڈگناہ ملے

اعتراض: اوّل مصرعہ میں تائے تعلیلیہ کی جگہ تائے انتہائیہ کا بھی وہم ہوتا ہی کہ پس یہ مصرع یوں ہو در کریم پہ جنت میں تا کہ راہ ملے جواب اگر احتمال ہوتا ہی تو مصرع ثانی اُس کو دفع بھی کرتا ہی پس اصلاح کی کیا ضرورت ہی جناب امیر سلمہٗ ؎

وہ بت پرست ہوں میں جا کے دیر کے در پر
پکارتا ہوں کوئی بت خدا کی راہ ملے

اعتراض: دیر سے بت ملنے میں چنداں خوبی نہیں کعبہ سے بت ملے تو سبحان اللہ شعر یوں ہو ؎

وہ بت پرست ہوں میں جا کے کعبہ کے در پر
پکارتا ہوں کوئی بت خدا کی راہ ملے

جواب کہنے والے کی غرض یہ ہی کہ میرا مسلک صلح کل ہی کعبہ نشیں ہو کر بت مانگتا ہوں کعبہ او ربت دونوں سے محبت ہی تاثیر یہ کہ کعبہ نشیں دیر سے بت مانگے کیونکہ کعبہ نشیں ہو کر اگر بت مانگے تو کعبہ سے اُس کو نہایت محبت ہی جناب امیر سلمہٗ ؎

پڑا ہی ہجر میں یہ تفرقہ جو تو ڈھونڈے
تو میں کہیں مرا سایہ کہیں تباہ ملے

اعتراض لفظ تباہ حشو ہی علاوہ اس کے ایک سایہ کا تداخل ہی ذوق دہلوی بھی ایسا ہی لکھ گیا ہی ؎

پڑے پھرتے ہیں یہ جدائی سے تیرے
کہیں ہوں کہیں دل کہیں جاں کہیں ہے

حق یہ ہے کہ ہمارے منشی صاحب کو اڑنے فکر سے مضامین چھین لینے کا خاصہ ملکہ ہے یہ بھی تو شعرا کی صفت ہے جواب تباہ حشو کیوں ہے کیا تباہ کہنے کے لفظ سے کہنے والے کی حالت زیادہ تباہ نہیں معلوم ہوتی غزل میں جس قدر ایسے الفاظ لائے جائیں گے اسی قدر زیادہ لطف پیدا ہوگا جب کسی استاد کا مضمون دوسرے استاد کے مضمون سے لڑ جائے تو کچھ اعتراض نہیں ہو سکتا - خواجہ نظامی (خسرو شیریں) ؎

مرا اے کاشکے مادر نمی زاد
وگر میزاد شیرم کس نمیداد

مولوی جامی (یوسف زلیخا) ؎

مرا اے کاشکے مادر نزادے
وگر زادے بخورد دیگر ندادے

خواجہ نظامی (سکندر نامہ) ؎

دو کارست با فرّ و فرخندگی
خداوندی از تو ز ما بندگی

امیر خسرو (قران السعدین) ؎

اے صفتت بند تو از زندگی
از تو خداوندی ز ما بندگی

اسی طرح اور اساتذہ کے مضمون بھی باہم لڑے ہیں مگر اُن پر گرفت نہیں کی گئی اور اسی کو توارد کہتے ہیں کیا آپ کو بھی اڑنے فکر سے مضامین چھین لینے کا ملکہ ہے تو گت ؎

بنایا دو دو دل نے کیوں نیا چرخ
ستم کو جبکہ کافی آسماں تھا

ذوق دہلوی بھی کچھ ایسا ہی فرما گیا ہے ؎

۱۴ و ۱۵ و ۱۶

نہ کرتا ضبط میں نالہ تو پھر ایسا دھواں ہوتا
کہ نیچے آسماں کے ایک نیا اور آسماں ہوتا

تسلیم ؎

ہوئے جوان وہ جب ربط میں فتور آیا
شباب ساتھ لئے حسن کا غرور آیا

اعتراض نون غنہ کا اظہار مکروہ ہے یوں ہونا چاہئے ؎

ہوئے وہ جبکہ جواں ربط میں فتور آیا

جواب۔ نون غنہ کا اظہار ایک تسلیم ہی نے نہیں کیا بلکہ دوسرے اساتذہ نے بھی کیا ہے۔ مومن ؎

مدفون ہو وہ غنچہ دہن جو امصیبتا

آرزو ؎

یہ ناز یہ غرور لڑکپن میں تو نہ تھا
کیا تم جوان ہو کے بڑے آدمی ہوئے

اُردو میں تو بہت سے الفاظ میں نون غنہ کا اظہار کیا جاتا ہے جیسے پان وغیرہ تسلیم ؎

دلِ کلیم کے ہوتے ہوئے خدا کی شان
پسند جلوہ فروشی کو کوہ طور آیا

اعتراض[1] علاوہ اس کے خرید کا ذکر نہیں اور فروخت موجود بنیا دوکان پر ٹھہرنے کا روادار نہیں یہاں ہانک لگا رہی ہیں کہ پورا تولنا یہ شعر یوں ہونا چاہئے تھا ؎

دل کلیم کی بھائی نہ خوش خریداری
پسند جلوہ فروشی کو کوہ طور آیا

جواب جلوہ فروشی کے معنی اظہار جلوہ کے ہیں پس خرید کے ذکر کی کچھ ضرورت نہیں جلوہ فروشی

---

[1] یہ اعتراض کا ایک جز ہے۔

ترکیب فارسی ہے لہذا اساتذۂ فارسی کے اسناد لکھے جاتے ہیں جن میں فروخت موجود مگر خرید کا ذکر نہیں ملک الشعرا طالب آملی ؎

وقت سحر بنالہ نکو شد کسے چرا
مستی بلبلاں نہ فروشد کسے چرا

میرزا غالب دہلوی ؎

تنکا یتے نہ فروشی و جلوۂ نخری
تو آشنائے کہ خواجہ و آشنائے تو کیست

مرزا بیدل عظیم آبادی ؎

بیدل گل رخسار بہیں جلوہ فروش ست
وقت ست کہ زخم دل ما تازہ کند چشم

جناب امیر سلمہٗ ؎

آنکھیں مرجانے کو کہتی ہیں وہ لب جینے کو
کیئے یہ حکم رہے کیئے وہ ارشاد رہے

اعتراض پہلے مصرع میں (وہ) حشو ہے علاوہ اس کے مرجانے کا تقابل جینا نہیں بلکہ جی جانا درست ہے ؎

آنکھیں گر مرنے کو کہتی ہیں تو لب جینے کو
کیئے وہ حکم رہے کیئے وہ ارشاد رہے

جواب ایسے الفاظ اساتذہ کے کلام میں بھی آئے ہیں پس اُن کا استعمال بیجا نہیں۔ مومن ؎

کیونکہ بدلے ہوئے تیور یہ تمہارے دیکھوں
کیونکہ ان آنکھوں سے غیروں کے اشارے دیکھوں

گو مرجانے اور جی جانے کا تقابل صحیح ہو مگر اس مصرع میں تو جینا ہی چاہیے کیونکہ جی جانا مرے ہوئے کے واسطے استعمال کرتے ہیں زندہ سے نہیں کہہ سکتے کہ جی جاؤ اور چونکہ کہنے والا زندہ ہے اُس سے یہ

خطاب نہیں کر سکتے۔ یہی حال مرنے اور مر جانے کا ہے جناب میرزا داغ سلمہ ؎

کے گھڑی چین سے تو اے ستم ایجاد رہے

تیرے سینہ میں جو میرا دل ناشاد رہے

دل سینہ میں نہیں ہوتا پہلو میں ہوتا ہے علاوہ اس کے اب "دکے" متروک ہے۔ جواب ریفارمر صاحب کی اس تحقیق کے قربان دو شعر میں بتاتا ہوں ان میں بھی بجائے سینہ کے پہلو ہو جائے تو مناسب ہے۔ ذوق ؎

جس طرح دیکھے قفس سے باغ کو مرغ اسیر + جھانکتا ہے یوں تجھے دل سینۂ صد چاک سے۔

شیخ حزیں ؎ تنگی سینہ دلم را بہ فغاں می آرد

ورنہ با ناز تو خاموشی دفریادیکے است

لفظ "کے" کے متروک ہونے کی نسبت وہی جواب کافی ہے جو آپ نے "ببلبلے ماتھی" کی نسبت لکھا ہے غیر مناسب نہ ہوگا اگر دو چار اشعار معترض صاحب کے بغرض اظہار سلیقہ و طرز کلام لکھدئے جائیں افسوس کہ مغربی طرز جس کے شوکت بہت موید ہیں ان اشعار میں نظر نہیں آتی۔ غالباً میری نظر کا قصور ہے یا یہا الذین اٰمنوا لم تقولون ما لا تفعلون شوکت کا کلام ؎

ہوا ہوں بسکہ گھٹ کر غم ابروئے دلبر میں

نیے دفن مرا بعد از فنا خنجر کے جوہر میں

یہاں تک ہم نے رکھا پردہ ناموس شہادت کا
کہ پانی ہو کے خون بھی مل گیا ہے آب خنجر میں

ستم کب ہے کہ اعضا جذب نظارہ سے سمٹے ہیں
کہ بعد از مرگ بھی ہوں دفن تیرے روزن در میں

عروج خاکساری سے بڑھا رتبہ یہ شوکت کا
کہ بام عرش پر پہنچی ہے اس کی ایک ٹھوکر میں

راقم

منم وامق عذرائے سخن

(مطبوعہ ۱۸ اگست ۱۸۸۵ء نیر قیصر)

گنج مراد آباد ضلع اُناؤ

مجھ کو ایک عرصہ سے مراد آباد کی حاضری کی آرزو تھی۔ اور باعث آرزو اشتیاق قدم بوسی حضرت شبلی عصر جنید دہر مولنا فضل الرحمن صاحب مدظلہم تھا۔ چند بار قصد کیا لیکن محروم رہا۔ بارے اب کے آرزو پوری ہوئی اور شرف پابوسی موجب سربلندی ہوا۔ جمعہ ۲۰ رجب ۱۳۰۵ھ کو بقصد مراد آباد یہاں سے روانہ ہو کر کانپور پہنچا۔ اُستاذی مولنا عبد الغنی خاں صاحب مرید حضرت شیخ کی معیت تھی وہاں ایک وجہ خاص سے ایک روز توقف کرنا پڑا۔ دوسرے دن کانپور سے قصبہ بلہور میں آیا۔ یہاں سے پالکی میں سوار ہو کر مراد آباد کو چلا۔ راستہ میں تھوڑی دیر میں ایک ندی ایسن نامی پڑی۔ پھر کچھ دور جا کر گنگا ملی۔ صبح کا وقت ابر گھرا ہوا گنگا پر عجب لطف دیتا تھا۔ دس بجے مراد آباد پہنچا۔ دریافت ہوا کہ اُس وقت حضرت درس حدیث میں مشغول تھے۔ اس لئے بازار کے کنارہ ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مسجد کے اندر کے مقبرہ میں جا بیٹھا۔ یہ مقبرہ خدا جانے کس زمانہ کا ہے۔ بیچ میں ایک قبر بنی ہوئی ہے۔ دھوئیں کے سبب سیاہ ہو رہا ہے۔ ایک طرف سیتل پاٹی کا فرش پڑا تھا اس پر اور چند آدمی (جو حصول زیارت کے واسطے آئے تھے) بیٹھے ہوئے تھے۔ میں بھی جا بیٹھا۔ مولنا اگرچہ فاصلہ پر تشریف رکھتے تھے مگر یہاں اور مسجد سے باہر وہ رعب طاری تھا کہ کوئی فرد بشر باواز بلند بات کرنے کی تاب نہیں رکھتا تھا۔ اور بے تکلف یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی زبردست حاکم کے باہر آنے کے منتظر ہیں۔ ایک گھنٹہ کے بعد شرف حضوری حاصل ہوا۔ حضرت چارپائی پر تشریف رکھتے تھے میں زمین پر بیٹھ گیا۔ کچھ تھوڑے سے دریافت حال کے بعد اشعار نعتیہ بہ کمال شوق و ولولہ پڑھنے لگے۔ چند منٹ کے بعد حجرہ میں تشریف لے گئے۔ مجھ کو بھی اندر آنے کے لئے ارشاد فرمایا۔ بزرگوں کے حالات بیان فرمائے۔ مثنوی شریف کے شعر پڑھے۔ الحق کہ مثنوی شریف کے شعر عجیب درد سے پڑھتے تھے منجملہ اور اشعار کے یہ شعر بھی تھا ؎

صحبت مرداں اگر یک ساعت ست

بہتر از صد خلوت و صد طاعت ست

کچھ عرصہ کے بعد استراحت کے واسطے رخصت فرمایا۔ حضرت کا قامت بلند، بدن دوہرا، رنگ گورا، داڑھی چھوٹی نہایت سفید، آواز بھاری اور باطنی کیفیت میں ڈوبی ہوئی۔ حضرت کا لباس ڈھیلا انگرکھا، ڈھیلا پاجامہ، دوپلڑی ٹوپی تمام سر کو ڈھکے ہوئے، کیمخت کا جوتا جس کی ایڑی بیٹھی ہوئی۔ حضرت کا حجرہ پرانا اور تنگ، ایک طرف چارپائی اُس پر فرد اور دری پڑی ہوئی (فرد اور دری دونوں نئے شاید پندرہ روز کے ہونگے) ایک طرف چوکی اُس پر کچھ مٹی کے برتن اور قلمدان۔ باقی جگہ میں شکستہ و کہنہ بوریا بس۔ بعد ظہر مسجد میں تشریف لاکر حدیث شریف کا درس فرمایا جس میں حاضر ہونے کا مجھ کو بھی عزت حاصل ہوئی۔ ایک گھنٹہ کے بعد حجرہ میں رخصت کے واسطے طلب فرمایا اور دعائے خیر کے بعد اجازت فرمائی۔ یہ مسجد (جس میں حضرت کا قیام ہے) نہایت پرانی اور مرمت طلب ہو رہی ہے۔ مسجد کے دروازہ میں داخل ہونے پر جانب دراست ایک مقبرہ ہے جس کا اوپر ذکر ہوا۔ اُس کے سامنے مغربی جانب کو چند قبریں ایک کنواں اور کچھ دور حجرہ مبارک ہے۔ گرد کے مکان بھی کہنہ و ویران ہیں۔ غرض کوئی چیز اہل دنیا کی دلچسپی کی نہیں ہے۔ مگر صدہا امیر و غریب تونگر و مفلس آتے ہیں اور جاتے ہیں۔ ایک کشش ہے کہ سب کو کھینچتی ہے۔ کسی فن کا آدمی ہو جب تک خود ہم کو اُس میں مداخلت نہ ہو ہم نہیں جانتے کہ وہ کیسا ہے کامل یا ناقص، استاد یا اناڑی۔ اگر ہم اصول اقلیدس سے واقف نہیں تو اگر ایک شخص کسی مشکل مشق کو حل کرے تو ہم یہی کہیں گے کہ کچھ لکیریں کھینچتا ہے۔ اس کا کیا نفع ہے یا اس کا حل کس ذہن و دماغ کا کام ہے، یہ ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ ایسا ہی کچھ تصوف کا حال ہے۔ جب تک ہم صاحب حال نہ ہوئے یہ معما حل نہیں ہو سکتا، اور یہ مطلب صاف ہونا ممکن نہیں ہے۔ عوام کرامات کو دیکھتے ہیں مگر صوفیائے کرام نے کرامت کو "حیض" کہا ہے۔ حضرت کی خدمت میں پہنچ کر دو زبردست خیال میرے دل پر طاری ہوئے جن کے سبب یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میں نے حضرت کا مرتبہ پہچان لیا لیکن یہ جانا کہ ہم میں اور اُن میں سوائے ظاہری مشابہت کے اور کوئی مشابہت نہیں۔ ہمارے خیالات سے ان کے خیال الگ اور ہمارے ارادوں سے ان کے ارادے جدا، ہمارے

مشاغل سے ان کے مشاغل علیحدہ، ان کی امیدیں اور خوشیاں اور خوف اور مقصود ویسا گو لکڑی کو جلاتی ہی ہم بھی دیکھتے ہیں اور اُن کے بھی پیش نظر ہی لیکن ہم کیا سمجھتے ہیں اور ان کے ذہن میں کیا آتا ہے۔

اول خیال تو یہ تھا کہ مراد آباد دنیا میں ہی اور گاؤں نہیں قصبہ ہی لیکن حضرت کی مسجد میں ایک دوسرا عالم نظر آتا تھا۔ دنیاوی معاملات کا کوسوں پتا نہ تھا۔ خود حضرت کی گفتار و کردار اور وہاں کے اہل قیام کے احوال سے (عام اس سے کہ وہ چند گھنٹہ کے آئے ہوئے ہیں یا دو چار برس سے رہتے ہیں) یہ معلوم ہوتا تھا کہ کچھ ایسے لوگ ہیں جو تعلقات دنیا سے کنارہ کرآئے ہیں۔ حیدرآباد کے امیر کبیر نواب خورشید جاہ بہادر جو ۲۵ لاکھ کے معافی دار ہیں میرے پہنچنے سے صرف ایک روز پہلے وہاں آئے تھے۔ مگر اُن کا ذکر بھی نہ تھا اور نہ کوئی وقعت اُن کی کسی کے ذہن میں معلوم ہوتی تھی۔ حال آں کہ کانپور اور بلہور اُن کے تذکروں کی صدا سے گونج رہے تھے۔ اور ہر ایک سوسائٹی (خواہ اعلیٰ ہو یا ادنیٰ) ان کے تذکرہ کو اپنے جلسوں کا دلچسپ مبحث بنائے ہوئے تھی۔ پھر یہ کس کا اثر تھا؟ کیا مراد آباد کے پانی کا؟ ہرگز نہیں۔ وہاں کی خاک کا؟ ہرگز نہیں۔ وہاں کے در و دیوار کا؟ ہرگز نہیں۔ حضرت کے ہاتھ پاؤں کا؟ ہرگز نہیں۔ حضرت کے بالوں کا؟ ہرگز نہیں۔ البتہ اُس کیفیت کا اثر تھا جو حضرت کے قلب میں تھی۔ وہ کیفیت کیا تھی؟ اس سے کون واقف ہے اور کوئی کیا جانے۔ مریض کا بدن بخار سے جلتا ہے، مگر وہ سوائے اثر کے مؤثر کو نہیں جانتا۔ سبب کو مشخص کرنا طبیب کا کام ہی۔ ہم بدن پر ہات رکھ کر گرمی محسوس کرسکتے ہیں مریض کو اپنا جسم گرم اور منہ کا مزہ تلخ معلوم ہوتا ہے لیکن یہ جاننا کہ یہ غلبہ صفرا کا نتیجہ ہے طبیب کا کام ہی۔

دوسرا خیال یہ تھا کہ خود میرا ذہن مجھ کو ذلیل سمجھتا تھا اور ہر چند حیرت سے غور کرتا تھا لیکن کوئی وقعت اپنی میرے ذہن میں نہیں آتی تھی۔ دنیاوی جلسوں میں لفٹنٹ کے دربار دیکھے، رؤسا کے مجمعے دیکھے۔ اہل علم کے مجلسیں دیکھیں مگر کہیں اپنے نفس کو اتنا بے حقیقت نہیں پایا۔ اپنے اعمال ذمیمہ ماضیہ پر خود نفس سخت ملامت کرتا تھا، اور اپنی بے مائگی پر خود نفرین کن تھا۔ ہر شخص سے خواہ وہ کوئی ہو اپنے تئیں کم وقعت تصور کرتا تھا۔ غرض ایک عجیب خیال تھا کہ پورا بیان میں آنا مشکل ہی۔ وہاں سے

آنے پر یہ خیال ایسے رہے جیسے کہ کسی دلچسپ خواب کا صبح کو خیال اور لطف ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ کیفیت زائل ہوگئی اور چند لمحہ کے بعد پھر نفس امارہ "انا ولا غیری" اور "ہمچو ما دیگرے نیست" کے پھندے میں جا پھنسا۔ یہ خیال میرے نزدیک محض نئے اور نرالے تھے۔ جودت العمر میں کسی جگہ اور کبھی پیدا نہیں ہوئے۔ اس سے قیاس چاہتا ہے کہ وہ جگہ بھی کچھ اور جگہوں سے نرالی تھی۔ للہ بس باقی ہوس۔ فقط

۲۵ رجب المرجب ۱۳۰۵ھ (غیر شائع شدہ)

اساتذۂ کرام

فارسی و عربی

(۱) بسم اللہ مولوی سید حسن شاہ صاحب رامپوری نے پڑھائی۔ موصوف کا ذکر تذکرہ کاملان رامپور مؤلفہ حافظ احمد علی خاں شوق اور انتخاب یادگار مؤلفہ منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی میں ہے۔

بسم اللہ کے چند روز کے بعد قطع تعلق ہوگیا اور رامپور چلے گئے۔

(۲) ان کے بعد میر فرزند علی صاحب متوطن مارہرہ نے پڑھایا۔ مولوی حسن شاہ صاحب نے صرف پارۂ عم پڑھایا تھا۔ باقی قرآن مجید میر صاحب نے پڑھایا۔ فارسی بہار دانش تک پڑھائی۔ خط کی مشق کرائی۔

(۳) میر صاحب کے بعد حکیم سلیم اللہ صاحب ساکن محلہ نبی اسرائیل کول (علی گڑھ) نے پڑھایا۔ سہ نثر ظہوری تک۔

(۴) میر فرزند علی صاحب کے پڑھانے کے زمانے میں عربی کا آغاز ہوا۔ مولوی سید اکبر صاحب سے (جو کالو خاں ضلع پشاور کے متوطن اور سادات ترمذی سے تھے۔ مولانا لطف اللہ صاحب کے شاگرد تھے۔ حدیث مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری سے پڑھی تھی۔ باوجود ولایتی ہونے کے اردو صاف صحیح بولتے تھے۔ تذکیر تانیث کی صحت

کا پورا اہتمام تھا۔ مولانا سہارنپوری کے درس میں افغانوں کو بوجہ اُن کی اردو زبان صاف نہ ہونے کے قرأت کی اجازت نہ تھی مگر مولوی صاحب اس سے مستثنیٰ تھے۔

صحت موصوف کی اچھی نہ تھی، اس لئے تعلیم کم حاصل ہوسکی۔ صرف کے فارسی رسالے صرف میر، زبدہ تک پڑھائے۔ اس کے بعد

(۵) مولوی غلام محمد صاحب پنجابی مقرر ہوئے جو شاگرد تھے مولوی محمد لطف اللہ صاحب کے۔ نحو اپنے وطن میں اس اہتمام سے پڑھی تھی جو اہل پنجاب کا اس فن کے پڑھانے میں ہے۔ مولوی صاحب نے شرح جامی تک نحو، شرح تہذیب و بدیع المیزان تک منطق پڑھائی۔ فقہ میں مالا بد منہ۔ منیۃ المصلی، قدوری، کنز الدقائق پڑھیں۔ شرح جامی کی تعلیم کا پورا اہتمام کیا۔ ایک بار رامپور سے ایک مولوی صاحب آئے جو شرح جامی کے استاد سمجھے جاتے تھے۔ عم محترم مولوی عبدالشکور خاں صاحب مرحوم نے اُن کو مکتب میں میرا امتحان لینے کے واسطے بھیجا۔ "حاصل محصول" کی بحث میں امتحان لیا۔ باہر سے جاکر عم محترم سے کہا کہ "لڑکا سمجھتا ہے"۔

(۶) مولوی غلام محمد صاحب پنجابی کے بعد مولوی عبد الغنی خاں صاحب (جو اجلّہ تلامذہ مولانا لطف اللہ صاحب سے تھے) تشریف لائے۔ قطبی سے پڑھانا شروع کیا۔ قطبی، میر قطبی، مختصر المعانی، ہدیہ سعیدیہ پورے اہتمام و کاوش سے پڑھائیں۔ مطالعہ کی سخت تاکید تھی۔ اس کی خامی پر تنبیہ فرماتے۔ فقہ میں ہدایہ اخیرین کتاب الرہن تک۔ منطق ملاحسن تک پڑھائی۔ اصول فقہ میں نورالانوار اور توضیح تلویح مقدمات اربعہ تک پڑھی۔ حدیث میں مشکوٰۃ المصابیح، تفسیر میں جلالین، تفسیر بیضاوی (سورۂ بقرہ تک) اسی کے ساتھ انگریزی کی تعلیم ہوتی رہی۔

(۷) اس زمانے کے بعد ۱۹۰۰ء میں علی گڑھ حاضر ہوا۔ مولوی لطف اللہ صاحب کی خدمت میں زانوئے تلمذ ادب سے تہ کیا۔ حمد اللہ، قاضی مبارک، میر زاہد رسالہ (مع غلام یحیٰی) مولانا سے پڑھا۔

(۸) شمائل ترمذی، ساڑھے نو پارے صحیح بخاری کے شیخ حسین صاحب عرب بھوپالی سے پڑھے۔ باقی روایات کی سند عطا ہوئی۔

(۹) حدیث المتحابّاں فی اللہ الخ کی روایت حضرت پیر مرشد مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی قدس سرہ نے (جو موصوف کو شاہ عبدالعزیز صاحب سے پہونچی تھی) عطا فرمائی۔

(۱۰) یہی حدیث شاہ ولی اللہ صاحب کی قاری عبدالرحمٰن صاحب پانی پتی (تلمیذ شاہ اسحٰق صاحب مرحوم) سے پڑھی۔ باقی روایات کی سند دی۔

(۱۱) مکہ مکرمہ میں وقاری سید عبدالرحیم صاحب کو (جو مصر اور قراء کے دور سابق کی یادگار تھے) کلام مجید پورا سنایا۔

(۱۲) مدینہ طیبہ میں قاری حسن شاعر سے اُن کا رسالہ قرأت پڑھا۔ آخیر سبق مسجد نبوی میں پڑھایا اور سند قرأت عطا فرمائی۔

(۱۳) شیخ حبیب اللہ الشنقیطی سے حدیث مصافحہ و مشابکہ کی نیز دیگر مرویات کی سند حرم شریف میں حاصل ہونے کی سعادت نصیب ہوئی۔

انگریزی

(۱) مولوی غلام محمد صاحب کی تعلیم عربی کے زمانے میں ۱۸۸۳ء میں ماسٹر عبدالرشید خاں صاحب ساکن علی گڑھ تعلیم یافتہ محمڈن کالج سے انگریزی شروع کی جو ۱۸۸۵ء تک جاری رہی۔

(۲) ۱۸۸۸ء میں آگرہ جاکر باقاعدہ آگرہ کالج کے ہائی اسکول میں درجہ ہشتم میں داخل ہوا ۱۸۸۹ء تک یہ تعلیم جاری رہی۔

(۳) علاوہ اسکول کی تعلیم کے مسٹر ورنن ہیڈ ماسٹر اور (۴) مسٹر کاکی سکنڈ ماسٹر سے انگریزی ادب حاصل کیا۔ وہاں سے علی گڑھ آکر (۵) مسٹر ہوریسٹ ہیڈ ماسٹر محمڈن کالج ہائی اسکول اور (۶) مسٹر کیسے بن ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول علی گڑھ سے انگریزی ادب پڑھنے اور لکھنے کی مشق کی۔

تعلیم انگریزی کے دوران میں الحمد للہ کبھی تعلیم مذکور کو تعلیم عربی پر غلبہ نہیں ہوا بلکہ تعلیم عربی پوری توجہ کے ساتھ جاری رہی اسی وجہ سے انگریزی میں زیادہ ترقی نہ ہو سکی۔

سیاق

طریقۂ حساب کاغذات ریاست (جس کو اصطلاحاً سیاق کہتے ہیں) حبیب اللہ خاں ساکن بھیکن پور و جبیب گنج سے سیکھا جو اس فن کے ماہر تھے۔ (غیر مطبوعہ)

خاندان

ہمارا خاندان شروانی ہے جو لودھی اور غلزئی کے بھائی شروانی کی اولاد میں ہیں۔ (سلطان بہلول لودھی کے وزیر اعظم عمر خاں شروانی تھے جن کا خطاب مسند عالی تھا) وہ ہمارے مورث ہیں۔ عمر خاں شروانی کے خاندان میں سلاطین لودیہ کی وزارت عظمیٰ کئی پشت تک قایم رہی۔

شیر شاہ سوری کے عہد میں اقتدار حاصل رہا۔ شیر شاہ نے ہمایوں بادشاہ کا اخراج ہندوستان سے کیا اور ہندوستان کی سلطنت پر قبضہ اس وجہ سے مغل سلاطین پٹھانوں کے مخالف ہوئے اور فوج سے خارج کر کے اُن کو آوارہ کر دیا۔ اکبر بادشاہ اور شاہجہاں کے عہد میں ہمارے بزرگ دلی سے اس نواح میں آئے۔ اور زمینداریاں قایم کیں جو آج تک اللہ تعالیٰ کے فضل سے ترقی کے ساتھ قایم ہیں۔ ہمارے پردادا صاحب محمد باز خاں تھے۔ اُن کے تین صاحبزادے تھے۔ حاجی محمد داؤد خاں مورث نواب محمد فضل اللہ خاں بڑے۔ منجھلے محمد خاں زماں خاں ہمارے دادا۔ موصوف انتظام ریاست اور کاغذات ریاست میں ماہر تھے۔ شاہ عبد العزیز صاحب سے بیعت تھی۔

مسائل اربعین رسوم شادی و غم کے متعلق شاہ محمد اسحٰق صاحب محدث مرحوم سے لکھوا کر اس کے مطابق خاندان کے رسوم کی اصلاح کی جو قریباً ایک صدی سے بفضلہ تعالیٰ آج تک قایم ہے۔ چھوٹے بھائی حاجی غلام محمد خاں دادوں کے مورث تھے۔ بھائیوں میں سے سب سے پہلے انھوں نے انتقال کیا۔ دادا صاحب مرحوم نے اُن کے فرزند محمد ہادی یار خاں صاحب کے بلوغ تک اُن کی ریاست کا کام کیا۔ خاں زماں خاں صاحب کے تین فرزند تھے۔ حاجی محمد ہدایت اللہ خاں جو عابد زاہد تھے انتظام ریاست میں ماہر علم دوست تھے شباب میں انتقال کیا۔ منجھلے حاجی محمد عبد الشکور خاں صاحب

عربی کے عالم تھے ملا حسن شمائل ترمذی وغیرہ کتابوں تک باقاعدہ تحصیل کی تھی۔ انتظام ریاست میں پوری مہارت تھی۔ ۷۵ برس کی عمر ہوئی۔ علوم کے پورے خادم تھے۔ مدرسۂ لطیفیہ علی گڑھ، دارالعلوم دیوبند سہارنپور، مدرسہ امدادیہ مراد آباد وغیرہ کی ہمیشہ خدمت کی۔ طلبہ کو وظائف دئیے۔ سرسید کے ساتھ مل کر محمڈن کالج کی بھی خدمت کی اگرچہ اُن کے عقائد کے خلاف رہے۔ آخر زمانہ میں حج کیا۔ زیارت مدینہ طیبہ سے مشرف ہوئے۔ واپسی میں بمقام جدہ رحلت کی وہیں مدفون ہیں۔ چھوٹے بھائی محمد تقی خاں صاحب میرے والد تھے۔ ان بھائیوں کا باہمی اتفاق مشہور تھا یہ ریاست ہمیشہ مشترک رہی۔

والد مرحوم کو مردانہ فنون، بنوٹ، لکڑی، ورزش، کشتی کا شوق رہا، نیز بندوق کے شکار کا۔ اسی کے ساتھ ادب اردو سے ذوق تھا۔ شروع میں مجھ کو غالب کی اشعار اردو کے معنی پڑھنے کے واسطے عنایت کی تھی اُسی سے مجھ کو ادب اُردو کا ذوق پیدا ہوا۔ والد مرحوم نے ایک کتاب سراپا معشوق اردو میں فراہم کر کے چھپوائی تھی اس میں سر سے پاؤں تک جملہ اعضا کے متعلق اساتذہ کے اشعار جمع کئے تھے۔ اس کا قلمی نسخہ میرے کتاب خانہ میں بھی ہے۔ والد مرحوم کو غدر سے پہلے اور بعد دہلی جاتے، وہاں رہتے اور وہاں کے عمائد مثلاً مفتی صدرالدین خاں صاحب آزردہ اور حکیم احسن اللہ خاں صاحب وغیرہما سے ملنے کا اتفاق ہوتا رہا۔ اس وجہ سے خورد و نوش نشست برخاست لباس، ذوق صحبت میں پورا اثر دلی کی صحبت کا تھا۔ مجھ کو اپنے والد مرحوم اور عم محترم دونوں کی صحبت تربیت کا فیض حاصل ہوا۔ ادب، تکار لباس اور خورد و نوش اور فنون مردانہ بنوٹ لکڑی وغیرہ کی مشق نتیجہ ہے والد مرحوم کی تربیت کا۔ والد مرحوم ہمیشہ دوپہر کا کھانا اپنے ساتھ کھلاتے تھے۔

علم عربی کی تحصیل اور پابندی مذہبی عم محترم کی نگرانی میں تربیت کا نتیجہ ہے۔ ریاست کے انتظام سے واقفیت مرحوم کی تعلیم و تربیت سے حاصل ہوئی۔ جزاھم اللہ تعالیٰ عنی خیر الجزاء۔

آمین یارب العالمین

(غیر مطبوعہ)

۱۵؍ شعبان ۱۳۵۶ھ۔ محمد مقتدیٰ خاں شروانی۔

انتظام ریاست

(ریاست مشترکہ و خاص)

۱۸۹۳ء مطابق ۱۳۱۰ھ میں تعلیم کا سلسلہ ختم ہوا۔

گھر آکر ریاست کا کام سیکھنا اور دیکھنا شروع کیا۔ معاملات ریاست میں عم محترم مرحوم کی نظر بہت وسیع اور عمیق تھی۔ موصوف کی نگرانی میں کام کیا۔ علاقہ ہردوئی میں اکثر قیام رہا۔ وہاں کاشتکاروں کی آراضی اور اس کے پیداوار کے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ کچے کے کھیتوں کی مساحتیں کیں۔ اس زمانے میں نیل کا کاروبار پورے عروج پر تھا۔ اس کی کاشت کرائی۔ مال تیار کرایا بھروا کر کلکتہ بھیجا۔ اسی سلسلہ میں ایک مرتبہ کلکتہ کا سفر کیا۔ ۱۹۰۵ء مطابق ۱۳۲۳ھ میں والد مرحوم کا انتقال ہوا۔ موصوف اپنے بھائی کے ساتھ ملکر ریاست کا کام کرتے تھے۔ دونوں بھائیوں کا اتفاق مشہور عام تھا۔ والد مرحوم کے انتقال کے بعد میں نے بھی عم محترم کے ساتھ مل کر کام کیا۔ اس اسلوب سے کہ پہلے موقعہ پر اُن کی خدمت میں میرا اولاد حسین کارندہ کے زبانی عرض کی کہ اب بھی حضور اسی طرح ریاست کے مالک ہیں جیسے کہ والد مرحوم کی حیات میں تھے۔ اس سے جو تردد کہ والد کے انتقال سے عم محترم کی طبیعت میں پیدا ہو گیا تھا صاف ہو گیا۔ چنانچہ بھیکن پور صبح کو جاکر میں کام کرتا تھا قبل دوپہر واپس آتا تھا۔ والد مرحوم کا بھی یہی طرز عمل تھا۔ جولائی ۱۹۰۷ء مطابق ۱۳۲۵ھ اثنائے سفر حجاز میں مراجعت کے وقت جدہ پہنچ کر عم محترم کی رحلت واقع ہوئی۔ اُس وقت عزیزوں اور حکام کی متفقہ مشاورت اور تحریک سے کل ریاست کا کام میرے سپرد ہوا تاکہ قرضہ ادا کیا جائے۔ بعد ادائگی قرضہ ریاست تقسیم ہو گئی۔ چونکہ عم محترم ریاست کے کارگزار تھے اس لئے قرضہ سب اُن کے دستخطی رقعوں کا تھا والد مرحوم کا ایک بھی نہ تھا۔

والد مرحوم کا اصول قرض کشی کے بالکل خلاف تھا اس لئے بھائی کی قرض کشی پر نہ صرف معترض تھے بلکہ بیزار تھے وقتاً فوقتاً اس کا شکوہ والد صاحب کی زبانی میں نے بھی سنا تھا۔

اپنے معتمد وکیلوں کی یہ رائے تھی کہ اگر میں قرضہ سے انکار کردوں تو میرے ذمہ قرضہ عائد نہیں ہوسکتا تھا۔ قرضہ سودی تین لاکھ روپیہ تھا جس کا سود ۹ / اور ۱۲ / سیکڑہ تھا۔

بفضلہ تعالیٰ میری طبیعت نے اس کو گوارا نہیں کیا کہ میں سبکدوش ہوکر سارا بار دوسرے عزیزوں کے ذمہ ڈالدوں۔ دو لاکھ روپیہ برادر عزیز عبدالجلیل خاں کے ذمہ تھا اوران کی ریاست کا حصہ گورنمنٹ کی جانب سے میرے ٹھیکہ میں تھا۔ اس طرح مجھ کو ۵ لاکھ روپیہ سودی ادا کرنا تھا قائم قسم مرحوم کی فیاضی مشہور روزگار تھی۔ نیک کاموں میں مثل عربی مدارس اور دوسری تعلیم گاہوں کے اہل حاجت کی خدمت وغیرہ میں بے دریغ روپیہ صرف فرماتے تھے۔ یہ فضل ربانی تھا کہ کام ہاتھ میں لیکر تمام مصارف خیر جاری رکھے اور سارا قرضہ مثل پانی کے بہ کر بہت آسانی سے ادا ہوگیا۔ یہ حضرت پیر مرشد قدس سرہٗ کی دعاء خیر کا نتیجہ تھا۔

ساڑھے چھ برس اس نہج سے ریاست کا انتظام جاری رہا۔ بالآخر بعض عزیزوں کو یہ طریقہ گوارا نہ رہا۔ اور ریاست کی تقسیم انھوں نے چاہی۔ نواب مزمل اللہ خاں مرحوم کو درمیان میں ڈالا۔ شروع میں مجھ کو یہ ناگوار ہوا۔ خصوصاً نواب صاحب کی وساطت۔ لیکن بالآخر میری یہ رائے قرار پائی کہ میری کارگزاری یا عدم کارگزاری، دیانت یا خیانت اگر کھل سکتی ہے تو اسی طریقہ سے لہذا میں نے بھی تقسیم پر آمادگی ظاہر کردی اور نواب صاحب مرحوم کل شرکاء کی جانب سے ثالث باضابطہ قرار پاگئے۔ موصوف نے بہت محنت سے ثالثی کے فرائض انجام دئے۔ اپنے فیصلہ میں میری دیانت کا اعتراف کرکے کل شرکاء کے حصے تقسیم کردئے۔

تقسیم کے بعد بھی چونکہ قرضہ باقی تھا لہذا اکثر حصہ اپنی جائداد کا شرکاء نے میرے ہی قبضہ میں چھوڑا تاکہ میں اُن کا قرضہ ادا کردوں۔ چنانچہ قرضے ادا ہونے کے بعد اُن کی جائدادیں اُن کے سپرد کردی گئیں۔

ان عزیزوں کے سوا خاندان کے اور عزیزوں کے بھی سودی قرضے اس طور پر ادا کئے کہ اُن کو اپنے پاس سے رقم دے کر سودی قرضے کے بار سے سبکدوش کرایا اور اُن کی جائدادیں اپنے یہاں رہن

رکھ کر ریزہ ریزہ آمدنی سے اپنا قرضہ بلا سود وصول کر لیا۔ یہ جائدادیں تین ضلعوں میں پھیلی ہوئی تھیں، علی گڑھ ایٹہ، بلند شہر۔ مدیون مسلمان سنی شیعہ اور ہندو سب تھے۔ جب قرضہ ادا ہو گیا فوراً جائداد واگذاشت کر دی۔ بعض دفعہ ایسا ہوا کہ باوجود تھوڑا قرضہ رہ جانے کے بلحاظ ضرورت مدیونان جائداد چھوڑ دی بقیہ رقم قرضہ معاف کر دی۔ والحمد للہ تعالیٰ علیٰ ذٰلک۔ اس طرح قریباً کل ۶ لاکھ قرضہ سودی ادا کیا گیا۔

اس کے بعد پھر میں نے اپنی جائداد ذاتی کا انتظام کیا اور بفضلہ تعالیٰ وافر جائداد کا اضافہ ہوا جس کی قیمت کم و بیش ۶ لاکھ روپیہ ہوئی۔ بہت سے جھگڑے جو عرصہ دراز سے چلے آتے تھے پاک وصاف ہو گئے۔

(غیر مطبوعہ)

تقسیم ترکہ کی برکت

عام خیال غلط یہ ہے کہ تقسیم ترکہ مسلمانوں کی جائدادوں کے فنا ہونے کا باعث ہے۔ تقسیم در تقسیم سے بڑی بڑی جائدادیں ریزہ ریزہ ہو کر فنا ہو جاتی ہیں۔ واقعات ذیل کی روشنی میں اس خیال کو جانچو۔

اس وقت ریاست بھیکم پور کا جمع خرچ نقدی بابتہ ۱۲۴۱ف پیش نظر ہے۔ جس کو ایک[1] سو تین برس کا زمانہ گزر گیا۔ یہ وہ وقت ہے کہ محمد باز خاں صاحب مرحوم رئیس بھیکم پور کا ترکہ تقسیم نہ ہوا تھا اور تینوں[2] فرزند ان کے مشترکاً ریاست پر قابض تھے۔ اس طرح دادوں بھیکم پور۔ حبیب گنج کی کل ریاستیں یکجا تھیں۔ محمد باز خاں مرحوم کا انتقال ۱۲۳۵ف میں ہوا۔ غفرلہ۔

۱۲۴۱ف میں مندرجہ جمع خرچ مذکور کل مواضعات ریاست حسب ذیل تھے۔

زمینداری مال ضامنی وکنگشہ وغیرہ کل ۶۵ آمدنی یک لکھ ۱۱۱۰۰۶-۹ مگر ممکن ہے کہ محمد باز خاں صاحب کے ترکے میں چھ سات برس کے زمانے میں کچھ اضافہ کر لیا گیا ہو۔ بہر حال خاں صاحب موصوف کا ترکہ اس سے زیادہ نہ تھا۔

---

[1] و [2] ملاحظہ ہو صفحہ ۳۲

یہ ترکہ تین فرزندوں پر تقسیم ہوا۔ منجھلے صاحبزادہ محمد خان زماں خاں صاحب مرحوم کے حصے میں بائیس ۲۲ موضع آئے حسب ذیل: زمینداری سترہ مال ضامنی پانچ اُن کی کل آمدنی پچیس ہزار سینتالیس تھی۔ مال و سوایہ وغیرہ ملا کر سال تمام میزان معہ للحصہ رتھی۔ مالگزاری کم و بیش سولہ ہزار روپیہ منافعہ اکتیس ۲۱ ہزار محمد خان زماں خاں صاحب کا ترکہ تین فرزندوں اور ایک دختر پر تقسیم ہوا۔ بڑی دختر نے حصہ لینے سے انکار کر دیا۔

محمد خان زماں خاں صاحب اور اُن کے فرزندوں نے ریاست کو برابر ترقی دی۔ نتیجہ یہ کہ اب اُن کے ورثار کے قبضے میں نو دہات ہیں آمدنی ایک فرزند کے ترکے کی بفضلہ تعالیٰ اُن کی آمدنی کے پنج گونی ہے اور دہات زمینداری ۳۶۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔

دوشنبہ ۹ رغرہ جمادی الآخرہ ۱۳۵۶ھ

مگر بلکہ آمدنی اس حصے کی محمد باز خاں صاحب کی ریاست کی آمدنی سے زیادہ ہے۔ یہی حال محمد باز خاں صاحب مرحوم کے باقی دو فرزندوں کے ورثار کی جائداد کا ہے۔ دونوں فرزندوں کے ترکے نے ترقی عظیم کی ہے۔ آمدنی اور تعداد جائداد اضعافاً مضاعفاً ہے۔

(غیر شائع شدہ)

سفرنامۂ مصر و روم و شام

اے ہمنفس از بہر دل زار بگو
افسانۂ آں شبے کہ با یار گزشت

ڈیر ایڈیٹر۔ سفر در وطن فن تصوف کا ایک مشہور مسئلہ ہے۔ اہل باطن پر تو اس کا انکشاف ہوتا ہی ہے۔ لیکن ہم ظاہر بین اس کے معنی کی فہم سے قاصر ہیں اور ہے بھی یوں کہ ہم کیونکہ سمجھ سکتے ہیں کہ گھر میں آرام سے مسہری پر دراز ہوں اور سیر کر رہے ہوں قسطنطنیہ کی مگر اپنے مخدوم علامہ شبلی کے فیضان

توجہ سے ہم نے بھی اس واردات کا مشاہدہ کیا اور گھر سے ایک قدم باہر رکھے کے بغیر قسطنطنیہ، بیت المقدس، بیروت اور قاہرہ وغیرہ کی دلآویز کیفیتیں اپنی آنکھ سے دیکھ لیں۔ اگر آپ علامہ موصوف کا سفرنامہ پڑھیں تو یہ حال آپ پر بھی منکشف ہو سکتا ہے۔ بکلف برطرف اجس سفرنامے کا اشتیاق دلوں کو مدت سے وقف تمنا اور محو آرزو کر رہا تھا اب طبع ہو کر شائع ہوا ہے اور حالات مصر کے اعتبار سے یہ کہنا بالکل حق بجانب ہو گا کہ ایک عزیز مصر معنی بازار میں فروخت کو آیا ہے۔ علامہ شبلی کی اصل غرض اس اولوالعزمی سے ٹرکی، شام، مصر کے تعلیمی حالات کا دریافت کرنا اور وہاں کے ایشیائی علوم کے نایاب کتاب خانوں کی سیر تھی۔ انہوں نے اپنی قابل مدح غرض کو نہایت جانفشانی اور تحقیق سے پورا کیا اور جو کچھ دیکھا اس کو بسط و شرح سے اس سفرنامے میں درج کیا ہے۔ مختلف فنون کے مدارس کے حالات یعنی ان کا سالانہ صرف، تعلیم، طلبہ کی تعداد، بورڈنگ ہوس کا انتظام اور تربیت کا طریقہ۔ ان تمام امور کو نہایت مستند طور پر بیان کیا ہے۔ پرانے کتاب خانوں کے حالات اور ان کی عزیزالوجود کتابوں کی کیفیت بھی مفصلاً مذکور ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہر شہر کے تمدن اور دلچسپ مقامات سے بھی بحث کی گئی ہے۔ اس سفرنامے کی فہرست میں قریباً ۸۰ عنوان مندرج ہیں۔ میں ناظرین باتمکین کو یقین دلا سکتا ہوں کہ ہر ایک عنوان کو دیکھ کر یہی دل چاہتا ہے کہ سب سے اول اسی کو پڑھنا چاہیے۔ بعض بطور نمونہ یہ ہیں۔ قسطنطنیہ کی موجودہ حالت اور تمدن تعلیم کی حالت۔ فوجی کالج۔ ترکوں کی علمی حالت۔ کتاب خانے۔ سیرگاہیں۔ سلطان کا نماز جمعہ میں آنا۔ اور فوجوں کا ملاحظہ سے گزرنا۔ ترکوں کے اخلاق و عادات و طرز معاشرت۔ عورتوں کی تعلیم و تربیت وضع۔ لباس۔ غازی عثمان پاشا کی ملاقات، تمغہ و فرمان سلطانی کی نقل، بیروت۔ بیت المقدس۔ قاہرہ وغیرہ

جو خوبی اس سفرنامہ کے ساتھ مخصوص ہے وہ یہ ہے کہ یہ اسلامی دیار اس نگاہ سے دیکھے گئے ہیں جو ان کے شایان حال ہیں۔ اس زمانے میں سفر کرنے والے اور حالات سفر لکھنے والے بہت مگر وہ قسطنطنیہ اور قاہرہ کو اسی دلچسپی اور نظر سے دیکھتے ہیں جو اس زمانے کا اقتضا ہے۔ پس وہ اپنے

مذاق کے مطابق ان شہروں کی سیر کے نتائج اخذ کرتے ہیں۔ اس تاثیر سے محض بے خبر رہتے ہیں جو اُس دیار کا ہر ایک ذرہ ایک مسلمان دل پر کرتا ہے۔ ہمارے نامور سیاح نے ایک محقق مسلمان کی نظر سے ان ممالک کو دیکھا اور مسلمانوں کی دلچسپی کا بیحد سامان اپنے سفرنامے میں فراہم کر دیا ہے دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ان اسلامی شہروں کی قدیم اسلامی تاریخ خود مستند مسلمان مورخوں کے بیان کے مطابق جابجا درج ہے۔ اور وہ یہی ہے کہ علامہ ممدوح سے بڑھ کر یہ کام کون کر سکتا ہے۔ اس سفرنامہ کو پڑھ کر آپ دریافت کر سکتے ہیں کہ جو مقامات پولٹیکل دنیا میں بے انتہا امپارٹنٹ خیال کئے جاتے ہیں اور ہر ایک عظیم الشان سلطنت اُن کو رشک کی نظر سے دیکھ رہی ہیں وہ صدیوں سے صدیوں تک شجاعان اسلام کے قدموں کے نیچے پامال رہی ہیں یہ سفرنامہ عمدہ کاغذ کے ۲۳۵ صفحے پر بہت نفیس چھپا ہے اور عہ میں علی گڑھ محمڈن کالج کے پتہ سے علامہ شبلی صاحب سے مل سکتا ہے۔

(اخبار آزاد کانپور مورخہ ۱۰ اگست ۱۸۹۴ء)

ۡلہ نیز بائی ریاست۔ محمد مقتدیٰ خاں شروانی۔

ۡ۲ه (۱) حاجی محمد داؤد خاں مرحوم جد نواب محمد فضل اللہ خاں مرحوم۔

(۲) محمد خاں زماں خاں مرحوم جد نواب صدر یار جنگ بہادر مدظلہ۔

(۳) حاجی غلام محمد خاں مرحوم جد رؤسائے دادوں۔ محمد مقتدیٰ خاں شروانی۔

ۡ۳ه (۱) حاجی محمد ہدایت اللہ خاں مرحوم۔ انھوں نے کوئی اولاد نرینہ نہیں چھوڑی۔

(۲) مولوی حاجی محمد عبدالشکور خاں مرحوم جد موجودہ رؤسائے بھیکم پور قدیم۔

(۳) محمد تقی خاں مرحوم پدر نواب صدر یار جنگ بہادر مدظلہ۔

محمد مقتدیٰ خاں شروانی

الفاروق

(تبصرہ)

اے آتشِ فراقت دلہا کباب کردہ

سیلابِ اشتیاقت جانہا خراب کردہ

الفاروق کی آمد آمد کا آوازہ مدّت سے ملک میں بلند تھا۔ پبلک کا شوق وقفِ انتظار تھا۔ خلیفۂ ثانی کی لائف کی عظمت واہمیت علامہ مصنف کے پیشِ نظر تھی اور اُن کی دقیقہ سنج نظر موادِ تحریر کی تلاش میں سرگرم۔ جن باتوں کو آج نگاہیں ڈھونڈتی ہیں وہ گزشتہ تاریخوں میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتیں۔

ہندوستان میں جو تاریخی مصالحہ ہے وہ اس عظیم الشان کام کے لئے کافی نہیں۔ مصنف کی تشنگی طلب سمندر طے کرکے اُن کو ترکی دارالخلافہ میں لے پہنچی جہاں انھوں نے نایاب کتاب خانے چھان ڈالے وہاں سے اُن کا شوق اپنے عزیز کی تلاش میں مصر لایا۔ غرض یہاں انتظار تھا، وہاں مصروفیت۔ ادھر تعجیل تھی اُدھر تاخیر۔ معرکہ طلب نگاہوں نے جب پبلک کی اس بے چینی کو محسوس کیا تو اُن کو موقع ہاتھ آیا۔ دیکھتے دیکھتے "سیرت الفاروق" "الفاروق" (اول) تالیف ہوئیں، چھپیں، بازار میں آئیں، اور اپنی اپنی قسمت کے مطابق فروخت بھی ہوئیں۔

جب یہ سیمیائی جلوے محو ہوئے اور صبح کاذب کی دھندلی روشنی کا فور ہوگئی تو صبح صادق نور افشاں ہوئی جس نے نگاہوں کو پُر نور اور دماغوں کو روشن کر دیا۔ ہم بعض مذکورہ بالا کتابیں پڑھ چکے تھے۔ لہٰذا الفاروق کو دیکھ کر ہم نے بے تامل کہا: "دیر آید درست آید"۔ اور جب ہم نے اس میں اُن کتابوں کے حوالے دیکھے جو قسطنطنیہ میں مصنف کی نظر سے گزری تھیں تو ہماری زبان سے بے ساختہ نکلا ؎ مصرعہ

دیر آمدہ، زراہِ دُور آمدہ

الفاروق کو غور و تامل سے پڑھنے کے بعد ہمارے تمہیدی الفاظ شاعرانہ مدح سرائی نہیں معلوم

ہوں گے، بلکہ یہ کہا جائے گا کہ جس قدر کہنا چاہیئے تھا اُس سے کم کہا گیا۔ حضرت فاروقِ اعظم کی لائف (جن کا ذرہ جنرلوں کی شمشیر سے زائد پُر اثر اور جن کی سادہ عظمت قیصر و کسریٰ کے جاہ و جلال سے بڑھ کر تھی) شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کی قلم سے نکلے تو کیا اُس کا غلغلہ اور انتظار اس سے کم ہو سکتا ہے جو ہم نے اوپر بیان کیا؟

الفاروق جس قسم کے مادّہ سے صورت پذیر ہوئی ہے وہ اعلیٰ درجہ اور اول قسم کا ہے۔ تاریخ طبری، کتاب الخراج، عقد الفرید، مقریزی، بلاذری، فتوح البلدان وغیرہ وہ کتابیں ہیں جو مسلمانوں کے فن تاریخ و جغرافیہ کی جان ہیں اور ان سے زائد معتمد کتابیں (جہاں تک علم ہے) اس وقت عالم میں موجود نہیں۔ یہ کتابیں مُصنف کے قابو میں ہیں۔ اور جہاں جس پہلو سے مناسب معلوم ہوتا ہے وہ علامہ روزگار ان سے کام لیتا ہے۔ قدیم معتبر تاریخیں، جدید تحقیق واقعات کے اصول، ان دونوں عنصروں کو ملا کر مؤلفِ الفاروق نے ایک تازہ دلفریب شکل پیدا کی ہے جو ایشیا اور یورپ دونوں کے قابو سے فرداً فرداً خارج تھی۔ اور جس کی نسبت خود مولانا نے فخریہ لہجے میں فرمایا ہے ؎

پیکرے تازہ کہ خواہم بہ عزیزاں بنمود
لختے از ذوقِ خودش نیز تماشا کردم

ہمارے مخدوم نے الفاروق لکھ کر نہ صرف تاریخِ اسلام پر ایک احسان کیا ہے بلکہ خود مذہبِ اسلام کی حقانیت کی ایک صاف و روشن بُرہان عالم کے سامنے پیش کی ہے۔ انصاف اور غور کی نظر اگر الفاروق پر ڈالی جائے تو یہ صاف سمجھ میں آتا ہے کہ حضرت فاروقِ اعظم ایک اعلیٰ نمونہ کمال و صفاتِ انسانی کے تھے۔ اس خیال کے بعد دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان قوتوں کو کس نے کامل کر کے شگفتہ کیا اور کس طرح اُن کی بُو فضائے عالم میں پھیلی۔ نہ وہ کسی یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ تھے، نہ عرب کے ایام جاہلیت کی سوسائٹی ایسی تھی جس کے سانچے میں ایسے باکمال انسان ڈھلتے۔ واقعات صاف شہادت دے رہے ہیں کہ یہ اُس ذاتِ قدسی کی تعلیم و تربیت کا اثر تھا جو انسانوں کو کامل بنانے اور خداوندِ حقیقی کے مظاہرِ قدرت کو ظاہر کرنے کے لئے مبعوث ہوئی تھی۔ اور خدا وندِ عالم نے بواسطۂ نبوۃ خود اُس کو

کامل بنایا تھا۔ ایسے انسان گزرے ہیں جو خود اپنی طبیعت کے زور سے بادشاہ بن گئے ہیں، اپنی قوت کے بل پر سپہ سالار بن کر فاتح عالم ہوئے ہیں۔ لیکن تیمور اور نپولین کے حالات پڑھ کر صاف عیاں ہوتا ہے کہ وہ طبیعت کی ایک لہر تھی جو ایک جانب کو بہا لے گئی۔ وہ بہت سی خوبیوں اور بہت سے نقائص کے مجموعے تھے۔

فاروق اعظم پر جس پہلو سے نگاہ ڈالو، امامت کے اعتبار سے، بادشاہی کے لحاظ سے، سپہ سالاری کی حیثیت سے، مقنن و مدبر کی نظر سے، اخلاق انسانی کی بنا پر، غرض ہر شکل میں اور ہر طرح دیکھو۔ خوب دیکھو۔ موافق نگاہ سے دیکھو۔ مخالف بن کر جانچو۔ قصہ مختصر جہاں تک دیکھا جائے دیکھو۔ سوائے خوبی کمال کے اور کچھ نظر نہ آئے گا۔

حق یہ ہے کہ صحابہ کرام حضرت سرور عالم صلعم کی ہدایت کے ایک اعلیٰ اور زبردست شہادت تھے اور آپ کی قوت تربیت کی ایک سچی تصویر۔ آپ کے فیضانِ صحبت سے حضرات ابوبکر، عمر، عثمان، علی، ابوعبیدہ، ابن جراح، سعد ابن ابی وقاص، عبدالرحمن ابن عوف، خالد ابن ولید، معاذ ابن جبل، زید ابنِ ثابت وغیر ذالک جیسے انسانی کمالات کے مختلف نمونوں کا پیدا ہونا ایک قوی اور مُسکِت ثبوت آپ کے من جانب اللہ مبعوث ہونے کا ہے اور اسی کا نام معجزہ ہے۔

الفاروق دو حصوں پر منقسم ہے جن کی مجموعی تعداد پانسو (۵۰۰) صفحے سے زائد ہے۔ حصۂ اول کے شروع ہونے سے پیشتر ایک تمہید ہے جس میں اسلامی تاریخ اور اس کے مختلف زمانوں کی حالت سے بحث کی ہے۔ معتبر تاریخوں کے نام، متقدمین و متاخرین کی طرز تحریر و تحقیق کا تفاوت بیان کیا ہے۔ فن تاریخ پر ایک عام نظر ڈالی ہے۔ اُس کے اصول و فروع بتائے ہیں اور ظاہر کیا ہے کہ مؤرخ کے کیا فرائض ہیں اور یورپ کے مؤرخ کس قسم کی بے اعتدالی کر جاتے ہیں۔

تمہید کے بعد حصۂ اوّل شروع ہوتا ہے۔ اور اُس میں حضرت عمر کے نسب، ولادت، سنِ رُشد، قبولِ اسلام، ہجرت، سنہ یکم ہجری سے وفاتِ حضرتِ سرورِ عالم صلعم تک کے حالات، سقیفۂ بنو ساعدہ، خلافت حضرت ابوبکر، ولیعہدی اور خلافت و فتوحات کا ذکر ہے۔

اس ضمن میں مصنف کو دو معرکۃ الآرا اختلافی مسئلے طے کرنے پڑے ہیں۔ ایک حدیث قرطاس دوسرا سقیفہ بنی ساعدہ۔

حدیث قرطاس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت سرورِ عالم صلعم نے وفات سے چار روز پیشتر قلم اور دوات طلب کی اور فرمایا کہ میں تمہارے لئے ایسی چیز لکھوں گا کہ تم آیندہ گمراہ نہ ہو۔ اس پر حضرت عمر نے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ آنحضرت کو درد کی شدت ہے اور ہمارے لئے قرآن کافی ہے۔ حاضرین میں سے بعض نے کہا کہ (معاذ اللہ) رسول بہکی باتیں کرتے ہیں، کسی نے کہا دوات قلم لے آؤ کسی کی رائے ہوئی کہ نہ لانا چاہیئے۔ غرض قیل وقال بڑھی اور آپ نے پریشان ہو کر سب کو اُٹھا دیا۔ یہ حدیث اسلام کے دو زبردست گروہوں کے مباحثہ کا صدہا برس سے نشانہ ہو رہی ہے۔ ایک گروہ اس کو خلیفۂ ثانی کے خلافِ کام میں لانا چاہتا ہے۔ دوسرا فریق ثابت کرتا ہے کہ اس میں کوئی امر خلافِ شرع یا ادب نہ تھا۔ شاہ عبدالعزیز صاحب نے "تحفہ" میں اس کی نسبت بارہ صفحے لکھے ہیں۔ جو لوگ شاہ صاحب مرحوم کی دلآویز عبارت اور شگفتگی مضامین سے واقف ہیں وہ خیال کر سکتے ہیں کہ کیا موتی پروئے ہوں گے اور کیسی گل کاری کی ہوگی۔ لیکن ہمارے علامہ نے نئے پیرایہ میں استدلال کیا ہے اور درایت کے سادہ اصول سے واقعہ کو جانچا ہے۔ لوگوں کو اُن کا بیان روکھا اور پھیکا معلوم ہوگا۔ مگر "انصاف بالائے طاعت است"۔ انھوں نے دو بڑے زبردست پہلو اختیار کئے ہیں۔ اور پوری صفائی سے اس گتھی کو سلجھایا ہے۔ اس موقع پر یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ہر فن کے مؤلف کا ایک فرضِ منصبی ہوتا ہے۔ متکلم کا فرضِ منصبی اور ہے۔ فقیہ کا اور، اور مورخ کا اور۔ جب ایک ہی واقعہ ان سب کے سامنے پیش ہوگا تو ہر ایک کی نظر اُس پر مختلف پہلوؤں سے پڑے گی۔ ایک مورخ کسی واقعہ کو صرف اُس کی واقعیت کے اعتبار سے جانچے گا۔ یا یوں کہو کہ جانچنا چاہئے۔ جو مورخ آج تاریخ لکھے وہ اُن سادہ اور زبردست اصول سے قطع نظر نہیں کر سکتا جنھوں نے فنِ تاریخ کو بامِ عروج پر پہنچا دیا ہے اور جو تاریخ نگاری کی جان ہیں۔ پس الفاروق کو تاریخ کی حیثیت سے دیکھنا چاہئے نہ فقہ یا کلام کی کتاب کی حیثیت سے۔ اور اُس کے مؤلف کو تحسین یا نفرین کے واسطے مورخین کی بزم میں لانا چاہئے نہ کہ مفتیوں کے دارالافتا میں۔

سقیفۂ بنی ساعدہ (جہاں حضرت ابوبکر کی خلافت کا فیصلہ ہوا) حدیث قرطاس سے بھی زیادہ معرکہ خیز ہے۔ مؤلف الفاروق نے اس موقع پر بھی پوری آزادی رائے سے کام لیا ہے اور کسی طرح اپنے اُس فرض کو ترک نہیں کیا جو مورخ ہونے کی حیثیت سے تھا۔ اس بحث کے ہر ایک پہلو کو پولیٹکل سائنس کے اصول سے جانچ کر واقعہ کے اصلی پہلو دکھا دئے ہیں۔

معمولاً کسی کتاب کی جلد اول و ثانی کے مابین کوئی فصل نہیں ہوتا۔ لیکن الفاروق کی دونوں جلدوں کے بیچ میں اتنا فاصلہ ہے کہ ایک عالم نظر آتا ہے اور کہہ سکتے ہیں کہ دونوں میں بُعد المشرقین ہے۔ ہماری مراد اُس نقشہ سے ہے جو "دنیاے اسلام" کے نام سے دونوں جلدوں کے بیچ میں چھپا ہے۔ جب ہم اُس کو کھولتے ہیں تو اُس کا مشرقی حصہ جلد اول پر اور مغربی حصہ جلد ثانی پر آجاتا ہے۔ اسی لئے ہم نے اُس کو بعد المشرقین سے تعبیر کیا ہے۔ یہ نقشہ فی نفسہ ایک عجیب چیز ہے۔ اور جرمنی کے جن پروفیسروں نے مرتب کیا ہے اُن کی جانفشانی اور دقیقہ سنجی لائق ہزار آفرین ہے۔ کسی بڑے مضمون کی عبارت کے اختصار کی تعریف بیان کریں تو معمولاً کہتے ہیں کہ "دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے"۔ لیکن یہ مثل نقشہ کے بارہ میں عمومًا اور اس نقشہ کے مقابلہ میں خصوصًا ناچیز ہے۔ نقشہ میں (دریا کیا چیز ہے) فُٹ بھر کاغذ میں (بلکہ اُس سے کم میں) سمندر بند ہوتے ہیں، بلکہ بہ کر۔

اس نقشہ میں کھاری پانی کے سمندروں سے گزر کر فتوحات اسلامیہ کے جانفزا سمندر موجزن ہیں۔ اور جس طرح دنیا کے سمندروں میں رنگ کا امتیاز ہے۔ کوئی اَسْوَدْ ہے، کوئی اَحْمر۔ اسی طرح اس نقشہ میں مختلف عہد کی فتوحات کے سیلاب اپنے اپنے رنگ سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ اور ایک نگاہ میں حضرت سرور عالم صلعم خلیفۂ اول سے ثالث تک کا، بنی اُمیّہ کے عہد اور اُس کے مابعد کی فتوحات کی حد معلوم ہو جاتی ہے۔ اس نقشہ کی مدد سے عرب کی گزشتہ تاریخ عمدہ طور پر سمجھ میں آسکتی ہے۔ شمس العلماء سید علی بلگرامی نے بھی ایک نقشہ "تمدن عرب" میں مثل اس کے دیا ہے۔ لیکن الفاروق کا نقشہ اُس سے زائد مفید اور زیادہ معلومات کا مخزن ہے۔ کاش یہ نقشہ بڑا چھاپ کر دیوار کے آویزاں کرنے کے لائق بنایا جائے۔

جلد ثانی (جیسا کہ خود مصنف نے دعویٰ کیا ہی) مصنف کی سعی و محنت کی تماشاگاہ ہی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ حضرت فاروق اعظم کی عظمت کی پوری تصویر ہی۔ جس شخص کو یہ نہ معلوم ہو کہ یہ کتاب حضرت عمر کے حالات میں ہی وہ حصۂ ثانی کی فہرستِ مطالب دیکھے تو سمجھے گا کہ یہ کسی انیسویں صدی کے مہذب و منتظم سلطنت کے محکموں کی فہرست ہی۔ کیا یہ کم تعجب خیز امر ہی کہ شائستگی نے جو وسعت حکومت کے مفہوم میں آج پیدا کی ہی اور اُسی وسعت کی بنا پر جو محکمے جزو سلطنت قرار پائے ہیں، وہ سب نہیں تو اُن میں سے اکثر ایک منتظم شکل میں حضرت عمر نے اپنی دس سالہ حکومت میں قائم فرما دئے تھے۔ اور نہ صرف قائم فرمائے بلکہ اُن کے فیض بخش نتائج عالم کو دکھلا دئے؟!

علامۂ مصنف کو سب سے اول اُن کی قوتِ دماغی اور جامعیت خیال پر آفریں کہنی چاہیئے کہ اُنھوں نے فاروق اعظم کی لائف کا ایسا وسیع اور جامع خاکہ اپنے ذہن میں قائم کیا، یا یہ الفاظ دیگر اُن کی عظمت کو اصلی ہیئت میں دیکھا۔ اُس کے بعد مصنف کی تلاش و تجسس کی داد دینی چاہیئے کہ جس قدر عنوان قائم کئے اُن کو پوری نکتہ سنجی اور موشگافی کے ساتھ معمور کیا اور واقعات کی مدد سے ہر بحث کا حق ادا کر دیا۔

اس جلد میں آغاز کرتے ہوئے مصنف نے فتوحاتِ فاروقی پر ایک نظر ڈالی ہی اور جن واقعات کو ختم کر آئے ہیں اُن کو ایک اور نگاہ سے دیکھا ہی۔ اول اسباب فتوحات سے بحث کی ہی۔ اس بحث میں مصنف نے اپنے آپ کو زورِ طبع کی مدد سے اُس طوفان کے مقابلہ میں قائم رکھا ہی جس میں اکثر ابنائے زمانہ کی رائیں بہتی پھرتی ہیں۔ یعنی جو کچھ یورپ کہے سب آمنّا و صدقنا۔ اور دعویٰ یہ کہ ہم نے یورپ سے آزادی خیال و تحقیقات کا سبق حاصل کیا ہی۔ محقق مصنف نے فتوحاتِ فاروقی کے اُن اسباب کی نسبت جو یورپین مورخ لکھتے ہیں یہ بتایا ہی کہ اُن میں طباعی کی ملمع سازی واقعات کے عنصر پر غالب ہی۔ پھر اپنی رائے کے مطابق اسباب قائم کئے ہیں۔ جو شخص ان دونوں بیانِ اسباب کا موازنہ کرے وہ مصنف الفاروق کی دقتِ نظر کا ضرور قائل ہو گا۔ اس بحث سے فارغ ہو کر حضرت عمر کا اُن فاتحین سے مقابلہ کیا ہی جو عالم میں (مثل سکندر اعظم) مشہور ہیں۔ اور ثابت کر دکھایا ہی کہ اُن میں ایک بھی فاتح حضرت فاروقی

سے برتر اور بہتر فاتح نہ تھا۔

بحثِ فتوحات کے بعد سلسلۂ انتظام سلطنت کو شروع کرتے ہیں۔ اول نوعیت حکومت سے بحث ہے کہ خلیفہ ثانی کی حکومت کا انداز شخصی سلطنت کے اصول پر تھا، یا جمہوری سلطنت کے۔ اس بیان میں یہ امر حیرت خیز ہے کہ حضرت عمر کی سی زبردست طبیعت اور پرزور رائے کا فرماں روا کیسا عام رائے کا قدرشناس اور جمہوری حکومت کے اصول کا پابند تھا، اور نہ صرف پابند، بلکہ شخصیت اور غلامی رائے کو مٹانے والا اور طبائع کو آزادی رائے کا سبق سکھانے والا تھا۔

اسی سلسلہ میں حضرت عمر کی مختلف حیثیتوں کی مجالس شوریٰ کے حالات ہم پڑھتے ہیں۔ یہ مجالس اپنے اپنے ارکان اور اپنے اپنے مسائل بحث کے لحاظ سے باہم ممتاز تھیں۔ ان میں بعض ایسی بھی تھیں جن میں رعایا کے قایم مقام طلب کئے جاتے تھے اور اُن سے مشورہ لیا جاتا تھا۔ اس بیان کی جان یہ ہے کہ خلیفہ کے حقوق کسی طرح عامۂ رعایا سے ممتاز نہ تھے اور اُن کی ذات کسی قانونی اثر سے مستثنیٰ نہ تھی۔ نوعیت حکومت کے بعد انداز حکومت کا بیان ہے، اور اس میں تقسیم ملک، عہدہ داران ملکی، اُن کے فرائض کا امتیاز، اُن کی تنخواہیں، رشوت کے انسداد کے طریقے، اُن کے جرائم کی تحقیقات کے لئے کمیشن کا تقرر، ان تمام اُمور سے مفصل بحث کی ہے۔

نظام حکومت کے بعد صیغۂ محاصل ہے۔ اس میں یہ دلچسپ ذکر ہے کہ اس طریقۂ خراج کے موجد عرب میں حضرت عمر ہیں۔ اسی ضمن میں عراق، شام و مصر کے صوبوں کے بندوبست کا ذکر ہے۔ بندوبست کے ذکر میں ہر صوبہ کے جداگانہ اصول بندوبست، اقسام اراضی اور پیداوار کو ملحوظ رکھنے، لگان کی شرح، مالگذاری کی ترقی اور پیمائش اراضی (اور اس کی صحت میں امام ابو یوسف کی یہ شہادت کہ "اراضی کی پیمائش اس احتیاط سے کی گئی جس طرح ریشمی کپڑا ناپا جاتا ہے") کا مفصل بیان ہے۔ خوبی بندوبست اس سے ثابت کی ہے کہ حضرت عمر کے بندوبست کے بعد اُفتادہ زمینیں آباد ہو گئیں اور پیداوار زراعت میں محسوس ترقی ہو گئی۔ اس دیدہ ریزی اور جانکاہی کے بعد بھی فرمانروا کو یہ احتیاط تھی کہ ہر سال صوبہ صوبہ سے دس دس معتمد آدمی دار الخلافہ میں طلب ہوتے اور اُن سے چار مرتبہ حلفاً پوچھا

جاتا کہ وصول مالگزاری میں رعایا پر سختی تو نہیں ہوئی۔ یہ کیسی عجیب بات ہی۔ بلکہ خوبی انتظام کا اعلیٰ ثبوت ہی کہ جس قدر خراج عراق وغیرہ صوبوں سے حضرت عمرؓ کے بابرکت عہد میں وصول ہوا اُس قدر نہ حجاج کی سختی وصول کر سکی نہ مامون کے زمانہ کا امن۔ خلیفۂ ثانی کے عہد میں محاصل عراق دس کروڑ اٹھائیس لاکھ درہم تھے۔ حجاج نے دو کروڑ آٹھ لاکھ وصول کئے۔ اور خلیفہ مامون کے عاملوں نے پانچ کروڑ اڑتالیس لاکھ۔ مصر کا خراج آج کل کے حساب سے پانچ کروڑ چھ لاکھ روپیہ سالانہ تھا۔ صیغۂ محاصل میں خلیفۂ ثانی نے جو اصلاحیں فرمائیں اور کاشتکاروں کے حقوق جس طرح مضبوط کئے اور تعلقہ داری و زمینداری کے قدیم ایرانی طریقہ کو قایم رکھا اُس کا بیان بھی مفصل طور پر ہی۔ صیغۂ محاصل کے بیان کا تتمہ یہ ہی کہ ترقی و استحکام زراعت کے واسطے ذرائع آبپاشی مہیا کئے گئے، نہریں کھدوائیں، تالاب کھدوائے، بند بنوائے۔ اور اس تمام سلسلہ کو محکمہ کی شکل میں منتظم فرمایا۔ یہاں تک کہ پانی کی تقسیم کے دہانے تک اپنی ہی منظوری سے بنوائے۔ علامہ مقریزی کا بیان ہی کہ صرف ملک مصر میں ایک لاکھ بیس ہزار مزدور برابر اس محکمہ میں کام کرتے تھے۔ اور اُن کے مصارف خزانہ خلافہ سے ادا ہوتے تھے۔

صیغۂ محاصل کے بعد صیغہ عدالت ہی۔ رومن امپائر کے بارہ اصول کارروائی اور حضرت عمرؓ کے قواعد کا موازنہ کیا ہی۔ بسیط طور پر محکمۂ عدالت کے جزئیات کی تفصیل لکھی ہی اور جتایا ہی کہ کس طرح انصاف میں عملاً اصول مساوات مرعی رکھا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ کا جو فرمان اصول عدالت کی نسبت نقل کیا ہی اُس کی عبارت سے ایک موقع پر جو مطلب مصنف نے اخذ کیا ہی وہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ اصل فرمان کی عبارت یہ ہی۔ "واجعل لمن ادعی بینة امداً ینتهی الیه فان احضر بینة اخذت له بحقه والا وجهت القضاء علیه"۔ اس کا ترجمہ یہ کیا ہی "جو شخص ثبوت پیش کرنا چاہے اس کے لئے ایک میعاد مقرر کرو۔ اگر وہ ثبوت دے تو اُس کا حق دلاؤ۔ ورنہ مقدمہ خارج"۔ آگے چل کر اس عبارت سے حسب ذیل دو اصول مستخرج کئے ہیں (۱) مقدمہ کی پیشی کی ایک تاریخ معین ہونی چاہیے (۲) تاریخ معینہ پر اگر مدعی علیہ حاضر نہ ہو تو مقدمہ یک طرفہ فیصل کیا جائے گا۔ معلوم نہیں اصول نمبر (۲) کہاں سے ماخوذ ہی۔ اس امر کا لحاظ رہے کہ فرمان مذکور کی ماقبل یا مابعد عبارت کو اس اصول سے کوئی تعلق نہیں۔

عدالت کے بعد افتا اور افتاء کے بعد پولیس و فوجداری کا ذکر ہے۔ اس صیغہ میں حضرت عمرؓ کے عرب میں جیل خانہ ایجاد کرنے کا ذکر ہے۔ اُن کی خلافت سے پیشتر عرب میں کہیں جیل خانہ نہ تھا۔ یہ بھی مذکور ہے کہ عادی مجرموں کو جلا وطنی کی سزا بھی ملتی تھی جو کسی جزیرے کو بھیج دیئے جاتے تھے۔

پولیس و فوجداری سے فارغ ہو کر ایک اور اہم صیغہ کا حال مصنف نے بیان کیا ہے یعنی خزانہ اور اس کے انتظامات، اُس کے افسر، مقصلات کے خزانوں اور خزانوں کے مکانوں کا مفصل حال تحریر کیا ہے۔ اس محکمہ کا ایجاد بھی عرب میں حضرت عمرؓ نے فرمایا۔

خزانہ کے بعد پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ ہے۔ اس میں اُن نہروں کے حالات ہیں جو علاوہ آبپاشی کے اور اغراض کے لئے تیار ہوئیں۔ مثلاً ایک نہر ابی موسیٰ تھی جو دجلہ سے نو میل مسافت طے کرکے بصرہ میں آئی تھی۔ اور اُس سے وہاں کا گلی کوچہ سیراب ہوتا تھا۔ ایک نہر خود امیر المومنین کے نام سے مشہور تھی۔ ۱۸ھ ہجری کے قحط عرب میں مصر سے غلہ بوجہ بعد مسافت دیر میں آیا اس لئے رفع قحط کے بعد خلیفہ ثانی نے وسائل آمد و رفت کو زیادہ آسان کرنے کی تدبیر فرمائی۔ دریائے نیل سے ۶۹ میل طویل ایک نہر نکال کر بحر قلزم سے ملا دی۔ اس طرح جہاز نیل سے سیدھے بحر قلزم میں آجاتے تھے۔ یہ بات کیسی تعجب کی ہے کہ اسی عہد مبارک میں گورنر مصر نے اُس عظیم الشان کام کا ارادہ کیا تھا جو انیسویں صدی میں فرانس کے ایک نامور انجنیئر کے ہاتھ سے پورا ہوا۔ یعنی حضرت عمرو ابن العاص نے نہر کے ذریعہ سے بحر روم و بحر قلزم کو ملا دینے کا ارادہ کیا تھا۔ نہر کا موقع تجویز کیا گیا، پیمائش کی گئی۔ مگر بعض پولیٹیکل مصلحتوں نے اُس کی تیاری ملتوی رکھی۔ نہروں کے بعد مفید عام عمارتوں کا حال ہے جن میں دار الامارہ، دفتر وغیرہ شامل ہیں۔ عمارتوں کے بعد سڑکیں ہیں۔ اور سڑکوں سے ہم اُن شہروں میں پہنچتے ہیں جو حضرت عمرؓ نے آباد کئے۔ ان بابوں کے ختم ہونے کے بعد فوجی محکمہ کا حال ہے۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں اس محکمہ کا وجود ہونا معمولی بات تھی کیونکہ وہ فتوحات کا زمانہ تھا۔ لیکن حیرت خیز وہ انتظام تھا جو آج سے تیرہ سو برس پیشتر اس محکمہ کا کیا گیا۔ الفاروق میں اس صیغہ کے مختلف شعبوں اور انتظاموں کا بیان پورے اٹھائیس صفحوں پر پھیلا ہوا ہے۔ ملک کو جس طرح فوجی حیثیت سے حضرت عمرؓ نے تقسیم فرمایا اور مختلف مواقع پر فوج کے صدر مقامات مقرر فرمائے اُن کی تشریح

اور اُن کے وجوہ اسباب سے بسیط و دقیق بحث کی ہے۔ فوجی بارکوں، فوج کے دفتر، کمسریٹ، فوجی چھاؤنیوں، بحری قلعوں، لائٹ ہؤسیز[1]، فوجی حفظانِ صحت، محکمۂ خبر رسانی، وغیرہ سبھی باتیں تو مکمہ ڈالی ہیں۔ یہ امر کیسا دلچسپ ہے کہ حضرت عمرؓ کے جرّار لشکر میں بہادرانِ راجپوت بھی شامل تھے۔ سندھ کے جاٹ شاہنشاہ فارس کی فوج میں ملازم تھے۔ جب ایران، عرب کے قبضہ میں آیا تو یہ فوج بھی حلقہ بگوش ہوئی اور بصرہ میں آباد کی گئی۔ اپنے موقع پر اسٹڈ (Le Strange) کا بھی بیان ہے۔ ہر فوجی صدر مقام کے متعلق بڑے بڑے اصطبل ہوتے تھے جن میں چار چار ہزار گھوڑے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ اُن کے واسطے وسیع شاداب چراگاہیں ہوتی تھیں۔ داغ کا طریقہ بھی رائج تھا۔ اس محکمہ میں یہ ایجاد ہوئی کہ اس سے قبل قبائل عرب نسل کے بارہ میں گھوڑیوں کی خوبی اور اصالت کی پروا نہیں کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے اس پر لحاظ فرمایا اور خالص عربی گھوڑیوں کے پیدا کرنے کی ترغیب دی۔ آج جو لوگ عربی گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں اُن کو خلیفۂ ثانی کے اہتمام کا ممنون ہونا چاہیئے۔ الفاروق کا یہ حصہ کسی پٹھان مورخ کی قلم کا جولانگاہ بننا چاہیئے تھا۔ مگر سچ یہ ہے کہ علامہ مصنف نے اس بحث کا بھی پورا حق ادا کیا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ اُن کا دماغ برسوں حضرت فاروقؓ کے حالات کی تفتیش میں مصروف رہا ہے، اس لئے اُن کے ہیرو Hero کے صفات کا پرتو اُن کے دماغ پر پڑا اور وہ جنگی مطالب اس خوبی اور صفائی سے لکھ سکے، ورنہ ایک مدرسہ کے مولوی کو اس مضمون کا لکھنا دشوار بلکہ ناممکن ہوتا۔

جنگی تہذیب صیغہ کے حالات پڑھ کر ہم مذہبی حالات پر پہنچتے ہیں۔ اور ان حالات کی ترقی اور شگفتگی اس آشفتگی کو رفع کرنے والی ہے جو جنگی حالات سے اعتدال پسند خیالات میں پیدا ہوتی ہے۔ اسی سلسلہ میں اشاعت اسلام، اُس کے طریقے، اور اُس کے اسباب مسطور ہیں۔ جو بھیانک شکل قرونِ اولیٰ کی اشاعتِ اسلام کی نسبت غیر مذہب والوں کے دماغوں میں غلط فہمی سے جمی ہوئی تھی اُس کو بہت کچھ (بلکہ بالکل) پروفیسر آرنلڈ نے اپنی بیش بہا تصنیف کے ذریعہ سے محو کر دیا ہے۔ تاہم الفاروق سے بھی بہت سی مثالیں اُس کی تردید کے لئے ملتی ہیں۔ حضرت عمرؓ کا ایک غلام مسلمان نہ تھا۔ انھوں نے ہر چند اس کو اسلام لانے کی ترغیب

---

[1] روشنی کے مینار (Light house)

دی، مگروہ ایمان نہ لایا۔ آخر خلیفۂ ثانی نے مایوس ہو کر فرمایا۔ "لا اکراہ فی الدین" یعنی دین کے معاملہ میں کسی پر جبر نہیں کر سکتے۔

متفرق انتظامات کے سلسلہ میں سب سے مشہور سنہ ہجری کا تقرر ہی جو آج تک موافق و مخالف میں رائج ہی۔ اس زمانہ میں یہ بات عجیب معلوم ہو گی کہ اُس وقت تک عرب میں دستاویزوں پر صرف مہینہ لکھا جاتا تھا، سنہ لکھنے کا رواج نہ تھا جس سے حساب کے وقت عجیب دِقت پیش آتی تھی۔ اسی ضرورت نے حضرت عمر کی توجہ تقرر سنہ کی طرف مائل کی۔ اسی باب میں یہ بات بھی معلوم ہوتی ہو کہ محکمۂ مردم شماری اور اُس کا دفتر بھی ایک محدود شکل میں قائم تھا۔

انتظامات متفرق کے ختم ہونے پر ایک نہایت اہم بحث شروع ہوتا ہی، یعنی ذمیوں کے حقوق۔ جو انصاف پسند اس مضمون کو پڑہیں گے وہ بے ساختہ بول اُٹھیں گے کہ اسلام سے پیشتر اور اسلام کے بعد بھی کسی قوم نے غیر قوموں کو وہ حقوق نہیں دئے جو اسلامیہ قرونِ اولیٰ میں بخشے گئے۔ انتہا یہ ہو کہ ذمی بغاوت کرتے اور برخلافِ خلافت سازشیں۔ اس پر بھی اسلام کا رحم قہر سے مبدّل نہ ہوتا۔ اور سزا دینے میں رعایت کا پہلو اور ترحم کا خیال پیشِ نظر رہتا۔ شام کے ایک شہر عربسوس کے باشندے رومیوں سے سازش رکھتے تھے اور ممالکِ اسلامیہ کی خبریں اُن کو پہنچاتے۔ خلیفۂ ثانی کو اس کی اطلاع ہونے پر دارالخلافہ سے یہ سزا تجویز ہوئی کہ اُن کی جائداد، زمین اور مویشی اور جو اسباب ہی سب کی فہرست مرتب کر کے ہر ایک کی دونی قیمت دی جائے اور ادائے قیمت کے بعد اُن سے کہہ دیا جائے کہ ہمارے ملک سے باہر چلے جائیں۔ اگر اس پر وہ عذر کریں تو چال چلن کی درستی کے لئے اُن کو ایک سال کی مہلت ملے۔ مہلت پر معاملہ ٹھہرا۔ مگر خوئے بدکب اور کہاں جاتی ہی۔ انھوں نے پھر وہی حرکت کی اور سال کے ختم ہونے پر جلا وطن کر دئے گئے۔

حضرت عمر کے ایک جلیل القدر حاکم نے حمص کے ایک ذمی سے غصہ میں صرف یہ لفظ کہدئے۔ "اخزاک اللہ" (خدا تجھکو رسوا کرے) جب غصہ فرد ہوا تو اس قدر ندامت اُن کو ہوئی کہ دربار خلافت میں اپنا استعفا بھیج دیا اور وجہ استعفا یہ لکھی کہ نہ میں ملازم ہوتا نہ یہ حرکت مجھ سے سرزد ہوتی۔ اسی باب میں جزیہ کی بحث ہی۔ مگر اُس کا حق رسالہ جزیہ میں ادا ہو چکا ہی۔ اس لئے یہاں ہم کو اُس کی نسبت کچھ کہنا نہیں ہے۔

غلامی کا رواج جن تدابیر سے حضرت عمر نے کم کیا اور غلاموں کو احرار کے رتبے بخشے، ان کو جدا بیان کیا ہے۔ اور اس بیان میں ایک وسیع اور عام غلط خیال کی تردید کی ہے جو حضرت شہربانو کی نسبت پھیلا ہوا ہے۔

حضرت عمر کی اُس صفت کے لئے جو عام طور پر مشہور ہے (یعنی انصاف اور سیاست) علامہ مصنف نے جداگانہ باب باندھا ہے۔ اُس میں حیرت خیز امر یہ ہے کہ کس طرح بدون جبر یا قہر کے حضرت فاروق کی وہ ہیبت اعلیٰ سے ادنیٰ تک چھائی ہوئی تھی جس نے سلاطین عالم کے جلال پست کر دیئے تھے۔ حضرت عمر کے رعب اور اثر کی داستان اس راز کی حل کرنے والی ہے کہ اصلی ہیبت اور عظمت اصول انصاف کی پابندی میں ہے۔ حضرت عمر نے جو اصول یا قانون جاری فرمایا اول اُس پر اپنے نفس اور اپنے اعزا اور اقربا کو پابند کیا۔ کسی قانون کے توڑنے کی سزا اغیار کے لئے ایک حصہ تھی تو اپنی اولاد کے لئے دو حصے۔ اُن کی اسی تعلیم کا اثر تھا کہ (جہاں تک ہم کو علم ہے) حضرت عمر کی اولاد کے دل میں کبھی خلافت یا حکومت کا خیال نہیں سمایا، حالآں کہ اور خلفا کی اولاد اس سے مستثنیٰ نہیں رہی۔

ان تمام حالات کے پڑھنے کے بعد خواہ مخواہ دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایک شخص واحد یہ سارے کام کیونکر انجام دیتا تھا جب کہ نہ آج کل کی سی آسانی وسائل آمد و رفت میں تھی نہ اُن کو شائستہ اور آسودہ ملک حکومت کے لئے ملا تھا۔ اُس پر طرہ یہ کہ علامہ شبلی بیان کرتے ہیں کہ ہر کام وقت پر انجام پاتا تھا۔ بڑے مشاغل چھوٹے چھوٹے مشاغل کے اوقات پر دعویٰ نہیں کر سکتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فاروق اعظم کام کرنے کی قوت خداداد رکھتے تھے۔ اور اُن کا ایک گھنٹہ دوسرے کام کرنے والوں کے ہفتوں یا مہینوں کی برابر تھا۔

امامت و اجتہاد کا باب ایسا دقیق دیکھا ہے کہ اُس کو بھی من اولہ الی آخرہ پڑھنے سے اُس کا نقشہ ذہن میں آسکتا ہے۔ لہذا ہم اُس کے لطف کو بالکلیہ ناظرین الفاروق کے لئے محفوظ رکھتے ہیں۔

امامت و اجتہاد سے فارغ ہو کر حضرت عمر کے ذاتی حالات لکھے ہیں۔ اس باب میں اُن کی مذہبی زندگی اور عبادات کے حال بھی ہم پڑھتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ کا ایک سچا اور فرماں بردار بندہ اپنے دینی فرائض کو کیسی سرگرمی سے ادا کر رہا ہے جو اُس کے واسطے زیبا ہے۔ یا بہ الفاظ دیگر یہ کہا جائے کہ اُس

پاک بندے سے اُس کی قوت ایمانی (کانشنس) وہ عہد سچائی کے ساتھ پورا کرا رہی ہے جو اُس نے اسلام لاکر اپنے مالک حقیقی سے کیا تھا۔ جو لوگ اس زمانہ میں مذہب اور اُس کی پابندی سے بھڑکتے ہیں وہ حضرت عمرؓ کی مذہبی لائف سے یہ سبق حاصل کر سکتے ہیں کہ "جس قدر مذہب اسلام کی پابندی کی جائے گی اُسی قدر انسان پاک باطن، فیاض اور ہمدردِ خلائق بنے گا۔ اور اپنے فرائض کے ادا کرنے کی کوشش کرے گا"۔ جو لوگ پابندئ مذہب کو تنگ خیالی اور درشتئ طبیعت کا سرچشمہ مان رہے ہیں وہ حضرت عمرؓ کے اُس برتاؤ کو دیکھیں جو وہ غیر مذہب رعایا سے برتتے تھے۔ اور اُس شفقت کے حالات پڑھیں جو اُن کو غلاموں کے حال پر تھی۔ اور یہ بھی سُن لیں کہ حضرت عمرؓ وہ شخص ہیں جن کی نسبت آنحضرتؐ نے فرمایا ہے۔ "اشدھم فی امر اللہ عمر" کہ تمام میری اُمت میں خدا کے احکام میں سخت تر عمرؓ ہے۔ اُن کی شدتِ فرمانبرداری یہ تھی کہ انھوں نے اپنی آہنیں طبیعت کو خدائے تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری میں موم سے زیادہ ملائم کر لیا تھا۔ جو لوگ ہم میں آج کل اپنے ادّعا کے بموجب کاروباری بن رہے ہیں وہ احکام مذہبی کے نہ بجا لانے کے لئے کثرت کار کو ایک خاصہ اور معقول عذر تصور کر رہے ہیں اور اس غلطی میں پڑے ہیں کہ نماز روزہ کی پابندی اُن لوگوں کا کام ہے (یا انھیں سے ہو سکتی ہے) جو مذہبی آدمی بن جائیں اور دنیا سے کچھ کام نہ رکھیں۔ ان لوگوں کو حضرت عمرؓ کے مشاغل خلافت اور کثرت عبادت کے حالات ملا کر غور سے پڑھنا اور اپنی رائے پر غور کرنا بیجا نہ ہوگا۔

حضرت عمرؓ کی گوناگوں قابلیتوں کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ باوجود ایک مدبر و مذہبی پیشوا ہونے کے اُن کو اشعار کا خاصہ ذوق تھا۔ ہزاروں شعر اُن کو یاد تھے۔ شعرائے جاہلیت میں سے زہیر وغیرہ کے کلام کی نسبت جو رائیں انھوں نے ظاہر فرمائی ہیں بڑے بڑے ادیب اُن کو آنکھوں سے لگائے رہو سکے ہیں۔ یہ کیسے لطف کی بات ہے کہ شاعری اُن کی حق پسند نظر کے سامنے آکر فیض سے محروم نہ رہی جو مخرّبِ اخلاق طریقہ شعرائے عرب میں جاری تھا کہ شریف عورتوں کا نام لیکر تشبیب قائم کرتے تھے اُس کو حضرت عمرؓ نے ترک کرا دیا، اسی طرح ہجو گوئی کو جرم قرار دیا۔

سب سے آخر میں اولاد اور ازواج کا ذکر ہے اور اس پر الفاروق ختم ہوتی ہے۔ خاتمہ میں اُن

واقعات کی بنیاد پر جو مذکور ہو چکے اپنے ہیرو کی نسبت مصنف نے رائے لکھی ہی اور اُس کا عنوان یہ بلیغ و بے نظیر شعر قرار دیا ہی ؎

لیس من اللّٰہ بمستنکر ان یجمع العالم فی واحد

یعنی خدا کی قدرت سے یہ کیا بعید ہی کہ تمام عالم ایک فرد میں سما جاے۔

خلاصہ یہ کہ حضرت عمرؓ کی اصلی تصویر دکھانے کی علامہ مصنف نے کوشش کی ہی۔ اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ وہ اپنی کوشش میں بہت کچھ کامیاب ہوئے ہیں۔ جو لوگ اہل اسلام کا سچا نمونہ اور صفات انسانی کا ایک زبردست مجموعہ دیکھنا چاہتے ہیں وہ الفاروق پڑھیں۔

اس کتاب کو تمام و کمال پڑھ کر مختلف وجوہ سے ہم کو یہ تمنا رہی کہ مسودہ پر مصنف کی ایک نظر اور پڑ جاتی تو خوب ہوتا۔ اس موقع پر اگر ہم چند الفاظ الفاروق کی طرز ادا کی نسبت کہیں تو شاید بیجا نہ ہوگا۔ الفاروق جس زمانہ کی تصویر ہی وہ اسلام کا مذہبی زمانہ تھا۔ اور اول سے آخر تک جن مسلمانوں کا ذکر اس میں ہے وہ مقتدائے مذہب اور آسمانِ عظمت کے ستارے تھے۔ متاخرین کی طرز یہ ہی کہ جب ایسے بزرگوں کا نام لکھتے ہیں تو کچھ مدحیہ کلمات اور دعائیہ فقرے ضرور اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ مذہبی مسائل پر بحث کا ایک خاص اسلوب مقرر ہو چکا ہی جس میں متکلم اپنے خیال کو ایسی پست آواز میں ظاہر کرتا ہی کہ گویا قعر چاہ میں سے آواز آرہی ہی۔ متقدمین کی روش اس سے جُدا تھی۔ صحابۂ کرام اور تابعین کے محض نام اُن کی تحریروں میں آتے تھے۔ بہت ہوا تو سارے بیان میں ایک دو جگہ رضی اللہ عنہ لکھدیا۔ لیکن ہر جگہ ان ناموں کے آخر میں نہیں۔ جو بات اُن کو حق معلوم ہوتی ہی صاف بے لوث کہہ جاتے ہیں۔ جو شخص متقدمین کی کتابوں کو پیش نظر رکھے اور اُن کی طرز تحریر سے آشنا ہو جائے ناممکن ہی کہ اس کے قلم سے اُسی قسم کی عبارت نہ نکلے۔ الفاروق کی تحریر میں جو آزادی ہی وہ بالکل نہیں تو اکثر طرز متقدمین کا پرتو ہی۔ کون کہہ سکتا ہی کہ متقدمین، متاخرین کے مقابلہ میں کم ادب شناس یا مرتبہ سنج تھے۔ مگر اُن کی طرز میں عرب اور اسلام کی سادگی تھی۔ یہ سادگی خراسان و ہندوستان کی آب و ہوا میں بہت کچھ بدل گئی۔ مخاطب جب واحد ہو (خواہ کسی مرتبہ کا ہو) تو عرب کے قاعدے کے بموجب ضمیر و صیغہ اُس کے واسطے واحد ہوگا۔ ہندوستان کے اہل

ادب نے مفرد کی جگہ عربی میں اس موقع پر جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ لیکن یہاں پر سمجھ لینا چاہئے کہ وہ عرب اور عربی کا قاعدہ تھا۔ ہماری زبان اردو کا طریقہ وہ نہیں ہے۔ ہم اگر کسی مخاطب کے مقابلہ میں (باستثنائے اپنے چھوٹوں کے) واحد کی ضمیر یا صیغہ استعمال کریں تو یا تو تذلیل و تحقیر معلوم ہوگی یا پہاڑی بولی۔ اگر یہ کہیں کہ تو نے یہ کام نہیں کیا یا مولوی رحیم بخش آیا تھا تو اول سے مخاطب کی ذلت اور دوسری سے سرحدی پہاڑیوں کی بولی معلوم ہوتی ہے۔ شرفائے دہلی اپنے سائیس و نفر کو بھی اس طرح مخاطب نہیں کرتے۔

حیف ہے کہ اہل مطبع نے اس کتاب پر کچھ رحم نہیں کیا۔ اس کثرت سے غلطیاں ہیں کہ طبیعت الجھتی ہے۔ غلط نامہ ہرگز ان غلطیوں کی تلافی نہیں کر سکا۔ بلکہ باقی ماندہ غلطیوں کو گویا غلط نامے نے مضبوط کر دیا۔ عربی عبارتیں جا بجا غلط ہیں۔ زیادہ افسوسناک ناموں کا غلط چھپنا ہے۔ الفاروق کی مقبولیت یہی غلط نام زبانوں اور قلموں سے نکلوائے گی اور اس طرح ہمارا لٹریچر گویا غلط ہوتا رہے گا۔ نقشہ ایسی بری طرح لگایا ہے کہ جلد بندی پر اس کا محفوظ رہنا مشکل ہے۔ کاش انگریزی کتابوں کی طرز پر لگایا جاتا۔

الفاروق کی نسبت ہم بہت کچھ لکھ چکے۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ اس کی عظمت کے مقابلہ میں بہت کم کہا گیا۔ تاہم ہم نے اپنے معزز ناظرین کا بہت وقت صرف کیا۔ حرج اوقات کی معافی چاہ کر ہم رخصت کے طلبگار ہیں۔ فقط

(رسالہ معارف اعظم گڑھ۔ ماہ جولائی ۱۸۹۹ء)

حیاتِ جاوید

(تبصرہ)

"حیاتِ جاوید" اس کتاب کا نام ہے جو نادرۂ روزگار خواجہ الطاف حسین صاحب حالی نے جواد الدولہ عارف جنگ ڈاکٹر سر سید احمد خاں مرحوم کے حالات میں لکھی ہے۔ اگر کوئی شخص دنیا میں بڑے بڑے کام کر کے اس شوق میں جان دے دے کہ اس کو ایسا نامور بیاگرفر (Biographer) ملے گا جیسا سر سید کو ملا، تو ہمارے خیال میں یہ کہنا حق بجانب ہوگا کہ اس نے سستا سودا خریدا۔ جو صاحب درد حیاتِ جاوید کو دیکھے گا وہ اس جانفشانی اور کاوش کا اعتراف ضرور کرے گا جو خواجہ

صاحب نے اس لائف کے لکھنے میں کی ہے۔ کئی برس مسلسل محنت کی۔ تینوں وطن چھوڑ چھوڑ کر علی گڑھ قیام کیا۔ ہندوستان سے لے کر انگلستان تک اپنے ہیرو کے حالات بہم پہنچانے کی جستجو کی۔ سرسید کی تصانیف کے ہزاروں صفحے پڑھے۔ جو موانع اور عوائق اس کام کے کرنے میں پیش آئے ان کا مردانہ مقابلہ کیا تب یہ کتاب مرتب کر کے پبلک کے ملاحظہ میں پیش فرما سکے۔ اردو لٹریچر کی جہاں نا اہل مؤلفوں اور مترجموں کے ہاتھوں مٹی پلید ہو رہی ہے، جہاں شہرت طلب و زر پرست طبیعتیں اپنے ذاتی اغراض کے نشہ میں چور ملک اور قوم کے دل و دماغ اور روپے کی غارتگری میں مصروف ہیں، وہاں شکر ہے کہ کچھ نہ کچھ ایسی تصانیف بھی شائع ہوتی رہتی ہیں جن پر اعلیٰ سے اعلیٰ لٹریچر فخر کر سکتا ہے۔ قوم کا مذاق جب تک بگڑا ہوا رہے گا اور جب تک ہم میں داستان امیر حمزہ اور بوستانِ خیال کے پڑھنے کا اثر باقی ہے اس وقت تک مخرب اخلاق ناول اور بے سروپا تاریخی ترجمے زیادہ قدر پاتے رہیں گے اور ان تصانیف کی کماحقہ قدر نہیں ہوگی جو باعتبار اپنی صفات اور مؤلفوں کی جاں کاہیوں کے قابل قدر ہیں۔ لیکن اگر قوم کا مذاق پاک ہونے والا ہے، اگر اردو داں پبلک علم دوست بننے والی ہے تو ضرور ایک روز "پوت کی دکان مانند پڑے گی اور جوہری بازار چمکے گا۔" (اگرچہ جرمن سلور کا رواج اور گلٹ کی مقبولیت اس زمانہ کے دور ہونے کی پیشین گوئی کر رہی ہے) گو یہ ڈنکا ہندوستان کے چاروں کونوں میں بج رہا ہے کہ علمی مذاق کی گرم بازاری ہے اور متاع علم ہاتھوں ہاتھ بک رہی ہے۔ مگر واقعات یہ سبق دیتے ہیں کہ یہ غلغلہ آوازِ دہل سے زیادہ وقیع نہیں اور اس ڈھولک کی آواز سے مشابہ ہے جو بازاروں میں گھٹیا نیلام کرنے والے پیٹا کرتے ہیں۔ ان ڈھولکوں کی آواز پر خریدار جمع تو ہو جاتے ہیں لیکن جب مال پر نظر ڈالتے ہیں تو سوائے بوسیدہ چیزوں اور شکستہ بستہ سودے کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ تاہم تھوڑے بہت گرفتار دام ہو کر اپنے صیادوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہی رہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک جو لوگ اپنے نفع کی غرض سے موجودہ حالت میں ناکارہ ناول اور بے سروپا تاریخی رسالے قوم میں شائع کر رہے ہیں وہ ایسے گناہِ عظیم کے مرتکب ہو رہے ہیں جو کسی طرح لائق معافی نہیں ہو سکتا۔

یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اخباری دنیا میں حیاتِ جاوید کی طرف سے کیوں اس قدر سناٹا ہے اور جو جرائد سرسید، خواجہ حالی، اور اردو لٹریچر ان تینوں کے نہایت راسخ عقیدتمند ہیں انھوں نے کتاب مذکور کسی

حیثیت سے بھی قابلِ التفات نہیں سمجھا۔ اگر اشاعتِ تصانیف کے علم کا ذریعہ صرف اخبار ہوتے تو شاید حیاتِ جاوید کے شائع ہونے کا علم بھی پبلک کو نہ ہوتا۔ سب سے زیادہ تعجب انسٹیٹیوٹ گزٹ پر ہی۔ ہمارے نزدیک "معارف" سے حیاتِ جاوید کا ریویو نقل کرنا اور خود نہ لکھنا اخبار مذکور کی شان کے خلاف تھا۔

حیاتِ جاوید کے دو حصے ہیں۔ ایک میں سرسید کی زندگی کے حالات ہیں اور یہ حصہ ۲۲۰ صفحہ پر ختم ہوتا ہی۔ دوسرے حصہ میں سرسید کی لائف، اُن کی تصانیف اور اُن کے کاموں پر ریویو کیا گیا ہی اور یہ حصہ بقول علامہ شبلی مؤلف کی محنت کا تماشاگاہ ہی۔ اِس حصہ کے ۵۰۰ صفحے ہیں۔

حصۂ اول کے شروع میں سرسید کے خاندان کا ذکر آتا ہی اور اُس کے ضمن میں دہلی مرحوم کے اخیر دورِ زندگی کی ایک دلکش جھلک پیشِ نظر ہو جاتی ہی۔ ان واقعات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ محبت وارتباط، خلوص ونیک دلی، اُمنگ اور زندہ دلی، علمی ذوق، مردانہ فنون غرض وہ تمام اوصاف جو سوسئٹی کے واسطے روح ورواں ہیں دارالسلطنت کی سوسئٹی میں اُس وقت بھی موجود تھے۔ ان واقعات کو پڑھ کر جب ہم قیاس کی مدد سے اکبری اور شاہجہانی دور کی سوسئٹی میں جاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہی کہ عرب کی صداقت، ایران کی زندہ دلی، توران کی جوانمردی اور ہندوستان کی رنگینی نے سوسئٹی کے رنگ میں ایک عجیب دلفریبی و دلکشی پیدا کر دی تھی۔ اُس کی نسبت یہ خیال کرنا کہ وہ محض تیرہ وتاریک غیر منتظم مجمع تھا انصاف کا خون کرنا اور اپنی کم علمی کا ثبوت دینا ہی۔ سید صاحب اور اُن کے خاندان کی صورتیں اس امر کی زندہ شہادت تھیں کہ اعیانِ دارالسلطنۃ میں ہنوز اُس تنومندی اور تندرستی کا اثر باقی تھا جو مردانہ فنون اور سپاہیانہ مشاغل کے اثر سے پیدا ہوئے تھے۔ صرف سید صاحب کا خاندان ہی ایسا نہ تھا اور خاندان بھی ایسے ہی قوی وتندرست افراد پیش کر سکتے تھے۔ چنانچہ نواب محمد میر خاں، نواب احمد بخش خاں کے خاندان اور شریف خانی خاندان کی مثال کافی ہی۔

سید احمد خاں کی لائف کے ابتدائی حصہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہی کہ جن صفات نے اُن کو "سرسید احمد خاں بہادر" بنایا اور اُن کو اوجِ ترقی تک پہنچایا اور جن صفات کی مدد سے انھوں نے اپنی پژمردہ قوم میں ہلچل ڈال دی اور شائستہ قوموں سے اپنی عظمت منوا کر چھوڑی، اُن کی بنیاد دارالسلطنت کی قدیم سوسئٹی

ڈال چکی تھی اور اس طرح سرسید قدیم سوسائٹی کے فرزند رشید تھے، نہ کہ جدید کے۔ سرسید کو قدیم سوسائٹی میدان میں پہنچ کر جدید سوسائٹی سے مبارز طلب کر رہی ہی اور یہ خدا کو علم ہی کہ کب تک ہمارے کالج اور اسکول ایسا جوان مرد پیدا کرنے میں کامیاب ہونگے۔

سرسید کی لائف اس امر کا قطعی فیصلہ ہی کہ جب تک جدید تربیت کے ساتھ قدیم اوصاف مسلمانوں میں پیدا نہیں کیے جائیں گے اُس وقت تک تعلیم جدید دُھن کے پکے مسلمان پیدا نہیں کر سکتی اور نیز اس امر کا کہ جب تک جدید تعلیم کی برقی قوت کے زور سے قدیم صفات کے اکڑے ہوئے جسم میں حرارت پہنچا کر حرکت پیدا نہ کی جائے اُس وقت تک وہ کارآمد نہیں ہو سکتیں۔ جو لوگ سرسید احمد خاں کے قدردان ہیں امید ہی کہ وہ اس نصیحت کو کم توجہی اور بے پروائی سے نہ سنیں گے جو اُن کی لائف پر شوکت آواز میں سنا رہی ہی۔ مؤلف لائف ہذا نے جو حالات سرسید کے خاندان کے لکھے ہیں اُن کے دیکھنے سے خاندان مذکور کی مجموعی صفت یہ معلوم ہوتی ہی کہ وہ لوگ دُھن کے پختہ اور آزاد منش ہوتے تھے۔

سرسید کا بچپن (جیسا کہ خود مؤلف نے لکھا ہی) معمولی بچپن ہی۔ ہمارے خیال میں اُن کی تعلیم اُس زمانے کی معمولی تعلیم سے بھی کم ہی۔ عربی میں شرح ملّا، شرح تہذیب، میبذی، مختصر معانی اور مطول ما انا قلت تک پڑھی۔ اور یہ بھی طالبعلمانہ نہیں بلکہ نہایت بے پروائی اور کم توجہی سے۔ جو جوان ہوتے ہوتے نسیاً منسیاً ہوگئی اور ۲۹ برس کی عمر میں پھر اُس کے از سرِ نو تازہ کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ مذکورہ بالا کتابیں پڑھنے کے بعد انھوں نے اپنے خاندانی علم ریاضی کی جانب توجہ کی اور حساب کی معمولی درسی کتابیں اقلیدس کے چند مقالے، ہیئت میں شرح چغمینی اور ایک آدہ رسالہ متوسطات کا اور آلات رصدیہ برجندی اور چند اور رسالے رصد کے متعلق پڑھے طب بھی شرح اسباب اور نفیسی تک پڑھی۔ اس نصاب پر ایک نظر ڈالنی ضروری ہی کیونکہ اس سے آیندہ اہم نتائج پیدا ہونگے۔ ظاہر ہی کہ اس نصاب میں جو کچھ تعلیم (سوائے ریاضی کے) تھی وہ سب محض سرسری اور ابتدائی تھی۔ یہ امر خاص طور پر قابل لحاظ ہی کہ درس "علم ادب" سے قریباً اور "علوم دینیہ سے" قطعاً خالی تھا۔ ۲۹ برس کی عمر میں (جبکہ وہ دہلی میں منصف تھے) اُن کو پڑھنے کا شوق ہوا اور "جو کتابیں ابتدا اس کم توجہی اور بے پروائی سے پڑھی تھیں اور اب بالکل نسیاً منسیاً

ہو گئی تھیں اُن کو از سرِ نو غور اور توجہ سے پڑھا۔ مولوی نوازش علی مرحوم (جو دہلی میں مشہور واعظ تھے اور تمام درسی کتابیں پڑھاتے تھے) اُن سے کچھ پچھلی پڑھائی کو تازہ کیا۔ اور کچھ فقہ میں مثل قدوری و شرح وقایہ اور اصولِ فقہ میں شاشی، نور الانوار اور ایک آدھ اور کتاب پڑھی۔ مولوی فیض الحسن مرحوم سے مقاماتِ حریری کے چند مقامے اور سبعہ معلقہ کے چند قصیدے پڑھے اور مولانا مخصوص اللہ سے (جو شاہ عبدالعزیز کے بھتیجے اور شاہ رفیع الدین کے خلف الصدق تھے) حدیث پڑھنی شروع کی۔ مشکوٰۃ اور ایک حصہ جامع ترمذی کا اور کسی قدر اجزا صحیح مسلم کے پڑھے۔ اور پھر قرآن مجید کی سند لی۔ بس اس سے زیادہ (جیسا کہ سرسید خود اقرار کرتے تھے) اُستاد سے انھوں نے کچھ نہیں پڑھا۔"

اس تعلیم میں بھی عربی لٹریچر برائے نام تھا۔ اور ہر چند فقہ و حدیث کی بعض کتابیں ہیں لیکن "عقاید" اور "تفسیر" کی ایک سطر بھی نہیں ہے۔

سرسید کی ملازمت کا دور ابتدا سے شاندار اور رفیع تھا۔ وہ جس میدان میں گئے مردانہ اور جس راہ سے گزرے آزادانہ۔ اسی مردانگی اور آزادی کی وجہ سے ہر صیغہ پر (جس میں وہ رہے) اُن کا کچھ نہ کچھ احسان ہے۔ یہ بات سرسید کی لائف میں بے نظیر ہے کہ باوجود ملازمت کے تعلقات کے جن کو وہ نہایت کاوش اور جانفشانی سے انجام دیتے تھے، اس جوانمرد نے مفید اور محنت طلب کاموں سے کبھی جی نہیں چرایا اور علمی مشاغل کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ دورانِ ملازمت ہی میں انھوں نے بہت سے ایسے کام کر لیے جن میں سے ایک بھی معمولی آدمی کی عمر بھر کی کارگزاری کا نتیجہ ہو سکتا تھا۔ مثلاً آثار الصنادید کی تالیف، آئین اکبری کی تصحیح، تاریخ بجنور اور تبیین الکلام وغیرہ کی تصنیف۔ عالمانہ حیثیت سے نکل کر عاملانہ صیغہ میں آئیے تو یہاں بھی سرسید کے کارناموں کی آب و تاب آنکھوں کو روشن کرے گی۔ مراد آباد کے ضلع میں قحط کا انتظام، غدر ۱۸۵۷ء کی کارگزاری وغیر ذٰلک امور اس کے بیّن ثبوت ہیں۔ غدر میں اور اس کے متصل جو خدمت گورنمنٹ اور ملک کی انھوں نے کی اُس سے سرکار اور رعایا دونوں کے دل میں ان کی عظمت کا سکّہ بیٹھ گیا۔ سید صاحب کے جن جن حالاتِ زندگی سے حیاتِ جاوید میں بحث کی گئی ہے وہ ایسی قدر کثیر اور مختلف النوع ہیں کہ اُن کے اجمالی ذکر سے بھی یہ مضمون طویل ہو جائے گا مع ہذا مولوی حمید الدین صاحب

سلیم اپنے ریویو میں ہم کو اس کام سے فارغ کر چکے ہیں لہٰذا ہم حصہ اول کے متعلق اسی قدر لکھ کر دوسرے حصہ کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔

دوسرا حصہ (جس کو ہم نے مؤلف کی محنت کا اصلی تماشا گاہ بتایا ہی) سرسید کی لائف، اُن کی تصانیف اور اُن کے کاموں پر ریویو ہی۔ اُس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ علامہ مؤلف نے نہایت غور اور فکر کے ساتھ سرسید کے ہر ایک کام کو (خواہ عملی ہو یا علمی) دیکھا ہی۔ اُن کی تصانیف کے ہزاروں صفحے پڑھ کر اُن کے مضامین کے ماسٹر بنے ہیں اور اس کے بعد پوری کاوش سے اُن پر ساڑھے پانسو صفحوں میں اس طرح ریویو کیا ہی کہ اُس کے مطالب بالاجمال اور اُن کے محاسن بالتفصیل ناظرین کے سامنے آشکارا کر دئے ہیں۔ قصہ مختصر سرسید کی ساٹھ برس کی جانفشانیوں کے کارنامے صفحات کاغذ پر یوں نمایاں کر دئے ہیں جیسے ایک زبردست مصور میلوں میں پھیلے ہوئے معرکہ کی تصویر چند انچ کاغذ پر مشاہدہ کرا دیتا ہی۔ اگرچہ سرسید کی تصانیف کے مختلف موضوع ہیں مگر سب سے زیادہ اہم اور عظیم سبجکٹ مذہب ہی اور اُن کی مذہبی تصانیف میں سب سے زیادہ مہتم بالشان تصنیف "تفسیر قرآن" ہی۔

ہم اس ریویو میں تھوڑی سی بحث تفسیر اور اُس رائے پر کرنا چاہتے ہیں جو مؤلف حیاتِ جاوید نے اُس کی نسبت ظاہر کی ہی۔ ہماری بحث کا اصل اصول یہ تنقیح ہی کہ "آیا سرسید کو تفسیر لکھنے کا حق اور منصب حاصل تھا یا نہیں"۔ اس تنقیح کا فیصلہ کرنے سے پیشتر ایک نظر ہم کو سرسید کے عربی علوم کے مبلغ اور اُن مشاغل پر ڈالنی چاہئے جن میں وہ تفسیر لکھنے سے پیشتر مصروف تھے۔ سرسید نے جو کچھ بچپن میں کم توجہی اور جوانی میں شوق سے پڑھا اُس کی تفصیل ہم حیاتِ جاوید کے حوالے سے اوپر بیان کر چکے ہیں اور یہ بھی بتا چکے ہیں کہ عربی لٹریچر کی تحصیل کالعدم اور تفسیر و عقائد کی تحصیل معدوم تھی عربی لٹریچر کی تعلیم صرف مقاماتِ حریری کے چند مقاموں اور سبعہ معلقہ کے سات قصیدوں میں سے چند قصیدوں میں محدود تھی۔ اُن کی لائف میں کہیں اس بات کا ثبوت نہیں کہ انھوں نے پھر کبھی اُس کی تکمیل کی جانب توجہ کی ہو۔ بلکہ اس کے برخلاف یہ ثبوت ملتا ہی کہ بوقتِ ضرورت انھوں نے دوسروں کی مدد کا سہارا لیا۔ چنانچہ خطباتِ احمدیہ کی تصنیف کے زمانہ میں ایک عربی عالم کو اس غرض سے ملازم رکھا تھا کہ وہ ایسے اشعار جاہلیت کے فراہم کرے جن

میں اُس عہد کے عربوں کی رسوم بد کا ذکر ہو (دیکھو حیات جاوید حصہ دوم صفحہ ۱۳۵) ایک اور موقع پر جب انھوں نے تفسیر کبیر کی ایک عبارت ولایت سے مولوی مہدی علی خاں صاحب سے منگوا بھیجی ہو تو لکھا ہی کہ اُس میں جو لغات مشکل ہوں اُن کے معنی لکھ دیئے جائیں۔ فن تفسیر کی ایک سطر بھی ان کی درسی کتابوں میں شامل نہیں۔ اور اس بات کا پتہ بھی نہیں چلتا کہ انھوں نے کوئی زمانہ اپنا فن تفسیر کے مطالعہ میں صرف کیا ہو یا تفسیر سے قبل انھوں نے کوئی تصنیف ایسی شائع کی ہو جو اُن کے مفسر ہونے کی شاہد ہو۔ مکتب چھوڑنے کے بعد وہ سرکاری ملازمت میں در آتے ہیں۔ اور کار منصبی کو نہایت کوشش سے مجتہدانہ انجام دیتے ہیں۔ سرکاری کام سے جو وقت بچتا ہی اُس کو وہ اور اہم اور محنت طلب کاموں میں صرف کرتے ہیں۔ اُن کے مشاغل مسلسل ملاحظہ کیجئے۔ اس میں ۱۸۳۹ء سے لیکر (جو اُن کی آغاز ملازمت کا زمانہ ہی) ۱۸۶۷ء تک (جبکہ انھوں نے تفسیر لکھنی شروع کی) سلسلہ وار وہ مشاغل مذکور ہیں جو سرکاری کام کے علاوہ وقتاً فوقتاً رہے۔

سنہ ۱۸۳۹-۴۱ء — ترتیب دفتر کا دستور العمل بنانا۔ جام جم اور انتخاب الاخوین تالیف کیا۔

سنہ ۱۸۴۲-۴۶ء — تالیف جلاء القلوب بذکر المحبوب۔ تحفہ حسن۔ تسہیل فی جر الثقیل۔

سنہ ۱۸۴۷-۵۳ء — عربی کتابیں جن کو بھول گئے تھے پھر تازہ کیں۔ کچھ جدید پڑھیں۔ تالیف آثار الصنادید۔ فوائد الافکار۔ قول متین در حرکت زمین۔ کلمۃ الحق۔ راہ سنت در رد بدعت۔ نمیقہ فی بیان مسئلہ تصور شیخ۔ سلسلۃ الملوک۔ ترجمہ آغاز کیمیائے سعادت۔ سید الاخبار کے مضامین سے مدد۔

سنہ ۱۸۵۴-۵۶ء — "دو کام نہایت سخت محنت کے کیے" یعنی بجنور کی تاریخ لکھی اور آئین اکبری کی تصحیح کی

سنہ ۱۸۵۷-۶۳ء — غدر کے مصائب اور خیر خواہی۔ اسپیشل کمیشن میں نشست۔ فارسی مدرسہ قائم کیا۔ تعلیم کے بارہ میں رائے لکھی۔ تالیف مشہور رسالہ اسباب بغاوت ہند رسالہ لائل محمڈنز آف انڈیا۔ رسالہ تحقیق لفظ نصاریٰ۔ تبیین الکلام۔ انتظام قحط ضلع مراد آباد۔ تصحیح تاریخ فیروز شاہی۔ [illegible]

سنہ ۱۸۶۳-۶۶ء — علی گڑھ سئینٹفک سوسٹٹی کی عمارت ہوائی - برٹش انڈین ایسوسی ایشن قائم کی سئینٹفک سوسیٹی اخبار نکالا۔

سنہ ۱۸۶۷-۶۸ء — ہومیوپیتھک علاج کی حمایت - اُردو زبان کی حمایت - رسالہ احکام طعام اہلِ اسلام

سنہ ۱۸۶۹-۷۰ء — سفر ولایت - انگلستان کی تعلیم و ترقی پر غور کیا - خطباتِ احمدیہ لکھی -

سنہ ۱۸۷۱-۷۵ء — تہذیب الاخلاق - کمیٹی خواستگارِ تعلیم مسلمانان - کمیٹی خزینۃ البضاعۃ - ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریویو - محمدن کالج قائم کیا -

سنہ ۱۸۷۶-۷۸ء — پنشن لی اور محمدن کالج کے کام میں لگ گئے - تفسیر القرآن لکھنا شروع کی -

مذکورہ مشاغل کی نوعیت پر غور کرنے سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں - اول یہ کہ اُن میں سے اکثر ایسے تھے جن میں وقت اور محنت دونوں کو پورے طور پر صرف کرنا پڑا ہوگا - دوم یہ کہ سرسید کی تصانیف ماقبل غدر سررشتہ و قانون، سیرت و تاریخ، تصوف اور مذہبی مناظرہ سے تعلق رکھتی ہیں - بعد غدر ان میں مباحث میں پالٹیکس اور تعلیم کا اضافہ اور ہوگیا - کوئی رسالہ یا کتاب تفسیر یا ادب سے تعلق نہیں رکھتی - نہ حیاتِ جاوید سے کہیں اس امر کا سُراغ ملتا ہے کہ سرسید نے تفسیر کا مطالعہ باقاعدہ کیا ہو - ہاں اس کا ثبوت ہے کہ ان کی نظر اس فن میں نہایت محدود تھی - کیونکہ یہ کھلا ہوا راز ہے کہ ہمیشہ ایک نہ ایک اسسٹنٹ اُن کے پاس روایت کشی کے واسطے رہا - خلاصہ یہ کہ سنہ ۱۸۷۶ء سے پیشتر ہم سرسید کو اس رنگ میں دیکھتے ہیں کہ فن تفسیر سے اُن کو کوئی لگاؤ نہیں اور سنہ ۱۸۷۶ء کے بعد وہ مفسر ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، تفسیر لکھتے ہیں، اصولِ تفسیر مدوّن کرتے ہیں - واقعاتِ بالا سے صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تفسیر لکھنے کا کوئی منصب سرسید کو حاصل نہ تھا اور اُن کا تفسیر لکھنا اپنی قوت سے زائد کام کرنا تھا اور ایسا کام قابلِ اعتماد نہیں ہوسکتا -

سرسید کی لائف پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے بھی ثابت ہوسکتا ہے کہ اُن کی طبیعت میں اثر قبول کر لینے کا مادہ بہت تھا اور ہر رنگ کو اُن کی طبیعت جلد اخذ کر لیتی تھی - ابتدائے شباب میں ہم اُن کو رنگین دیکھتے ہیں - بڑے بھائی کا انتقال ہوتا ہے اور وہ دفعۃً "ملائے خشک" بن جاتے ہیں - دارالسلطنۃ کی سوسائٹی میں جو جو رنگ پیدا ہوتے جاتے ہیں اُن کو یکے بعد دیگرے لے لیتے ہیں - ایک وقت بدعتی ہیں

دوسرے وقت وہابی ہیں۔ آج ایک تصنیف لکھی کل اُس کو خود لغو اور بیہودہ بتا دیا۔ غدر کے مصائب دیکھ کر ہجرت کا عزم کر لیتے ہیں پھر مسلمانوں کی مدد پر عزم راسخ ہو جاتا ہے۔ غدر کے بعد انگریزی سوسائٹی کا رنگ مرغوب ہوتا ہے۔ اور یکے بعد دیگرے ترقی کی منازل طے ہوتی ہیں۔ تبیین الکلام میں جن عقائد کو برحق مانتے ہیں تفسیر میں انھیں کو فضول اور مہمل قرار دیتے ہیں۔ مثلاً تبیین الکلام میں نزولِ وحی کی نسبت لکھا ہے "وحی وہ چیز ہے جس سے خدا کی مرضی نامعلوم باتوں میں کھل جاتی ہے اور یہ بات کئی طرح پر ہوتی ہے۔ اول یہ کہ خدا سے اُس کا پیغام سنا جائے۔ دوسرے یہ کہ خدا کا فرشتہ اپنی صورت میں آوے اور خدا کا پیغام پہنچا دے۔ تیسرے یہ کہ فرشتہ خدا کا آدمی کی صورت میں بن کر آوے اور خدا کا پیغام پہنچا دے...... پانچویں یہ کہ خدا کی طرف سے دل میں خدا کا کلام ڈالا جاوے۔ ہم مسلمانوں کے مذہب کے بموجب مطلق وحی کا آنا صرف انبیا پر ہی منحصر نہیں ہے (دیکھو تبیین الکلام صفحہ ۱۶۰ مقدمہ ثانیہ) تفسیر میں نزول وحی کی کیفیت دیکھئے۔ "خدا اور پیغمبر میں بجز اُس ملکۂ نبوت کے جس کو ناموسِ اکبر اور زبانِ شرع میں جبرائیل کہتے ہیں اور کوئی ایلچی پیغام پہنچانے والا نہیں ہوتا۔ اُس کا (پیغمبر کا) دل ہی وہ ایلچی ہوتا ہے جو خدا پاس پیغام لیجاتا ہے اور خدا کا پیغام لاتا ہے" دیکھو تفسیر القرآن صفحہ ۲۹ مطبوعہ ۱۲۹۷ ہجری) تبیین الکلام میں پانچ طریقے نزولِ وحی کے بتائے اور "ہم مسلمانوں" کا لفظ کہہ کر یہ ظاہر کر دیا کہ خود اُن کا عقیدہ بھی یہی تھا۔ تفسیر میں صرف پانچواں طریقہ قائم رکھا باقی سب رد کر دیئے۔ یا مثلاً تبیین الکلام میں فصاحت کو قرآن مجید کا معجزہ بتاتے ہیں (دیکھو تبیین الکلام صفحہ ۱۶۲) تفسیر میں فصاحت کے معجزہ ہونے سے انکار کرتے ہیں (دیکھو تفسیر القرآن صفحہ ۳۲، ۳۳ مطبوعہ ۱۲۹۷ھ) یا مثلاً تبیین الکلام کی مذکورۂ بالا عبارت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اُس وقت اُن کا یہ عقیدہ تھا کہ فرشتے انسانی صورت اختیار کر سکتے ہیں۔ تفسیر میں اُس کی تردید کرتے ہیں (دیکھو تفسیر القرآن صفحہ ۲۶-۱۴۶ مطبوعہ ۱۲۹۷ھ) واقعات یہ ثابت کرتے ہیں کہ سر سید کی تفسیر اُسی مادۂ قبول اثر کا نتیجہ تھی۔ تبیین الکلام لکھنے کے وقت اُنھوں نے وہ تصانیف بہم پہنچائیں جو دہریوں نے انجیل کے برخلاف لکھی تھیں اور اُن کے مطالب سے آگاہی حاصل کی۔ ۱۸۶۹ء میں وہ ولایت کا سفر کرتے اور وہاں کے خیالات سے کماحقہٗ واقف ہوتے ہیں سر ولیم میور کی "لائف آف محمد" کا جواب لکھنے اور اُن اعتراضوں سے واقف ہوتے ہیں جو سر ولیم میور

نے اسلام پر کئے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں میں کسی قدر انگریزی پھیلتی ہی۔ سرسید کی سالہا سال کی آزادانہ تحریروں کا اثر محسوس ہوتا ہی اور مسلمانوں کو شرعی مسائل میں شبہے پیدا ہوتے ہیں۔ پے درپے کامیابیاں سرسید کو اپنی رائے پر پورا اعتماد کرنا سکھاتی ہیں۔ علمائے ہندوستان نئے خیال کے مسلمانوں کے شبہات رفع کرنے کی جانب نہ متوجہ ہوتے ہیں اور نہ اُن کو رفع کر سکتے ہیں۔ ان تمام امور کا اثر سرسید کی حساس طبیعت پر سخت پڑتا ہی۔ اور وہ خود تفسیر لکھنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اب اس کو انسانی فطرت کا قصور کہو، کامیابی کا نشہ سمجھو، یا ہمدردی اسلام خیال کرو کہ وہ اس امر کے محسوس کرنے سے قاصر رہتے ہیں کہ میں اس میدان کا مرد نہیں اور جس کام پر ہاتھ ڈالتا ہوں اُس کے کرنے کے لئے میرے پاس سوائے زورِ عقل کے اور کوئی مصالحہ موجود نہیں۔ حقیقۃً یہ تعجب خیز امر ہی کہ جس فن کی باقاعدہ اسٹڈی انھوں نے ساری عمر نہیں کی اُس میں تصنیف کرنے کے واسطے وہ کس طرح تیار ہو گئے! سید صاحب کو جو جو رکاوٹیں اس راہ میں پیش آئی ہیں ان سب پر انھوں نے جہاں تک ممکن تھا زور آزمائی کی ہی۔ سب سے زیادہ مجبور کرنے والا فن حدیث تھا، انھوں نے حتی المقدور اس فن کو غیر معتمد قرار دینے میں کوشش اٹھا نہیں رکھی۔ فرض کیجیے ہم اس کو تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کر سکتے ہیں کہ مفسر کو علوم شرعیہ میں ماہر ہونے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اس کو ایک ساعت کے واسطے تسلیم نہیں کر سکتے کہ قرآن کا مفسر ایسا شخص ہو سکتا ہی جو عربی کا ادیب نہ ہو۔ سید صاحب نے اپنی تفسیر کی بنا اس پر قائم کی ہی کہ جہاں کلام مجید کی عبارت آج کل کے خیالات کے خلاف ہو وہاں حقیقی معنی چھوڑ کر مجاز اور استعارہ قرار دیا جائے۔ ہم یہ دریافت کرتے ہیں کہ یہ تمیز کہ کہاں استعارہ اور مجاز ہی اور کہاں حقیقت سوائے ادیب کے دوسرا شخص کر سکتا ہی؟ ہرگز نہیں اور جب سید صاحب ادیب نہ تھے تو پھر کس طرح انھوں نے مجاز اور حقیقت کا فرق سمجھ لیا۔ لطف مزید یہ ہی کہ وہ اختلاف کرتے ہیں ایسے ادیب مفسروں سے جیسے علامہ زمخشری وغیرہ ہیں۔ فطرت انسانی کے عجیب کرشمے ہیں سید صاحب نے بڑے زور شور سے علمائے اسلام پر جا بجا یہ حرف رکھا ہی کہ وہ حکومت، اپنی گردوپیش کی سوسائٹی، عوام مسلمین کی رضاجوئی اور تقلید کے اثر سے متاثر ہو کر حقیقت سے دور جا پڑے تھے۔ لیکن افسوس کہ اُن کو یہ حس نہیں تھی کہ یہی مذکورۂ بالا اثر خود اُن کے خیالات، رائے اور قلم پر پورے طور سے مسلط

ہو رہے تھے۔ وہ اس امر کے مدعی تھے کہ زمین و آسمان میں جو کچھ اسرار الٰہی اور رموز ربانی ہیں وہ سب اُن کی عقل پر روشن ہیں (کیونکہ وہ ہر ایک آیتِ کلام مجید کے معنی کو اپنی عقل کی کسوٹی پر کستے ہیں جو مطابق عقل ہوں اُن کو لیتے ہیں جو خلاف ہوں اُن کو رَد کرتے ہیں) لیکن شیام بہاری کے جعل کا راز اُن کی عقل پر نہیں کھلتا۔ کاتج کے غبن کے کھل جانے پر وہ اس امر کا تو اقرار کرتے ہیں کہ جعلی چکوں کا روکنا (جب تک کہ اُن کا علم نہ ہو) اختیار بشر سے باہر ہے۔ لیکن اس امر کے کبھی قائل نہیں ہوتے کہ اسرار الٰہی کے انکشاف میں بھی عقل کی رسائی محدود ہے اور اُس کے کُل رازوں کا سمجھ لینا اختیار بشر سے خارج ہے۔ مؤلفِ حیاتِ جاوید نے بالائی باتیں تفسیر کے متعلق بیان کی ہیں۔ مثلاً جدید تفسیر کی ضرورت، موجودہ علمائے عربی کا اس میدان کا مرد نہ ہونا، سید صاحب کا اس کام کو محض حمایت اسلام کی غرض سے انجام دینا، وغیرہ لک۔ لیکن اصل تنقیح یعنی یہ کہ "سرسید میں مفسر بننے کے اوصاف جمع تھے یا نہیں" حیاتِ جاوید اور نیز معارف کے مضمون میں (جو خواجہ صاحب نے تفسیر مذکور کی بابت لکھا تھا) اچھوتی رہی ہے۔ ہمارے خیال میں سرسید کی تفسیر نگاری کی مثال بعینہٖ ایسی ہے کہ ایک طوفان خیز سمندر میں جہاز کو ایسا کپتان لے جائے جو نہ کسی بحری مدرسہ کا تعلیم یافتہ ہو نہ کسی ماہر استاد کی صحبت میں اُس نے جہاز رانی سیکھی ہو اور محض ضرورتِ وقت پر لحاظ اور اپنی عقل پر بھروسا کرکے جہاز کو لے کر چل کھڑا ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسے جہاز کا انجام کیا ہوگا!!!

خواجہ صاحب نے دیباچہ میں لکھا ہے: "ہم کو اس کتاب میں اُس شخص کا حال لکھنا ہے جس نے چالیس برس برابر تعصب اور جہالت کا مقابلہ کیا ہے۔ تقلید کی جڑ کاٹی ہے۔ بڑے بڑے علمائے مفسرین کو لتاڑا ہے۔ اماموں اور مجتہدوں سے اختلاف کیا ہے۔ قوم کے پکے پھوڑوں کو چھیڑا ہے اور اُن کو کڑوی دوائیں پلائی ہیں۔ جس کو مذہب کے لحاظ سے ایک گروہ نے صدیق کہا ہے تو دوسرے نے زندیق خطاب دیا ہے اور جس کو پالٹکس کے لحاظ سے کسی نے ٹائم سرو Time server سمجھا ہے تو کسی نے نہایت راستباز لبرل (LIBRAL) جانا ہے۔ ایسے شخص کی لائف چپ چاپ کیونکر لکھی جاسکتی ہے۔ ضرور ہے کہ اُس کا سونا کسوٹی پر کسا جائے اور اُس کا کھرا پن ٹھوک بجا کر دیکھا جائے۔ وہ ہم میں پہلا شخص ہے جس نے مذہبی لٹریچر میں نکتہ چینی

کی بنیاد ڈالی ہی۔ اس لئے مناسب ہی کہ سب سے پہلے اُسی کی لائف میں اُس کی بیردی کی جائے اور نکتہ چینی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔ اگرچہ سرسید کے معصوم ہونے کا نہ ہم کو دعوٰی ہی اور نہ اُس کے ثابت کرنے کا ہم ارادہ رکھتے ہیں۔ لیکن اس بات کا ہم کو خود بھی یقین ہی اور ہم چاہتے ہیں کہ اوروں کو بھی اس کا یقین دلائیں کہ سرسید کا کوئی کام سچائی سے خالی نہ تھا اور اس لئے ضروری ہی کہ اُن کے ہر ایک کام کو نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ کیونکہ سچ میں اور صرف سچ ہی میں یہ کرامت ہی کہ جس قدر اُس میں زیادہ کرید کی جاتی ہی اُسی قدر اُس کے جوہر زیادہ آب و تاب کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔"

دیباچۂ کتاب حصۂ دوم کا عنوان یہ قرار دیا ہی: "سرسید کی لائف۔ اُن کی تصانیف اور اُن کے کاموں پر ریویو۔" لہذا ایک نظر اس پر ڈالنا ہی کہ آیا کہاں تک پکے پھوڑے چھیڑے گئے اور کہاں تک ریویو کے سخت پہلو کا حق ادا کیا گیا۔ ہم کو حیاتِ جاوید حرف بہ حرف پڑھنے کے بعد اس امر کا افسوس سے اعتراف کرنا پڑتا ہی کہ جس پر زور قلم سے مذکورۂ بالا فقرہ نکلا ہی اُس کا سارا زور یا سرسید کی حمایت میں صرف ہوا ہی یا مخالفین کے لتاڑنے میں۔ پکے پھوڑوں کو چھیڑنے کی جگہ وہ اُس سے بچکر نکل گیا ہی چھوتا ہوا۔ سونے کو تاؤ نہیں دیا گیا جس سے اُس کی کھوٹ الگ ہو جاتی اور کندن نکھر جاتا۔ نکتہ چینی کی نسبت یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ اُس سے حیاتِ جاوید قریبًا خالی ہی۔ ہمارے خیال میں سرسید نے اُردو لٹریچر میں جو آزادی اور نکتہ چینی کی روح پھونکی ہی وہ قومی زندگی کی اساس ہی۔ اُس کو قائم رکھنا اور ترقی دینا ہر ایسے قلم کا فرض ہونا چاہیے جو قومی مضامین کے میدان میں در آئے۔ اور قوم میں جو تھوڑی بہت عادت سرسید نے کڑوے گھونٹ پینے کی ڈالی ہی اُس کو مداحی کی چاٹ سے بھلا دینا مرحوم کی ایک بہت بڑی خدمت کی قدر شناسی کے خلاف ہوگا۔ اگر قوم کے یہ ذہن نشین نہ ہو کہ اُس میں کچھ آہنی قلم ایسے بھی ہیں جو بخلاف مصور کے موقلم کے ظاہری اُمور کی تہ میں پہنچتے اور فاسد مادے کے موقع پر نشتر بن کر اندر پیر جاتے ہیں، اُس وقت تک قوم سیدھی نہیں چل سکتی۔ کیا انگلستان میں جانسن جیوفرے جیسے آزاد خیال ریویو نگار پیدا نہ ہوتے تو انگریزی لٹریچر موجودہ ترقی کی منزل پر پہنچتا؟ ہرگز نہیں۔ کیا ہم کو وہ جواب یاد نہیں ہی جو ایک آزاد عرب نے خلیفہ ثانی کو اُس وقت دیا تھا جب انھوں نے یہ فرمایا تھا کہ اگر میں غلطی کروں تو مجھ کو روک دینا۔ وہ

جواب یہ تھا کہ اگر آپ ٹیڑھے چلیں گے تو ہم آپ کو نوکِ شمشیر سیدھا کر دیں گے تلوار کا دور گیا اور بجائے اُس کے آہنی قلم کا دور دورہ ہے۔ حیف ہے کہ اگر لوہے کا قلم مُوقلم بن جائے اور نشتر کے موقع پر رنگ آمیزی کرنے لگے۔ لائف تاریخ کا جزو ہے۔ تاریخ کے کیا معنی ہیں؟ واقعات کی حکایت اور جو کچھ واقعہ ہوا اس کا بیان۔ آنے والی نسلیں اُس کمی کو پورا نہیں کر سکتیں جو وقائع نگاری میں معاصرین کی قلم سے رہ جائے۔ بیشک آیندہ نسلوں کو ٹھنڈے دل سے بے لگاؤ فیصلہ کرنے کا موقعہ بمقابلہ معاصرین کے زیادہ ملتا ہے۔ لیکن جن واقعات کو ہمعصر بیان نہ کریں اُن کو وہ کس طرح پیدا کر سکتے ہیں اور ظاہر ہے کہ جب جج کے سامنے کل واقعات نہ ہوں تو اُس کا فیصلہ صحیح نہیں ہو سکتا۔ دیکھو دنیا کے بڑے بڑے ملک اور بڑی بڑی قومیں ایسی ہیں جن کے حالات عدم کی کالی چادریں لپٹے ہوئے ہیں۔ اب لوگ ہر طرف ٹٹولتے ہیں۔ تاریک غاروں میں گھستے ہیں۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھتے ہیں۔ اور سمندر کی تہ میں غوطہ لگاتے ہیں مگر مدعا ہاتھ نہیں آتا۔ کیوں؟ صرف اس لئے کہ معاصرین نے واقعات نہیں لکھے۔

حیاتِ جاوید کو من اولہ الی آخرہ پڑھنے کے بعد اُس پر رائے قائم کرنی درست ہو سکتی ہے۔ اُس میں ایک سطر بھی ایسی نہیں جس کو کرٹسزم (criticism) سے تعبیر کر سکیں۔ جہاں اشد ضرورت نکتہ چینی کی پیش آتی ہے وہاں اس فرض کو یوں ادا کیا ہے۔ اول تفسیر کو لیجیے۔ تفسیر جیسا معرکۃ الآرا مسئلہ ہے وہ ظاہر ہے اور سرسید کی تفسیر کی حالت یہ ہے کہ اب تک خود اُن کے بڑے بڑے ذی استعداد دوستوں نے اُس کو تسلیم نہیں کیا۔ تفسیر کے محاسن میں تو مؤلف حیاتِ جاوید نے ۲۲ صفحے لکھے ہیں لیکن جرح کے موقع پر یہ عبارت لکھ کر چھوڑ دی ہے "مگر چونکہ اُس میں بمقابلہ علوم جدیدہ کے ایک نئے علمِ کلام کی بنیاد ڈالی گئی ہے اور صدہا مقامات میں جمہور مفسرین سے اختلاف کیا گیا ہے اور ہر ایک آیت کے معنی ایک خاص اصول کے موافق بیان کئے گئے ہیں اس لئے ممکن نہیں کہ مفسر کے بیان میں کچھ لغزشیں نہ ہوئی ہوں لیکن ایسی مستثنیات سے تمام تفسیر کی خوبی زائل نہیں ہو سکتی"۔ یہ کسی جگہ مثالاً بھی نہیں بتایا کہ فلاں فلاں مقام پر لغزشیں ہوئی ہیں۔ (۲) غبن کا مقدمہ دیکھیے۔ تمام واقعہ کو بیان کر کے لکھا ہے۔ "اُن کا کلرک انگریزی کی تحریروں پر بلا تامل دستخط کر دینا کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں ہے۔ تمام دفتر سرکاری و غیر سرکاری میں اسی طرح

ماتحتوں پر اعتماد کیا جاتا ہی کیونکہ اگر اُن پر ایسا اعتماد نہ کیا جائے اور خواہی نخواہی اُن کے کام کو مشتبہ سمجھا جائے تو ہرگز کام نہیں چل سکتا۔" کلرک مذکور غبن کے معاملہ میں ایک بار سزا پا چکا تھا۔ سرسید کے دوستوں نے اُس کی طرف سے ہوشیار رہنے کی بار بار نصیحت کی تھی۔ وہ جس ٹھاٹھ سے رہتا تھا اور جس اَللے تللے سے خرچ کرتا تھا، روز روشن کی طرح ہویدا تھا اس پر بھی اُس کی طرف سے مشتبہ ہونا خواہی نخواہی کا اشتباہ نہیں کہا جا سکتا (۳) وفات کا واقعہ جس پیرایہ میں بیان ہوا ہی اُس کو پڑھ کر ایک مورخانہ طبیعت کا آدمی (جو اصل حال سے آگاہ ہو) کانپ اُٹھے گا۔ کیا وہ واقعہ بے نتیجہ تھا جس کے بیان کرنے کی ضرورت نہ تھی؟ کیا اُس سے سوچنے والی طبیعتیں عبرت کا سبق حاصل نہیں کر سکتیں؟ کیا وہ "سوءِ مزاج" کا نتیجہ تھا؟ (۴) ٹرسٹیز بل (Trustees Bill) کو ملاحظہ کیجئے۔ آج تیرہ برس کے گزر جانے کے بعد تجربہ اور مشاہدہ نے اُس کے سارے پہلو ملک و ملت کے سامنے آشکارا کر دئے۔ سرسید کے انتخاب کی غلطی روز روشن کی طرح ہویدا ہو گئی۔ لیکن آج بھی وہی پرانا استدلال اُس کی تائید میں پیش کیا جاتا ہی جو تیرہ برس پیشتر سرسید کی جانب سے پیش ہوا تھا۔ شاید تیرہ ۱۳ برس پیشتر وہ کچھ سنگین اور وقیع معلوم ہوتا ہو لیکن اب تو وہ پارٹی فیلنگ سے زیادہ با وقعت نہیں۔ یہ استفسار کیا جا سکتا ہی کہ جب تیرہ ۱۳ برس کے تجربہ نے اُس رائے کو بیکار و بے سود ثابت کر دیا، یوروپین اسٹاف بدظن تھا اور یوروپین اسٹاف کی جائز خواہشوں کا لحاظ کالج کا مہتم بالشان اصول ہی۔ لیکن ۹۶-۱۸۹۵ء کے بعد اس بات کا تجربہ ہو جانے پر کہ ۱۸۹۸ء کی کارروائی عمدہ نتائج پیدا نہیں کر سکتی اُس کی اصلاح کی کیا فکر کی گئی۔ کیا یوروپین اسٹاف سارے ٹرسٹیوں سے بدظن تھا؟ کیوں نہیں نواب محسن الملک یا دوسرے ٹرسٹی کو جوائنٹ سکرٹری مقرر کیا گیا؟ مابعد کے واقعات ثابت کر چکے ہیں کہ یوروپین اسٹاف نواب صاحب پر اعتماد کر سکتا تھا۔ بجائے اس کے کہ اصلاح کی جاتی اُس کو اور زیادہ مضبوط کیا گیا (۵) اسسٹنٹ سکرٹیری کا جدید عہدہ قانون کو ترمیم کرا کر قائم کیا گیا اور اُس پر سید محمد احمد خاں بہادر مقرر کئے گئے۔ اس میں ذرہ برابر شبہ نہیں رہا ہی کہ اگر مسٹر بیک جیسا زبردست پرنسپل سرسید کی وفات کے بعد کالج میں نہ ہوتا تو ۱۸۹۸ء کی کارروائی کالج کا خاتمہ کر چکی تھی۔

(۶) حیاتِ جاوید میں صرف کرٹسزم (criticism) کی کمی ہی نہیں بلکہ اپنے ہیرو کے محاسن نمایاں کرنے میں حدِ مناسب سے زیادہ توغّل کیا گیا ہے۔ مثلاً پبلک اسپیکنگ کے بیان میں اتنا کہنا حق بجانب تھا کہ سرسید ہندوستان کے اعلیٰ اسپیکروں میں تھے۔ اُردو میں اُن سے بڑھ کر اسپیکر اب تک کوئی نہیں ہوا۔ مؤلفِ حیاتِ جاوید کو اس قدر تعریف کافی نہیں معلوم ہوئی۔ اور انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ تمام ہندوستان میں کوئی اسپیکر سرسید سے بڑھ کر نہیں ہوا۔ اس بلندی تک اپنے ہیرو کو پہنچانے کے واسطے اُن لوگوں کو ہٹایا ہے جو سدِ راہ تھے۔ جو ہندوستانی انگریزی میں اعلیٰ اسپیکر ہوئے ہیں اُن کو یوں گھٹایا ہے کہ وہ برک اور پٹ کی بنائی ہوئی سڑکوں پر چلتے ہیں۔ یہ نہیں خیال فرمایا کہ غیر زبان میں اعلیٰ اسپیکر ہونا بہ نسبت اپنی زبان کے اعلیٰ اسپیکر ہونے کے زیادہ مشکل ہے۔

۷۔ اس امر کے ثابت کرنے کے واسطے کہ جو خدمت اسلام کی سرسید نے کی وہ تیرہ سو برس کے عرصہ میں کسی نے نہیں کی تمام پچھلے علما کے پچھلے کاموں کو یوں دبایا ہے کہ "اُن کے علمی مشغلوں میں کوئی فکر اور خلجان خلل انداز نہ تھا۔ وہ معاش کی طرف سے فارغ البال تھے۔ وہ قوم کی خدمت کرتے تھے سلطنت اُن کی خدمت کرتی تھی۔" افسوس ہے کہ واقعات اس رائے کا ساتھ نہیں دیتے۔ واقعات یہ ثابت کرتے ہیں کہ جیسے جانگداز خلجان اور روح فرسا افکار اُن کی راہ میں حائل تھے ویسے اب ہندوستان میں ڈھونڈے بھی نہیں مل سکتے۔ اگر اس مسئلہ پر کوئی صاحب مفصل بحث دیکھنا چاہیں تو ہمارے رسالہ "علمائے سلف" میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ علمائے سلف کی نسبت خود سرسید کے خیالات بھی واقعات پر مبنی نہیں معلوم ہوتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا سے لیکر انتہا تک وہ سارے علما کو ایک ہی انداز کا سمجھے ہوئے تھے۔ اور جو خلافِ شان حالات انھوں نے بچشمِ خود دیکھے یا بعض علما کی نسبت سنے انھوں نے قاطبۃً کل علما سے اُن کو بدگمان کر دیا تھا۔ وہ جا بجا علما کی نسبت یہ ریمارک کرتے ہیں کہ اُن کے جو کچھ خیالات تھے وہ اگلوں کی تقلید پر مبنی تھے اور دوسروں کی پیروی کی عادت نے خود اُن کی قوتِ فیصلہ کو معطل کر دیا تھا۔ حالانکہ یہ ریمارک قرونِ اولیٰ کے علما کی نسبت ہرگز صحیح نہیں۔ انھوں نے جو کچھ کیا اور لکھا سب مجتہدانہ۔ اُن بزرگوں کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا رواں رواں آزاد تھا۔ یہ بات مُسلّم

ہے کہ چار سو برس تک مسلمانوں کی تاریخ میں اجتہاد کا دور رہا اس کے بعد تقلید شروع ہوئی اور سو[١٠٠] سوا سو[١٢٥] برس کے بعد تقلید کی جکڑبند ایسی سخت ہوتی گئی کہ آخر قوتِ فیصلہ سلب ہوگئی اور علما لکیر کے فقیر رہ گئے۔ اس صورت میں دورِ اول کے بیانوں سے اس بنا پر یہ توجیہ کرنا کہ وہ آبائی تقلید کا نتیجہ ہیں درست نہیں ہے۔ یہ خیال بھی سرسید کا عموماً علمائے اسلام کی نسبت پایا جاتا ہے کہ ان بزرگوں کو حکومت کا خوف اور عوام کا پاس و لحاظ اظہارِ حق سے مانع تھا۔ میرے نزدیک ایسا خیال کرنا ان بزرگوں کی سچی عظمت کو گھٹانا ہے۔ کیا امام احمد بن حنبل نے مامون الرشید کے خوف سے مسئلہ خلقِ قرآن میں حق کو چھپایا؟ کیا وہ پابجولاں بغداد کے بازاروں میں تشہیر نہیں کئے گئے؟ کیا اگر مامون الرشید کو چندروز بھی اجل اور مہلت دیتی تو امام ممدوح کے قتل میں کچھ کسر باقی تھی؟ کیا امام اعظم نے خلیفہ منصور سے اختلاف کرکے دُرّے نہیں کھائے؟ کیا انھوں نے جیل خانہ میں وفات نہیں پائی؟ کیا سعید ابنِ جُبیر کو حجاج سے سفاک کا جبروت اظہارِ حق سے روک سکا؟ کیا وہ شہید نہیں کئے گئے؟ کیا سعید ابن المسیب نے دُرّوں کی مار نہیں کھائی؟ کیا خواجہ حسن بصری نے ابن ہبیرہ گورنر کوفہ کو بیدھڑک ملامت نہیں کی؟ کیا امام ابنِ طاؤس نے خلیفہ منصور کو دنداں شکن جواب بیباکانہ نہیں دیا؟ یہ اور ایسے ہزاروں واقعات ثابت کرتے ہیں کہ خوف یا طمع کبھی ان جوانمردوں کی رائے کو نہیں دبا سکی۔ کالی بھیڑ کس گلہ میں نہیں ہوتی۔ بہت سے لوگ زمرۂ علما میں ایسے بھی گزرے ہیں جو خوف اور طمع کا شکار ہوگئے۔ لیکن ان کے ایسا کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ سب ایسے ہی تھے۔ حیاتِ جاوید میں سرسید کا ایک اور قول اسی قسم کا نقل کیا ہے۔ "اصل یہ ہے کہ قدیم زمانہ میں جبکہ علما نے اس قسم کی رائیں لکھیں علم ایک نہایت محدود فرقہ میں تھا جس کو وہ خاص خاص لوگوں کے سوا اوروں میں شائع کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اور تمام لوگ اعلیٰ و ادنیٰ علوم کے ادنیٰ ادنیٰ مسائل سے بھی بےبہرہ تھے۔" افسوس ہے کہ سرسید جیسے محقق کے قلم سے ایسے الفاظ نکلیں۔ ہم مسلمانوں کی قدیم تاریخ دیکھتے ہیں تو واقعات اس کے خلاف پاتے ہیں۔ معتبر تاریخ شاہد ہے کہ قدیم زمانہ میں جبکہ علما نے اس قسم کی رائیں لکھیں ایک ایک استاد کے حلقۂ درس میں تیس تیس چالیس چالیس ہزار آدمی جمع ہوتے تھے۔ مکان اور کوچے جب تنگی کرنے لگے تو اساتذہ کو وسیع میدانوں میں بلند چبوتروں پر بیٹھ کر درس دینا پڑا۔

اُستاد کی آواز شاگردوں تک پہنچانے کے لئے تین تین سو مستملی کھڑے ہوتے تھے۔ ابومسلم نے جب بغداد کے ایک میدان میں درس حدیث دیا تو اُن کے مجمع میں چالیس ہزار دواتیں شمار ہوئی تھیں۔ تیسری چوتھی صدی ہجری میں غزنین سے لیکر اندلس تک علم پھیلا ہوا تھا۔ افغانستان۔ خراسان۔ فارس۔ ماوراءالنہر عراق۔ شام۔ حجاز۔ مصر۔ اُندلس۔ صقالیہ۔ تیونس۔ اور مراقش۔ غرض ایشیا۔ افریقہ۔ اور یورپ تینوں برّاعظم مسلمانوں کے علوم سے روشن ہو رہے تھے۔ شہروں اور قصبوں سے گزر کر دیہات تک میں علم کی گرم بازاری تھی۔ جو علما مقتدائے دین اور رُکن اسلام مانے گئے ہیں وہ باعتبار توطّن صدہا مقامات کے رہنے والے اور بلحاظ نسل بیسیوں نہیں بلکہ سینکڑوں خاندانوں سے تعلق رکھنے والے تھے۔ آزاد اور غلام، آقا اور نوکر، امیر اور غریب، مرد اور عورت دین دار اور دنیادار سب ہی دولتِ علم سے مالامال تھے۔ ان واقعات کے ہوتے ہوئے کس طرح تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ قدیم زمانہ میں علم ایک نہایت محدود فرقہ میں تھا۔ جس کو وہ اپنے خاص خاص لوگوں کے سوا اوروں میں شائع کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اور تمام لوگ اعلیٰ و ادنیٰ علوم کے ادنیٰ ادنیٰ مسائل سے بھی بے بہرہ تھے۔ کاش کوئی ہم کو بتائے کہ نہایت محدود فرقہ کون سا تھا جس میں علم قدیم زمانہ میں محدود تھا۔ کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ مسلمانوں کا بنارس اور روم کون سا شہر تھا؟!

(۸) مؤلف حیاتِ جاوید نے سرسید کے مخالفین کے لتاڑنے میں اعتدال سے زیادہ سرگرمی کا اظہار کیا ہے۔ یہاں تک کہ اُن کی نیت پر بھی جا بجا حملہ کیا ہے۔ سرسید کے مخالفین میں ایسے بھی تھے جنھوں نے نیک نیتی سے مخالفت کی۔ ہم بعض ایسے بزرگوں سے واقف ہیں جو سرسید کے مذہبی خیالات کے سخت مخالف تھے۔ اُن سے ہمیشہ خلوت و جلوت میں مباحثہ کرتے رہے اور اس کے ساتھ ہی باقی اور تمام کوششوں میں اُن کے اول سے آخر تک ممد و معاون رہے خواہ وہ کام سینٹفک سوسیٹی کی شکل میں تھا یا کالج اور کانفرنس کی صورت میں۔ کالج کے نازک وقتوں میں آڑے آئے اور اب تک اُن کاموں کی مدد میں سرگرم ہیں۔ کیا ایسے مخالفین کے ہوتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ جن لوگوں نے سرسید کے مذہبی خیالات سے اختلاف کیا اُن کی نیت بخیر نہ تھی! ہم کو اس میں بھی کلام ہے کہ سرسید کے جواب

عربی کے عالم ہیں اُن میں سے کسی نے بھی تفسیر کو مانا ہو۔ خود نواب محسن الملک بہادر نے سرسید سے اس بارہ میں کُھلّم کُھلّا مخالفت کی اور طرفین کا مباحثہ عرصہ تک اخبار میں شائع ہوتا رہا۔ اس مباحثہ میں نواب صاحب نے تفسیر کو "تفسیر القول بمالا یرضیٰ بہ قائلہ" کا خطاب دیا تھا۔ اور جب تک یہ امر پایۂ ثبوت کو نہ پہنچا دیا جائے کہ یہ تفسیر محض سرسید کے زورِ طبع کا شگوفہ نہیں ہے بلکہ اسلوب کلام الٰہی اور دابِ ادبِ عربی کے موافق ہے اُس وقت تک یہی خطاب اُس پر صادق آتا رہے گا۔

(۹) کالج کے حالات میں مذہبی تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے حیاتِ جاوید میں لکھا ہے "مذہبی تعلیم و تربیت بھی اس کالج کی خصوصیات میں ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ یہ شاخ جیسی کہ ایک محمدن کالج میں ہونی چاہیے ابھی تک اُس درجہ پر نہیں پہنچی لیکن اس کا الزام سرسید یا کالج کے منتظموں پر عائد نہیں ہوتا۔ اول تو دو مذہبی کمیٹیاں جو شیعہ اور سنی دونوں کی مذہبی تعلیم کی نگرانی اور انتظام کے لئے جدا جدا مقرر تھیں اور جن سے سرسید نے لوگوں کی بدگمانی کے خیال سے خود علٰحدگی اختیار کی تھی انھوں نے کبھی اس طرف توجہ نہیں کی۔ دوسرے دُنیوی تعلیم کے کورس جو یونیورسٹی وقتاً فوقتاً مقرر کرتی ہے وہ اس قدر مشکل اور طویل الذیل ہوتے ہیں کہ اُن کے پورا کرنے میں طلبا کو دوسری طرف متوجہ ہونے کا بہت ہی کم موقع ملتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر اُن پر مذہبی تعلیم کا زیادہ بوجھ ڈالا جائے تو دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو وہ کالج چھوڑ دیں گے یا یونیورسٹی کے امتحانوں میں کامیاب نہ ہو سکیں گے باایں ہمہ جس قدر مسلمانوں کی مذہبی تعلیم و تربیت کا اہتمام اس کالج میں کیا جاتا ہے اور جس کی تفصیل سالانہ رپورٹوں میں ہمیشہ چھپتی ہے ہندوستان کے کسی کالج میں اُس کا وجود نہیں"۔ ہم کو تعجب ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب جیسے آزاد خیال کے قلم سے یہ لفظ کیونکر نکلے ہیں۔ افسوس ہے کہ حیاتِ جاوید میں اس قسم کے استدلال کی کمی نہیں ہے۔ جو حالت مذہبی تعلیم کی کالج میں عہد سرسید میں رہی اُس پر "اہتمام" کا لفظ میں نہیں خیال کر سکتا کس طرح صادق آسکتا ہے۔ مؤلف نے ایک چھوٹا سا جزئیہ بھی ایسا بیان نہیں کیا جس سے یہ ثابت ہوتا کہ مذہبی تعلیم کا "اہتمام" تھا۔ بڑی سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اُس کی تفصیل سالانہ رپورٹوں میں ہمیشہ چھپتی ہے۔ ہم نے سرسید کے عہد میں سالانہ رپورٹوں میں قریباً اتنا ہی مضمون مذہبی تعلیم کی بابت پایا گہ سنی طالبعلموں

کا سُنی استادوں نے اور شیعہ طلبا کا شیعہ استادوں نے امتحان لیا"۔ اول تو یہ طریقہ ہی قابل غور ہے کہ جو پڑھائے وہی امتحان لے۔ اس سے قطع نظر کیجئے تو یہ کبھی نہیں دکھایا گیا کہ نتیجۂ امتحان کیا رہا؟ کتنے طلبا شریک امتحان ہوئے؟ کامیاب طلبا کی تعداد فیصدی کیا رہی؟ یہ کہنا جو کمی تعلیم دینیات میں رہی اُس کا الزام سرسید کے ذمہ دو وجہ سے نہیں آسکتا۔ اول یہ کہ دو مذہبی کمیٹیاں شیعہ سنی طلبا کی تعلیم مذہبی کے انتظام و نگرانی کے لئے جدا جدا مقرر تھیں۔ دوسرے یہ کہ یونیورسٹی کی تعلیم کا بار اس قدر ہی کہ مذہبی تعلیم کا بار طلبا اٹھا نہیں سکتے" ہمارے ناقص خیال میں درست نہیں۔ اول دلیل کے جواب میں یہ پوچھا جا سکتا ہی کہ آیا کبھی سرسید نے ان کمیٹیوں کی پروا کی یا اُن سے کام لیا؟ اگر انھوں نے کام نہیں کیا تو سرسید نے کبھی اجلاس ٹرسٹیاں میں اُن کی شکایت پیش کی؟ کبھی اُن کا جلسہ طلب کیا؟ جو جگہیں موت کے پنجہ نے خالی کیں اُن کو معمور کیا گیا؟ حق یہ ہی کہ کام نہ کرنے کے الزام کے لئے وہ تھے اور کام کرنے والے اور تھے۔ افسوس ہی کہ ہم کالج کے نقصان کے خیال سے اس مبحث کی تفصیل زیادہ نہیں کر سکتے تاہم ہمارا کانشنس اس کہنے پر مجبور کرتا ہی کہ سرسید کے عہد سکریٹری شپ اور مسٹر بیک کی پرنسپلی کے زمانہ میں کالج میں جو چیز سب سے زیادہ غیر مہتم بالشان تھی وہ مذہبی تعلیم تھی۔ بجائے اس کے کہ اس تربیت سے مذہب کی حرمت ذہن نشین ہوتی وہ ایک عمدہ پالیسی کے پیرایہ میں دماغوں میں جاگزیں ہوتا تھا۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ کالج کی جس مذہبی تعلیم کو سراہا جاتا ہی وہ کیا چیز تھی؟ سرسید تحریر اور تقریر میں ہمیشہ مذہب کے سرگرم حامی رہے۔ لیکن عالم عمل میں آئیے تو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ مذہب کیا تھا جس کے سرسید اس قدر حامی تھے۔ دوسری دلیل کا یہ جواب ہی کہ یونیورسٹی کی تعلیم کا بار بیشک زیادہ ہی تاہم اُس قدر تعلیم مذہب میں جو کالج میں سرسید کے زمانہ میں تھی ترقی ناممکن نہ تھی۔ یہ کہنا کہ محمڈن کالج سے بڑھ کر کسی کالج میں تعلیم مذہبی کا اہتمام نہیں، ہی کالج کی مذہبی تعلیم کی وقعت نہیں بڑھا سکتا۔ ہندوستان کے کالج عموماً سرکاری ہیں یا مشنریوں کے یا ہندوؤں کے۔ ان کے مقابلہ میں اگر مسلمانوں کی مذہبی تعلیم محمڈن کالج میں زیادہ ہوئی تو اُس کی حقیقی فضیلت ثابت نہیں ہوئی مع ہٰذا ہم کو اس میں کلام ہے کہ اسلامیہ کالج لاہور کے مقابلہ میں دینیات کا زیادہ اہتمام محمڈن کالج میں تھا۔ مؤلف حیات جاوید نے

بعض علمائے دیوبند پر اس بنا پر اعتراض کیا ہی کہ انھوں نے کمیٹی دینیات کی ممبری قبول نہیں کی لیکن یہ کہیں نہیں بتایا کہ جن علمانے ممبری قبول کی اُن سے کیا کام اس کے سوا لیا گیا کہ محمڈن کالج میں اہتمام دینیات کے نہ ہونے کا ذمہ دار اُن کو قرار دیا جائے؟!

ہماری یہ رائے ہی کہ سرسید کی لائف ایک ایسے زبردست آزاد نگار قلم کا کام ہی جو نفرت و محبت دونوں سے بری ہو اور اُمید ہی کہ اگر مسلمانوں میں تعلیم کی اصلی ترقی ہوئی تو سرسید کی متعدد لائفیں لکھی جائیں گی اور اُن کے واسطے حیاتِ جاوید بنیاد کا کام کرجائے گی۔ یہ افسوس البتہ ہی کہ جو واقعات رہ گئے اُن کو آئندہ لائف نگار پیدا نہ کرسکیں گے۔

حیاتِ جاوید میں بعض فروگزاشتیں قابلِ لحاظ رہ گئی ہیں۔ مثلاً حلیہ میں ناک کے بھاری پن کا ذکر نہیں حالانکہ ایک مدبر کے حلیہ کا یہ ایک ضروری جزو ہی۔ سرسید کی شادی کا ذکر نہیں۔ احباب کے بیان میں یہ ذکر نہیں کہ سرسید نے احباب کس طرح پیدا کیے۔ نواب محسن الملک کا ابتداءً بقصدِ جنگ آنا اور پھر سرسید کے سامنے ہتھیار ڈال دینا ایک دلچسپ واقعہ ہی۔ اسی طرح اور دوستوں کے بھی ابتدائی حالات ہونگے اس ذکر کے لکھنے کی اس وجہ سے بھی ضرورت تھی کہ اس عہد میں لیڈر بننے کا سودا ہر دماغ میں ہی مگر ان صفات سے لوگ عموماً بے خبر اور بے بہرہ ہیں جو ایک آدمی کو لیڈر بنا دیتی ہیں۔ فقط

۹ر فروری ۱۹۰۲ء

امیر خسرو کا بچپن

"نقار خانہ میں طوطی کی آواز کون سنتا ہی" یہ ایک مشہور مثل ہی۔ اولوالعزم پرانے کلیوں کو توڑتے اور نئے کلیئے قائم کرتے ہیں۔ طوطئے ہند امیر خسرو کے کمال نے مثل بالا کا عکس آئینۂ ہمت میں دیکھا ہی۔ اُن کے واسطے یہ کہنا پڑتا ہی کہ "طوطئ ہند کی آواز نقار خانۂ گردوں میں کون نہیں سُنتا"۔ جہاں جاؤ ان کا کمال بلند آوازہ ہی۔ جس طرف کان لگاؤ اُن کا کلام سامعہ نواز ہوتا ہی۔ صوفیا کی مجلس میں حاضر ہو،

بزم شعرا میں جاؤ، پرانے مکتبوں کی طرف جانکلو، موسیقی کے جلسوں میں بیٹھو، گیت گانے والیوں کے پاس سے گزرو، لطیفے، کہ مکریاں وغیرہ سنو، ہر جگہ خسرو یا کھسرو کا نام سنو گے۔ زمانہ بدلا تو مذاق بھی بدل گئے۔ ہم کسی باکمال کا نام یا کلام سنتے ہیں تو اُس کے حالات کا تفحص اور شوق دل میں پیدا ہوتا ہے۔ سوسائٹی بے خبر، پیش نظر کتابیں خالی، دل کی آرزو دل ہی میں رہ جاتی ہے۔ جس طرح ایک تازہ پودا پانی نہ ملنے سے خشک ہو جاتا ہے اسی طرح یہ عزیز شوق مدد نہ پہنچنے سے افسردہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ قیامت یہ ہے کہ جن اہلِ کمال کے نام مقبولیت کی برکت سے زیادہ روشن ہیں انھیں کے حالات پر تاریکی کے زیادہ پردے ڈالے ہیں۔ امیر خسرو کی مقبولیت مسلّم۔ تصوف کی کتابیں پڑھو، تذکرے دیکھو، معدودے چند واقعات پاؤ گے۔ اُن واقعات سے اُس مذاقِ واقعہ سنج کی سیری نہ ہوگی جو حال کی سوانح عمریاں دیکھ کر پیدا ہوتا ہے۔ اسلاف میں باکمال بھی تھے وقائع نگار بھی۔ پھر یہ کیا غضب ہے کہ ایسے زندہ جاوید کملاء کے حالات لحدِ فنا میں سو رہے ہیں۔ حال یہ ہے کہ گزشتہ تین چار صدیاں ہم پر ایسی گزر گئی ہیں جن میں خیالی و ذہنی مضامین کی حکومت ہمارے دماغوں پر رہی ہے۔ علوم میں معقولات، فنون میں شاعری، رات دن انھیں کا چرچا تھا۔ اور ان دونوں کو واقعات سے بہت کم مناسبت ہے۔ اس زمانہ کی اعلیٰ سے اعلیٰ تصنیف پڑھو اُس کا سرمایۂ ناز ذہنی موشگافی پاؤ گے جس کے لئے اپنا خیال اور دماغ کافی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طبیعتیں حقائق سے غیر مناسب ہو گئیں۔ مذاق، واقعات سے آشنا نہ رہی۔ تاریخی سرمایہ کو طاقِ نسیان میں پڑے پڑے فنا کی دیمک چاٹ گئی۔ خلاصہ یہ کہ پچھلوں نے اگلوں کی کمائی ڈبو دی اور ڈبو کر فنِ تاریخ سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ قیامت ہے کہ ابن بطوطہ اور ابن جبیر کے نام اور کام یورپ نے مرتب و مجسم کو سنائے اور دکھائے تب ہم کو یہ خبر ہوئی کہ ہم میں بھی "یہ سرمایۂ نازش" تھا۔ ہندوستان میں بہت سے علمائے نامور گزرے ہیں۔ مگر اُن کے حالات میں کوئی تذکرہ یا طبقات کی کتاب نہیں ملتی۔ اگر آزاد بلگرامی۔ سبحۃ المرجان لکھ کر تھوڑی بہت جان نہ ڈال دیتے تو اُن کا نام بھی زندہ نہ رہتا۔ شعرا کا حال سب سے زیادہ تباہ ہوا۔ یہاں ازل سے نام و نشان سے دشمنی چلی آتی ہے۔ تذکروں میں مسجع اور مقفّیٰ عبارت بہت، نام اور تخلص کی رعایت سے مملو، فقرے مسلسل، لیکن سلسلۂ واقعات معدوم

تذکرہ حالات مفقود۔ اس ظلمت کدہ میں جب کسی طرف سے روشنی کی کرن آجاتی ہے تو آنکھیں سی کھل جاتی ہیں، دل نورِ مسرت سے روشن ہو جاتا ہے۔

یہ تو مشہور ہے کہ امیر خسرو کے چار دیوان تھے تحفۃ الصغر[1]، وسط الحیات[2]، غرۃ الکمال[3]، بقیہ نقیہ[4]۔ ان چاروں کا خلاصہ (دیوانِ خسرو کے نام سے) ہندوستان کے ایک مشہور مطبع نے چھاپا ہے۔ عبرت کی آنکھیں ان اربعہ عناصر کو دیکھ کر آٹھ آٹھ آنسو روتی ہیں۔ کلام کو ایسا مسخ کیا ہے کہ اصلی خط و خال کا نشان باقی نہیں۔ مطبوعہ نسخہ کو کسی صحیح مجموعہ سے ملا کر پڑھئے تو اصلیت جلوہ گر ہو۔

تحفۃ الصغر کا ایک قدیم قلمی نسخہ حال میں میرے ہاتھ آیا ہے۔ دیباچہ میں مصنف نے اپنی ابتدائی شاعری کے کچھ حالات لکھے ہیں جو بے حد دلچسپ ہیں۔ تنہا خوری پسندیدہ نہیں۔ مخزن کے خوانِ نعمت پر اُس کا لُب لباب چنتا ہوں ع

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

عبارت صنائع بدائع سے مرصع نہ ہوتی تو لفظی ترجمہ پیش کرتا جس سے حال و قال دونوں کا لطف حاصل ہوتا۔

اس چھوٹے سے دیوان میں ۱۶ برس کی عمر سے ۱۹ برس تک کا کلام ہے۔ ابتداءً امیر خسرو کا تخلص سُلطانی تھا۔ وہی اس مجموعہ میں جا بجا نظر آتا ہے۔ کم کم خسرو بھی ہے۔ قصیدہ، غزل، رُباعی، قطعہ، ہر قسم کا کلام پاؤ گے۔ تصوف، تغزل، مدح، ظرافت کا بھی ہر رنگ موجود ہے، ہجو نام کو نہیں۔ اقسام کلام کا شمار حسب ذیل ہے قصائد ۳۴، ترجیع بند ۲، ترکیب بند ۲، قطعات ۲۳، غزلیات (غیر مرتب) ۸۷، مثنوی ۱، رباعیات ۲۰۵۔ قصائد میں بعض قصیدے سلطان علاؤ الدین کی مدح میں ہیں یہ غالباً الحاقی ہیں۔ اس لئے کہ سلطانِ ممدوح ۶۹۵ھ ہجری میں تخت نشین ہوا اور اُس وقت امیر خسرو کی عمر ۴۳ برس کی تھی۔

خلاصہ: دیباچہ میں جو حالات آپ ابھی پڑھیں گے اُن کے سوا یہ دو چار اور معلوم ہو سکتے ہیں۔

امیر خسرو ۶۵۲ھ[1] میں مومن آباد پٹیالی (ضلع ایٹہ ممالکِ متحدہ) میں پیدا ہوئے۔ پانچ برس کے تھے

---

[1] سالِ پیدائش قران السعدین کے ان اشعار سے واضح ہوتا ہے ؎ آنچہ بتاریخ زہجرت گزشت + بود شش صد و پنجاہ و ہشت۶۵۸
سالِ من امروز اگر پرسی + راست بگویم ہمہ شش بود و سی۔ ۶۵۸ - ۳۶ = ۶۵۲ھ

کہ دارالکمال دہلی پہنچے۔ باپ کا سایہ کم سنی میں سر سے اٹھ گیا۔ نانا نے تربیت کی۔ یاوریِ طالع دیکھو۔ اُس زمانہ میں حضرت سلطان نظام الدین اولیاؒ کا قیام اُن کے ننہال[1] میں تھا۔ انھوں نے لڑکپن میں ہی شرفِ بیعت حاصل کیا۔ نیز منزلِ سخن کی ہدایت پائی۔ مرشدِ کامل نے آغاز ہی میں یہ گُر تلقین فرما دیا تھا "بہ طرزِ صفاہانیاں بگو" (یعنی عشق انگیز و زلف و خال آمیز) ابتداءً جو شعر کہتے وہ حضرت کے ملاحظہ میں پیش کرتے۔ دیوانِ مبتدی و منتہی حضرت نے خود ان کو پڑھایا اور اُس کے رموز و اشارات ذہن نشین فرمائے۔ اس فیضان نے کلامِ خسرو میں وہ سوز و گداز پیدا کر دیا کہ آج تک جو سُنتا ہے دل تھام لیتا ہے (یہ حالات سیر الاولیا اور سیر العارفین سے ماخوذ ہیں)۔

خلاصہ دیباچۂ تحفۃ الصغر بندہ خسرو عرض پرداز ہے کہ عنایتِ ایزدی سے میں نے بارہ برس کی عمر میں بیت و رباعی کہنی شروع کی۔ فضلا و بلغائے روزگار اُن کو سُنکر تعجب کرتے تھے۔ اُن کے تعجب سے میرا شوق اُبھرتا تھا۔ وہ بزرگ میری قابلیت دیکھ کر ترغیب دیتے تھے۔ میرا یہ عالم تھا کہ کثرتِ شوق کے اثر سے شام سے صبح تک چراغ کے سامنے مثلِ قلم سرنگوں رہتا تھا اور رات کو مطالعہ میں مصروف۔ یہاں تک کہ نظر میں دقت پیدا ہوئی۔ اور کلام کی باریکیاں خیال میں آنے لگیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی تھا کہ ابنائے جنس میری طبیعت کے امتحان لیتے تھے امتحان سے میرا دل گرماتا تھا۔ اور دل کی گرمی زبان میں روانی پیدا کرتی تھی۔ اس وقت تک کوئی استاد نہ ملا تھا جو دقائق کی راہ بتاتا، قلم کو بے راہ رَوی سے روکتا، نقائص کو دور کر کے کمال کا جلوہ دکھاتا۔ پس میں نوآموز طوطی کی طرح اپنے ہی خیال کے آئینہ کے سامنے بیٹھا مشقِ سخن کرتا تھا اور سخن سنجی سیکھتا تھا۔ اسی طرح آہنِ دل کی صیقل گری اپنی ہی قوتِ بازو سے کرتا رہا۔ استادوں کی تصانیف کا مطالعہ ہمیشہ کرتا تھا۔ حتیٰ کہ مذاق لطفِ کرم و ذوقِ سخن سے آشنا ہوا۔ انوری و سنائی کا کلام دیکھتا اور فہم کو روشنی پہنچاتا۔ جو عمدہ نظم نظر آتی اُس کا جواب لکھتا جس دیوان کا مطالعہ کرتا اُسی کے انداز پہ شعر کہتا۔ ایک عرصہ تک خاقانی کے دامنِ دولت سے لپٹا رہا۔ جو الفاظ اُس کے کلام میں مغلق تھے ان کی تعلیق کی (یعنی

[1] قدیم دلّی کا ایک دروازہ "منڈا دروازہ" کے نام سے مشہور تھا۔ اُس کے پاس ہی امیر خسرو کے ننہال کا مکان تھا۔ اُس کا موقع اب بی بی نور کے مقبرے کے قریب متصل درگاہ حضرت قطب صاحب ہے۔ ۱۲

نوٹ لکھے) اگرچہ مغلق اشعار کو حل کرتا تھا تاہم بمقتضائے نوعمری کماحقہٗ حقائق کلام واضح نہ ہوتے تھے۔ ہرچند
میری ہمت آسمان پیما تھی لیکن استاد کے کلام کا پایہ اتنا بلند تھا کہ میرے فہم کی رسائی وہاں تک
نہیں ہوتی تھی۔ بایں ہمہ عاقبتہ الامر اُستاد کی پیروی سے طبیعت بڑھنے لگی۔ چونکہ میرے کلام کا کوئی مرجع نہ
تھا ہر اُستاد کے رنگ میں کہتا تھا۔ اس لئے اس مجموعہ میں متقدمین و متاخرین سب کا رنگ موجود ہے۔

حاصل کلام میرے والد نے تحصیل علم کے واسطے مکتب میں بٹھایا۔ یہاں یہ حال تھا کہ قافیہ کی تکرار
تھی۔ میرے اُستاد مولانا سعد الدین خطاط مشق خط کی تاکید کرتے تھے۔ میں اپنی ہی دُھن میں تھا۔ وہ پیٹھ
پر دُرّے لگاتے مجھ کو زلف و خال کا سودا تھا۔ انتہا یہ کہ اُسی سن میں وہ شعر و غزل کہنے لگا جس کو سُنکر
بزرگوں کو حیرت ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ صبح کے وقت میرے اُستاد کو خواجہ اَصیل نائب کوتوال نے خط
لکھنے کے لئے بلایا۔ میں دوات قلم لے کر ہمراہ ہوا۔ اُس عزیز کے گھر میں خواجہ عزیز الدین نظر بند تھے۔
خواجہ موصوف عالم متبحر اور دریائے سخن کے شناور تھے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو وہ مطالعۂ کتاب
میں مصروف تھے۔ اثنائے مطالعہ میں جب کسی مضمون پر گفتگو کرتے تو منہ سے موتی جھڑتے۔ اور جواہر
آبدار زبان سے نکلتے۔ میرے اُستاد نے اُن سے کہا "یہ میرا ذرا سا شاگرد اس بچپن میں نظم کا بے حد
شائق ہے۔ شعر پڑھتا بھی خوب ہے۔ کتاب اس کو دے کر امتحان لیجئے۔" خواجہ عزیز نے فوراً کتاب مجھکو دیکر
سنانے کی فرمائش کی۔ میں نے اشعار ترنم آمیز لہجہ میں پڑھنے شروع کئے۔ اُس کے اثر سے آنکھیں پُرنم
ہوگئیں۔ ہر طرف سے تحسین کی آواز آنے لگی۔ پھر میرے اُستاد نے کہا کہ "پڑھنا سن لیا۔ اب کوئی بیت پیش
کرکے جودت طبع کی آزمائش کیجئے۔" خواجہ ممدوح نے چار غیر متناسب چیزوں کے نام لیکر کہا ان کو نظم میں
موزوں کرو۔ وہ نام مُو، بیضہ، خربزہ، تیر تھے۔ میں نے اُسی جلسہ میں یہ رُباعی موزوں کرکے سنائی۔ رُباعی

ہر موئے کہ در دو زلف آں صنم ست — صد بیضۂ عنبریں در آں موئے صنم ست
چوں تیر بداں راس دلش راز یراکہ — چوں خربزہ دندانش درونِ شکم ست

جس وقت میں نے یہ رباعی پڑھی خواجہ نے بہت ہی آفریں فرمائی۔ اور نام پوچھا۔ میں نے کہا۔
"خسرو" باپ کا نام پوچھا۔ میں نے کہا "لاچین" کہا لاچین ترک خطا ہے؟ میں نے جواب دیا کہ بخطا

ترک ہی۔ دریافت کیا تم درم خریدۂ ناصری[1] ہو؟ عرض کی سلطانی شمسی[2] ہوں (سلطانی اشرفی کو کہتے ہیں۔ درم خریدہ کی کیسی رعایت ہی) فرمایا چونکہ تمہاری نسبت سلطانی ہی لہٰذا سلطانی اپنا تخلص رکھو۔ اس کے بعد بہت سی باتیں میرا دل بڑھانے کو کیں اور فن کے متعلق بہت ہی دقیق باتیں تلقین کیں جن کو میں اپنے دل میں رکھتا گیا۔ اُس روز سے میں نے اپنا تخلص سلطانی رکھا۔ اس دیوان میں یہ سکہ بہت رائج ہی۔ اُس کے بعد میں باریک مضامین کے پیچھے پڑا رہا۔

یہ سب کچھ ہوا مگر زمانہ لڑکپن کا تھا اس لیے کلام کبھی جمع کرنے کا خیال نہیں کیا۔ میرا بھائی تاج دین زاہد (جس کی باریک بیں طبیعت مشاطۂ طرۂ اشعار ہی) اُن اشعار کو فراہم کر لیتا تھا اور جو کچھ میں نے ۱۶ برس کی عمر سے ۱۹ برس کی عمر تک کہا اُس کا ایک مجموعہ اُس نے بنایا۔ میں نے اُس کو دیکھ کر کہا "یہ پانی میں ڈبو دینے کے قابل ہی"۔ اُس نے نہ مانا۔ اور فرمائش کی کہ اس کو مسلسل کر دو۔ چنانچہ میں نے ہر حصۂ کلام پر ایک شعر اُس کے عنوان کے طور پر کہہ کر لگا دیا۔ یہ میرا ایجاد ہی۔ مجھ سے پیشتر کسی نے یہ سلسلہ قائم نہیں کیا۔ اس دیوان کا نام تحفۃ الصغر ہی۔ سچ یہ ہی کہ ہر چند اوراق باطل جمع ہیں۔ میدان نشیب و فراز سے معمور تھا اور پانو میں لنگ تھی۔ میں نے بہت چاہا کہ بادپائے قلم کو جنبش نہ کرنے دوں لیکن دوستوں نے نہ مانا۔ عموماً سب اور خصوصاً بھائی (تاج دین) برابر مُصر رہی۔ میں برسوں اس تاج بلند گوہر کے سلک محبت میں سرفراز رہا ہوں اور اخوت کے اثر نے ہم دونوں کو بے مبالغہ برادرانِ توام کی مثال بنا دیا ہی۔ خدا ہمارے بھائیوں کی تعداد میں ترقی دے ؎

بسکہ جانم یگانہ شد بادو
در گمانم۔ کہ ایں منم۔ یا او

اُس کا مقصد یہ تھا کہ یہ دفتر پُر حشو کسی شمار میں آجائے۔ میں کہتا تھا کہ لوگ اعتراض کریں گے۔ وہ کہتا تھا کہ دانا یہ دیکھ کر (جیسا کہ نام سے ظاہر ہی) کہ یہ بچپن کا کلام ہی اعتراض نہ کرے گا۔ نادان کے اعتراض کا لحاظ کیا! میں کہتا تھا کہ اس میں شتر گربہ (رطب و یابس) بہت ہی۔ اس کا جواب تھا کہ لوگ

---

[1] اشارہ بجانب سلطان ناصر الدین ۱۲ [2] اشارہ بجانب سلطان شمس الدین التمش ۱۲

اس کو تعویذ بنا کر موشک بازو (بازو کی چوہیا) پر باندھیں گے۔ غرض برادر موصوف کے اصرار سے اس مجموعہ کو یارانِ خوب شمائل کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ امید ہو کہ بہ طیب خاطر قبول فرمائیں گے۔

نظرے خوش گزرے

آپ نے دیباچہ کا خلاصہ ملاحظہ فرمایا۔ دیکھنے کے قابل یہ بات ہے کہ امیر خسرو کو کشور سخن کا تاج دار کس چیز نے بنایا۔ فطری مناسبت، کثرت مطالعہ، ولولۂ شوق، اصلی سبب تھے۔ سوسائٹی کا قابل ہونا، ہمسروں کی چھیڑ چھاڑ، بزرگوں کی نقادی و شفقت، یارانِ ہمدم کی ہمت افزائی، ان سے اُن اسباب کو قوت پہنچی۔ اور سب کے مجموعی زور نے تختِ خسروی پر جا بٹھایا۔ جب جوہر قابل بنکر دربار سلاطین میں پہنچے تو "خانِ شہید" شاہزادہ محمد سلطان پسر غیاث الدین بلبن سے مربی ملے جو خود سخن سنج و نقادِ فن تھے۔ قِرانُ السعدین میں امیر خسرو نے اپنی ترقی کا جو گر لکھا ہے وہ ہر راہروِ منزلِ کمال کے واسطے توشہ بن سکتا ہے

هر چه ستایش کنندم مرد هوش — گرچه بود راست نیارم بگوش
زانکه چو زیں فن بغرور اوفتم — ترسم ازیں مرتبه دور اوفتم
چرب زبانی بنود سودمند — طفل بود کش بفریبی به قند
آنکه شناسندهٔ ایں گوہرست — گر همه نفریں کندم در خورست

وانکه به تقلید نشست اندریں
نشنوم ار خود کندم آفریں

(رسالہ مخزن مورخہ ۱۰ مئی ۱۹۰۴ء)

غزل فارسی

حُسنِ اتفاق کا کرشمہ دیکھو۔ حکومتِ عرب سے عجم کا آزاد ہونا اور فارسی لٹریچر کا ادبِ عرب کی حکم رانی سے نکلنا ساتھ ساتھ ہوا۔ عجمی فرماں روا فتوحِ عرب کی روح کے حلقہ بگوش رہے۔ یعنی انھوں نے مسلمان رہ کر سلطنت کی۔ اسی طرح فارسی شاعری جانِ نظم عروض و قافیہ میں عربی شاعری کے تابع فرمان رہی۔ صورت کو چھوڑ کر معنی کو دیکھو تو متنبّیؔ اور خاقانیؔ اپنی بلند پروازیوں میں خیالات کے ایک ہی آسمان سے تارے توڑ کر صفحۂ کاغذ کو منور کرتے ہیں۔ دولتؔ شاہ نے اپنے تذکرے میں شعرائے فارسی کے دَور قائم کئے ہیں۔ مقدمہ میں متنبّیؔ وغیرہ شعرائے عرب کا ذکر کیا ہے اور اس طرح فارسی شاعری کی ابتدا کو عربی شاعری کی انتہا سے ملا کر سلسلہ مسلسل کر دیا ہے۔ فہم انسان کی نارسائی دیکھئے۔ جس چیز کے آغاز کی تلاش میں اٹھتی ہے انجام کار قیاس کی بھول بھلیوں میں سرگردانی اٹھاتی ہے۔ یہی حال فارسی شاعری کی ابتدا کا ہے۔ بہرام گور کا عالم سرخوشی میں پہلا مصرع کہنا، یعقوبؔ لیث کے چھوٹے سے بچے کی زبان سے موزوں مصرعے کا نکل جانا، ہٹے سے نشان ہیں جو پیک خیال کو منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا سکتے۔ قیاس کی مکر چاندنی سے نکل کر واقعات کی صبحِ صادق کے نور میں آؤ تو رودکیؔ کا دلکش ترانہ سامعہ نواز ہوتا ہے۔

اِس پُرشکوہ قافلہ کی قافلہ سالاری ابوالحسن[1] رودکی کی قسمت میں تھی۔ دربارِ سامانی کی عظمت کے جہاں اور ساز و سامان تھے وہاں ملک الشعراء رودکیؔ کا طمطراق بھی تھا جس کی جلو میں دو سو زرین کمر غلام چلتے تھے۔ قلندر مزاج شعراء اگرچہ ہمیشہ رودکیؔ کی شوکت کے خیال میں رہے لیکن یہ دلکش خواب پھر بہت ہی کم نظر آیا۔ ظاہر ہے کہ اس اوج موج میں مزاجِ خیال کے حوصلے قصیدے ہی کے میدان میں نکل سکتے تھے۔ ہجری چوتھی صدی کا آغاز رودکیؔ کا دور ہے۔ اس زمانہ سے سعدیؔ کے زمانہ تک (وفات

---

[1] ابوالحسن عبداللہ رودکی سمرقندی مادح امیر احمد نصر سامانی والی بخارا۔ وفات نصر سامانی ۳۳۱ھ ہجری

سعدی (۶۹۱ھ ہجری) قصیدے کا دور اور زور سمجھنا چاہیے۔ اس چار سو برس کے عرصے میں قصیدے نے نشو و نما کے مختلف مدارج طے کیے۔ بچپن سے لڑکپن، لڑکپن سے جوانی، جوانی سے کہولت، کہولت سے بڑھاپا۔ زندگی کی یہی منزلیں ہیں۔ یہی منازل قصیدے کو پیش آئیں۔ خاقانی[1] کا زمانہ (چھٹی صدی ہجری کا درمیانی حصہ) قصیدے کے شباب کا زمانہ تھا۔ دورِ شباب زور شور کا زمانہ ہے۔ اس وقت کے قصائد مبالغہ کے زور میں طوفان سے بھی بڑھ چڑھ کر ہیں۔ جوانی اور جنون کا ڈانڈا ملا ہوا ہے۔ شباب قصیدہ کی مداحی ستایش کا جنون ہے۔ ممدوح زمین پر ہے وہ آسمان پر بتا رہے ہیں۔ ہاتھ کے اشارے سے دکھاتے ہیں۔ کوئی نہ دیکھے تو ہاتھ سے اس کا منہ اوپر کو اٹھا دیتے ہیں۔ نہ مانے تو دلیل سے سمجھاتے ہیں، اس پر بھی نہ سمجھے تو ہجو سے سمجھاتے ہیں۔ سلح خانے کی چھت سے ہمیشہ چرخ ہفتم کے فرشتے تنگ رہے۔ اگر پیادہ اتنا اونچا نہ ہوتا تو فرخ و وزیرے کہاں رکھے جاتے۔ ڈربی کی گھوڑ دوڑ میں تیزی رفتار کا معیار سکنڈ اور منٹ ہیں۔ ہمارے شعراء کے ممدوحوں کے گھوڑے صدہا برس ہوئے اس ریکارڈ کو توڑ چکے ہیں۔ یہ چند منٹ اور سکنڈ میں "اسکائی ریس" (Sky race) کا دور پورا کرتے ہیں۔ وہ چشم زدن میں دورِ فلک سے باہر نکل جاتے ہیں۔ مبالغہ کے مضامین پر خواہ ہنسو خواہ سوسائٹی کے مذاق سے عبرت حاصل کرو لیکن شکوہِ کلام، قوتِ ادا، زورِ بیان اور روانیِ سخن کو دیکھ کر تم بے اختیار آفرین کہہ اٹھو گے۔ شباب کے بعد پیری ہے۔ پیری میں شباب کی باتیں خواب کی باتیں ہیں۔ مرزا غالب بہادر شاہ کی مدح میں وہی مضامین صرف کرتے ہیں جو عنصری نے سلطانِ محمود کی ستایش میں باندھے تھے۔ یہ خیال کا خواب نہیں تو کیا ہے۔ بیان میں سحر کی تاثیر ہے۔ غالب و قاآنی کی جادو بیانی قصیدے کے ناتواں جسم میں پھر روحِ جوانی پھونک گئی۔

قصیدہ جس قدر منجھتا گیا اسی قدر اس میں سے مغلق الفاظ، دشوار ترکیبیں، اور مشکل مضامین چھٹتے گئے۔ جہاں قصیدے کی سرحد غزل سے ملی ہے وہاں قصیدے کی صفائی غزل کی روانی سے ہمدوش ہے۔ شعراء کے چوتھے طبقہ میں کمال اصفہانی ہے جس کو دربارِ کمال سے "خلاق المعانی" کا خطاب ملا ہے۔ اس کے

---

[1] خاقانی شروانی وفات ۵۸۲ھ ہجری۔ ۱۲

قصیدے کی صفائی تیغ اصفہانی کے جوہر کو شرماتی ہے۔ اسی طبقہ میں غزل گویوں کے امام شیخ سعدی جلوہ فرما ہیں۔ اُن کا کلام کالملح فی الطعام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کا دیوان "شعرا کا نمکدان" کہلایا۔ صفائی کلام کے علاوہ غزل کے لئے شکستگی و خستگی بھی درکار ہے۔ جب غزل کے فروغ کا زمانہ آیا تو شکستگی و خستگی کے اسباب بھی پیدا ہو گئے۔ ساتویں صدی میں تاتار سے ایک سیلاب بلا اُٹھا جو عجم کو تاخت تاراج کرتا ہوا نکل گیا۔ یہ ایک قہر تھا جس نے سارے کارخانے درہم برہم کر دیئے۔ دربار لٹ گئے۔ تاجداروں کے سر کٹ گئے۔ گرمی ہنگامہ کافور ہوئی اور ہر طرف افسردگی چھا گئی۔ اس سے بہتر وقت غزل کے فروغ کے واسطے کون سا ہو سکتا تھا ؎

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

یہی زمانہ ہے کہ شیراز سے غزل کا ترانہ بلند ہوا۔ جس طرح ملکی سلطنت بدلی اُسی طرح کشورِ سخن کا انقلاب ہوا۔ خلافت کا چشم و چراغ مستعصم بغداد میں شہادت سے سرخرو ہوا۔ اصفہان میں کشور قصیدے کے تاجدار کمال اصفہانی کو سعادت شہادت نصیب ہوئی۔ عبرت کا تماشا دیکھو۔ جس قتلِ عام نے قصیدے کا تاج اتارا اُسی نے غزل کو تختِ اقبال پر بٹھایا۔ یہی تاتاریوں کا ہنگامہ تھا جس نے سعدی کی طبیعت میں افسردگی و شکستگی پیدا کی۔ اس طرح زوال قصیدہ اور کمالِ غزل ایک ہی سبب کے دامن سے وابستہ ہیں۔ سعدی کے سینے میں عشق کا سوز اور دماغ میں حکمت کا نور پنہاں تھا۔ سوزِ غزل کے پردے میں چمکا۔ حکمت گلستاں بوستاں میں جھکی۔

عام طور پر شیخ سعدی غزل کے مجتہد اول مانے گئے ہیں۔ تلاش اس کو غلط ثابت کرتی ہے۔ تقدم کا شرف خواجہ سنائی غزنوی کو حاصل ہے۔ خواجہ ممدوح دوسرے طبقہ میں ہیں۔ اُن کے معاصر خاقانی و انوری کی غزل قصیدے کا اُترا ہوا خاکہ ہے۔ لیکن خواجہ کی غزل میں وہ صفائی اور ملاحت ہے جو آگے چل کر حافظ اور سعدی کا حصہ ہو گئی۔

یہ ضرور ہے کہ سعدی سے پہلے غزل قصیدے سے دبی ہوئی تھی۔ شیخ کے زورِ طبع نے اُس کو اتنا

بلند کر دیا کہ اُس نے قصیدے کو دبا لیا۔ امیر خسرو نے سوز و گداز کو چمکایا۔ حسن دہلوی نے لطافت سے اُس کا حسن دوبالا کیا۔ سعدی کے بعد سلمان ساوجی اور عبید زاکانی باکمال قصیدہ گو گزرے ہیں انھوں نے قصیدے کو اُبھارا لیکن پھر اُس کا رنگ نہ جما۔ دولت شاہ نے سلمان ساوجی کے دَور کو غزل گو یوں کا دور لکھا ہے۔ قصیدے کے ساتھ ہی ساتھ مثنوی بھی عالم وجود میں آئی ہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ قصیدے کے عہد میں قصیدے سے اور غزل کے دور میں غزل سے دبی رہی۔ دَور اوّل میں اساتذہُ مثنوی فردوسی، سنائی، عطّار، خاقانی، مولنائے روم اور نظامی وغیرہ گزرے ہیں۔ دور ثانی میں سعدیؔ خسرو، جامی، خواجو، فیضی، ظہوری، زُلالی وغیرہ۔ مثنوی کا اشکال اس سے واضح ہوتا ہے کہ ابتدا سے انتہا تک مشکل سے تیس چالیس مثنوی گو ایسے نکلیں گے جو شہرت کے دربار میں باریاب ہوئے ہوں۔ حال آں کہ قصیدہ اور غزل کے استاد صدہا مشہور ہیں۔

ہم نے تفحص کے بعد غزل کے بارہ دور قائم کئے ہیں۔ ہر دور میں جن اساتذہ کا دَور دورہ رہا اول اُن کے نام تقدیم و تاخیر کی ترتیب سے لکھے ہیں۔ پھر ہر ایک کے کلام کا نمونہ دکھایا ہے۔ اور اپنی فہم ناقص کے مطابق ہر دور کی خصوصیتیں جتائی ہیں۔ خاتمۃ الباب شیخ علی حزیں ہیں۔ بنارس جا کر اُن کی قبر دیکھو۔ بیکسی کہہ رہی ہے کہ باغِ سخن کا بُلبل، زار نالیوں سے چور، حسرتِ بہار کو دل سے لگائے یہیں سو رہا ہے۔ پتھر کا دل ہوگا جو سنگِ مزار کے اشعار پڑھ کر بے تاب نہ ہو جائے گا۔ اشعار ؎

زباں دانِ محبت بودہ ام دیگر نمی دانم ۔۔۔ ہمیں دانم کہ گوشِ از دوست پیغامے شنید ایں جا

حزیں از پائے رہ پیما بسے سرگشتگی دیدم ۔۔۔ سرِ شوریدہ بر بالینِ آسایش رسید ایں جا

دلِ حزیں سے یہ مضمون غزل کا مرثیہ بن کر نکلا ہے۔ جو جوشِ جنوں صدہا برس فارس، عراق عجم، خراسان ماوراءالنہر اور ہندوستان کی خاک چھانتا رہا آخر ٹھنڈا ہو کر کاشی کی سرزمین میں خاک میں مل گیا۔ اگر یہ سچ ہے کہ بنارس میں قیدِ حیات سے آزاد ہونے والے پھر جنم نہیں لیتے تو مان لو کہ اب قیامت تک غزل فارسی اسی قبر کی مجاور رہے گی۔ ظاہری اسباب کی تیکھی چتون بھی یہی اشارہ کرتی ہے۔ لوحِ مزار کا آخری شعر اسی انجام کی خبر دے رہا ہے۔ شعر ؎

روشن شد از وصالِ تو شبہائے تارِ ما

صبحِ قیامت است چراغِ مزارِ ما

دَورِ اوّل - ابو الفرج رونی - منوچہری دامغانی - مسعود سعد سلمان -

دَورِ دوم - عبد الواسع جبلی - خاقانی شروانی - انوری ابیوردی - ادیب صابر - خواجہ سنائی غزنوی ظہیر فاریابی - سیف الدین اسفرنگی -

دَورِ سوم - نظامی گنجوی - شاپور نیشاپوری - خلاق المعانی کمال اصفہانی - پوربہائی جامی -

دَورِ چہارم - خواجہ فرید الدین عطار نیشاپوری - مولانا جلال الدین رومی - شیخ سعدی شیرازی - اوحدی مراغی - عراقی ہمدانی - ہمام تبریزی - امیر خسرو دہلوی - خواجہ حسن دہلوی - خواجو کرمانی -

دَورِ پنجم - سلمان ساوجی - حسن متکلم ناصر بخاری - خواجہ حافظ شیرازی - کمال خجندی -

دَورِ ششم - سید نعمت اللہ قدس سرہٗ - سید قاسم انوار قدس سرہٗ - خواجہ عصمت بخاری - کاتبی - شیخ آذری -

دَورِ ہفتم - شاہی سبزواری - امین ترلابادی - درویش قاسم تونی - طاہر بخاری -

دَورِ ہشتم - مولانا جامی - خواجہ آصفی - ہلالی استرآبادی - اہلی خراسانی - بنائی ہروی - سہیلی

دَورِ نہم - بابا فغانی شیرازی - لسانی شیرازی - میلی ہروی - غزالی مشہدی - وحشی یافقی - محتشم کاشی - ولی دشت بیاضی -

دَورِ دہم - نقی کمرہ - ملک قمی - ظہوری ترشیزی - شفائی اصفہانی - نظیری نیشاپوری - عرفی شیرازی فیضی اکبرآبادی - ثنائی مشہدی - شاپور طہرانی - طالب آملی - اسیر شہرستانی -

دَورِ یازدہم - صائب تبریزی - سلیم طہرانی - کلیم ہمدانی - صیدی طہرانی - شوکت بخاری - طاہر قزوینی فطرت مشہدی - عالی شیرازی -

دَورِ دوازدہم - (خاتمۃ الباب) شیخ علی حزیں لاہیجانی -

دورِ اوّل - ابوالفرج رونی - منوچہر دامغانی - مسعود سعد سلمان -

ابوالفرج رونی (مادح ابوعلی سیمجور تھا - جو قبل ظہور دولت سلطان محمود سلاطین سامانیہ کی طرف سے صوبۂ خراسان میں گورنر تھا - وفات ابوعلی سیمجور ۳۸۷ھ ہجری) ۔

بیا ای صنما بر دو پای بنشستی   دلم ز دست برون بردی و درون خستی
نه مست بودی و پنداشتم که چون مستان   همی به حیله شناسی بلندی و پستی
سه روز شد بیش از آن تا ز درد فرقت تو   نه هوشیاری دانم که چیست نه مستی
درست گشت که جانِ منی بدین معنی   که تا ز من بگسستی به من نه پیوستی
به جانِ جانان اگر تو بدستِ خویش دلم   چنانکه برده امروز باز نفرستی

وله

چه دلبری چه عیاری چه صورتی چه نگاری   نه گاه خلوت جفتی نه وقت عشرت یاری
بغمز عقل گدازی بجنگ چنگ نوازی   بوعده روبه بازی به عشوه شیر شکاری
چو بوسه خواهم زنگی چو صلح جویم جنگی   چه راست دانم لنگی چه خوست این که تو داری
نه سوزی و نه بسازی نه کاهی و نه فزائی   نه بندی و نگشائی - چه دیو دست سواری
شگفت یوسف رونی چرا نه یوسف خوئی   بلے قرینه رونی - ولیک گرگ بیاری

منوچہر دامغانی (سلطان محمود غزنوی کے زمانہ میں تھا) جلوس سلطان محمود ۳۸۷ھ وفات ۴۲۱ھ ہجری ۔

بار رخت ای دلبر عیار یار   نیست مرا جز غم تو بر دگر بار
دو رخ رخشان تو گلنار گشت   بر دلِ من ریخته گلنار نار
چشم تو خونخواره هر جادوے   مانده از آن چشمک خونخوار خوار
بنده هوادار و هواخواه تست   بنده هوا خواه وفادار دار
داد کن ای کودک و بردار جور   مهر بیش آر و بردار دار
ای تو دل آزار و من آزرده دل   دل شده آزار دل آزار زار

ولہ

اے باعدوے ما گزندہ زکوے ما — اے ماہ رشے شرم نداری زرشے ما
نامم نہادہ بودی بہ بدخواہ جنگجو — با ہر کسے ہمی گلہ کردی زخوے ما
جستی و یافتی دگرے بر مرادِ دل — رستی زخوے ناخوش و از گفتگوے ما
اکنوں بجوے اوست رواں آبِ عاشقی — آں روز شد کہ آب گزشتے بجوے ما
گوئید سرد تر بود آب از سبوے تو — گرم است آبِ ما کہ کہن شد سبوے ما
اکنوں کے بکام دلِ خویش یافتی — چندیں بہ خیرہ خیرہ چہ گردی بکوے ما

مسعود سعد سلمان جرجانی۔ (مادح سلطان محمود و مسعود و ابراہیم غزنوی) جلوس سلطان مسعود سنہ ۴۲۱ھ وفات سنہ ۴۳۲ھ۔ جلوس سلطان ابراہیم سنہ ۴۵۱ھ وفات سنہ ۴۸۱ھ ۵

آمد آہستہ با کرشمہ و ناز — دوش نزدِ من آں نگار طراز
زلف پُرتاب و پیچ بر شکستہ بگل — چشم پُرخواب سرمہ کردہ بناز
برنہادہ برابر دال چوگال — تیر غمزہ بچشم تیر انداز
گفتمش چوں روی بنومیدی — جنگ مانند ما ز کرد آغاز
اے نیازے مرا نیاز بہ تست — ور چہ دارد بمن زمانہ نیاز
من چو پرداختم بمہر تو دل — تو زمانے بوصل من پرداز

ولہ

اے سلسلۂ مشک فگندہ بقمر بر — خندیدہ لبِ پُرشکرِ تو بہ شکر بر
چوں قامتِ تو نیست سہی سرو خراماں — چوں چہرۂ تو نیست گل لعل ببر بر
چنداں غم و اندوہ فراز آمدہ در دِل — کاندوہ شدہ اندہ و غم یکدگر بر
دل شد سپر جاں ز نہیبِ مژۂ تو — تا چوں مژہ زخمے نزند آخر بہ جگر بر

تا ہجر نشستہ است بہ نزدیک تو ساکن — ایں وصل سراسیمہ بماندہ است بدر بر

بر تو گذرم رشتے بتابی ہی از من — گوئی کہ ندیدی تو مرا جز بگذر بر

من بر تو ہمی ہر چہ کنم دست نیابم — اے رشک قمر دست کہ یابد بقمر بر

ریویو

دورِ اوّل کے جن اساتذہ کی چند غزلیں ملیں درج کی گئیں، نمونہ انداز کے لئے کافی ہیں۔ عبارت و معنی دونوں پر غور کیجئے۔ مطلع ہی غزل کے کل شعر ہم قافیہ و ہم ردیف ہیں۔ مقطع نہیں۔ بندش اور الفاظ کی ترکیبِ لفظی صاف کہہ رہی ہے کہ قصیدہ گویوں کا کلام ہے۔ نزاکت و لطافت استعارہ و مجاز جو جانِ غزل ہی معدوم ہے۔ جوش و ولولہ اور سوز و گداز بھی نہیں۔ اِن صفات کے پیدا ہونے کے دو بڑے سبب ہیں۔ ایک تصوف، دوسرا سوسائٹی کا رنگ۔ تصوف اِن شعرا میں نہ تھا۔ سوسائٹی سپاہ کے نعروں اور ہتھیاروں کی جھنکار سے گونج رہی تھی۔ نزاکت کہاں باریاتی۔ سوز و گداز کو مصروفِ کارزار سپاہی زادہ کیا جانے۔ وہ لوگ سومنات کو دارالشرک ہونے کے لحاظ سے قابلِ فتح جانتے تھے۔ رہا اس میں سوز و گداز یا حسن کا جلوہ دیکھنا یہ نازک خیالی متاخرین کے حصہ میں آئی۔ غالب کہتے ہیں ؎

بہ سومناتِ خیالم در آے تا بینی
روان فروز بردوش ہاے زناری

ابوالفرج رونی اور منوچہری کی غزلیں پڑھ کر جب مسعود سعد سلمان کی غزل میں یہ شعر نظر آتا ہے ؎

زلف پُر پیچ بر شکستہ بگل
چشم پُر خواب سرمہ کردہ بناز

تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک چٹیل میدان کے بعد کوئی سبزہ زار آنکھوں کے سامنے آگیا۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ استعارہ و تشبیہ و لطافت غزل کے واسطے کہاں تک ضروری ہے۔ مسعود کا زمانہ سلطان ابراہیم بن مسعود کے عہد تک رہا۔ یہ عہد بمقابلہ سلطان محمود و مسعود کے آسائش کا عہد تھا۔ سلجوقیوں سے صلح ہو گئی تھی۔ ابراہیم کے حوصلے اتنے بلند نہ تھے جو محمود و مسعود کی طرح سوسائٹی میں تلاطم برپا رکھتے۔ غالباً اسی

آسایش دامن کا رنگ مسعود سعد سلمان کی غزل میں جھلک رہا ہے۔

خلاصہ یہ کہ ایک مصروفِ کارزار سوسائٹی کو جس قدر سوز و گداز و محبت کے مضامین پر غور کرنے کی فرصت مل سکتی ہے اُسی قدر سرمایہ اس دور کی غزل میں ہے۔ ان غزلوں کے انداز سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دشتِ قفچاق کا سیدھا سادہ ترکمان اپنے محبوب سے بات چیت کر رہا ہے۔ مضامین کو دیکھو تو سمجھ جاؤ گے کہ جو مضامین غزل کے لئے روحِ رواں ہیں وہ اُس عہد میں پیدا ہو چکے تھے۔ معشوق کی جفاکاری، بیوفائی، وعدہ خلافی، مست ناز ہونا، رقیبوں کے ساتھ اختلاط، عاشق صادق سے بیگانگی، ہرجائی ہونا، فراق کے ستم، وصال کی آرزو، سوزِ عشق، عشاق کی وفاداری، اخلاق آزردگی، خستگی، انتظار، زمانہ کی دشمنی، اشک باری، جامہ دری، بے صبری، زرد روئی ان کی آنکھ کی تشبیہ ابر سے چشم معشوق کی خونخوارگی، بدمستی، پُرخوابی، جادوگری، تیر افگنی، بیماری، مژگاں کی تیراندازی۔ ابرو کی کمان و چوگان سے تشبیہ۔ رخ کی تشبیہ گل لالہ و ماہ سے لب کی صفات: پر شکر۔ لب لعل مثل شراب (مرجان) ہونا زلف کے اوصاف: مشک و عنبر و قیر۔ نامۂ گنہگاراں[1]۔ آشفتگی۔ پُرپیچ۔ قد کی سرو سہی سے۔ رفتار کی کبک دری سے۔ معشوق کے خطاب۔ تُرک، نگار، کودک، پسر، دوست، لعبت، بُت، صنم، صفاتِ معشوق: کمر بستہ ہونا، دلبر، عیار، حور لقا، نازنین، پری رو، سیم ذقن، پستہ لب، بنفشہ مو، سوار۔ (قاصد کبوتر، باز۔

آج لوگ ایشیائی شاعری کے مضامین کو اَن نیچرل (Unnatural) بتاتے ہیں۔ تم اوپر کے مضامین کو غور سے دیکھو۔ عہد محمود و مسعود کا تصور باندھو۔ خراسانیوں کی افتادِ مزاج اور رسوم پر نگاہ ڈالو۔ غزنین اور خراسان کی جغرافیائی حالت سوچو پھر انصاف سے کہو کہ ان میں کون سی بات اَن نیچرل ہے۔

جب معشوق کی نگاہِ گرم دل میں زخم پیدا کر دے تو ایک جنگجو جو رات دن تیر و شمشیر کے زخم لگاتا کھاتا رہا ہو اُس حالت کو تیغ زنی و تیر افگنی سے بڑھ کر کس پیرایہ میں بیان کر سکتا ہے۔ وہ

---

[1] دیکھو زلف کی تشبیہ "نامۂ گنہگاراں" سے کیا اشارہ کر رہی ہے۔ ۱۲

بنفشہ کا پیچ و تاب، کبک دری کی مستانہ خرامی، سرو کی راستی، گل ولالہ کی رعنائی رات دن دیکھتے رہتے تھے۔ پھر اگر ان چیزوں کو وہ اپنے کام میں لائے تو قانونِ فطرت کی رو سے کس جرم کے مرتکب ہوئے۔ درباروں کا شکوہ، مشک و عنبر، مرجان وغیرہ تکلف کے سامان ہمہ وقت پیش نظر رکھتا تھا انھوں نے ان کا نام لیا تو کیا برا کیا۔ اصل یہ ہے کہ خود ہماری نیچر بدل گئی۔ اس کا کوئی علاج نہیں۔ اس دور کا کلام جہاں تک ہم نے دیکھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حسبِ ذیل مضامین اس وقت تک غزل میں نہیں آئے تھے۔

واعظوں پر پھبتیاں، امورِ دین کا استخفاف، معجزات کی بے ادبی، مے و میخانہ، دیر و بتخانہ، لوازم آتش پرستی، بلبل و گل، شمع و پروانہ، انداز و ادا، لب کی صفت میں آب حیات و زندگی بخشی۔ آنکھ کی تعریف میں قاتل و کشتن خط و خال وغیر ذالک۔

یہ دور غزنین و بخارا میں گزرا ہے جو فقہ وغیرہ علوم دینیہ کے اور علماء کے اثر کے مرکز تھے۔ سلطان محمود و مسعود کے حالات پڑھو۔ تو معلوم ہوگا کہ دونوں پر علماء کی صحبت کا کیا اثر تھا۔ اس حالت میں جو باتیں خلافِ دین تھیں وہ بآسانی قلم سے نہیں نکل سکتی تھیں۔ گل و بلبل چمنستانِ غزل میں آنے کے لئے غالباً بہار شیراز کا انتظار کر رہے تھے۔ شمع و پروانہ بزم عیش و عشرت کے لوازمے ہیں۔ میدان جنگ میں عیش و عشرت کہاں۔ لب کی حیات بخشی آنکھوں کا قاتل ہونا۔ نزاکت و لطافت کے جوہر ہیں جو متاخرین کی جانکاہیوں سے چمکے۔ دورِ اول میں ان مضامین کا نہ ہونا ہماری شاعری کی حد درجہ نیچرل ہونے کی دلیل ہے۔

(رسالہ اردوئے معلی کانپور جلد ۲ نمبر ۶
ماہ جون سنہ ۱۹۰۴ء)

اُردو غزل

اُردوئے معلیٰ کے گزشتہ نمبر میں (اُردو) غزل گوئی پر ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ مجھ کو اُس کے اُس حصے سے بالکل اتفاق ہے کہ غزل نظم کا ایک ضروری جزو ہے اور جو لطف وہ اپنی نوعیت خاص سے دل کو بخشتی ہے وہ قطعہ یا مثنوی یا قصیدے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ غزل کو ایک ایسی کیاری تصور کیجئے جس میں رنگ رنگ کے خوشنما پھول کھلے ہوئے ہوں اور ہر پھول کی دلفریبی دامن دل کو اپنی طرف کھینچتی ہو۔ جو لطف خاص ان کیاریوں کے دیکھنے سے حاصل ہوگا وہ اُن کیاریوں کے نظارے سے حاصل نہیں ہوگا جن میں ایک ہی طرح کے پھول ہوں۔ تفنّن انسان کی زندگی کو گوارا رکھنے کا ایک ذریعہ ہے۔ کیا نئے مفتی یہ فتویٰ صادر کریں گے کہ میز پر بس ایک قسم کا کھانا مہمانوں کے سامنے لایا جائے۔ کیسا ہی مزیدار کھانا ہو۔ دو وقت متواتر کھلا کر مہمانوں کے چہرے دیکھئے کہ میز پر وہ شگفتگی و رغبت سے آتے ہیں یا بددلی اور افسردگی کے ساتھ۔

جس طرح فارسی شاعری کی ابتدا عربی شاعری کی انتہا سے جا ملی ہے اسی طرح ابتدائے اُردو شاعری انتہائے فارسی غزل سے ہمدوش ہے۔ شیخ علی حزیں اور میاں ولی کا ایک زمانہ ہے۔ اگلے اساتذۂ اردو کبھی کبھی طرح بھی فارسی غزل کی انتخاب کرتے تھے۔ مثلاً:

(فارسی) ؎ مے گرفتیم بجاناں سرراہے گاہے — او ہم از لطف نہاں داشت نگاہی گاہے

(اردو) ؎ سرسری اُن سے ملاقات ہے گاہے گاہے — محفلِ غیر میں گاہے سرِ راہے گاہے

اُس زمانے کے اُردو کے اُستاد اردو فارسی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اکثر متقدمین (بلکہ بعض متاخرین) نے اردو فارسی دونوں دیوان مرتب و مدوّن کئے۔ اس اختلاط اور ربط وضبط کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ فارسی غزل کی پیروی اردو غزل کرے۔ اور شیراز و اصفہان کے ترانوں کی صدا دہلی اور لکھنؤ کے مشاعروں میں گونجے۔ تم اُردو شعرا کی نکتہ سنجی اور قوت بیان کی جس قدر

چاہو تعریف کرو لیکن اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ وہ علم و فضل میں کامل نہ تھے۔ اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ اُن کے دماغ ایسے زبردست اور پُرقوت نہ تھے کہ ایجاد و اختراع پر قادر ہوتے۔ ایجاد کا دروازہ بند تھا تو تقلید کی شاہ راہ کھلی ہوئی تھی۔ جو مضامین انھوں نے فارسی غزل میں دیکھے انھیں کو علوم متعارفہ قرار دے کر اُردو غزل کی شکل پیدا کی۔ غزل میں چار چیزیں ہو سکتی ہیں: مضمون، خیال، زبان، طرزِ ادا۔ اُردو غزل میں مضامین قریباً فارسی غزل کے ہیں۔ خط و خال، زلف و کمر، ناز و کرشمہ، وحشت و افسردگی شکستگی و خستگی، شمع و پروانہ، بلبل و گل، قیس و لیلیٰ اور فرہاد و شیریں۔ یہ تمام مضامین فارسی غزل کے ہیں۔ اور اردو غزل کی بساط بھی اتنی ہی ہے۔ خیال کی ترقی اور وسعت، قوتِ دماغ کے تابع ہے جو ممارستِ علوم سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ معلوم ہے کہ ممارستِ علوم اردو شعرا کے حصے میں نہیں آئی۔ لہذا قوتِ خیال کے کرشمے اُردو غزل میں بہت کم ہیں۔ اب صرف دو چیزیں رہ گئیں۔ ایک زبان دوسرے طرزِ ادا۔ بس انھیں دو میدانوں میں اردو کے جوہر کھلتے ہیں اور حق یہ ہے کہ اُن کی آب و تاب دیکھ کر جوہری حیران و ششدر رہ جاتے ہیں۔ میر و مرزا سے لیکر ذوق و اسیر تک بلکہ داغ و امیر تک نظر ڈالو وہی خیال و مضمون پاؤ گے۔ فرق ہے تو زبان اور طرزِ ادا کا۔ ایک ہی خیال و مضمون پر سوسائٹی کے تغیر سے جو اثر پڑا ہے وہ البتہ مختلف طبقوں میں محسوس ہوتا ہے۔ مثلاً مصحفی و جراءت کے یہاں مستی اور رندی پاؤ گے۔ متاخرین کے یہاں نہیں ہے۔

فارسی غزل کو دیکھو۔ مضامین اُس میں بھی قریباً متحد ہیں لیکن یہاں سے وہاں ایک بات زائد ہے، یعنی خیال۔ اس خیال کی نیرنگی نے غزل فارسی کو ایک ایسا شاہدِ رعنا بنا دیا ہے جس کے جلووں کی انتہا نہو۔ جب دیکھو ایک نیا جلوہ دیدہ افروز ہوگا۔ اور پہلا جلوہ دوسرے سے اتنا ممتاز ہوگا کہ یہ سمجھنا مشکل ہو جائے گا کہ آیا یہ وہی آفتِ روزگار ہے جو پہلے جلوہ گر تھا یا اور ہے۔ مولانائے روم، عطار، سعدی خسرو، حافظ، فغانی، شفائی، نظیری، عرفی، ملک قمی، ظہوری، طالب آملی اور حزیں کے کلام کو غور سے دیکھو تو صاف صاف عیاں ہو جائے گا کہ ہر چند یہ سب (باعتبار سخن) ایک ہی آسمان کے تارے ہیں لیکن اُن کے بروج و منازل ایک دوسرے سے اس قدر بعید و متفاوت ہیں کہ گمان ہوتا ہے کہ ع

ہر یکے را آسمانے دیگر است

ایک کی روشنی کا رنگ دوسرے سے اتنا ممتاز ہی کہ ہر ایک کو دیکھ کر بے ساختہ زبان سے نکلتا ہی کہ یہ نیا رنگ ہی۔ یہ خیال کی وسعت و نیرنگی اُن کے علم و فضل کا کرشمہ تھا۔ شفائی کے کمال فلسفہ کو میر باقر داماد نے مانا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا سند ہو سکتی ہی۔ پچھلی چند صدیوں میں بہت کم فضلا ایسے ہوئے ہونگے جو ملّا جامی کے ممنونِ احسان نہ ہوں۔ سعدی کے کمال کا سلسلہ اُس سرچشمہ تک پہنچتا ہی جو لبِ دجلہ علوم کے دریا بہا رہا تھا یعنی نظامیہ بغداد۔ علیٰ ہذا القیاس غزل فارسی میں جس چیز نے شورِ محشر برپا کر رکھا ہی وہ تصوف ہی۔ فارسی غزل گویوں میں بہت سے باکمال ایسے ہوئے ہیں جن کے سینوں میں عشقِ حقیقی کی آگ شعلہ زن تھی۔ یہ شعلے جب منہ سے باہر آئے غزل کہلائے۔ خواجہ سنائی، مولانائے روم، شیخ عطار، شیخ نعمت اللہ ولی، سید قاسم انوار قدس سرہم وہ بزرگ ہیں جو بزم اُنس اور انجمن سخن دونوں کے صدر نشیں تھے۔ ان سے نیچے طبقے میں باعتبار تصوف سعدی، خسرو جامی وغیرہ ہیں۔ ایک طبقہ وہ تھا جو (بظاہر) اہلِ باطن نہ تھا لیکن قوتِ خیال کی مدد سے تصوف کے جوہر اپنے کلام میں چمکا گیا مثلاً نظیری۔ کملائے اُردو میں میر درد علیہ الرحمۃ ایسے گزرے ہیں جو عشقِ حقیقی کے لذت چشیدہ تھے۔ ورنہ بہت سے ایسے تھے جن کو غالباً عشقِ مجازی سے بھی مناسبت نہ تھی۔

فارسی غزل کو جس پایہ کے مربی ملے وہ اردو کو کہاں نصیب ہوئے۔ میر علی شیر اور مرزا عبدالرحیم خانخاناں تو بہت اعلیٰ مثالیں ہیں کم و بیش ہر ایک دربار باقاعدہ مربی فن تھا۔ عہد محمود سے زمانہ شاہجہاں تک ملک الشعرا دربار کا ایک باضابطہ رکن نظر آتا ہی۔ فرمانروا کا اثر شعرا کے دماغ پر کیا پڑتا تھا اُس کو دیکھنا چاہتے ہو تو فیضی، طالب آملی، کلیم ہمدانی کو دیکھو۔ اکبر کی جامعیت، جہانگیر کی رنگینی، شاہجہاں کے زہد کا جلوہ ان کے کلام میں دیکھ کر تم پہچان لوگے کہ کون کس کے دربار کا ملک الشعرا تھا۔

اُردو شاعری کو مربی نہ دلی میں ملا نہ لکھنؤ میں۔ دربارِ دہلی میں سخنوری تھی، حوصلہ پیدا کرنے کا ساز و سامان نہ تھا۔ دربار لکھنؤ میں دولت تھی دماغِ سخن نہ تھا۔ کملائے سلطنت کے زمانے میں شاعر کامل فن (شیخ ناسخ) دشتِ غربت کی خاک چھانتا پھرا۔ البتہ دونوں جگہ کی سوسائٹی میں جان تھی۔ جو کچھ ہی اسی کی

برکت ہی۔ دربار باندہ اور رامپور بھی کچھ جھلک دکھا گئے۔ لیکن تربیتِ فن کچھ اور ہی اسباب چاہتی ہی۔ حیدرآباد (خدا اُس کو آباد رکھے) غالباً اس غرض کے واسطے موضوع نہیں ہوا۔

قصہ مختصر اسباب جو کچھ ہوں غزل اُردو میں خیال بہت ہی محدود اور کمزور ہی اور اُس کو وسعت اور ترقی دینے کی اشد ضرورت ہی۔ یہ کیا ضرور ہی کہ جو غزل اُردو لکھے وہ پریشاں روزگار، خمیدہ کمر، دیوانہ، افسردہ دل، زندگی سے بیزار، ہجراں نصیب ہی ہو۔ یہ کیا فرض ہی کہ جس پر اُردو شاعر فریفتہ ہو وہ زمانے بھر کا عیار، ازلی ظالم، بیوفا، ہرجائی، غرض صفاتِ مذمومہ کا مجموعہ ہو۔ کیا سخن سرائی زلف کے پیچ و خم اور دہن کے عدم میں ایسی گم ہوگئی کہ اب اُس کو وہاں سے نکلنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ اگر ہجراں میں لذتِ درد ہی تو کیا وصل میں لطف و نشاط نہیں۔ پھر کیوں اُس کو برباد ہی رکھا۔ کیا لازم ہی کہ جب صبح ہو تو قیامت ہی آئے۔ کیا وہ صبح عالمِ امکان میں نہیں جو سرورِ وصل سے سرشار دماغ پر جلوہ گستر ہو۔ کیا واجب ہی کہ ہم بھی وہی ادائیں دیکھیں جو اُن آنکھوں کو نظر آئیں جو ایک سانس میں بارہ سو سے زائد ڈنڑ پیلتے تھے۔ کیا شیخ جی کی پگڑی اُتار کر دھول جمانے کے سوا اور کوئی دل لگی دنیا میں نہیں ہی جو ہم بھی طبیعت کو خوش کرنے کے واسطے شیخ ہی جی کی تلاش کرتے پھریں۔

خلاصہ کلام۔ خیال کو تقلید کے دائرہ تنگ سے نکالنا چاہئے۔ جو جس عالم کا جلوہ دیکھے اُسی کا جلوہ دکھائے ہاں۔ آزادیِ خیال کے یہ معنی نہیں کہ گھوڑے کی لگام اُتار کر اُس کو چھوڑ دو کہ بادلوں کی طرح بھاگتا پھرے بلکہ یہ مطلب ہی کہ جس طرح استاد چابک سوار کی تعلیم کے بعد گھوڑے اپنی اپنی رفتار کے جوہر دکھاتے ہیں اسی طرح تربیت آشنا اور با مذاق خیالوں کو اپنا اپنا رنگ دکھانے کی اجازت دو۔ یہ اصرار مت کرو کہ بڑے میاں سر ہلاتے ہوئے قدم قدم گھوڑے کو لے گئے تھے لہٰذا ہم بھی اُسی ہیئت کذائی سے اُسی راستے پر انھیں کے نقشِ قدم پر چلائیں گے۔ روشِ رفتار سیکھو اُن سے چلو اُن میدانوں میں جو تمہاری نگاہ کے سامنے ہیں "پاے مرا لنگ نیست ملکِ خدا تنگ نیست"۔

شعرائے فارسی کو جو موقع وسعتِ خیال کے ملتے گئے اُن سے وہ خوش اسلوبی کے ساتھ نفع اٹھاتے رہے۔ عہد غزنوی و سلجوقی کی معرکہ آرائیوں کی یادگار تیغ چشم۔ کمان ابرو۔ تیر نظر۔ ترک چشم فارس میں

کی دلفریبیوں کی بلاد، گلزار کے تازیے، میخانے کے لوازمے، آتشکدوں کے پرکالے، ترسازادہ، مغبچہ، ہندوستان کا خراج، بت کدہ، بیت و صنم، برہمن، سومنات، زنّار، پرشگال، ستی، ہندو۔ خیال شاعری کی قوت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ایک دوہاتھ کا ڈورا (زنار) کیسے کیسے دلکش و دلفریب تماشے دکھلا گیا۔

جب یہ حالت اساتذۂ فارسی کی رہی تو کیا وجہ کہ ہم اس عمدہ صفت میں اُن کی پیروی نہ کریں۔ جو میدان مغربی روشنی نے ہم کو دکھائے ہیں کیا وجہ ہے کہ اُن کے گل بوٹے سے ہم کاشانہ ادب کو آراستہ نہ کریں جب کہ باغوں میں صدہا پھول دلربایانہ انداز دکھلا رہے ہیں تو کیا سبب کہ ہم دامن خیال میں گل و یاسمن اور لالے کے سوا اور کوئی پھول چن کر نہ رکھیں۔ گلاب جب ایک ہزار رنگ میں جلوہ فرما ہے تو ہم کیوں صرف گل سُرخ کے بلبل بنے رہیں۔

اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ ہمارے غزل گو بھاکھا کے لٹریچر سے واقفیت حاصل کریں اور اُس کے مضامین لطیف کو سلیقہ اور تمیز کے ساتھ اُردو میں لائیں۔ بھاکھا میں محبت کے بعض مضامین ایسے لطیف اور پاکیزہ ہیں کہ ذوق سلیم کو آئینہ حیرت بنا دیتے ہیں۔ تصوف کی روح اُردو غزل میں پھونکنی چاہیئے۔ جو دل و دماغ امیں بادۂ مردافگن سے سرشار نہ ہوں وہ خواجہ میر درد، شاہ نیاز احمد صاحب اور شاہ تراب علی صاحب کے دیوان دیکھ کر جوش بیان و خیال کا سبق سیکھ سکتے ہیں۔ لیکن یہ یاد رہے کہ توکل و قناعت وغیرہ کے وہ مضامین جو قال میں آکر آدمی کو نکما کر دیتے ہیں اور اپاہج بنا دیتے ہیں ہرگز مسائلِ تصوف نہیں۔ اُن سے احتراز چاہیئے۔

ایسے مضامین اور الفاظ سے پرہیز لازم ہے جن سے امرد پرستی کا رنگ جھلکتا ہو۔ فارسی اور اردو غزل کا کروہ وہ حصہ ہے جو مضامین امرد پرستی کا جلوہ دکھلاتا ہے۔ رقابت کا مفہوم بھی جہاں تک ممکن ہو کم کرنا چاہیے۔ اس کی لے اس قدر بڑھ گئی ہے کہ بے حمیتی کے درجے تک پہنچ گئی ہے! ایک اور حصہ ہے جو قابل حذف ہے یعنی شکایت زمانہ، آسمان کو گالیاں دینا، اپنی حالت کو یاس کے مرتبے میں خوار و خستہ ظاہر کرنا۔ یہ مضامین جوہر مردانگی کو مٹاتے اور دلوں میں افسردگی پیدا کرتے ہیں۔ اور

اس زمانے میں جب کہ دلوں کو ابھارنے اور ان میں امنگ پیدا کرنے کی شدید ضرورت ہی بالخصوص ان مضامین کو یک قلم قلم زد کر دینا واجب ہی۔ وہ مضامین بھی جن سے انبیا کی توہین اور معجزات کی تحقیر ہوتی ہی ضرور ترک کر دینے کے لائق ہیں۔ یہ مضامین دل میں سوء ادب اور بدزبانی کی خصلت پیدا کرتے ہیں۔ اور اس طرح انسان ایک عمدہ صفت ادب سے محروم ہو جاتا ہی۔

آخر میں یہ کہہ دینا ضرور ہی کہ زبان اور اصول نظم میں ہم کو اساتذۂ فن کی تقلید لازمی طور پر کرنی چاہئے اور جو زحمت اس میں ہو اُس سے بچنے کے لئے فضول حیلے نہیں تراشنے چاہئیں۔ انتخاب مضامین اور ان کو ادا کرنے میں ذوق سلیم اور خوش اسلوبی سے کام لینا چاہئے۔ یہ نہ ہو کہ خس و خاشاک کا انبار چمنستانِ غزل میں کر دیں، اور اُس کی مزخرف صورت دیکھ دیکھ کر محض اس خیال سے خوش ہوں کہ ایک نئی شکل نکل آئی۔ فقط

(رسالہ اُردوئے معلّی کانپور
جلد ۳ نمبر ۲ ۔ ماہ اگست ۱۹۰۴ء)

ریڑی ضلع مین پوری

شکوہ آباد ضلع مین پوری کی تحصیل ہیں جمنا کا کنارہ خوبی منظر اور حسن سواد کے اعتبار سے نظر فریب عالم رکھتا ہی۔ لطف شکار اُس کی دلچسپیوں کو دوبالا کر رہا ہی۔ اُس شعر کا لطف نہیں بھولتا، جو وہاں سے ایک عزیز نے دعوت شکار کے عنوان پر لکھ بھیجا تھا ؎

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ برکف
بامید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد

سورے کا انتظار اور متعدد عدون کا تمنا دوسرا مصرع کس خوبی سے ادا کر رہا ہی۔ صدہا برس سے بارش کا پانی کنارہ مذکور کی چھاتی پر آرے چلا رہا ہی جن کے اثر سے ہزاروں چاک اُس کے سینے پر نظر آتے

ہیں۔ اس طرح جو نشیب و فراز پیدا ہوا ہی اُس نے کناروں کو پہاڑوں کا نمونہ بنا رکھا ہی۔ ان کھڈول
میں چکارہ ہرن کا چڑھنا اُترنا وادیوں میں دلآویز رفتار سے دوڑنا نظم کی جیتی جاگتی تصویر ہی۔
گزشتہ سرما کے چند روز میں نے اس میدان کے شکار میں صرف کئے ایک روز چکارہ اور لومڑی کی
تلاش صحرا نوردی و بادیہ پیمائی میں مشغول کئے ہوئے تھی کہ ایک ایسا منظر نظر کے سامنے آگیا جو اپنی
نوعیت میں گرد و پیش کے عالم سے بالکل ممتاز تھا یعنی رفیع الشان عمارت کے کھنڈر دور سے نظر آنے
لگے۔ نگاہ کے ساتھ دل اُن کی طرف متوجہ ہوا اور توجہ نے استفسار حال کیا۔ معلوم ہوا کہ قصبہ ریڑی ہی۔ یہ
سن کر شکار کے خیالات دماغ سے جدا ہونے لگے اور اُن کی جگہ شوق آثار قدیمہ لینے لگا۔ موقع پر پہونچکر
ایک وسیع قبرستان ملا جس میں صدہا سنگین اور پختہ قبریں بنی ہوئی تھیں، شہر خاموشاں کا سکوت اور
وقار ہمیشہ دلوں پر اثر کرتا ہی۔ لیکن ان کے سکوت کی تاثیر گرد و نواح کے سناٹے کے ساتھ مل کر بہت
زیادہ قوی ہوگئی تھی۔ قیامت یہ کہ اُن کی خاموشی صدائے صبر آزمائی دے رہی تھی۔ قبروں کی حالت،
سنگ مزار کی صفائی و موزونی کہتی تھی کہ ہم ذی مرتبہ لوگوں کی آرام گاہ ہیں۔ مگر گم ناموں کے نام
پوچھو تو خاموش۔ بیسیوں قبریں دیکھیں، کتبہ اور کتابہ نام کو نہ ملا۔ آخر نگاہ شوق اُس احاطے کی طرف
بڑھی جو وسط گورستان میں بنا ہوا ہی اور جس کے اندر کے گنبد گویا صلائے زیارت دے رہے تھے۔
شوق اس خیال سے بیچین ہوا کہ اس میں ضرور بے نشانوں کا نام و نشان ملے گا۔ وہاں پہنچکر دیکھا
کہ ایک وسیع احاطہ قبروں سے معمور ہی غربی حصے میں دو سنگین روضے بنے ہوئے ہیں۔ ان کی جالیاں
سنگ سرخ کی ہیں اور گنبد گچ کے گنبدوں کا بھاری پن اُس طرز عمارت سے ملتا ہوا ہی جو عہد مغلیہ سے
پیشتر مسلمانوں میں رائج تھی۔ جالیوں کے نفیس جال اور بیل بوٹے سنگ تراشی کے عمدہ نمونے ہیں،
ہر ایک گنبد کے نیچے دو یا تین پختہ قبریں ہیں۔ شرقی روضے کی پشت پر جنوب کی جانب پختہ فرش پر
قبریں ہیں۔ منجملہ اُن کے ایک قبر کا اعتقاد سب سے زیادہ دلوں کو گرویدہ کئے ہوئے ہے نا کامی یا مایوسی
بن گئی جب یہاں بھی لب گور پر مہر سکوت دیکھی، یعنی با ایں ہمہ اہتمام لوح مزار نقش مدعا سے سادہ تھے
فاتحہ پڑھی اور مایوس باہر نکل آیا۔ نکلتے نکلتے ایک پختہ دیوار نظر آئی، جا کر دیکھا تو عیدگاہ کا قبلہ رخ

پردہ تھا۔ اُس وقت کی مسرت بیان کے امکان سے باہر ہے جب اُس دیوار پر بڑا سا سنگین کتبہ نظر آیا۔ خط کی کشتگی اب بھی شوق کی سد راہ تھی۔ آخر اینٹوں کے ایک انبار پر چڑھ کر ٹنکا رپارٹی نے پڑھنا شروع کیا۔ کسی لفظ کو کوئی نکالتا تھا اور کسی لفظ کو کوئی۔ جب کوئی مشتبہ لفظ صاف ہوتا تو ایک نعرۂ مسرت بلند کیا جاتا، بالآخر سارا کتبہ پڑھ لیا گیا کوشش کا پھل ذیل کی عبارت ہے:۔

"بنائے این بقعہ شریف بتوفیق یزدانی و تائید سبحانی و فضل ربانی در عہد خلافت سکندر الثانی علاء الدنیا والدین المخصوص بعنایت اللہ رب العٰلمین ابو المظفر محمد شاہ السلطان ناصر امیر المومنین و نوبت ایالت بندہ کمینہ خدائے گانی کافور سلطانی یقبل منہم و احسن اللہ جزاہم فی المنتصف من شہر المبارک رمضان اعظم اللہ حرمتہ سنۃ احدیٰ عشر و سبعمائۃ (۷۱۱ھ)"

اس عبارت سے واضح ہوگا کہ چھ سو گیارہ برس ہوئے سلطان علاء الدین خلجی کے عہد میں اُس کے سربرآوردہ امیر ملک کافور (فاتح دکن) نے یہ عیدگاہ بنوائی تھی سارا حصہ فنا ہوگیا، یہ دیوار قائم ہے بارش کے ہزاروں حملے اُس پر ہوئے ہیں، تاہم وہ قدم جمائے میدان میں کھڑی ہے پلاستر اکثر جگہ سے اُکھڑ گیا ہے۔ مگر کسی اینٹ نے اپنے موقعہ سے جنبش نہیں کی گردن پر نیلی چینی کی تختیاں لگی ہیں اُن کے نیلے رنگ کی آب و تاب صاف کہہ رہی ہے کہ کاریگر نے ابھی ہاتھ اٹھایا ہے۔ عیدگاہ نے تو دل خوش کیا لیکن روضوں میں آرام کرنے والوں کے حال پر سے پردہ نہ اُٹھا۔ رپڑی والوں سے پوچھا تو جوش خوش اعتقادی بہت کچھ ظاہر کیا لیکن حال اس سے زیادہ نہ کہہ سکے کہ پختہ فرش والی قبر فتا شاہ کی ہے۔ باقی رہا یہ امر کہ وہ بزرگ کون تھے، کب تھے، کس سلسلے کے تھے، یہ کچھ نہ کھلا۔ یہاں سے چلے آنے پر بھی تلاش کی خلش دل میں رہی کتابیں دیکھیں واقف کاروں کو خط لکھے ٹھیک پتہ نہ چلا جوئندہ یا بندہ۔ پانچ مہینے کی تلاش کے بعد ایک بزرگ سید علیم الدین صاحب امام آستانہ سلطان نظام الدین اولیا دہلی کی توجہ سے حال معلوم ہوا اور جیسا دل چاہتا تھا ویسا ہی معلوم ہوا۔

جن بزرگواروں کے وہ مزار ہیں اُن کا اصل مسکن برناوہ ضلع میرٹھ تھا۔ وہاں کے ایک بزرگ علاؤ الدین چشتی نے اگلے زمانے میں "چشتیہ بہشتیہ" ایک کتاب لکھی ہے۔ اس میں رپڑی کے مزاروں کا

حال بھی درج ہے، اُس کی عبارت فارسی کا خلاصہ متعلق مقام یہ ہے:

مخدوم شیخ بدرالدین صاحب ولایت حضرت ابوایوب انصاری کی اولاد میں ہیں جو جلیل القدر صحابی تھے۔ یہ حضرت نصیرالدین چراغ دہلی کے خلیفہ تھے، سو برس سے زیادہ عمر پاکر ؁ ہجری میں رحلت کی۔ ان کا مزار برناوہ کے متصل ہینڈن ندی کے کنارے پر ہے۔ اُن کے صاحبزادہ نصیرالدین بزرگ تھے۔ یہ اپنے والد کے خلیفہ اور مرید ہیں۔ ۱۱ ذی الحجہ روز یکشنبہ کو ۸۴۹؁ ہجری میں ان کا انتقال ہوا۔ شیخپورہ رایڑی کے مزار میں ان کی قبر بڑے سنگ سرخ کے گنبد کے نیچے ہے۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ علاءالدین عرف بدہن وفات ۲۰ شوال ۸۷۶؁ ہجری روز دوشنبہ۔ ان کی قبر اپنے والد کی قبر کے متصل سنگ سرخ کے گنبد کے نیچے ہے۔ دوسرے شیخ فخرالدین عرف شیخ فدو۔ وفات ۱۴ شوال ۸۳۵؁ ہجری۔ ان کی قبر احاطے کے شمالی دیوار کے متصل اپنے والد کے مزار کے پس پشت واقع ہے۔ ان کا آستانہ زیادہ مشہور ہے۔

بزرگان بالا کے علاوہ شیخ زکی الدین، قاضی عبدالملک (جو قاضیان برناوہ کے جدِّ اعلیٰ ہیں) خواجہ ابو اعلیٰ وغیرہ بزرگوں کی قبریں بھی اس احاطے میں ہیں۔ دونوں گنبدوں کے بیچ میں مخدومہ جہاں بنت شیخ ابو الاعلیٰ کی قبر ہے۔ انتہیٰ خلاصہ چشتیہ بہشتیہ۔

شیخ فدوّ علیہ الرحمۃ کی قبر کا جو نشان مذکور ہوا اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ شرقی گنبد شیخ نصیرالدین کے مزار کا ہے، اور غربی اُن کے صاحبزادہ شیخ علاءالدین کے مزار کا۔ قصبہ سے مغربی جانب ایک شکستہ وسیع مسجد ہے جو کسی زمانے میں جامع مسجد تھی، اس کی چھت اور محرابیں شکستگی کی نذر ہو چکی ہیں۔ مگر کتبہ کے ٹکڑے مسجد کے ایک گوشہ میں رکھے ہیں، ان کی عبارت باوجود سعی پوری نہیں پڑھی گئی۔ جو کچھ پڑھی گئی اُس سے مفہوم ہوا کہ سلطان محمد شاہ غازی کے زمانے میں یہاں ہندوؤں سے سخت معرکہ پڑا تھا (اس معرکے نے غالباً مذکورۂ بالا گورستان کی آبادی میں معتد بہ حصہ لیا ہوگا) شکرانۂ فتح میں بت خانہ توڑ کر اُس کی جگہ یہ مسجد بنائی گئی۔ فاتح کا نام نظام الملک لکھا ہے۔ مسجد کی عبارت میں بتخانہ کے پتھر جا بجا نظر آتے ہیں۔ قصبہ رہڑی کا ذکر (بنام رایری) ابن بطوطہ نے سفرنامے کی جلد

دوم میں اور ابوالفضل نے آئین اکبری میں (بضمن صوبۂ آگرہ) کیا ہی۔

آج یہ قصبہ ویران اور تباہ ہی۔ تاہم سادات، شیوخ اور پٹھانوں کے خاندان اُس میں آباد ہیں اور جہاں تک سنا گیا انھوں نے اپنے نسب کو محفوظ رکھا ہی ایک شخص کی زبانی یہ سنکر دل کو خاص مسرت ہوئی کہ وہ شروانی پٹھان تھا۔ اس سے بھی زیادہ خوشخبری یہ تھی کہ ہمارا کالج اپنا فیض اس ویرانہ کو بھی پہونچا رہا ہی۔ تعلیمی حالت دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہاں کا ایک لڑکا کالج میں پڑھتا ہی دیوبند کی برکت بھی پیچھے نہیں رہی۔ وہاں کے ایک صاحب مدرسۂ مذکور میں فارغ التحصیل ہوئے ہیں افسوس ہی کہ وہ اُس زمانے میں باہر تھے ورنہ نیاز حاصل کرتا۔

(رسالہ علی گڑھ منتھلی۔ ماہ جولائی سنہ ۱۹۰۴ء)

دیباچۂ غرّۃ الکمال امیر خسرو

(ریویو)

یہ امر مسلّم ہی کہ خسرو اقلیم سخن امیر خسرو کا خزانۂ کلام شمار سے باہر تھا نسلِ تیمور کے ایک فرمانروا کے کتاب خانے میں امیر ممدوح کے لاکھ سے زیادہ شعر موجود تھے۔ جب نئے کلام کی آمد موقوف ہو گئی تو اُس کو دعوٰی ہوا کہ اب اس سے زائد نہیں ہی۔ اگر ہی تو کوئی لائے اور انعام لے۔ انعام کے شوق میں لوگ تلاش کر کر کے نئے نئے مجموعے لاتے۔ جو آتا یہاں موجود تھا۔ جب دعوٰی فیصلہ بن چکا تو ایک ضخیم جلد آئی جو شاہی کتاب خانے میں نہ تھی۔ بادشاہ کو کعبۂ خسرو کے سامنے سر جھکانا پڑا اور اُس نے تسلیم کیا کہ امیر باکمال کا کلام حد شمار سے خارج ہی۔ داغستانی نے لکھا ہی کہ امیر خسرو کے تین دیوان ہیں۔ تحفۃ الصغر، وسط الحیوٰۃ، غرۃ الکمال۔ لکھنؤ میں جو دیوانِ خسرو چھپا ہی اُس کے دیباچے میں فرماتے ہیں۔ اب تک میرے چار دیوان ہو چکے ہیں۔ تحفۃ الصغر، وسط الحیوٰۃ، غرۃ الکمال، بقیۂ نقیہ

یہ مجموعہ انھیں عناصر سے صورت پذیر ہوا ہی۔ اس کے بعد جو کلام موزوں ہوگا وہ پانچواں دیوان ہوگا۔"

خاکسار کو ایک قلمی مجموعہ ملا ہی جس کا نام "نہایۃ الکمال" ہی جس میں دیباچہ، قصائد غزل وغیرہ سب کچھ ہی۔ ممکن ہی کہ یہ پانچواں دیوان ہو۔ دیباچہ میں اس کا ذکر نہیں کہ کون سا دیوان ہی۔ اس کے سوا میرے یہاں ایک اور ضخیم قلمی نسخہ ہی۔ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ مستقل مجموعہ ہی یا عطر مجموعہ۔ لکھنوی نسخہ کی بعض غزلیں اس میں ہیں (جو مختلف دیوانوں کی ہیں) لیکن اس کی بیسیوں غزلیں اس میں نہیں۔[1]

تحفۃ الصغر ہاتھ آیا تو اُس کے دیباچہ کا خلاصہ ناظرینِ مخزن کی نذر کیا گیا۔ اب خوبیِ قسمت سے غرۃ الکمال کا دیباچہ دستیاب ہوا ہی۔ شوق کہتا ہی کہ اس کے جواہرات بھی مخزن کو بھیج، اگرچہ جوہری سات سمند پار عدم کے موتی رولنے چلا گیا لیکن جواہر خانے کا دروازہ کھلا ہوا ہی ؎

ہنوز آں ابرِ رحمت دُر فشاں ست

خم و خم خانہ   بامہر و نشاں ست

خدا اس خزانہ کو معمور رکھے۔ غریب الوطن دوست کی نشانی ہی۔ دیباچۂ غرۃ الکمال کے ننو صفحے ہیں۔ عبارت اوّل سے آخر تک مرصع اور رنگین ہی۔ مگر دربارِ خسروی کا یہ آداب ہی کہ مرصع اور رنگین عبارت کا خلعت واقعات کو عطا ہوتا ہی۔ کارچوبی پوشاک خیالی پیکر کو نہیں پہنائی جاتی۔ حمد کے بعد نعت ہی۔ نعت کے بعد پیر کی مدح۔ پھر سلسلۂ سخن یوں آغاز فرماتے ہیں کہ "انسان کا سرمایۂ ناز نطق ہی، اور نطق قدرتِ الٰہی کا برگزیدہ نمونہ"۔ اسی سلسلے میں لکھتے ہیں کہ "دیکھو بہرا اور گونگا چونکہ فیض سخن سے محروم ہی لہٰذا کسی بزم میں توقیر نہیں پاتا۔ طوطی اور شارک (مینا) حال آں کہ جانور ہیں مگر انسانی کلام کی نقالی کی بدولت وہ قدر پاتے ہیں کہ انسان کی خوش بیانی کی مثال اُن سے دی جاتی ہے"۔ نمونہ عبارت ملاحظہ کیجیے:۔

"طوطی کہ حیوانِ غیر ناطق است بسببِ نطق عاریتی درجے[2] یافتہ است کہ اربابِ الباب جملہ

---

[1] بقیہ نقیہ ثابت ہوا۔ [2] ترجمہ۔ طوطی جو ایک حیوان غیر ناطق ہی اس کا درجہ عارضی گویائی کی وجہ سے اتنا بلند ہی کہ سارے عقلا و فضلا اور فصیحوں کی گویائی کو اس کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں، اور اُس کا پنجرا امرا دار وں کے یہاں (باقی نوٹ بر صفحہ آیندہ)

فصحاء عالم و فضلاء عالم را نسبت سخن بر و میکنند و بدام قفس عزت او را در بالین گاہ سراں و پائیں جائے سروراں بآئین مکنت مکانے بلند ارزانی میدارند۔ و در سواد ہندوستان کہ خیال بہشت در آئینہ جائے پر طاؤسانِ او بتواں دید۔ مرغیست کہ آنرا شارک میگویند و در خراسان سارو میخوانند۔ و این خبر سائر در طوطیانِ جہاں طیراں نمودہ کہ زبان آموزاں ماہر تُہر دہانش چناں باز میکنند کہ....... بہ سخن شیریں شکر خواری می شود کہ پیش او بلبلاں را گاہ شکر خائی زبانِ شیریں در کام گرفتہ میگردد بلکہ سخن در دہاں....... باز ہم در..... ہندوستان زنار دارانند...... زبانِ ایشاں بر بیان منطق الطیر در افواہ افتادہ۔ چنانچہ در معرفت بانگِ زاغ کتابہا ساختند و چیزے از مغیبات ازاں سواد میتوانند کہ بخوانند و از تیزی زبانِ کنجشک بالقطع فالے می گیرند و می گویند کہ بیشتر موافق و مقابل می افتد و بعضے مردمانِ ناقصِ عقل کہ از مرتبۂ عاقلی غافل اند ایشاں را بجہت بیانِ منطق مرغے کہ میگوید و نمیدانند کہ چہ میگوید شب و روز پرسش و پرستش میکنند و ہر رومیتے کہ آں بیخبراں ازیں علم می آرند آں جمع غیر سلامت وجوہ تحوآں میکنند و بہ تعلم و تلمذ بہ پذیرند"

آگے یہ کہہ کر کہ انسان کیسا سادہ لوح ہے کہ باوجود نطق اصلی کے نقلی گویائی پر فریفتہ ہو جاتا ہے فرماتے ہیں قطعہ

گر بود بہتر ز گفتِ آدمی گفتِ دگر　　　　کے خدائے پاک مردم را بخطاب "قل" کند

(بقیہ نوٹ بر صفحہ گزشتہ) سربلند ہے۔ ملک ہندوستان میں جس کے طاؤس کے بہشت کا جلوہ دکھاتے ہیں ایک پرند ہے جس کو شارک (مینا) کہتے ہیں اور خراسان میں اس کا نام سارو ہے۔ یہ امر تمام دنیا میں مشہور ہے کہ ماہر لوگ اس کو ایسی اچھی طرح بولنا سکھاتے ہیں کہ بلبل اس کے سامنے بولنا بھول جاتا ہے۔

ہندوستان میں ایک گروہ ہے جس کی نسبت یہ مشہور ہے کہ وہ پرندوں کی بولی سمجھتا ہے۔ چنانچہ اس نے کوے کی آواز پر کتابیں لکھ ڈالی ہیں جن سے وہ غیب کا حال بیان کرنے کا دعویٰ کرتا ہے۔ چڑیا کی آواز سے شگون لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اکثر ٹھیک[1] اور سچ ہوتا ہے۔ اور بعض بے عقل کہ جو اپنے مرتبہ سے ناواقف ہیں ان کو جانوروں کی بولی سمجھنے والا سمجھ کر رات دن ان کی پرستش اور پرستش میں مصروف ہیں حالانکہ جن جانوروں کی وہ بولی ہے اس کو وہ جانور خود نہیں سمجھتے کہ وہ کیا کہتے ہیں اور جو کچھ وہ نافہم بک دیتے ہیں یہ بے عقل اس کی تاویل گڑھتے ہیں اور ان کی شاگردی اختیار کرتے ہیں۔

لیک نشناسد چو مردم قیمتِ گفتارِ خویش — فالِ میموں گیرد از پرندہ و غلغل کند
ناسپاسی میکند شاعر کہ با گفتِ چناں — ہر زماں وصفِ بیانِ قمری و بلبل کند
آرے آرے تشنہ ہا چنداں خورش برگ خورد — خوبرویا آں چناں رخسارہ میلِ گُل کند
نعمتِ کُلّیست نطق و گر بداند قدرِ آں — جزو جزو بندہ شکرِ نعمتِ آں کل کند

فضیلتِ نطق ثابت کرکے اُس کی دو قسمیں کی ہیں۔ نظم و نثر۔ نثر پر نظم کی ترجیح کے جو دلائل لکھے ہیں اُن میں ایک یہ بھی ہے کہ موسیقی سا فنِ لطیف نظم کا محتاج ہے۔ نظم نہ ہو تو ریشم کے نغمے بھی بے لطف ہیں۔ کلیات میں یہ مضمون کیسے پاکیزہ پیرائے میں ادا کرتے ہیں ؎ قطعہ

مطربے می گفت خسرو را کہ اے گنجِ سخن — علمِ موسیقی زجنسِ نظم نیکوتر بود
زانکہ ایں علمیست کز دقت نیاید در قلم — واں نہ دشوار ست کاندر کاغذ و دفتر بود
پاسخش گفتم کہ من در ہر دو معنی کاملم — ہر دو را سنجیدہ بر وزنے کہ آں بہتر بود
فرق من گویم میانِ ہر دو معقول و درست — تا بداں انصاف کاں از ہر دو دانش ور بود
نظم را علمے تصور کن بنفسِ خود تمام — کو نہ محتاجِ سماع و صوتِ خنیاگر بود
گر کسے بے زیر و بم نظمِ فرو خواند رواست — نے بمعنی ہیچ نقصاں، نے بلفظ اندر بود
ور کند مطرب بسے ہاں ہاں و ہوں ہوں در سرود — چوں سخن نبود ہمہ معنی او ابتر بود
نائے زن را ہیں کہ صوتے دارد و گفتار نے — لاجرم در قول محتاجِ کسے دیگر بود
پس دریں صورت ضرورت صاحبِ صوت و سماع — از برائے شعر محتاجِ سخن پرور بود
نظم را حاصل عروسے داں و نغمہ زیورش — نیست عیبے گر عروسے خوب بے زیور بود

سلسلۂ بالا میں متقدمین شعرا میں مولانا رضی الدین نیشاپوری اور مولانا ظہیر الدین فاریابی کے علم و فضل کی مدح کرتے ہیں اور متاخرین میں مولانا شہاب الدین حمرہ اور مولانا بہاء الدین بخاری کی۔ اس بحث کو ختم کرکے نظم فارسی کا نظم عربی سے موازنہ کیا ہے۔ یہ تسلیم ہے کہ عربی اپنی خوبیوں میں پارسی پر فائق ہے۔ لیکن نظم پارسی نظم عربی سے بہتر ہے اور اس کی تین دلیلیں ہیں: (اول) شعر کی جان وزن ہے۔

اور اشعارِ فارسی کا وزن عربی نظم کے وزن سے زیادہ لطیف اور کامل ہے۔ کیونکہ جو زحف عربی شعروں کے وزن میں جائز ہے وہ اگر فارسی شعر میں لے آئیں تو ناموزوں ہو جائے۔ فارسی نظم ایک حرف بلکہ ایک حرکت کے تغیر سے غیر موزوں ہو جاتی ہے۔ عربی نظم میں حرف بلکہ لفظ کا تغیر بھی کھپ جاتا ہے۔ جو خوبی وزنِ فارسی میں ہے عربی کیا عبری وغیرہ میں بھی نہیں۔ واقف کار جانتے ہیں (دوسری دلیل) عربی زبان اپنی وسعت کے لحاظ سے بے پایاں ہے۔ ایک معنی کے لئے ہزار لفظ اور ایک لفظ کے لئے دس معنی جس کے قبضہ میں یہ خزانہ ہو وہ کسی موقع پر تنگ دست نہیں ہو سکتا۔ فارسی میں برعکس ہے۔ یہاں ایک لفظ کے ایک سے زائد معنی بہت کم ہیں۔ انصاف سے دیکھئے پارسیوں کو کس قدر دشواری نظم میں مطالب ادا کرنے میں ہے اور عربی دانوں کو کس قدر آسانی (تیسری دلیل) ہم عربِ عربا (خالص عرب) کے کلام سے بحث کرتے ہیں۔ وہاں قافیہ ہی قافیہ ہے۔ اگرچہ اہلِ فارس نے عربی نظم میں ردیف کو داخل کیا ہے لیکن ان کا کلام ٹکسالی نہیں۔ فارسی میں قافیہ کے ساتھ ردیف بھی ہے۔ اور ردیف نظم کے لئے سرمایہ آرائش و زیبائش ہے۔ خلاصہ یہ کہ عربی شعر میں کیا باعتبارِ وزن اور کیا بلحاظ وسعتِ زبان و ترکِ ردیف ہر طرح آسانی ہے۔ بایں ہمہ خوبیِ معنی کے لحاظ سے فارسی شاعری عربی شاعری سے بالاتر ہے۔ اس موقع پر یہ اعتراض نہیں کرنا چاہئے کہ شعرِ عربی کا رتبہ اس لئے بلند ہے کہ اس سے کلام اللہ کی تائید ہوتی ہے اور نہ یہ کہ خود کلامِ ربانی اسی زبان میں نازل ہوا ہے۔ کیونکہ میں خود یہ تسلیم کرتا ہوں کہ فارسی کا کلام اس مقام میں بمقابلہ عربی محض ہیچ اور ہیچ ہے ؎

درآں مقام کہ از شرعِ مصطفیٰ گوئیند
نعوذ باللہ کہ از شاعری سخن رانم

لیکن یہ موقع شرعی بحث کا نہیں۔ اربابِ معنی کو مضامینِ خاقانی کی بلندی، کلامِ انوری کی روانی، سید حسن، نظامی و ظہیر کی نظم کا حسن پیشِ نظر رکھ کر انصاف فرمانا چاہئے۔ مقامِ دعویٰ سے مقامِ انصاف میں آئیں تو کہہ سکتے ہیں کہ ہم لطفِ زبانِ عربی کے قائل ہیں۔ وہ لطفِ نظمِ فارسی کے وزن کو مانیں۔ ایک لطیف کا مقابلہ دوسرے سے ہو گیا۔ ہمارے یہاں خیالات بدیع ہیں، ان کے یہاں تخیلات فصیح

یہ دونوں بھی برابر رہی۔ ہماری ردیف کے مقابلہ میں وہ کوئی خوبی پیش نہیں کر سکتے۔ لہٰذا پارسیت شعر کو فوقیت رہی۔ سلسلۂ کلام دراز ہو چکا۔ دیباچہ میں اس سے زیادہ گنجائش نہیں۔ لیکن ایک مضمون جو دل میں چبھ رہا ہے بے اختیار زبانِ قلم پر آتا ہے۔ یہ بات ثابت ہے کہ پارسیوں کو شاعرانہ طبیعت کے لحاظ سے عربوں پر ترجیح ہے۔ اگر عرب کا شاعر کامل و فصیح ملک فارس میں جائے تو ممکن نہیں کہ وہ زبان پارسی میں بات چیت بھی صحیح اور درست طور پر کر سکے۔ معانی اہل فارس کا استنباط کرنا یا پارسی نظم و انشا پر قادر ہونا تو دوسری بات ہے۔ اس کے برخلاف پارسی کا شاعر اپنے ملک میں عربی ادب و فضل حاصل کر کے شعر عربی کہہ سکتا ہے۔ بلکہ عربی الفاظ کو معانی پارسی سے ربط دے کر ایسا عمدہ مجموعہ تیار کر سکتا ہے کہ جو منصف مزاج دونوں فنوں سے واقف ہوگا وہ بے اختیار احسنت کہہ اٹھے گا۔ اور اگر شاعر مذکور ملکِ عرب میں جا پہنچے تو وہاں کے فصحا کو اس کے علم و فضل کا اعتراف کرنا پڑے گا۔ زمخشری[۵۱] خوارزم کا باشندہ تھا، عرب میں علامہ مشہور ہوا۔ سیبویہ[۵۲] جو مجمل چھوڑ گیا تھا اس نے مفصل کر دیا۔ ہندوستان کے باشندے طباعی میں تمام عالم سے بڑھے ہوئے ہیں۔ اس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ عرب، خراسانی، ترک، ہندو وغیرہ جو ہندوستان کے اسلامی شہروں میں (مثلاً دہلی، ملتان، لکھنؤ) نہ ان شہروں میں جو ہندوؤں کے مرکز ہیں (مثل گجرات، مالوہ، دیوگیر) آئے اور تمام عمر یہاں کی زبان سیکھے ناممکن ہے کہ اس کو صحیح اور درست بول سکے۔ اپنے ہی ملک کے انداز پر گفتگو کرے گا۔ عرب عربی پر قادر ہوتے ہیں۔ جب یہاں کی بولی بولتے ہیں بھرم کھل جاتا ہے۔ ہندو خواہ شہر کے باشندے ہوں خواہ گانو کے۔ دہلی میں آ کر رہتے اور زبان پارسی سیکھتے ہیں لیکن ماہر ہرگز نہیں ہوتے۔ خراسانی، عراقی، شیرازی، اور ترک کی جودتِ طبع زبان ہندی کے آگے سر جھکا دیتی ہے۔ اور وہ بیچارے ہرچند کوشش کرتے ہیں، لیکن جب بولتے ہیں منہ کی کھاتے ہیں۔ جو اہلِ قلم ہندوستان کے اسلامی شہروں (خصوصاً دہلی) میں نشو و نما پاتے ہیں وہ ہر ملک کی زبان بولنے اور اس میں نظم و نثر لکھنے پر قادر ہوتے ہیں۔ جس دیس میں پہنچ جائیں اسی کی روش پر چل سکتے ہیں۔ یہ بات تجربے سے ثابت ہو چکی ہے کہ ہم میں بہت سے ایسے

---

۵۱ علامہ زمخشری۔ مصنف تفسیر کشاف و مفصل وغیرہ۔ ۵۲ نحو کا امام مشہور۔ جو اس فن کے موجدوں میں ہے۔

ہیں جنھوں نے ملک عرب دیکھا بھی نہیں۔ تاہم زبان عرب کو اس فصاحت کے ساتھ حاصل کیا کہ بلغائے
عرب اُن کے مرتبہ کو نہ پہنچ سکے۔ اور بہت سے تاریک (مقابل ترک جیسے عجمی مقابل عربی) میں ایسے[1] دیکھے
ہیں کہ انھوں نے زبانِ ترکی ہندوستان میں سیکھ کر وہ گویائی حاصل کی کہ اس گروہ کے فصحا اُن کی
زبان میں گونگے رہ گئے۔ زبان پارسی کی یہ کیفیت ہی کہ ہر چند وہ پارس سے یہاں آئی ہی لیکن سوائے
ماوراء النہر کے (جہاں کی پارسی ہندوستان کی پارسی کے مطابق ہی) کسی ملک کی پارسی کے الفاظ درست
نہیں۔ خراسانی "چہ" کو "چی" اور جیسے "کجا" کو "کجو" کہتے ہیں کتاب میں۔ دیکھو "چہ" اور "کجا" لکھا جاتا ہی۔
اور الفاظ صحیح وہی ہیں جو کتابی ہوں۔ اُن کے یہاں بہت سے ایسے الفاظ ہیں جو اس کسوٹی پر کھوٹے
ثابت ہوتے ہیں اس کے برعکس ہندوستان کی فارسی دریائے سندھ کے کنارے سے سمندر کے کنارے تک یکساں اور دری
(خالص اور ٹکسالی) فارسی[2] ہی۔ ہندوستان کی زبان[3] کا یہ حال ہی کہ ہر سو کوس پر اور بولی جاتی ہی۔ پارسی
اس چار ہزار کوس میل میں ایک ہی ہی۔ اور پھر اس خوبی کے ساتھ کہ گفتگو کتابی زبان کے موافق ہی (اس
مقام پر دیباچہ کی عبارت مشکوک ہی) کی طرح نہیں ہی جو "کردہ" کو "کردہ گن" اور "کردہ ہیں" بولتے ہیں
ترکستانیوں کے مثل جو ہر لفظ کے آخر میں "ہیں" ضرور بڑھاتے ہیں۔ جیسے "گفتہ ہیں" اور "رفتہ ہیں"
ولایت سے آنے والے علما و فصحا (عوام اوباش کا ذکر نہیں) دہلی کی فارسی کی مدح کرتے ہیں۔ اور اہل
دہلی ان کی زبان پر ہنستے ہیں۔ یہاں کی زبان پر وہ گرفت نہیں کر سکتے اس لئے کہ یہاں کی زبان نرم
شگفتہ (موزوں) و لطیف و نظیف (پاک) و درست و فصیح ہی۔ لطف یہ ہی کہ ہم سب کی بولی بولتے ہیں
ہماری بولی کوئی نہیں بول سکتا۔ جو ہماری زبان پر کلام کرے اُس پر میرا یہی دیباچہ حجت ہی۔

---

[1] امیر خسرو کی مادری زبان ترکی تھی۔ [2] آگے چل کر تم دیکھو گے کہ ملتان سے لے کر بنگالے کی انتہا تک امیر خسرو مختلف مقامات میں رہ چکے تھے لہذا انھوں نے جو کچھ کہا ہی سن کر لکھا ہی سنی سنائی بات نہیں لکھ دی۔ ہندوستان پر مسلمانوں کے حملے اگرچہ عہد سلطان محمود سے (چوتھی صدی ہجری کے آخر میں) شروع ہو گئے تھے لیکن مستقل سلطنت قطب الدین ایبک نے آغاز صدی ہفتم میں قائم کی۔ امیر خسرو نے جس زمانہ میں دیباچہ لکھا ہی وہ ساتویں صدی کا آخری زمانہ تھا۔ یہ مسلمانوں کی سلطنت کا غایت اقتدار تھا کہ سو برس سے کم عرصہ میں ٹکسالی فارسی پنجاب سے انتہائے بنگالہ تک مادری زبان بن گئی۔

[3] معلوم ہوتا ہی کہ آج سے چھ سو برس پیشتر بھی ہندوستان میں کوئی عام زبان نہ تھی۔ اگر تھی تو فارسی تھی

گوئی بیاؤ ببیں و ذم درکش
گردگر گوں بود قلم درکش

اہل دہلی کی زبان کی خوبی جسے تسلیم نہ ہو اُس کو میرے سامنے لے آؤ تاکہ اُس کا دعویٰ سر تسلیم خم کردے۔

اس سلسلے کے بعد لکھا ہی کہ شعر و سخن پر اس بنیاد پر اعتراض کرنا کہ اُس میں ہجو و ذم وغیرہ مذموم مضامین ہوتے ہیں بجا نہیں۔ اس لئے کہ قابل مذمت یہ مضامین ہیں نہ نظم۔ کمال فن کی مدح سرائی میں سیف الدولہ اور متنبی کا یہ لطیف لطیفہ درج کر گئے ہیں کہ مشہور ہی کہ سیف الدولہ متنبی کے سامنے شعرا کی فلاکت اور بے سروسامانی پر طعن کر بیٹھتا تھا اور مال کی بحیثیت مربی کمال ہونے کے تعریف کیا کرتا تھا۔ ایک روز سیف الدولہ حمام میں تھا متنبی کو بھی بلا بھیجا۔ دونوں لنگی باندھے ہوئے تھے۔ خلوت تھی اور امیر کی طبیعت شگفتہ۔ زندہ دل شاعر کو فی البدیہ ایک مضمون سوجھا۔ عرض کی جہاں پناہ! اس وقت آپ کی اور بندے کی یہ حالت ہی کہ سوا لئے ایک لنگی کے کچھ پاس نہیں۔ متنبی تو اب بھی متنبی ہی۔ مگر حضور غور فرمائیں کہ کتنے پانی میں ہیں" سیف الدولہ متنبی کی سیف زبانی سے کٹ گیا اور بل کھا کر کہنے لگا۔ "اَنَسِيتَ قِربتکَ" یعنی کیا تو اپنی مشک بھول گیا ؟ (متنبی کی نسبت مشہور ہی کہ سقا تھا) متنبی نے برجستہ کہا "اَنسانِي قُربتکَ" یعنی آپ کے تقرب نے بھلا دی۔ جواب کی آب داری غصے کی جلتی آگ پر پانی کا کام کر گئی۔

شعرا کی تین قسمیں قایم کی ہیں: (اول) صاحب طرز خاص و جدید جیسے حکیم سنائی، انوری، ظہیر و نظامی۔ چوں کہ خاقانی، مجیر (بیلقانی) کا اور کمال اصفہانی رضی الدین نیشاپوری کا اور معزی مسعود سعد سلمان کا تتبع کرتے ہیں اس لئے اس قسم سے خارج ہیں۔ (دوم) جو متقدمین یا معاصرین میں سے کسی کی طرز کے پیرو ہوں۔ (سوم) جو پرائے مال کو تاکیں۔ اول استاد ہیں، دوسرے شاگرد، تیسرے غارت گر۔ جس باکمال میں چار شرطیں جمع ہوں وہ استاد مانا جائے گا۔ پہلی شرط یہ ہی کہ اُس کی طرز اوروں سے ممتاز ہو۔ دوسری یہ کہ اُس کے کلام کی عذوبت و سلاست شعرا کی طرز پر ہو نہ کہ واعظوں اور صوفیوں کے انداز پر۔ تیسری یہ کہ کلام خطا سے پاک ہو اور چوتھی یہ کہ ادھر اُدھر کے پیوندوں سے اپنا مرقع آراستہ نہ کرے (یعنی اوروں کے مضامین نہ اڑائے)۔

شاگرد تین طرح کے ہوتے ہیں۔ شاگرد اشارت۔ شاگرد عبارت اور شاگرد غارت۔ شاگرد اشارت

کی یہ صورت ہی کہ مبتدی کا شعر وزن سے گر جائے یا مضمون خبط ہو جائے تو استاد دانا اشارہ کر دے کہ اس کو یوں اور یوں باندھو (معلوم ہوا کہ اصلاح کی اتنی ہی حد ہی) یوں ہی اشاروں اشاروں میں مبتدی فن کی باریکیاں سمجھنے لگتا ہی۔ شاگرد عبارت وہ مبتدی ہی کہ استادوں کی پیروی کرے اور ان کے کلام میں جو لفظ اور معنی دیکھے ان کو اپنے کلام کا نمونہ قرار دے۔ شاگرد غارت وہ حریف ہیں جو خود کچھ کرنے کی ہمت نہیں رکھتے مگر مصنف بننے پر مرتے ہیں۔ یہ لوگ استادوں کے خزانہ سے مال نکال کر اپنے ویرانے میں رکھتے اور دوسروں کے قطرہائے خون کو اپنا جگر گوشہ بناتے ہیں۔ خدا ایسے بے شرموں کے شر سے بچائے۔ یہ نہ سمجھنا کہ استادی اور شاگردی کی بحث میں نے اس لئے اٹھائی ہی کہ مجھ کو استادی کا دعویٰ ہی۔ حاشا میں نے جو شرطیں استادی کی قرار دی ہیں ان میں سے بعض مجھ میں موجود نہیں۔ وجہ یہ کہ میرے کلام کے بہت سے شعبے ہیں اور وہ اربعہ عناصر سے مرکب ہیں۔ وعظ اور حکمت پر جو کچھ میں نے لکھا ہی اس میں سنائی و خاقانی کی پیروی کی ہی اور یہ انداز بوجہ بلندی آگ سے مشابہ ہی جو عالم بالا کی طرف میل رکھتی ہی۔ تخلص (قصیدہ) اور خلاصۂ خیال میں طرز رضی و کمال اختیار کی ہی جو روانی اور صفائی میں پانی سے ملتی جلتی ہی۔ غزل اور مثنوی میں سعدی اور نظامی کے قدم بقدم ہوں۔ اس روش کو بلحاظ لطافت و شادابی ہوا سے مناسبت ہی۔ میرے کلام کا حصہ مقطعات رباعیات معما و لغز۔ خود میرے وجودِ خاکی کا غبار ہی جو اس لحاظ سے خاک ہی کہ اس میں بہت سے جواہرات چھپے ہوئے ہیں۔ میری نثر بھی میری ہی طبیعت کا جوہر ہی اور نثر کے معاملے میں کسی کا ممنونِ احسان نہیں ہوں۔ خلاصۂ کلام یہ ہی کہ استادی کی چار شرطوں میں سے پہلی شرط یعنی صاحب طرز خاص ہونا مجھ میں موجود نہیں۔ میں خود کہہ چکا ہوں کہ میں نے بہت سے اساتذہ کا تتبع کیا ہی۔ دوسری شرط کہ کلام خطا اور قصور سے پاک ہو اس کا بھی مجھ کو دعویٰ نہیں۔ بندے کی نظم اگرچہ رواں ہی لیکن غزل اور لغز (جیسا کہ) میں جا بجا لغزشیں بھی ہیں۔ "نظم بندہ اگرچہ بیشتر روانست اما جا بجا در غزل و لغز لغزیدنی ہم ہست"۔ دونو مذکورۂ بالا شرطوں کی نسبت مجھ کو اقرار ہی کہ پایۂ استادی تک میری رسائی نہیں۔ رہی تیسری شرط یعنی کلام شاعرانہ ہو نہ واعظانہ و صوفیانہ۔ مجھ کو دعویٰ ہی کہ میرا کلام شاعرانہ ہی صوفیانہ اور واعظانہ

نہیں ہے۔ چوتھی شرط کہ مرقع دوزی نہ ہو یہ بھی مجھ میں موجود ہے۔ میں نے آج تک دوسروں کے متاع نہیں تاکے۔ قصہ مختصر میں مالکِ طرزِ خاص نہیں۔ خطا سے میرا کلام پاک نہیں۔ میرا کلام اسلوبِ شعرا کے مطابق ہے۔ سرقہ میں نے نہیں کیا۔ بس استادی کی دو شرطیں مجھ میں ہیں دو نہیں ہیں۔ میں نے اپنا محاکمہ خود کر دیا کہ سندِ استادی نصف میرے قبضہ میں ہے نصف نہیں ہے۔ ؎ ع

ناتمام ناتمام ناتمام[لہ]

خلاصۂ وجہ تالیف دیباچہ

ایک روز میں شب کو بیٹھا ہوا چمنِ سخن کی سیر کر رہا تھا۔ اپنے ہی کلام کا ایک گلدستہ (جو بہارِ جوانی کا شگوفہ ہے) ہاتھ میں تھا۔ ع

رَبِیعُ العُمرِ اَیَّامُ الشَّبَاب

یعنی جوانی بہارِ زندگانی ہے۔ کبھی اُس کے پھول پتے سے اپنا دل نہال کرتا اور کبھی اُس کو ترنم میں ادا کر کے بلبل کی طرح دل شاد۔ غرض کبھی لکھتا کبھی پڑھتا۔ اسی عرصے میں برادرم علاء الدین شاہ کاتب (گویا اُنہی کی شان میں حضرت علیؓ نے فرمایا تھا "عَلَیکَ بِحُسنِ الخَطِّ فَاِنَّہٗ مِن مَفَاتِیحِ الرِّزقِ" خوشخطی سیکھو کہ روزی کی کنجی ہے) آ پہنچا۔ تھوڑی دیر خاموش رہ کر پوچھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ میں نے حال کہا۔ سن کر بولا کہ تمہارے تازہ کلام کا ایک انبار میرے پاس جمع ہے جو ہنوز غیر مرتب ہے۔ اول اُس کو مرتب کر دو پھر اور کلام کی فکر میں پڑنا۔ میں نے ٹالا۔ لیکن اُس نے نہ مانا۔ باصرار کہا۔ "اول سواد اتے کہ برمن است بیاض کن بعد ازاں منشآت پیشینہ کہ منسیات شدہ است بداں پیوند۔ پس ضابطہ و رابطہ برآں بند۔ بعد آں چنانچہ روئے "تحفۃ الصغر" و "وسط الحیوۃ" را بہ محاسنِ دیباچہ مزین گردانیدہ جمالِ "غرہ" را نیز بدیباچہ کمال بیارائے۔" یعنی "جو مسودے میرے پاس ہیں پہلے اُن کو صاف کرو پھر انہیں میں پرانی تحریریں جو طاقِ نسیاں کی نذر ہو چکی ہیں ملا دو۔ اُس کے بعد ایک ضابطہ اور رابطہ اُن کا باندھو۔ یہ سب ہو چکے تو "تحفۃ الصغر" اور "وسط الحیوۃ" کی طرح "غرہ" کو بھی دیباچہ سے آراستہ کرو۔

[لہ] یہ مضمون جتنا اوپر نقل ہوا پہلی قسط تھی جو مخزن ماہ دسمبر ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا۔ باقی ماندہ مضمون مخزن ماہ فروری ۱۹۰۵ء میں شائع کیا گیا اور وہ اب آگے چلتا ہے:۔

آخر چھ گو اپنے دوست کی فرمائش ماننی پڑی۔ اور دوسرے ہی روز صبح کو مسودوں کا تھیلا کھول کر ترتیب شروع کر دی۔ شبانہ روز محنت کر کے دو ہفتے کے بعد یہ مجموعہ تیار کر دیا۔ ژ(تا) بعد دو ہفتہ

ایں ماہ چہاردہ را کہ غرّہ کمالش خوانند آراستگی تمام بر آوردم) ؎

تا ماہ ست ایں کہ خورشید ست پر نور

بنامیزد چہ گویم چشم بد دور

مرتب ہوتے ہی شائقین کے مطالعہ میں پہنچا اور ہر طرف سے تحسین و آفرین کی صدائیں آنے لگیں۔ جب دیوان مرتب ہو کر سخن شناس دوستوں کی نظر سے گزر لیا اُس وقت میں نے یہ دیباچہ لکھ کر لگا دیا۔

اسی بیان میں لکھتے ہیں کہ مثنوی قران السعدین کلیاتِ ہذا کا ایک حصہ ہے۔ مثنوی مذکور ۳۶ برس کی عمر میں امیر خسرو نے تالیف کی تھی۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ چالیس برس کے سن سے پہلے تین دیوان خسروی تیار ہو چکے تھے۔ تحفۃ الصغر (۱۹ برس کی عمر تک کا کلام) وسط الحیوٰۃ اور غرّۃ الکمال۔

وجہ تالیف لکھ کر اُن صنائع کلام کا ذکر کیا ہے جو خود اُن کی ایجاد ہیں۔ فرماتے ہیں کہ جو ایجادیں تحفۃ الصغر اور وسط الحیوٰۃ میں آ چکی ہیں وہ اُن کے علاوہ ہیں۔ حیف بے مائگی صنائع کی دقّت اُس پر کاتب کی عنایت بے غایت ہیں باوجود مطالعہ مکرر اُن کا مفہوم مشخص نہ کر سکا۔ اس لئے یہ جواہرات ناظرین مخزن کے سامنے نہیں سجا سکتا۔ معمے کی نسبت لکھا ہے کہ متقدمین یا تو حساب ابجد سے معمّا کہنے میں کام لیتے تھے یا ایسی معلق اور مبہم ترکیبیں استعمال کرتے تھے جن سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ بس یہ معمّا ہے۔ مولانا بہاؤالدین بخاری کی طبّاعی نے اسلوبِ معما ایسا پیدا کیا کہ شعر اپنے مطلب اور مضمون میں بنفسہٖ تمام ہو۔ اسی ضمن میں بعض الفاظ برسبیل ایہام ایسے بھی آ جائیں جن سے کوئی نام پیدا ہو جائے۔ میں نے یہ تصرف کیا کہ مضمونِ شعر ایسا لطیف و نفیس ہو کہ سننے والوں کو معمے کا گمان بھی نہ ہو۔ جب ذرا سا نظر کاوش کرے تو کسی لفظ عربی کے ترجمۂ فارسی سے یا بالعکس نقشِ مدعا صورت پذیر ہو جائے۔ فصل صنائع میں بعض اشعار ایسے لکھے ہیں جو عربی فارسی دونوں میں پڑھے جا سکتے ہیں، علی ہذا القیاس ہندی اور فارسی۔ یہ بھی لکھا ہے کہ ایک رسالہ "مصحف" نامی میں نے ایسا تصنیف کیا جو عربی فارسی دونوں زبانوں

ہیں پڑھا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں کوئی یہ نہ سمجھے کہ مجھ کو عربی شعر کہنا نہیں آتا۔ پھر اثباتِ دعوے کے واسطے تھوڑا اپنا کلام عربی نقل کرتے ہیں۔ آخر خود ہی انصاف کرتے ہیں کہ "حقیقت این است کہ این طریق نیک نبیدانم"۔ سلسلے میں سلسلہ پیدا کرکے کہتے ہیں کہ میں نے چند جزو ہندی نظم کے بھی لکھ ڈالے ہیں۔ تین دیوان ترتیب دینے کا ذکر کرکے کہتے ہیں مجھ سے پہلے شاہانِ سخن میں سے کسی کے تین دیوان نہ تھے (دیوان کے ایک معنی دربار بھی ہیں) مسعود سعد سلمان[ل] کے البتہ تین دیوان ہیں۔ ایک عربی، دوسرا فارسی، تیسرا ہندی؛ صرف فارسی میں تین دیوان سوائے میرے کسی کے نہیں ہیں۔ دیوانِ اول تحفۃ الصغر جو بچپن کا کلام ہے، دوسرا وسط الحیوٰۃ عنفوانِ شباب کا ذخیرہ ہے، تیسرا یہ "غرۃ الکمال"۔ میرے نزدیک کلام غرۃ الکمال ہی ہے۔ پہلا دیوان اس لئے جداگانہ مرتب کر دیا ہے کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ بچپن کا کلام ہے اور وہ حرف گیری سے باز رہیں۔ دوسرا اس واسطے فراہم کیا کہ "اوساطِ مردم را صید کنم"۔

در ذکر سرگزشت خویش و پیوستن به ملوک و سلاطین و مشهور گشتن

میرے والد سیفِ شمسی (منسوب بہ سلطان شمس الدین التمش) نہایت بہادر اور صفت شکنی میں شہرۂ روزگار تھے۔ باوجود اس کے نہایت کم سخن تھے۔ ترک کی نسبت مشہور ہے کہ "ترک در خواب فرشتہ است"۔ مگر وہ بیداری میں بھی فرشتہ تھے۔ ایسے فرشتے خواب میں نظر آئیں تو آئیں۔ نہایت پاکباز اور باخدا تھے۔ خود تو محض اُمّی تھے لیکن اُن کی ہمت اس طرف متوجہ رہی کہ مجھ کو یعنی امیر خسرو کو کچھ آجائے۔ جو تھوڑی بہت مجھ میں قابلیت ہے وہ انھیں کی تربیت کا نتیجہ ہے۔ اُن کو شہادت کی بہت تمنا تھی۔ خداوند تعالیٰ نے اس سعادت سے اُن کو سرخرو فرمایا؎

"سیف" از سرم برفت و دلِ من دو نیم ماند گزشت
دریائے من رواں شد و "دُرِّ یتیم" ماند

[ل] مسعود سعد سلمان کا زمانہ عہد سلطان محمود غزنوی سے سلطان ابراہیم کے عہد تک ہے۔ فتح ہندوستان کے آغاز میں مسعود کا ہندی زبان پر اتنا قادر ہو جانا کہ صاحبِ دیوان بن گیا سلمانوں کی علم دوستی اور وسیع خیالی کی روشن دلیل ہے۔ یہ بیان خلاف واقعہ نہیں ہو سکتا۔ دیکھو۔ البیرونی کی "کتاب الہند"۔ زیر دست ثبوت موجود ہے ۱۲

(فرشتہ" نے بجائے "برفت" کے "گزشت" لکھا ہے اور یہی زیادہ موزوں ہے)۔

میری عمر اُس وقت سات برس کی تھی۔ (دیکھو۔ ذرا سے بچے کے دماغ پر دادا باپ نقشِ تربیت جما چکا تھا) اِس صغر سن میں جبکہ دودھ کے دانت ٹوٹتے تھے میرا کلام نمونۂ دُرافشانی تھا۔ "دراں صغر سن کہ دنداں می اُفتاد سخن می گفتم و گہر از دہانم می ریخت"۔ (کیا اس سے یہ سمجھنا چاہیے کہ نظم میں کچھ ہوں ہاں کرتے تھے۔ سات برس کا بچہ باتیں کرے تو کیا لکھنے کی بات ہے) والد کے بعد نانا[1] کفیلِ تربیت ہوئے۔ نانا نہایت با اقبال اور صاحبِ اقتدار تھے۔ اگرچہ لفظ "سلطانی" سے محروم تھے مگر حقیقت میں سلطان وہی تھے۔ اُن کی فراخ حوصلگی نے تمام ہندوستان قابو میں کر رکھا تھا۔ تخت کی آڑ میں کل کام وہی کرتے تھے۔ مفسدوں کا منہ بند رکھنے کے واسطے بعض خدمات بھی اُنھوں نے لے رکھی تھیں۔ دو سو ترکی اور دو سو ہندی غلام اور دس ہزار سوار اُن کی سرکار میں تھے۔ سال بہ سال کثرت سے کلاہ و قبا اُن کے توشہ خانے سے تقسیم ہوتیں۔ باورچی خانہ سے بکثرت محتاجوں کو کھانا ملتا۔ اُن کا فیض ہندو اور مسلمان دونوں کو یکساں پہنچتا تھا۔ ستر برس عہدۂ عرض مملکت پر ممتاز رہے۔ میں جب اُن کی آغوش شفقت میں بیس برس کا ہوا تو اُنھوں نے ایک سو تیرہ برس کی عمر میں وفات پائی۔ نانا کے انتقال کرنے پر میں شاہزادہ قتلو خاں[2] عرف چھجو کے دامنِ دولت سے جا لپٹا۔ دو برس شاہزادہ ممدوح کی سرکار میں رہا۔ کئی قصیدے اُس کی شان میں لکھے۔ میں ہمیشہ اُس کی مجلس میں حاضر رہتا اور اپنی خوش بیانی سے حاضرین کو مسرور کرتا۔ ایک روز بادشاہ کا چھوٹا بیٹا بغرا خاں[3] خانِ معظم قتلو خاں کے

---

[1] راوت عرض عماد الملک ۱۲

[2] علاؤ الدین محمد بن اعز الدین کشلی خاں ملقب بہ خانِ اعظم۔ سلطان بلبن کا بھتیجا تھا۔ اس کی سخاوت اور مجلس آرائی شہرۂ آفاق تھی۔ ۱۲ فرشتہ

[3] سلطان غیاث الدین بلبن کے دو بیٹے تھے۔ قاآن الملک محمد سلطان خان شہید۔ یہ شاہزادہ بوجہ اپنے بے نظیر صفات کے باپ کو نہایت عزیز تھا۔ فضیلت، ہنر اور دانش میں بے مثل تھا۔ اس کی مجلس ہمیشہ علما و فضلا سے آراستہ رہتی۔ امیر خسرو اور خواجہ حسن پانچ برس اُس کے پاس ملتان میں رہے۔ اُس کی مجلس میں شاہنامہ، دیوان خاقانی و انوری، خمسۂ نظامی اور کلام امیر خسرو پڑھا جاتا تھا۔ اُس کی شعر فہمی مسلّم تھی۔ کلام متقدمین سے بیس ہزار شعر کے قریب منتخب کر کے ایک بیاض مرتب کی تھی اور اس کو اپنے قلم سے نہایت خوشخط لکھا تھا۔ اُس کی شہادت کے بعد سلطان نے وہ بیاض امیر علی جامدار کو دے دی (باقی نوٹ بر صفحہ آئندہ)

یہاں مہمان آیا (یہ دونوں باہم چچازاد بھائی تھے) چند مصاحب و ندیم ساتھ تھے۔ منجملہ ندیموں کے شمس الدین دبیر اور قاضی اثیر بھی تھے۔ خانِ معظم کی مصاحبت میں صرف میں ہی تھا۔ اُس طرف سے وہ سب چھیڑ چھاڑ کرتے تھے۔ اس طرف سے صرف میں جواب دیتا تھا۔ تاہم سب کا قافیہ تنگ تھا۔ میں نے لطائف و ظرائف سے محفل کو اس قدر گرمایا کہ شاہزادہ بغرا خاں نے فرطِ سرور میں ایک طبقِ زر میرے سامنے رکھوا کر کہا کہ یہ آپ کے باورچی خانہ کا خرچ ہے۔ ہمارے خان (قتلو خاں) کا مزاج نہایت غیور تھا، اُس کو یہ امر شاق ہوا۔ میں نے ہر چند معذرت کی لیکن اس کا مزاج صاف نہ ہوا۔ مگر یہاں تک بڑھا کہ میری صفائی کی فکر ہونے لگی۔ آخر مجھ کو کنارہ کش ہونا پڑا۔ اور بے سروسامانی میں سامانے میں سامانِ امن نظر آیا۔ اور میں وہیں چلا گیا (سامانے کا حاکم شاہزادہ بغرا خاں تھا) لوگوں نے شاہزادے سے غائبانہ میری اس قدر تعریف کی کہ وہ سراپا شوق بن گیا۔ جب میں حاضر ہوا تو ندیمِ خاص مقرر کیا۔ میرا عروج روز بروز ترقی پذیر تھا کہ ناگاہ پرچمِ شاہی دارالملک دہلی سے

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) سخن فہم اُس کے اشعار سے محفوظ ہو کر اُن کو اپنی بیاضوں میں نقل کرتے تھے۔ حیف کہ یہ شاہزادہ مغلوں کے معرکہ میں باپ کی زندگی میں شہید ہو گیا۔ ۱۲

دوسرا بیٹا بغرا خاں تھا۔ یہ عیش و عشرت کی جانب مائل تھا۔ ماہرانِ موسیقی، قصہ خواں، خوش طبع اور ظرفا کا اس کی سرکار میں مجمع رہتا۔ باپ نے طغرل کو مغلوب کر کے بنگالہ کا حاکم کر دیا۔ اس ملک سے اُس کو اس قدر اُنس تھا کہ باپ نے خانِ شہید کے بعد ولیعہد بنا کر سلطنتِ دہلی دینی چاہی۔ مگر یہ لکھنوتی چلا گیا۔ سلطان بلبن کے بعد اس کا (بغرا خاں کا) بیٹا معز الدین کیقباد تختِ دہلی پر بیٹھا۔ یہ بیٹے کے ماتحت رہ کر بنگالے پر حکومت کرتا رہا۔ ایک بار دہلی آ کر بیٹے سے ملا تھا۔ اسی ملاقات کی یادگار قران السعدین امیر خسرو کی۔ دہلی میں سلطنت پر سلطنت بدلتی رہی لیکن یہ حاکمِ بنگالہ رہا۔ جو بادشاہ ہوتا اُس کی اطاعت سے خوش ہو کر حکومتِ بنگالہ بدستور اُسی کے نام چھوڑ دیتا۔ ۱۲ (خلاصۂ تاریخ فرشتہ)

لہ طغرل ایک ترکی غلام سلطان غیاث الدین بلبن کی جانب سے حاکمِ بنگالہ تھا۔ ۶۷۸ ہجری میں یہ دیکھ کر کہ بادشاہ بوڑھا ہو گیا ہے اور شاہزادے سرحدِ پنجاب پر مغلوں کے مقابلے میں مصروف ہیں آمادۂ بغاوت ہو گیا۔ سلطان نے اول اُمرا کو اُس کے مقابلے پر بھیجا۔ جب اُن سے مہم سر نہ ہوئی تو خود مقابلے پر اُٹھا۔ یہ حکم دے کر کہ کشتیوں کی تو، دکٹیر جمنا اور گنگا میں جیا رہی۔ شکار کے بہانے سامانے کی طرف گیا۔ وہاں سے بغرا خاں کو مع لشکرِ خاص ہمراہ لے کر لکھنوتی کی جانب روانہ ہوا۔ برسات کا موسم تھا اس لیے راستہ میں ہرج ہوا۔ جب بادشاہ لکھنوتی پہنچا تو طغرل میدان چھوڑ کر آگے بڑھ گیا تھا۔ لشکرِ سلطانی بھی تعاقب میں بڑھا۔ غرض بہت سی سرگردانی کے بعد طغرل کا مقابلہ لشکرِ شاہی سے ہوا۔ اور وہ اُسی معرکے میں کام آیا۔ بعد فتح بادشاہ نے لکھنوتی کی حکومت اپنے بیٹے بغرا خاں کو دے کر دارالسلطنت کی جانب معاودت کی۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس مہم کے وقت سلطان کی عمر پچھتر برس کی تھی۔ ۱۲

لکھنوتی[۱] کی جانب روان ہوا (۶۷۸ھ) شاہزادہ خود عزمِ ہمرکابی کر رہا تھا کہ قاصدِ سلطانی پہنچا اور شاہزادہ مع سپاہ لشکرِ شاہی میں آملا۔ بندہ ساتھ تھا۔ ایک سال تک قطع مسافت کرتا رہا۔ تاہم منزلِ مقصود کا پتا نہ تھا۔ خلاصہ یہ کہ لکھنوتی سے ڈیڑھ سو کوس اُس طرف جا پہنچے پھر بھی گھوڑوں کی پشت زین سے گرانبار رہی۔ کیچڑ کا یہ عالم تھا کہ پرندہ اُس میں گر پڑتا تو شہد کی مکھی کی طرح پھنس رہتا۔ قصہ دراز اور عرصۂ بیان تنگ خلاصہ یہ کہ طغرل کا قلع قمع ہوگیا اور شاہزادے کو حکومتِ لکھنوتی عطا ہوئی۔ شمس الدین دبیر اور قاضی اثیر نے چاہا کہ میں بھی شاہزادے کے دربار میں حاضر رہوں۔ مگر میں عزیزوں کی مفارقت سے گھبرا گیا تھا۔ لشکرِ شاہی کے ہمراہ دہلی چلا آیا۔ انھیں مہینوں میں قاآن الملک (خانِ شہید) فاتح و منصور داخل دار السلطنت ہوا۔ میری سخنوری کی شہرت سن چکا تھا۔ بلا کر ندیمی کا خلعت بخشا اور ملتان کو ساتھ لے گیا۔ وہاں مُغلوں کا معرکہ پیش آیا۔ اور شاہزادے کو شہادت نصیب ہوئی۔ میں بھی گرفتار ہو گیا تھا۔ مگر زندگی باقی تھی۔ خداوند تعالیٰ نے اُس بلا[۲] سے نجات دی۔ رہائی پاکر میں قبلۃ الاسلام (دہلی) کی زیارت سے مشرف ہوا اور والدہ کی قدمبوسی کا شرف حاصل کیا۔ کچھ عرصہ تک مومن پور عرف پٹیالی میں گنگا کنارے وقت خوشی سے گزرا۔ اسی عرصے میں سلطانِ عادل غیاث الدین نے رحلت فرمائی (۶۸۶ہجری) اور دولتِ معزی کا علم بلند ہوا۔ بندے کی طلبی ہوئی۔ دربار میں ملک نظام الدین کا دور دورہ تھا اور اُس کے دل میں ایک وجہ سے مجھ خاکی کی جانب سے غبار تھا۔ مجھ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں

۱؎ لکھنوتی بنگالے کا قدیم اسلامی دار السلطنت تھا۔ گور بھی اسی کو کہتے تھے۔ اکبر بادشاہ نے جنت آباد لقب دیا۔ اب ویران پڑا ہے۔ پھر بھی اُس کے کھنڈر اگلی عظمت کی نشانی ہیں۔ لارڈ کرزن کی جو شاہانہ توجہ قدیم آثار کے حال پر مبذول ہے اُس میں گور کو بھی حصہ ملا ہے۔ اور اُس کے کھنڈروں کی حفاظت اور زمانہ امکان درستی کا اہتمام ہو رہا ہے۔ گنگا کے مشرقی کنارے پر نقشے میں ویرانہ گور کا نشان دیا ہے۔

۲؎ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ امیر خسرو کتنے روز تک مغلوں کی قید میں رہے۔ فرشتہ نے بضمن معرکہ خانِ شہید یہ لکھا ہے کہ امیر خسرو بھی جو اس معرکے میں شریک تھے مغلوں کے اسیر ہوگئے اور پھر جس طرح دول رانی خضر خاں میں درج ہے رہائی پاکر دہلی پہنچ گئے۔ مثنوی دول رانی خضر خاں کا ایک نفیس نسخہ میرے پاس ہے۔ اُس میں (جہاں تک میں نے تلاش کی) صرف یہ اشعار اس واقعہ کے متعلق ضمناً آگئے ہیں جن سے کوئی واقعہ مشخص نہیں ہوتا صرف صحرا نوردی ظاہر ہوتی ہے ؎ دمایئے کہ این نفسِ بد آموز ٭ گرفتار مغل شد دور از فروز بیاباں می بریدم ریگ بریگ ٭ زبس گرما سرم خورشید چوں دیگ ۔ من وپامن چو من تشنہ سوارے ٭ رسیدیم از رہ اندر جویبارے آگے لکھا ہے کہ میں نے تھوڑا سا پانی پیا۔ مگر رفیق سفر اور اُس کا گھوڑا دونوں زیادہ پانی پی گئے اور فوراً مر گئے۔ ۱۲

ضرر نہ پہنچائے۔ اس لئے کنارہ کشی کرکے حاتم خاں کے زیر سایہ پناہ لی۔ امیر موصوف نے اس قدر دولت مجھ کو عطا کی تھی کہ اگر میں اُس کو خرچ نہ کر ڈالتا تو میری اولاد کی عمر بھی آبرو اور فراغت سے بسر ہو جاتی۔ تھوڑے ہی دن حاتم خاں کی ندیمی میں گزرے تھے کہ نظام الدین جنت کو سدھارا (مجلس نظامی بوستانِ فردوسی جائے خوشش کرد) اور میں دربار شاہی میں حاضر ہو کر خلعتِ ندیمی سے ممتاز ہوا اور دولتِ تقرب سے مالا مال۔ بادشاہ کی اقبالمندی کا زمانہ تھا۔ اور رات دن عیش و عشرت کے چرچے تھے۔ آخر ساقی زمانہ نے اُس کو وہ جامِ نامرادی پلایا جس کے خمار نے آنکھ کھولنے کی مہلت نہ دی۔ اُس کا قرۃ العین شمس الدین تخت پر بٹھایا گیا۔ اور شائستہ خاں (جو آسمانِ فیروزی تھا) اُس کا پشت و پناہ بنا۔ بندہ خسرو کو خدمتِ شائستہ خانی سے سرفرازی ہوئی۔ آخر چترِ شاہی خود شائستہ خاں کے سر پر آکر ٹھہرا۔ اور وہ فیروز شاہ بن کر تخت نشین ہوا۔ (۶۸۹ھ ہجری) خداوند تعالیٰ اُس کے اقبال کو بلند رکھے۔ اگرچہ میں نے ہمیشہ درباروں ہی میں بسر کی اور شاہزادوں کا ہمنشیں اور ہم زانو رہا مگر اوجِ ناموری پر اسی بادشاہ کی تربیت و مرحمت سے پہنچا۔ تمام بادشاہوں سے زیادہ ذی علم ہے۔ اور اگلے پچھلے بادشاہوں میں کوئی اُس کے مثل سخن فہم نہیں ہوا۔ میرے کلام کی جو کچھ حقیقت ہے اُس کو خوب سمجھتا ہے اور پوری قدردانی فرماتا ہے۔

آگے ایک موقع پر اپنے چار سخن سنج اور سخن فہم دوستوں کا ذکر کیا ہے۔ مولانا شہاب الدین، قاضی سراج الدین، "برادر" تاج الدین زاہد اور "برادرم" علاؤ الدین علی شاہ۔ آخر الذکر کی نسبت فرماتے ہیں کہ وہ دوست موافق و منصف ہے۔ نہ میری طرفداری کرتا ہے اور نہ انصاف کی جانب پشت۔ اُس کا مرتبہ شاہانِ سخن میں مسلّم ہے۔ اور ایسا دوست ہے کہ اگر برادرانِ موافق اُس یوسف لقا کو ہزار جان کے بدلے میں بیچ ڈالیں تو بھی ٹوٹے میں رہیں گے۔ فقط

(رسالہ مخزن لاہور ماہ دسمبر ۱۹۰۴ء و فروری ۱۹۰۵ء)

ل فرشتہ نے لکھا ہے کہ نظام الدین اُس وقت مرا جب کہ معز الدین مفلوج ہو کر مرض موت میں مبتلا ہو چکا تھا۔ امیر خسرو کی عبارت صاف کہہ رہی ہے کہ بادشاہ کی صحت و تندرستی کے زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا۔ ۱۲

اکبر کی جوہر پروری

نیرنگیٔ قدرت کا ایک حیرت خیز نمونہ وہ شخص انسانی تھا جو اکبر کے نام سے شہرۂ روزگار ہوا۔ یک اَن پڑھ، مغل کا لڑکا تیرہ برس کی عمر میں ایک نام کی سلطنت کے تخت پر قدم رکھتا ہے۔ اس سلطنت ی وسعت یہ تھی کہ اُس کی کسی سرحد سے دلّی دور نہ تھی۔ اور حالت یہ کہ ملک زبردست دشمنوں (ہیمو سال وغیرہ) سے گھرا ہوا تھا۔ دربار سرکش مدعیانِ قوت (بیرم خاں خانخانان وغیرہ) کے ہاتھ میں ا۔ جب باوٗن برس کی تخت نشینی کے بعد تختے کی نوبت آئی تو سلطنتِ اکبری بدخشاں سے آسام تک ور کشمیر سے دکن تک پھیلی ہوئی تھی۔ پھیلاؤ وہ نہیں جو اس کے نامور مورث تیمور کے ملک کا تھا کہ نت نشیں کے مرتے ہی تخت کا تختہ تختہ بکھر گیا۔ بلکہ وہ پھیلاؤ جو ہمالیہ کی چٹانوں کا ہے۔ جو جوڑ اُس نے لگا دئے تھے وہ اُس وقت تک نہ اُکھڑے جب تک خود اُس کے جانشیں اُن کے جڑے کھاڑ ڈالنے کی قسم نہ کھا بیٹھے۔ انتظام ایسا کہ جزو سے لیکر کُل تک آئین اور ضابطے کی زنجیر میں جکڑا ا تھا۔ ابوالفضل کی جادو نگاری کی تصویر آئین اکبری دیکھو۔ جہاں صوبوں کے آئین دیکھوگے وہاں اونٹ ی ناک میں تیل ڈالنے کا قاعدہ بھی نظر آئے گا۔ قصہ مختصر کیا بلحاظ وسعت و قوت اور کیا بلحاظ انتظام و ئین ایک ایسی سلطنت اس اَن پڑھ مغل نے چھوڑی جس کی نظیر بہ حیثیت مجموعی تاریخ عالم میں کم تر نظر آتی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس بے نظیر سلطنت کے قایم ہونے کا اصلی سبب کیا تھا۔ راحت پسند دماغ اس معمے کو یوں آسانی سے حل کر دیتے ہیں کہ اکبر کو آدمی اچھے مل گئے تھے۔ گویا یہ عظیم الشان سلطنت ایک حسنِ اتفاق کا نتیجہ تھی۔ یہ ایک قسم کا ظلم ہے جو اس والا مرتبہ بادشاہ کی نام آوری کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس سوال کا صحیح جواب یہ ہے کہ یہ سلطنت اُس بے نظیر قوتِ تربیت کا نتیجہ تھی جو اکبر کی ذات میں قدرت نے فیاضی سے ودیعت رکھ دی تھی۔ یہ وہی قوتِ تربیت تھی جس نے رفتہ رفتہ ایک چھوٹی سی حکومت کو عظیم الشان سلطنت بنا دیا، جس نے ابوالفضل اور مان سنگھ سے ارکینِ سلطنت

بنا کر اُس سے سلطنت کے وہ کام لئے جو تاریخ کے کارنامے بن گئے، جس نے کسی فن اور ہنر کو ترقی و تہذیب سے محروم نہیں چھوڑا۔ بالآخر جس نے خود اکبر کی ذات کو بھی جنتر میں کھینچ کر سب بل نکال دیئے۔

اُمرائے اکبری کے سرتاج وہ امیر ہیں جن کا نام نورتن کے لقب سے جہاں میں روشن ہے۔ اُن میں بھی جو سب سے زیادہ مقرب تھے وہ ابوالفضل اور فیضی تھے۔ فیضی دربار اکبری میں باریاب ہوا تو اُس میں ایک ہونہار فارغ التحصیل طالب علم سے زیادہ کوئی حیثیت نہ تھی۔ اُس کی یہ حالت تھی کہ طبابت کے ذریعہ سے بہ دقت اوقات بسری ہوتی تھی اور کچھ آراضی بطور مدد معاش حاصل کرنے کی کوشش میں اہل کاروں کی جھڑکیاں اُٹھا چکا تھا۔ اُنیس برس کی عمر میں بادشاہ کا مُجرائی ہوا۔ اٹھارہ برس کے بعد اُس کو (۳۰ جلوسی) ملک الشعراء کا خطاب ملا۔ ابوالفضل کو ۱۵ جلوسی میں فیضی کی وساطت سے بیئس برس کی عمر میں شرفِ حضوری حاصل ہوا۔ جس حال میں دربار میں پہنچا اُس کو خود بیان کرتا ہے کہ "رعونتِ مُلّایانہ سے دماغ معمور تھا اور تنگ دلی سے سینہ تاریک"۔ وسعتِ خیال اور بے تعصبی کے انوار فیضِ شاہی سے اس کے دل و دماغ پر جلوہ گستر ہوئے۔ ایک ملّائے خشک کس طرح "علامی" ابوالفضل بن گیا۔ اس کی داستان تاریخ اکبری میں پڑھو اور دیکھو کہ کس طرح اکبر نے اس سے سیف و قلم کے کام لئے۔ جو زمانہ سلطنت اکبری کا ان دونوں بھائیوں کی باریابی سے پہلے گزرا وہ یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اکبر اکبر ہے۔ بیرم خاں خانخاناں کا مع دیگر امرائے ترکمانی خاتمہ کر دیا گیا تھا۔ ادھم جو بیرم کے توڑنے میں قوتِ بازو تھا جب ہوائے خودسری کے جھونکے نہ سنبھال سکا تو خود اُڑا دیا گیا۔ راجہ ٹوڈرمل کی جوہر دانی عیاں ہو چکی تھی۔ راجہ بھگوان داس اور راجہ مان سنگھ شرف تقرب و اختصاص حاصل کر چکے تھے اور اُن کی کارگزاریاں جریدۂ عالم پر نقش ہوتی جاتی تھیں اور اس طرح شاہانہ تدبیر ایک عظیم الشان مسئلہ حل کر چکی تھی۔ مالوے کی یلغار ہو چکی تھی۔ چتوڑ، کالنجر، اور رنتھنبور وغیرہ حصار سنگین فتح ہو چکے تھے۔ قصہ مختصر عزم اکبری کے سامنے خاموش و گویا دونوں قوتیں سر جھکا چکی تھیں۔ خانخاناں کی حشمت دیکھو۔ باپ نے اس کو چار برس کا چھوڑا تھا۔ جب محمد امین دیوانہ اور چند ماماتیں اس کو دربار شاہی میں لائیں تو شکستہ حالی میں مبتلا تھا۔ اکبر کی دوربیں نظر نے یہ کہہ لیا کہ ایک

روز خانخاناں ہو کر نورتن کا بیش بہا نگینہ بنے گا۔ بدگویوں اور بداندیشوں نے نیش زنی کی لیکن بے سود شاہی شفقت کے آغوش میں پلا۔ پہلے میرزا خاں پھر خانخاناں بنا۔ فتح اللہ شیرازی ایران میں پیدا ہوا، بڑھا اور پڑھا۔ لیکن کسی نے نہ پہچانا۔ دکن کے دربار نے قدر کی لیکن وہاں بھی فتح اللہ شیرازی نہ تھا۔ یہ جوہریاں آگرہ کھلے کہ مستوفی الممالک راجہ ٹوڈرمل کا دست و بازو بن کر سلطنت کے مالی امور کا نظم و نسق درست کرنے لگا۔ مآثر الامراء میں لکھا ہے کہ تیسویں سال جلوس میں فتح اللہ کو امین الملک بنا کر حکم دیا کہ راجہ ٹوڈرمل مہمات ملکی و مالی اُن کے مشورے سے طے کریں اور پُرانے معاملے جو مظفر خاں کے عہد سے پیچھے پڑے تھے اب فیصل کر دیئے جائیں۔ میر ممدوح نے چند ضابطے بہبودیٔ سلطنت اور بہتری رعایا کے بنا کر حضور شاہی میں پیش کئے جو پسند ہوئے اور ان کے صلے میں عضد الدولہ کا خطاب عطا ہوا۔ میر فتح اللہ کا قول تھا کہ "اگر در خدمت ایں کثرت آرائے وحدت گزیں نمی رسیدم راہے بایزد شناسی نمی بردم"۔ ٹوڈرمل لاہور کا کھتری تھا۔ مآثر الامراء کے مؤلف نے لکھا ہے کہ اکبر کے فیض تربیت سے اُس نے بڑی ترقی پائی اور چار ہزاری منصب پا کر درجہ امارت و سرداری پر فائز ہوا۔ کام لینے کی قابلیت دیکھیے۔ گجرات فتح کیا تو وہاں کی تشخیصِ جمع ٹوڈرمل کے سپرد کی۔ جب بنگالہ کی مہم خان عالم اور خانخاناں سے باوجود کوشش سر نہ ہو سکی تو ٹوڈرمل کو جرنیل بنا کر بھیجا اور اس مہم کے سر کرنے کا سہرا اس کے سر رہا۔ ایک بار نہیں بار ہا ایسا ہوا کہ قلم رکھ کر اُس نے تلوار پکڑی تو میدان جیت کر آیا اور تلوار رکھ کر قلم لیا تو میدان کاغذ میں جوہر قابلیت دکھائے۔

یادش بخیر راجہ بیربر مہیش داس نامی برہمن شیتی بھاٹ تھا۔ اکبری دربار میں مہیش داس سے کب رائے[۱] ہوا۔ کب رائے سے راجہ بیربر بنا۔ خطاب کا راجہ نہیں، جاگیردار۔ نام کا بیربر نہیں، شیر میدان۔ نگر کوٹ کے راجہ سے مزاجِ شاہی برہم ہوا تو یہ اس کی سرکوبی پر مامور ہوئے۔ آخر میں بیربر کی تلوار یوسف زئیوں کے ملک میں جا کر چمکی۔ راجہ مان سنگھ کو حضوری اس وقت حاصل ہوئی کہ جب باوا اور اس کا باپ دونوں کنور تھے اور مان سنگھ کا دادا راجہ بہارا مل آمیر کی گدی پر تھا۔ اس واقعہ کے چودہ

۱؎ اصل لفظ کوی رائے ہے۔ کوی، شاعر ۱۲

برس بعد راجہ بھگوانداس کو موروثی گدی ملی تھی۔ مان سنگھ ہنوز کنور تھا کہ بڑی بڑی مہمیں سر کرلیں۔ ایک روز ہم اُس کو مغرب میں کابل کا صوبہ دار دیکھتے ہیں تو دوسرے روز مشرق میں بنگالہ میں حکومت کررہا ہے۔ شان وشوکت کا یہ عالم کہ اُس کے بھاٹ کے پاس سَو ہاتھی تھے۔ کبھی خطاب فرزندی پایا کبھی میرزا راجہ بنا۔

آدمیوں سے گزر کر علوم و فنون کو دیکھئے۔ ہر قسم کے کمال اور اہلِ کمال کی سرپرستی جیسی اکبر نے کی ویسی اخیر دَور کے کسی دربار نے نہیں کی۔ قوتِ تربیت کا اثر ملاحظہ ہو۔ جو ایرانی شعرا ہندوستان میں آئے اور تربیتِ دربار سے فیضیاب ہوئے ان کے کلام کو ان ہمعصر شاعروں کا کلام نہیں پہنچتا جو ایران میں رہے۔ نظیری، ظہوری، عرفی، غزالی مشہدی، طالب آملی کا جواب متاخرین میں وہاں ہو تو دکھاؤ۔ محتشم ہندوستان نہیں آیا۔ باوجود اُستادی۔ ع ؎

"ورائے شاعری چیزے دگر ہست"

اُس کے کلام میں پیدا نہ ہوئی۔ دیکھ لو، شیخ علی حزیں کلام محتشم کی بےنمکینی کا شاکی ہے۔ آئینِ اکبری دیکھو۔ ہر فن کی تربیت کے قاعدے جزو سلطنت تھے۔ بطور مثال دو فنِ لطیف لیجئے۔ تصویر اور شال بافی۔

تصویر

ابوالفضل لکھتا ہے۔ "ابتدا سے بادشاہ کو اس فن کا شوق ہے اور توجہ شاہانہ اُس کے رواج اور تکمیل کی جانب مائل ہے۔ اس توجہ کے اثر سے اس فن کو خوب ترقی ہے اور ایک گروہ نامور مصوروں کا ملک میں موجود ہو گیا ہے۔ داروغہ اور بتکچی مامور ہیں کہ ہفتہ وار ایک مصور کا کام نظرِ شاہی میں پیش کرتے رہیں۔ ہر ایک کا ہنر جانچا جاتا ہے۔ جو قابلِ انعام ٹھہرتے ہیں اُن کو انعام عطا ہوتا ہے۔ جس قدر اُن کی مہارت ترقی کرتی جاتی ہے اُسی انداز سے ماہواریں اضافہ فرمایا جاتا ہے۔ رنگ آمیزی میں اور ہی حسن پیدا ہو گیا ہے۔ ہنرمندانِ شیریں کار نے بہزاد و اہلِ فرنگ کی مصوری سے (جو شہرۂ روزگار ہے) اپنے مرقعے ملا دیئے۔ نازکی، نقوش کی صفائی، ہاتھ کی قوت اور دیگر صفات مرتبہ کمال کو پہنچ گئی ہیں۔ اِن خوبیوں کے اثر سے بے جانوں کی تصویروں میں وہ تازگی اور رونق پیدا ہو گئی ہے جو جانداروں کی تصویر میں ہوتی ہے۔ سَو سے زائد درجۂ کمال حاصل کرچکے ہیں۔ جو قریب بہ کمال ہیں یا نصف

راہ طے کر چکے ہیں وہ بہت ہیں۔ میر سید علی سرگردہ مصورین ہیں۔ یہ فن تھوڑا سا اُس نے اپنے باپ سے سیکھا تھا۔ دربار میں پہنچ کر بادشاہی عاطفت کی بدولت کمال و ناموری کی دولت سے مالامال ہوا۔ خواجہ عبدالصمد شیریں قلم شیرازی ہے۔ اس فن کو پہلے بھی جانتا تھا۔ لیکن شاہی نظر کے فیض سے اُس کا اور ہی عالم ہو گیا۔

اس واقعہ کو غور سے پڑھو۔ دسونتا ایک کہار کا لڑکا جو اس کارخانے کی خدمت پر مامور تھا دیکھتے دیکھتے وہ بھی لگا کیل کانٹے کاڑھنے۔ بادشاہ نے ایک روز اس کو دیوار پر نقش بناتے دیکھ کر سمجھ لیا کہ اس کے ہاتھوں میں قابلیت ہے۔ خواجہ عبدالصمد شیریں قلم کے ہاتھوں سپرد کیا گیا۔ چند ہی روز میں خوبی تربیت سے استاد بن گیا۔ آخر جنون یہ رنگ لایا کہ اُس نے خودکشی کر لی۔ بہت سے نادر مرقعے یادگار چھوڑے۔ بساون چہرہ کشائی، رنگ آمیزی اور ہو بہو تصویر اتارنے میں یکتا ہے۔ کیسو، لعل، مکند، مشکین، فرخ، قلماق، مادھو، جگن، مہیش، کھیم کرن، تارا، سانولا، ہربنس، رام اس فن میں سرآمد زمانہ ہیں"۔

شال بافی مورخ ممدوح کا بیان ہے کہ اس فن میں حسب ذیل ایجاد بادشاہ نے کئے ہیں۔ طوس اکبری عہد سے پہلے صرف ایک رنگ کا ہوتا تھا جو پشم کا قدرتی رنگ ہے)۔ اب متعدد رنگ کا ہوتا ہے۔ تعجب ہے کہ سرخ رنگ کو یہ پشم قبول نہیں کرتی۔ طرحدار، صرف چار رنگ کا ہوتا تھا۔ بادشاہ نے بہت سے رنگ اضافہ کر دیئے ہیں۔ زردوزی، کلابتون، قلغہ، باندھنوں، چھینٹ، الچہ، اور زردار، یہ سب ایجاد اکبری ہیں۔ پہلے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بُنے جاتے تھے۔ اب طول اور عرض میں ترقی دے کر ان کو جامہ رس بنا دیا گیا۔ زمانہ سابق میں شال کشمیر سے کم کم آتی تھی اور کمیابی کی وجہ سے لوگ احتیاطاً چار تہ کر کے اوڑھتے تھے۔ اب بہ کثرت آتی ہے اور بڑے چھوٹے سب بے تہ کے اوڑھتے ہیں۔ توجہ شاہی سے نہ صرف کشمیر میں شال بافی کو ترقی ہوئی بلکہ لاہور میں ایک ہزار سے زائد کارخانے قائم ہیں۔ یہ ایجاد بھی ہوا ہے کہ زر کے تانے اور ریشم کے بانے سے شال بُنی جاتی ہے۔ مایان اس کا نام رکھا گیا ہے۔ عمامے اور کمر کے پٹکے اُس سے بنتے ہیں۔

اکبر نے خود اپنی تربیت کس طرح کی اُس کو بھی مختصراً بیان کرنا چاہیے۔ بہت بڑا ذریعہ وہ بے نظیر مجمع تھا جو ہر ملت اور ہر فن کے اہلِ کمال کا تختِ شاہی کے گرد رہتا تھا۔ اکبر کشادہ دلی اور توجہ سے ہر ایک کے علم سے فائدہ حاصل کرتا تھا۔ مختلف خیالات کو باہم ٹکرایا جاتا تھا۔ علمی مسئلوں کی چھیڑ چھاڑ رہتی تھی۔ اس طرح ہر قسم کی معلومات کا ذخیرہ اکبر نے اپنے دماغ میں فراہم کر لیا تھا۔ ایک وقت کتاب سننے کا مقرر تھا۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ شاہی کتب خانے کے دو حصے ہیں۔ کم تر کتابیں باہر رہتی ہیں۔ زیادہ محل شاہی میں۔ ہندی، فارسی، یونانی، عربی، اور کشمیری زبان کی نظم و نثر کتابیں کتب خانۂ شاہی میں فراہم ہیں۔ ترتیب کے ساتھ ہر روز فہرست ملاحظہ میں پیش ہوتی ہے۔ بادشاہ جس کتاب کو سنتا ہے اوّل سے آخر تک سنتا ہے۔ جہاں تک کتاب سُن لی جاتی ہے خود بدولت خود اپنے ہاتھ سے اس مقام پر نشان ہندسہ بنا دیتے ہیں۔ سُنانے والا جس قدر ورق سناتا ہے اسی قدر اشرفی اور روپے بطور انعام اس کو دیے جاتے ہیں۔ مشہور کتابوں میں سے کم کتابیں ایسی ہوں گی جو محفل ہمایوں میں نہ پڑھی گئی ہوں۔ وہ کون سی گزشتہ داستان، علمی نکات اور حکمت کے مسئلے ہیں جو بادشاہ کو یاد نہیں۔ کتابوں کو بار بار سننے سے ملال نہیں ہوتا بلکہ ہر مرتبہ نہایت شوق سے سنتا ہے (" و بفراواں خواہش نیوشند")۔

ہمیشہ اخلاق ناصری، کیمیائے سعادت، قابوس نامہ، مکتوبات شرف منیری، گلستاں، حدیقۂ سنائی، مثنوی معنوی، جام جم، بوستاں، شاہنامہ، خمسۂ شیخ نظامی، کلیات خسرو و مولانا جامی، دیوان خاقانی و انوری اور تاریخی کتابیں پیش گاہِ حضور میں پڑھی جاتی ہیں۔ فقط

(اکبر نمبر رسالہ زمانہ۔ کانپور ۱۹۰۵ء)

راجہ کندن لال اشکی الہٰی

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم
از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

کچھ کم تین ہزار برس کا زمانہ گزرا کہ اونتکاپوری (اُجین) میں پانڈووں کی نسل کی آخری نشانی راجہ کھیمی کو دستِ انقلاب نے مٹایا اور آنند کایستھ کو سرور کامیابی بخشا۔ سات سو برس تک حکومت اس سلسلے میں رہی۔ انجام کار اس کی بھی برہمی کا وقت آپہنچا۔ اور شہرۂ روزگار راجہ بکرماجیت کے ہاتھوں آخر فرماں روا موہن کا نہ صرف تاج گیا بلکہ سر بھی نذرِ تاراج ہو گیا۔ جب گھر بگڑا تو گھر والوں میں تفرقہ پڑ گیا۔ کچھ ملک اودھ میں جا بسے، کچھ اور اطراف میں۔ دامودر نامے ایک خستہ حال نے کمپل میں سکونت اختیار کی۔ وہاں یاوری تقدیر نے ایک ایسے مرشد کامل (سمندر پال جوگی) کے آستانہ پر پہنچایا جس کے ابرِ کرم سے دامودر کی سوکھی کھیتی ہری ہو گئی۔ کمپل کے متعلق ۱۴ پرگنوں کی جاگیر بارگاہِ مرشد سے عطا ہوئی۔ ہزار برس ان پرگنوں پر یہ خاندان حاکم رہا۔ فرماں روائے قنوج (جے چند) کے باپ راجہ گوبند چند کا اقبال اس خاندان کا اوبار تھا۔ خاتمۃ الباب رائے چند نے دروازہ زنداں دیکھا۔ بعد چندے زمانہ سے انقلاب کا دوسرا ورق اُلٹا۔ چوتھی صدی سمبت میں جلال الدین خلجی نے قصبہ کمپل فتح کیا۔ باشندوں کو غبارِ فرار میں چہرۂ امن نظر آیا۔ بعضے اکبر آباد، بعضے دوسرے مقامات کو چلے گئے۔ ہمارے ہیرو کے مورث کرم چند کو سندیلہ پسند آیا۔ شمشیر کی بے وفائی کا دو مرتبہ مشہور تجربہ کرنے کے بعد اب اس خاندان نے اس کو کمر سے کھول دیا اور قلم ہاتھ میں لیا۔ سترھویں صدی سمبت میں رائے کھیم داس تاج البلاد شاہجہاں آباد میں آباد ہوئے اور خدمتِ شاہجہانی سے سربلندی حاصل کی۔ ان کے بیٹے رائے نند رام عہد عالمگیر میں موروثی منصب پر ممتاز رہے۔ یہ چندربھان برہمن کے شاگرد تھے۔ شعر گوئی کا شوق تھا۔ لکھتے ہیں ؎

زیرپائے تو مقیم اند ہزاراں دل ریش
قدم آہستہ بنہ جائے درنگ است اینجا

نندرام کے نورِ نظر رائے ٹوک رام محمد شاہی ہیں۔ آخر عمر میں خدمتِ شاہی سے مستعفی ہوکر نواب قمرالدین خاں کی سرکار میں توشک خانہ کے مشرف ہو گئے تھے۔ سرآمد اہلِ دل میرزا عبدالقادر بیدل سے تلمذ تھا۔ اُن کا شعر ملاحظہ ہو ؎

ساقی۔ بیش بجام بلوریں۔ چہ می دہی
گل را پیالہ کن۔ کہ لبِ یار نازک ست

ٹوک راج کے چارہ لختِ جگر تھے۔ خوش حال رائے رند تخلص۔ حضرت شاہ گلشن کے چمنِ فیض سے گلِ مراد چنتے تھے۔ پانچ ہزار مغلیہ سواروں کی وکالت پر ممتاز تھے۔ نادرشاہ ترکی و فارسی کی استعداد سے خوش ہوکر مالِ یغما کے ساتھ اُن کو بھی لے گیا۔ کابل پہنچے تو پیامِ اجل آپہنچا۔ صاحبِ تصانیف کثیرہ تھے۔ انقلاب کے ہاتھوں نے سب برباد کردیں۔ ترانۂ رند ؎

حالم برآں صنم بگوئید	از سختیِ عشق ہم بگوئید
گر از دل من خبر بجوید	آفت زدہ ستم بگوئید
از جانِ رمیدہ گر بپرسد	آوارۂ کوئے غم بگوئید
افسانۂ شامِ غم بخوانید	ویں قصۂ صبح دم بگوئید
گر رنجہ بود ز سیر گوئی	آہستہ و دیدہ و کم گوئید
باور نکند اگر بدیں قول	از جانب من قسم بگوئید

کاں سوختہ در غم تو جاں داد
فریاد ز دستِ عشق۔ فریاد

رائے بھیکم رائے موزوں نے وارستگی میں بسر کی۔ دلّی برباد ہوئی تو ناچار پٹنے چلے گئے۔ کلامِ موزوں ؎
در لباسِ بیخودی دارند باہم نسبتے
چشمِ گریانِ من و آں دیدۂ خونبارِ تو

؎ مکن اے بیوفا رسمِ ستمگاری بحالِ من نگاہِ رحم کُن تا دُور گردد انفعالِ من

رائے تو چند مصوری، نجوم اور طب میں صاحبِ دستگاہ تھے۔ اور رسالہ بیسن داغ کی رسالہ داری پر مامور۔

رائے سدانند عاصی تخلص، سراج الدین علی خاں آرزو کے شاگرد۔ یہ بھی رسالۂ مذکور کے رسالہ دار رہے۔ جب اُس رسالے کا شیرازہ ابتر ہوا تو چندے دلّی میں بسر کی۔ پھر میرزا جواں بخت بہادر کے ہمراہ پورب کے سفر پر روانہ ہوئے قصبۂ سانڈی سے ترکِ رفاقت کر کے رام پور چلے گئے اور مرتے دم تک وہاں کے حکم راں نواب فیض اللہ خاں کے دامنِ فیض سے لپٹے رہے۔ ولہٗ ؎

گریبانِ من و زلفِ درازش بدستِ یکدگر بودے چہ بودے
بہ بیہش آہ۔ دل از خویش رفتہ اگر خود در نظر بودے چہ بودے

؎ بگوشِ گل چہ سخن گفتۂ کہ خندان ست
بہ عندلیب چہ فرمودۂ کہ گریان ست

اُردو کلام بھی ہے۔ اگلے زمانے کی زبان پر اب ہنسی آتی ہے اس لئے نمونہ نہیں لکھا۔ دیوان اشعار مجمع الحسنات و تاریخ ہند یادگار چھوڑی۔ یادگار معنوی کے سوا چار صوری یادگاریں چھوڑیں۔ رائے منوہر لال فلسفی (راجہ کندن لال کے باپ) علوم معقول و منقول مولوی عزالدین رام پوری، مولوی محمد روشن بجھوری، شاہ نیاز احمد صاحب سرہندی بریلوی، اور مولوی رفیع الدین صاحب دہلوی سے پڑھے تھے۔ سفر کلکتہ میں انگریزی سے بھی واقف ہوگئے تھے۔ اولاً سرکار نواب فیض اللہ خاں میں وکیل رہے۔ محمد علی خاں کے قتل ہونے کے بعد فرماں روائے اودھ کے دربار میں ملازمت کی۔ پھر یکے بعد دیگرے عہدہ ہائے ذیل پر مامور ہوتے رہے۔ میر منشی صاحبِ جانشین گورنر جنرل بہادر مرشد آباد۔ سررشتہ داری پراونشل کورٹ اپیل بریلی۔ وکیل ورڈیونیو اضلاع مغربی۔ سررشتہ داری فوجداری اٹاوہ۔ مرنے سے دو[2] برس پہلے ترکِ خدمت کر کے خانہ نشیں ہوگئے تھے۔ ۱۲۴۵ھ میں بہ مقام فرخ آباد گنگا کنارے سفر آخرت اختیار کیا۔ تصانیف گلستانِ ارم، شبستانِ سرور، شارستانِ نور (نثر فارسی) ترجمہ اسطرانومی۔

فارکیو شہر ہیئت فثا غورس۔ دو رسالے علم جغرافیہ ہیں۔ سدید الاستخراج علم تقویم میں۔ عجاب (حساب) اسمار البلاد۔ رسالہ احکام۔ و دیوان اشعار ے

ع عیسیٰ سحر بالینِ من نبضم بدست آورد و گفت — دارد تپِ عشقِ کسے ہرگز نخواہد زیست ایں

ع بیخود شدہ ام ز دردِ دوری — ہاں گریہ بروئے من زن آبے

ع خندہ می زند بر گل طعنہ می زند بر برق — نورِ چشم سیماب ست ایں دلے کہ من دارم

اُن اہل کمال کی فہرست جن کی خدمت میں راجہ کندن لال فائز ہوئے۔

LIBRARY
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)

اسمائے علما و فقرا و اطبائے اہل اسلام:۔

بمقام دہلی — شاہ عبد العزیز صاحب۔ مولوی عبد القادر صاحب۔ شاہ غلام علی صاحب نقشبندی۔ مولوی موسیٰ اسمٰعیل صاحب۔ مولوی عبد الحی صاحب۔ مولوی اسحاق صاحب۔ مولوی محمد حیات لاہوری۔ مولوی محمد کاظم۔ مولوی محمد شریف۔ مولوی ولی محمد۔ مولوی نظام الدین۔ مفتی اکرام الدین۔ مولوی محمد سلام اللہ۔ مولوی غیاث الدین۔ مولوی فضل امام۔ مولوی احمد یار۔ حکیم محمد شریف خاں۔ حکیم اجیت سنگھ۔ شاہ صابر بخش۔ سید امیر پنجہ کش رام پور۔ مولوی شریف الدین۔ مولوی جمال الدین۔ مولوی غلام جیلانی رفعت تخلص۔ مولوی محمد روشن (بمقام بریلی) مولوی عماد الدین۔ مولوی ولی اللہ۔ مولوی مدن صاحب حافظ معین الدین۔ مولوی نجابت حسین (بمقام فرخ آباد) مولوی ولی اللہ۔ مولوی مدن خاں (بمقام کانپور) حکیم امام الدین خاں۔ حکیم فرزند علی خاں۔ شیخ احمد عرب یمنی شروانی (بمقام مین پوری) مولوی سلامت اللہ۔ مولوی فضل رسول بدایونی۔ مولوی حسین بخش کاکوروی (بمقام شاہجہاں پور) مولوی خلیل خاں بزرگ۔ مولوی محمد شریف ثانی

اکبر آباد — شاہ محمدی بیدار۔ حافظ عبد اللہ۔ شاہ دستگیر اکبر آبادی۔ جواد ساباطی۔ فریدوں میرزا زردشتی عالم سرنج گیا۔ مولوی غلام حسین جونپوری۔ میرزا جان آرا۔ ہیرا لال خلعت راجہ پیارے لال (در علم معقول خصوصاً کلام دستگاہ معقول داشتند۔ مگر افسوس کہ نوجوان ازیں جہاں برفتند) بابرا اچھے میاں صاحب۔ لکھنؤ۔ مولوی سید محمد صاحب۔ مولوی سید میرن صاحب مجتہدانِ امامیہ۔ مولوی ظہور اللہ مولوی ولی اللہ۔ مولوی قدرت علی۔ مولوی عبد الحکیم نبیرۂ مولوی عبد العلی۔ مولوی امداد علی۔ مولوی احمد علی

مولوی فضلِ حق - مولوی تراب علی - مولوی سعد اللہ - مولوی نعمت اللہ - لالہ دیبی پرشاد در علم ہند سہ بیعدیل اند - و بالفعل کہ شفائی ببیند یہ مطالب آں میرسند حکیم الملوک مرزا علی صاحب - حکیم مرزا محمد علی صاحب مسیح الدولہ مرزا علی حسین خاں صاحب ۔

آسامی شعرا

بریلی شیخ عبد الملک حمتانہ - پرکاش داس لطفی - راجہ رتن سنگہ زخمی - مولوی غلام حضرت عشقی - مولوی برہان الدین نزہت - میر غلام علی عشرت - مرزا امان بیگ فریاد - سعادت یار خاں رنگین امین الدولہ آزاد - عبد الجلیل سائل نواب خاں بہادر خاں - مولوی نظیر الدین حسن - منشی بدیع الدین محو - قاضی محمد سعید الدین خاں بہادر - نواب حافظ یار خاں نواب شاہ عالم خاں - عبد الصمد قیصر - تلوک چند شیدا گنگا پرشاد رند - قاضی نور الحق منعم - مولوی عبد الرزاق یمنی -

فرخ آباد آغا حسن شیرازی - میاں نصیر دہلوی - لکھنو - شیخ امام بخش ناسخ - خواجہ حیدر علی آتش - محمد خاں رند - میرزا محمد رضا برق - حسن علی خاں اثر - علی اکبر شیرازی - گل محمد خاں ناطق - اس شہر کے بعض شعرا جو مدت سے مرثیہ گوئی ہیں در پیے تھے اور اب انھوں نے اس فن کو مرتبہ کمال پر پہنچا دیا ہے - اس سے پہلے میرزا جعفر علی فصیح - میر مستحسن خلیق - اور میاں دلگیر نے نام پایا تھا - اب میر ضمیر - میر انیس میاں دبیر اپنے فن میں عمدہ ہیں (در فنِ خود خوب اند) -

عاملان موسیقی -

دہلی ہمت خاں - نور خاں - میت خاں - چھوٹے صاحب - قائم خاں جنگو خاں واجیل عرف حلال خور - مسماۃ کشتی - بیگا - جوبن - رام پور - خالق داد والہ داد پنجابیاں - جمالی - دھمالی - مراد بخش - غلام غوث - بولن خاں - بریلی - نواب اقبال الدولہ - منشی پراگدت (ہر دو شاگرد ان میاں شوری) نظام خاں - امیر خاں - میراں قائم خاں - احمد علی پسر میاں جانی - سکھ و سکھن بانیاں - میر تقی ستار نواز بر فاقت راجہ اودت نراین -

فرخ آباد سُندر - راجن وغیرہ - لشکر مہاراجہ سیندھیا بہادر - تیغہ طبلہ نواز - محمد خاں دُھرپتیا - بھورو پاپائی - چیلا بائی شعبدہ باز -

کانپور سکھ بدن و ہمشیر ہایش -

بنارس	رتم ۔ چترا
اکبرآباد	زین مقطوع الانف (نکٹا) جو الا کھی ۔ ایک عورت ملازم راجہ سنسار چند والی نگرکوٹ ۔
لکھنؤ	میر علی صاحب ۔ حسین علی خاں ۔ مولوی یہ ہیں نے سنا ہو کہ پیار خاں رباب خوب بجاتا تھا ۔

اسمار علمار و فقرائے ہند جن سے ملاقات اور فیض حاصل کرنے کا اتفاق ہوا :

اوّل استاد مؤلف ۔ اوچھا لب اندر صاحب اور اُن کے تین بھائی اور دو بیٹے جو سب کے سب علم و عمل میں سرآمد معاصرین تھے ۔ برہمن سال پرست پنڈت ہرکشن (کہ اہل ہند کے مقبول چاروں طریقے جیسے چاہیئے ویسے طے کر چکے تھے) ایک اُن کے بیٹے مکند رام (جو بیاکرن یعنی نحو میں سرآمد اقران اور ضلع بریلی میں صدر امین و صدرالصدور رہے تھے) پنڈت جیت ناتھ (کہ علم سدھانت خوب جانتے تھے) حکیم موتی رام (کہ اُن کو آدمی سدھانتے تھے) حکیم گنگا بلبھ (جن کی طبابت فقیر کی دانست میں بلکہ کل آدمیوں کے نزدیک نمونہ کرامات تھی) اُن کے بیٹے شیر بلبھ (جو اپنے باپ کے قریب قریب تھے) دین کھنڈوی جوگی (جن کی عمر تین سو برس سے زائد تھی) ایندجی مجذوب ۔ جانکی داس (جو علاوہ درویشی بانسری بجانے کے فن میں کامل تھے) برہمچاری رام کشن (صاحب مقامات و کرامات تھے) زنگیلہ سوامی کو جنبھ پہاڑ پر دیکھا اور اُن کے دل کو وسوسۂ دنیا سے پاک پایا ۔ راجہ سوئی کے مرشد کو کانگڑے میں دیکھا (جو منجملہ سدھان تھے)

بنارس ۔ چند فاضل بے مثل مثل بھیروں ۔ مشر ۔ دامودر بھٹا چارج ۔ سمیر بھٹا چارج ۔ چندر نرائن بھٹا چارج ۔ رام زنجن سوامی وغیرہ ۔ قنوج ۔ میا رام پنڈت (علم نجوم میں بے مثل) بلدہ ملّا داس ۔ تواری درگا پرشاد کو اعمال میں اور دیو کنندن کو شعر ہندی میں کامل پایا ۔ نیورا گھاٹ منگل گر درویش (جن کو لوگ صاحب کرامات کہتے تھے) بندرابن ۔ موتی داس بری میاں ۔ لکھنؤ پنڈت گنگا دھر (علم کلام جانتے تھے) پنڈت شنکر ناتھ ماہر منتر شاستر ۔ فرخ آباد ۔ انند ناتھ علم کیمیا خوب جانتے تھے بہت سے نباتات جو اس فن میں کارآمد ہیں مجھ کو بھی دکھائے تھے ۔ میں نے بعض کا تجربہ کیا تو ٹھیک پایا ۔ تاہم میں نے کچھ التفات اس فن کی طرف نہیں کیا ۔

لالہ موتی رام گوہر مولوی عزالدین کے شاگردوں میں تھے ۔ ابتدائے حکومت اہل فرنگ سے کورٹ اپیل بریلی و صدر دیوانی الہ آباد کے وکیل رہے ۔ ۱۲۶۵ھ میں رخت سفر باندھا ۔ راجہ کندن لال لکھتے ہیں کہ ایسا

گویا اور خوش تقریر ہیں۔ نے کوئی نہیں دیکھا۔ فضلا اُن کی تقریر سُن کر دنگ رہ جاتے تھے۔ سخاوت میں مشہور تھے۔ کلام گوہر ہے

موبمو دل گرد زلفِ معنبر دارم
روزگار سیہ و طالع ابتر دارم

لالہ سوہن لال۔ استعداد علوم ضروری کے ساتھ فنونِ طبیہ میں کمال تھا۔ دبستان فارسی۔ قواعد فارسی ہیں شاہد کمال ہی۔ ملازمت۔ سررشتہ داری سائر علاقہ بریلی۔ سررشتہ داری فوجداری۔ ضلع مظفرنگر و پیلی بھیت کی نائب تحصیلداری فوجداری۔ یہ اُن کی ملازمت کی فہرست ہی۔ چند روز کلکتہ میں رہے تھے۔ سنہ ۱۲۴۹ھ میں کالبد عنصری کی رفاقت چھوڑ دی۔

لالہ ہولاس رائے متخلص بہ رشک۔ فن تاریخ میں یگانہ تھے۔ رضوان فریب۔ ہمیشہ بہار۔ حدائق الاخبار قصہ یاسمین رخ و تاج الملوک اُن کی تصنیف ہیں۔ نتیجہ طبع ہے

می برد از دلم شکیب طرۂ جانفزائے تو — آب زغنچہ می برد خندۂ خوش ادائے تو
حسنِ ملیحت اے پری شور فگندہ در جہاں — گرد سیاہ خالے کاکل مشکسائے تو

راجہ کندن لال ولادت سنہ ۱۲۱۲ ہجری بعہد نواب سعادت علی خاں۔ پانچ برس کی عمر میں میر جعفر علی ساکن قصبۂ سنبھل (جو سادات بخارائی میں سے تھے) اُن کی تعلیم فارسی پر مقرر ہوئے۔ چھٹے سال میرزا احمد علی زبان ترکی سکھانے پر۔ نویں سال شیخ خان محمد درس صرف و نحو پر۔ اور گیارہویں سال ملا محمد اکبر شاہ کابلی بجائے شیخ خان محمد موصوف۔ بعض فارسی کتابیں مولوی محمد سعید شاگرد مولوی صبغۃ اللہ سے پڑھیں۔ بانک کا فن امید سنگھ سے۔ شمشیر بازی احمد خاں سے۔ تیراندازی اپنے والد اور خلیفہ قادر بخش سے۔ گھوڑے کی سواری (اسپ تازی) کالے خاں سے اور خط نستعلیق میر غلام حسین سے سیکھا۔ چودہ برس کی عمر میں قصبۂ ٹانواں میں شادی ہوئی۔ پندرہ برس کی عمر تھی کہ اُن کے باپ پورب کو گئے اور اُن کو حضرت شاہ نیاز احمد صاحب سرہندی کے سپرد کر گئے۔ شاہ صاحب ممدوح ریاضی میں خواجہ احمد دہلوی کے شاگرد تھے۔ اور خواجہ احمد منجم مشہور خیر اللہ کے علوم عقلی میں قاضی مبارک گوپاموی سے تلمذ تھا اور قاضی مبارک کو تلمذ میرزاہد ہروی سے۔ دو برس شاہ صاحب ممدوح کی خدمت میں رہ کر کتب ذیل پڑھیں۔ میرزاہد کے دو

رسالے۔ مُسلّم تھوڑا سا صدرا۔ شمس بازغہ۔ زبدۃ الہیئتہ اور تین مقالے اقلیدس کے۔ مطوّل اور مسلّم مفتی محمد عوض سے۔ تفسیر بیضاوی ایک سورت کے فاضل تھے۔ اور طب کی درسیہ کتابیں حکیم جمال الدین سے دیکھیں۔ اسی سال سری اوجھا کب اندر خلف اوجھا برزر فرزند اوجھا رتن بپ ولد ہمایوں گدا سے اپنے والد کی اجازت کے بعد بعیت کی معالج العلوم اور حساب التخمین اپنے والد سے فرخ آباد میں پڑھیں۔ سولویں سال علم استخراج نجوم بزور مطالعہ حاصل کیا۔ اور رسالہ مصباح النجوم لکھا۔ اپنے علوم دینی۔ نیائے (منطق ہندی) اور سانکھ (علم طبعی) اُن سے از سرِ نو پڑھے۔ علم کاب (یعنی شعر ہندی) تواری خوشحال رائے سے جن کی عمر اس وقت اسّی برس کی تھی حاصل کیا۔

اُنیسویں سال دلّی جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں پہنچ کر اپنے والد کے اُستاد مولوی رفیع الدین صاحب کی خدمت میں زانوے تلمذ تہہ کیا اور رسالہ مساکن و ایام و لیالی شاذ و سیوس مجسطی اور طبیعات شفا کا درس لیا۔ اس تحصیل کے سوا باقی رسائل متوسطات تذکرہ اور مجسطی اپنے والد سے پڑھے تھے۔ تصوف کی بعض مشکلات شاہ غلام مسکین سے حل کیں، اور علم منتر کی تکمیل سری پال کرشنا نند سرستی سے کی۔

تیس برس کی عمر تھی کہ ضلع شاہجہاں پور میں بعہدۂ پیشکاری ملازمت حاصل کی۔ اسی زمانہ میں داغ فرزندی نصیب ہوا۔ اور اس صدمہ سے ملازمت چھوڑ کر تین برس کے قریب خانہ نشیں رہے۔ درمیان میں ایک دفعہ پھر استعفا دیا۔ آخر میں اپنے چھوٹے بھائی کو جگہ دلا کر ۱۸۲۳ء میں خانہ نشیں ہو گئے۔ اُس عہد کی قدر دانی کب بیکار رہنے دیتی تھی۔ مسٹر رابنسن نے باصرار بلا کر قنوج کی تحصیلداری پہ مقرر کر دیا۔ ہنوز وہاں نہ پہنچے تھے کہ منتظم الدولہ ناظم الملک محمد مہدی علی خاں سپہدار جنگ دو مہینے کے وعدے پر لکھنؤ اپنے ساتھ لائے اور محمد علی شاہ کے حضور میں پیش کیا۔ پیشگاہ شاہی سے خدمت وقائع نگاری عطا ہوئی۔ پانچ برس کے بعد امجد علی شاہ نے عہدۂ میر منشی کے ساتھ راجہ کا خطاب بخشا۔

یہاں پہنچ کر لالہ کندن لال لکھتے ہیں۔ رمضان ۱۱۵۹ھ سے رفیقۂ زندگی کی مفارقت کے صدمے سے افسردہ و دل گیر رہتا ہوں۔ وفات کا حال معلوم نہیں۔ لیکن ۱۲۶۳ھ (عہد واجد علی شاہ) تک زندہ تھے۔ آخر میں سیدھا ہاتھ بیکار ہو گیا تھا۔

تصنیفات راجہ کندن لال | مشکوٰۃ النجوم۔ در علم استخراج۔ مصباح الحساب۔ ادوار ماضیہ (علوم ہند پر) آثار باقیہ (علوم یونانی پر) آداب باقیہ (علوم عرب پر) نوادر رافرنجیہ

(علوم انگریزی پر) نزہتہ الناظرین (مذکورہ بالا چاروں کتابوں کا خلاصہ) جام جہاں نما (ہیئت) استقصا (علم ہندسہ، قطع مخروط) (علم قطاع) ودیعتہ الصنا (علم طبعیات) سبعہ سیارہ۔ حکمت ہندی، مصطلحاتِ علوم، فرن لوجی، حکمت پارسی قدیم۔ اکسیر سعادت (تطبیق میان تصوف وفلسفہ) نغمہ عنادل (تصوف) دو رسالے سنسکرت میں (عبادت روزانہ وسالانہ اہل ہنود) منتخب پوران (سنسکرت میں) اور چھوٹے چھوٹے رسالے مختلف فنون میں مثل تصویر کشی۔ ساعت سازی۔ زبان یونانی۔ عبرانی، اور سریانی کا لغت۔ انگریزی کی مدد سے ترجمہ کیا اور انگریزی کو اپنے مطالعہ کی مدد سے حاصل کیا۔ تین کتابیں حیوانات بر و بحر اور طیور کے حال میں لکھیں۔

خاتمۃ الباب راجہ کندن لال اور اُن کے خاندان کی داستان آپ نے سُنی۔ اُن تعلقات کو دیکھا جو گزشتہ سوسائٹیوں میں باہم تھے۔ بُلبل شیراز کا نغمہ گویا تصویر حال تھا ؎

مہرِ تو در وجودم و عشقِ تو در سرم
باشیر اندروں شد و با جاں بدر شود

پُشتوں کے حالات پڑھیئے سلسلۂ ربط مُسلسل نظر آئے گا۔ تلمذ اور شاگردی ہی تو نسلاً بعد نسل ملازمت کا تعلق ہے تو موروثی اور پُشتینی۔ یہ کیا دلفریب منظر ہے کہ "اسامی علما و فقرا و اطبائے اسلام" میں حکیم اجیت سنگھ۔ کنور ہیرالال۔ لالہ دیبی پرشاد بھی نظر آتے ہیں۔ راجہ کندن لال نے ہوش سنبھالا تو اپنے آپ کو ایک بخاری سید کے آغوشِ تربیت میں پایا۔ علوم کے سوا اور فنون (شمشیر بازی وغیرہ) سیکھی تو مسلمانوں سے سیکھی۔ مولوی رفیع الدین صاحب دہلوی اُس خاندان کے رُکن رکین تھے جو کئی پشت تک ہندوستان کا مذہبی اور دینی پیشوا رہا۔ اُن کی شفقت دیکھو کہ کندن لال اور اُن کے باپ دونوں کو دامنِ شفقت کے سایہ میں رکھا۔ اُستادوں کی محبت اور عظمت کی تصویر راجہ کندن لال کے یہ الفاظ ہیں۔ مولوی رفیع الدین صاحب کو ان الفاظ سے یاد کیا ہے۔ "قدوۃ العلما الراسخین۔ امام المتاء لہین مولوی محمد رفیع الدین صاحب کہ اُستادِ والدم نیز بودند"۔ شاہ نیاز احمد صاحب بریلوی شیر بیشۂ ولایت تھے۔ یہ بھی راجہ کے موروثی اُستاد ہیں۔ اُن کا ذکر کس شان سے کرتے ہیں۔ "قاموسِ ذخارِ معانی حکمیہ۔ بحرِ محیط مطالبِ عقلیہ مرکز دائرۂ علوم

کاشف، استادِ اخلاق و نجوم محیِ سنن حکمائے متقدمین زبدۂ علمائے متاخرین فخر فلاسفۂ نامدار افتخار علمائے ذی وقار۔ حضرت شاہ نیاز احمد صاحب سرہندی"۔ شاہ عبدالعزیز صاحب کا جہاں نام لیا ہے وہاں اس طرح۔ "زبدۂ حکمائے انام قدوۂ اہلِ حکمت و کلام حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب"۔

ملازمت کا سلسلہ عہد شاہجہانی سے شروع ہوا تو اُس وقت تک رہا جب تک کہ سلطنت مغلیہ میں دم رہا۔ جہاں وہ اپنے بزرگوں کے نام کے ساتھ شاہجہانی، عالمگیری، محمد شاہی لکھتے ہیں وہاں وفاداری و قدردانی کی تصویریں آنکھوں میں پھر جاتی ہیں۔ جب دامنِ دربار ہاتھ سے چھوٹا تو امرا کی سرکار پسند کی۔ دلّی چھوٹی تو رامپور آئے۔ رامپور چھوڑا تو لکھنؤ گئے۔ غرض رہی اسی دائرہ میں۔ یہ وہ دَور ہے کہ زمانہ سکھوں، مرہٹوں، جاٹوں سبھی کے دربار سجا رہا تھا۔ لیکن ان کو کیا۔ ربط جس سے تھا اُس سے تھا۔ راجہ کندن لال نے دوسری ملازمت جس طرح کی اُس کی کیفیت آپ نے پڑھی۔ ملازمتوں کے ساتھ استعفوں کا سلسلہ جاری رہا۔ قنوج کی تحصیلداری چھوڑ کر لکھنؤ چلے گئے۔ اور وہاں تین درباروں نے معزز عہدوں پر ممتاز رکھا۔

اُس عہد کی تعلیم پر نگاہ ڈالو۔ علاوہ علوم کے، مردانہ فنون، استعمال اسلحہ، گھوڑے کی سواری، فنونِ لطیفہ، خوش نویسی، تصویر کشی وغیرہ دائرہ تعلیم سے باہر نہ تھے۔ راجہ کندن لال کی ہمہ گیر طبیعت کا رنگ اُن کی تصانیف، اُن کی مختلف ملازمتوں، اور اُن اہلِ کمال کی فہرست سے ٹپک رہا ہے جن سے وہ ملے۔ یہ ہمہ گیر طبیعتیں وہی تعلیم پیدا کر سکی جس پر صرف قدامت کے جرم میں نفرت کی نگاہیں پڑتی ہیں۔ جس عہد کی "آپ بیتی" راجہ کندن لال نے سنائی ہے وہ انقلاب حکومت اور شورش کا دَور تھا۔ تاہم ہر فن کے اہلِ کمال ہر جگہ کثرت سے نظر آتے ہیں۔ اس سے قیاس کیا جاتا ہے کہ ایک زبردست سلسلۂ تعلیم ملک میں رائج تھا۔ جو بدامنی میں بھی فیض رساں رہا۔ اہلِ ہند کے اہلِ کمال کی فہرست کہہ رہی ہے کہ یہ علوم و فنون کسی برباد کن اثر کے نیچے صدیوں پامال نہیں رہے تھے۔ بلکہ سرپرستی کے اثر سے اب تک اُن میں شگفتگی باقی تھی۔

راجہ کندن لال کی تصانیف میں سے اکسیر سعادت اور منتخب تنقیح اخبار میرے پاس ہیں۔

یہ حالات منتخب کا انتخاب ہیں۔ علاوہ ان کتابوں کے اُن کی بعض اور بھی نفیس علمی یادگاریں (مرقع تصاویر و خطاطی) میرے یہاں موجود ہیں۔ فقط

(رسالہ زمانہ۔ کانپور۔ ماہ جنوری ۱۹۰۶ء)

حضرت خضر علیہ السلام

مسلمانوں میں کم تر اشخاص ایسے ہوں گے جو اس برگزیدہ نام کے ذکر سے رطب اللسان نہ ہوں۔ نام کے ساتھ وہ روایتیں بھی زبانوں پر ہیں جو حضرت خضرؑ کی نسبت مشہور ہیں۔ خصوصاً سکندر و آبِ حیات کا تعلق اور حیات جاوید۔ زندہ دل شعرا نے بھی ان مضامین کو لیا ہے اور سحرِ بیان کی مدد سے ہزاروں بار ان عظام رمیم میں جانِ تازہ ڈالی ہے۔ اس میں شبہ کی کم گنجایش ہے کہ ان روایات کی عام شہرت زیادہ تر شعرا کی جادو بیانی کا نتیجہ ہے۔

شہرت اور حقیقت بہت کم ساتھ رہتی ہے۔ شہرت کی شوخی و چالاکی حقیقت کی سلامت روی و متانت سے بہت آگے بڑھ جاتی ہے اور اکثر جہاں شہرت کا پرچم لہراتا نظر آتا ہے وہاں حقیقت کا نشان بھی نہیں ہوتا۔ جو روایتیں حضرت خضرؑ کے متعلق شہرۂ آفاق ہیں ان کی نسبت یہ بحث کہ آیا وہ کہاں تک محققین کے نزدیک قابل تسلیم ہیں خالی از فائدہ نہ ہوگی۔

لفظ "خضر" مشتق ہے خُضرۃ سے جس کے معنے ہیں سبزی، گندم گونی، نمکینی۔ دو طرح مستعمل ہے خِضر (بکسر خا، و سکون ضاد) دوم خَضِر (بفتح خا، و کسر ضاد) عربی میں ثانی فصیح تر ہے، فارسی میں اول زیادہ مرّوج ہے۔

قرآن مجید کی سورۂ کہف میں خدا کے ایک خاص بندہ سے حضرت موسیٰؑ کے ملنے کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ ارشادِ ربّانی کا ترجمہ و خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

"دو دریاؤں کے ملنے کی جگہ پہونچ کر) انھوں نے (یعنی حضرت موسیٰ اور ان کے خادم نے)

ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ کو پایا جس کو ہم نے اپنی مہربانی میں سے دیا اور اپنی طرف سے اس کو ایک علم سکھایا تھا۔ موسیٰؑ نے ان سے کہا کہ آپ اجازت دیں تو میں آپ کے ساتھ رہوں بشرطیکہ جو علم (لدنی) آپ کو سکھایا گیا ہے اس میں سے کچھ مجھ کو بھی سکھا دیں۔ انھوں نے کہا تم کو میرے ساتھ ہرگز صبر نہ ہو سکے گا، اور جو چیز تمہاری آگہی کے احاطہ سے باہر ہے اس پر تم کیسے صبر کر سکتے ہو۔ موسیٰؑ نے کہا کہ انشاء اللہ آپ مجھ کو ضابط پائیں گے اور میں آپ کے کسی حکم کے خلاف نہ کروں گا۔ انھوں نے کہا اگر تم کو میرے ساتھ رہنا ہی ہے تو جب تک میں تم سے کسی بات کا تذکرہ نہ کروں تم مجھ سے اس کی بابت کچھ پوچھنا ہی نہیں (اس کے بعد کشتی میں سوراخ کرنے، لڑکے کے قتل کرنے اور دیوار بنا دینے کا واقعہ بیان فرمایا گیا ہے۔ آخر میں اس خاص بندے نے اپنے افعال کی حکمت بیان کر کے کہا ہے میں نے جو کچھ کیا اپنے اختیار سے نہیں کیا۔ یہ ہے اصل حقیقت اس کی جس پر تم سے صبر نہ ہو سکا"

کلام مجید میں ان کی نسبت جو ارشاد ہے صرف اس واقعہ کا بیان ہے جو موسیٰؑ کے ساتھ گزرا۔ رہا ان کا زندہ جاوید ہونا یا قصۂ آبِ حیات وغیرہ اس کا ذکر کہیں کلام مجید میں نہیں ہے۔

امام ابن الدین حجر عسقلانی نے اصابہ کے باب الخاء میں خضر علیہ السلام کے متعلق مفصل بحث کی ہے اور ۴۲ صفحوں میں وہ صحیح اور غیر صحیح روایتیں جمع کی ہیں جو اس بارہ میں آئی ہیں۔ حافظ ممدوح جس پایہ کے محقق ہیں وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ بستان المحدثین میں فرماتے ہیں "تصانیف ابن حجر زیادہ بریک صد و پنجاہ کتاب ست وبہتر و محکم تر از تصانیف جلال الدین سیوطی ست .... اتقان و ضبط علم حافظ ابن حجر بیشتر از علم جلال الدین سیوطی ست ہر چند عبور و اطلاع فی الجملہ سیوطی را زیادہ باشد" اپنے داب و دستور کے مطابق موقع بالا پر ابن حجر نے حضرت خضرؑ کی نسبت بھی اس تدقیق سے بحث کی ہے کہ کوئی پہلو نہیں چھوڑا۔ حق جو نگاہ اس کے پڑھنے کے بعد پوری تسلی حاصل کر سکتی ہے۔ حقیقت شناس اہل نظر کے واسطے مضمون بالا کا لب لباب ذیل میں لکھا جاتا ہے۔

خضر (صاحب موسیٰ علیہ السلام) اُن کے نسب، نبوت، طول عمر اور بقا میں اختلاف ہے۔ اگر آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک اور اُس کے بعد تک اُن کے زندہ رہنے کو تسلیم کیا جائے تو ایک قول کے مطابق وہ صحابی کی تعریف میں داخل ہیں۔ مگر متقدمین میں سے کسی نے صحابہ کے ساتھ اُن کا ذکر نہیں کیا حالانکہ اکثر نے اُن اقوال کو قبول کیا ہے جو اُن کے معمّر اور زندہ ہونے کے بارہ میں وارد ہیں۔ جہاں تک معلوم ہو سکے میں نے اُن کے حالات اس باب میں جمع کر کے صحیح اور غیر صحیح ہونے کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔

وجہ تسمیہ مجمن کی روایت ہے "فانہ جلس علی فروۃ بیضاء فاذا ھی تھتز تحتہ خضراء" (ہذا لفظ احمد) یعنی چٹیل زمین اُن کی نشست کی برکت سے لہلہانے لگی تھی۔

نبوت کلام مجید میں حکایت موسیٰؑ کے سلسلہ میں حضرت خضرؑ کا یہ قول منقول ہے "وما فعلتہ عن امری" یعنی میں نے یہ فعل از خود نہیں کیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ فعل مذکور بحکم الٰہی وقوع پذیر ہوا۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ حکم اُن تک کس طرح پہونچا۔ بلا واسطہ[1] آیا ہو۔ یہ بھی[2] احتمال ہے کہ کسی پیغمبر کے ذریعہ سے ہوا ہو۔ یہ احتمال بعید ہے (اس لئے کہ اس کا کوئی قرینہ نہیں) الہام[3] کے ذریعہ سے ہو یہ اس لئے قابل تسلیم نہیں کہ الہام یقینی ہونے میں وحی کا ہم پلہ نہیں اور بدون وحی ایسے امور صادر نہیں ہو سکتے جیسے قتل نفس یا بہت سی جانوں کو خطرۂ غرق میں ڈالنا۔ نبوت مان لینے سے سب پہلو درست ہو جاتے ہیں۔ نیز نبی غیر نبی سے زیادہ عالم کس طرح ہو سکتا ہے۔ حدیث صحیح میں وارد ہے "ان اللہ قال لموسیٰ بل عبدنا خضر" نیز نبی غیر نبی کے تابع کس طرح ہو سکتا ہے۔ ثعلبی کا مقولہ ہے کہ حضرت خضر (تمام اقوال کے موافق) طویل العمر نگاہوں سے پوشیدہ اور نبی ہیں۔ ابو حیان اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ جمہور اُن کی نبوت کے قائل ہیں نیز اس امر کے کہ بذریعہ وحی ان کا علم معرفت[4] باطنی تھا اور حضرت موسیٰؑ کا علم ظاہری۔ حضرات صوفیہ میں ایک گروہ اُن کے ولایت کا قائل ہے۔ علی بن ابی موسیٰ حنبلی اور ابو بکر انباری بھی (نبوت و غیر نبوت کا اختلاف نقل کرنے کے بعد)

لے آتیناہ من لدنا علما۔

ولایت کے قائل ہیں۔ ابو القاسم قشیری اپنے رسالہ میں لکھتے ہیں کہ خضرؑ نبی نہ تھے ولی تھے۔ ماوردی نے ایک قول یہ نقل کیا ہی کہ وہ منجملہ فرشتوں کے ایک فرشتے ہیں۔ ابو الخطاب ابن وجیہ لکھتے ہیں کہ معلوم نہیں وہ فرشتے ہیں یا نبی یا ولی۔ بعض اکابر علما کا قول ہی کہ زندقہ کی بنیاد پر پہلی چوٹ حضرت خضرؑ کی نبوت کا اعتقاد ہے۔ کیونکہ زنادقہ اُن کی ولایت سے اس بات پر استدلال کرتے ہیں کہ ولی پیغمبر سے افضل ہے۔ چنانچہ کسی کا قول ہی "مقام النبوۃ فی برزخ فوق الرسول ودون الولی" یعنی برزخ میں مقام النبوت رسالت سے اوپر اور ولایت سے نیچے ہے۔ نبوت کے تسلیم کرنے کے بعد رسالت کی بحث ہی کہ آیا وہ نبی تھے تو رسول بھی تھے یا نہیں؟ حضرت ابن عباس کا قول ہی کہ وہ نبی غیر مرسل تھے۔ اسمٰعیل بن ابی زیاد محمد بن اسحاق اور بعض اہل کتاب کا یہ عقیدہ ہی کہ وہ اپنی قوم کی جانب مرسل تھے اور اُن کی قوم نے اُن کی رسالت کو قبول کیا۔ ابو الحسن رمانی اور ابن جوزی نے اس کی تائید کی ہی۔ حافظ ابن حجر خلاصۂ بحث فرماتے ہیں کہ "ان غالب اخبارہ مع موسیٰ ھی الدالۃ علی تصحیح قول من قال انہ کان نبیاً" یعنی جو ماجرا حضرت موسیٰؑ کے ساتھ گزرا وہ اُن لوگوں کے قول کا مؤید ہی جو حضرت خضرؑ کی نبوت کے قایل ہوئے ہیں۔

زمانۂ پیدائش

اس عنوان میں جو اقوال منقول ہیں وہ نہ محدثانہ ہیں نہ مورخانہ لہذا نظر انداز کیے جاتے ہیں۔

قصۂ ذوالقرنین

ابن عساکر نے بواسطہ خثیمہ بن سلمان ابو جعفر سے روایت کی ہی کہ اُن کے والد نے روایت کی (جس کا خلاصہ متعلق مدعا یہ ہے) کہ ذوالقرنین کا ایک دوست گروہ ملائکہ میں سے تھا۔ ذوالقرنین نے ایک روز اُس سے درازیٔ عمر کی ترکیب پوچھی تو اُس نے آب حیات کا چشمہ بتلایا جو ظلمات میں تھا۔ ذوالقرنین وہاں گیا۔ حضرت خضر مقدمۃ الجیش تھے۔ ان کو آب حیات ملا ذوالقرنین ناکام رہا۔ خثیمہ بن سلمان نے حضرت جعفر صادق سے انھوں نے اپنے والد ماجد سے مثل بالا روایت کی ہی۔ سلمان اشج صاحب کعب احبار سے یہ روایت کی جاتی ہی کہ خضرؑ ذوالقرنین کے وزیر تھے (سکندر کا نام کسی روایت میں نہیں۔ اس میں بہت بحث ہی کہ ذوالقرنین کون تھا)۔

درازیٔ عمر اس عنوان کے متعلق حسب ذیل روایتیں نقل کی ہیں:۔

نمبر	نام راوی	مضمون روایت	جرح وتعدیل
۱	دارقطنی عن طریق رواد بن الجراح عن مقاتل بن سلیمان عن الضحاک عن ابن عباس	خضرؑ کی اجل میں اس قدر مہلت دی گئی ہے کہ وہ دجال کی تکذیب کریں گے۔	رواد ضعیف ہیں۔ مقاتل متروک ضحاک نے ابن عباس سے سماعت نہیں کی۔
۲	ابو نحیف (کتاب المعمرین)	خلاصۂ احادیث یہ ہے کہ خضر اطول الناس عمراً ہیں۔	
۳	خواجہ حسن بصری	الیاس جنگلوں میں اور خضر دریاؤں میں موکل ہیں پہلے صور کے پھکنے تک اُن کو بقا عطا کی گئی ہے۔ ہر سال دونوں حج کے موقع پر باہم ملتے ہیں۔	یہ روایت بلفظ یُروی ہے
۴	حارث بن ابی اسامہ (فی مسندہ)	آنحضرت نے ارشاد فرمایا ہے کہ خضر بحر میں اور یسع بر میں اور دونوں ہر شب کے اُس سد کے پاس جمع ہوتے ہیں جو درمیان یاجوج ماجوج اور انسانوں کے ہے اور ہر سال حج وغیرہ کرتے ہیں اور تمہاری نہر سے اس قدر پانی پیتے ہیں جو سال آیندہ تک کافی ہوتا ہے۔	اس روایت میں عبدالرحیم وابان ہیں جو دونوں متروک ہیں۔
۵		خضر ما بین بحر اعلیٰ و بحر اسفل منبر نور پر ہیں الخ	اس کے سلسلۂ رواۃ میں عبداللہ بن مغیرہ ہے جو بے اصل روایتیں کرتا ہے (یحدث بما لا اصل لہ) ابن یونس کا قول ہے کہ وہ منکر الحدیث ہے۔

نمبر	نام راوی	مضمون روایت	جرح وتعدیل
۶	ابن شاہین	انبیاء میں سے چار نبی زندہ ہیں: دو آسمان پر عیسیٰ و ادریس دو زمین پر خضر و الیاس الخ	اس کی اسناد ضعیف ہے۔
۷	ثعلبی	ثعلبی نے کہا کہ کہا جاتا ہی (یقال) خضر اُس وقت تک زندہ رہیں گے کہ قرآن اٹھالیا جائیگا	

نووی نے لکھا ہی کہ اکثر علما اُن کے زندہ اور موجود ہونے کے قائل ہیں اور یہ صوفیہ اور اہل صلاح ومعرفت کے نزدیک متفق علیہ ہی۔ اور وہ حکایتیں (جن میں انھیں دیکھنا۔ اُن سے ملنا۔ فائدہ حاصل کرنا اور سوال وجواب مقامات مقدسہ ومواقع خیر میں اُن کا موجود ہونا مذکور ہی) شمار سے باہر ہیں، اور اُن کی شہرت حد بیان سے خارج۔ ابن الصلاح نے اپنے فتاوی میں لکھا ہی کہ وہ جمہور علما اور عامہ صلحا کے نزدیک زندہ ہیں اور اس سے جس نے انکار کیا ہی وہ بعض محدثین ہیں (واتما شذ بانکارہ بعض المحدثین)۔ امام ابن حجر عسقلانی ان دونوں قولوں کی تنقید کرتے ہوے کہتے ہیں۔ بعض متاخرین نے وہ حکایات جمع کی ہیں جو صلحاء وغیرہ سے تیسری صدی ہجری کے بعد نقل کی گئی ہیں (قلت قد اعتنی بعض المتاخرین بجمع الحکایات الماثورۃ عن الصالحین وغیرہم ممن ورد بعد الثلثمائۃ) ان کی تعداد بیس تک نہیں پہونچی۔ ان میں سے بعض کی اسناد میں ایسے لوگ موجود ہیں جن کی تضعیف بوجہ اُن کی کثرت اغلاط یا ایہام کذب کے کی گئی ہی۔ مثلاً ابوعبدالرحمان سلمی اور ابوالحسن بن جہضم۔ یہ کہنا کہ چونکہ تواتر میں راویوں کے ثقہ اور عدل ہونے کی شرط نہیں بلکہ یہ شرط ہی کہ اس خبر کو اس قدر کثیر راوی روایت کریں کہ اُن کا اجتماع کذب پر عادۃً محال ہو۔ اگر سب کے الفاظ ایک ہوں تو فبہا ورنہ جس قدر بیان مشترک ہوگا متواتر سمجھا جائے گا۔ لہذا ان روایتوں سے بھی تواتر معنوی مستفاد ہوتا ہی، صحیح نہیں۔ کیونکہ ان روایتوں کا قدر مشترک یہ ہی کہ خضرؑ زندہ ہیں، لیکن اُس میں یہ خلل ہی کہ بعض کا یہ قول ہی کہ "ہر زمانہ کے خضرؑ جدا ہیں" اور وہ نقیب الاولیا ہیں۔ جب ایک نقیب رحلت کرتا ہی دوسرا اُس کی جگہ مقرر ہو جاتا ہی۔ نئے نقیب کا نام بھی خضر رکھدیا جاتا ہی" یہ وہ قول ہی جو صوفیہ کے ایک

گروہ میں برابر بدون اختلاف متداول رہا ہے۔ اس صورت میں یہ تعین نہیں ہو سکتا کہ جو بزرگ نظر آئے وہ رفیق حضرت موسیٰ تھے یا خضر زمان۔ اس کی تائید اُس اختلاف حلیہ سے ہوتی ہے جو دیکھنے والے بیان کرتے ہیں۔ کوئی بوڑھا بتاتا ہے کوئی ادھیڑ کوئی جوان۔ اور یہ اس پر محمول ہے کہ لوگوں نے مختلف اوقات میں مختلف اشخاص کو دیکھا ہو (وہو محمول علی تغایر المرئی وزمانہ واللہ اعلم) سہیلی نے کتاب التعریف والاعلام میں کہا ہے کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ خضرؑ نے آنحضرت کا زمانہ نہیں پایا صحیح نہیں۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ بخاری اور ایک گروہ محدثین اس امر کے قائل ہیں کہ خضر اول صدی ہجری کے انقضا سے قبل رحلت کر گئے۔ اور ہمارے شیخ ابوبکر بن العربی نے حدیث "لا یبقی علی وجہ الارض" سے اس قول کی تائید کی ہے۔ سہیلی نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ خضر کا آنحضرت سے ملنا اور وفات شریف پر تعزیت اہل بیت کرنا طرق صحاح سے مروی ہے۔ منجملہ اُن کے وہ روایت ہے جو ابن عبداللہ نے تمہید میں نقل کی ہے جو اپنے وقت کے امام حدیث تھے۔ روایت مذکور میں ہے کہ لوگ تعزیت کرنے والے کی آواز سنتے تھے مگر صاحب آواز کو دیکھتے نہ تھے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ یہ خضر ہیں۔ سہیلی کا یہ بھی قول ہے کہ ابن ابی الدنیا نے مکحول کی روایت سے حضرت انس سے الیاس کا آنحضرت سے ملنا روایت کیا ہے۔ اور جب بقاء الیاس عہد قدسی تک تھی تو بقاء خضر بھی جائز ہے۔ ابوالخطاب ابن دحیہ نے بیانات سہیلی پر یہ اعتراض کیا ہے کہ جن روایتوں کی طرف سہیلی نے اشارہ کیا ہے اُن میں ایک بھی صحیح نہیں اور خضرؑ کا اجتماع کسی نبی کے ساتھ سوائے حضرت موسیٰ کے ثابت نہیں (جس کی شکایت کلام الٰہی میں ہے) اور جو روایات اُن کی حیات کے متعلق ہیں اُن میں سے ایک بھی اہل نقل کے نزدیک پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچی۔ جو لوگ اُن کو نقل کرتے ہیں اور اُن کے سقم (ما علیہ) کو بیان نہیں کرتے اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو ناقلین کے علم میں اُس کا نہ ہونا دوسرے سقم کا وضوح اہل حدیث کے نزدیک۔ اور مشائخ نے جو کچھ اس بارہ میں نقل کیا وہ خالی از تعجب نہیں اس لئے کہ ایک خردمند اس کو کیونکر روا رکھ سکتا ہے کہ وہ کسی شخص سے ملے اور وہ یہ کہے کہ میں خضر ہوں اور وہ اس کی تصدیق کرے۔ رہی حدیث تعزیت جس کو ابو عمر نے نقل کیا ہے وہ موضوع ہے

جس کو عبد اللہ بن المحرز یزید بن الاصم سے اُس نے علیؓ سے روایت کیا ہے۔ ابن المحرز متروک ہے جس کی نسبت ابن المبارک نے (جیسا کہ مقدمہ صحیح میں مسلم نے لکھا ہے) فرمایا ہے کہ میں اونٹ کی مینگنی دیکھنے کو ابن المحرز کے دیکھنے سے بہتر سمجھتا ہوں۔ اس طرح اُنھوں نے نجاست کو اس کی روایت سے افضل سمجھا۔ ابن حجر کہتے ہیں کہ حدیث تعزیت اور طریقوں سے بھی مروی ہے جو آگے مذکور ہوں گے۔ حدیث حدیث تعزیت کون موضوع ہے جس کی تکذیب باقوال امام احمد یحییٰ، اسحاق اور ابو زرعہ ثابت ہے اُس کا منشا ظاہر الذکارہ (کھلے طور پر غلط) ہے۔ اور منجملہ مجازفات (لغویات) ہے۔ انتہی ملخصاً کلام ابو الخطاب۔ ابن حجر کہتے ہیں کہ میں حدیث انس کو بطولہ ذکر کروں گا۔ نیز یہ کہ اس کے اور طریقے بھی ہیں سوائے اُس کے جو سہیلی نے لکھا ہے۔ جو لوگ ان کے معمر ہونے کے قایل ہیں وہ آب حیات سے سند لاتے ہیں۔ نیز اُس بیان سے جو صحیح بخاری و ترمذی میں ہے۔ لیکن یہ لحاظ رہے کہ وہ مرفوعاً ثابت نہیں۔

چند حالات حضرت خضرؑ کا ذکر جو بعثت آنحضرتؐ سے پہلے وقوع میں آئے

اس سلسلہ میں مستند وہ ماجرا ہے جو حضرت موسیٰ کے ساتھ کلام مجید میں مذکور ہے اور جو بروایت صحیحین ثابت ہے۔ اس کے بعد وہ روایت ہے جو طبرانی نے معجم کبیر میں حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے کی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ خضرؑ ایک روز بازار سے گزر رہے تھے کہ ایک مکاتب غلام نے آواز دی کہ مجھ کو کچھ دو اللہ تمہارے مال میں برکت کرے گا۔ خضرؑ نے کہا کہ میں خدا پر ایمان رکھتا ہوں جو وہ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔ میرے پاس کچھ نہیں جو میں تجھ کو دوں۔ اُس مسکین نے کہا کہ میں خدا کا واسطہ دے کر تم سے سوال کرتا ہوں۔ میں نے تمہارے چہرہ پر آثار بزرگی دیکھ کر بہبودی کی امید باندھی تھی۔ خضرؑ نے کہا کہ میں خدا پر ایمان رکھتا ہوں میرے پاس کچھ نہیں البتہ تم مجھ کو لے چل کر بازار میں بیچ لو۔ مسکین نے کہا یہ واقعی کہتے ہو۔ کہا۔ ہاں۔ اس لئے کہ تو نے ایک ایسا عظیم الشان واسطہ دیا ہے کہ میں تجھ کو محروم نہیں کر سکتا۔ غلام یہ سن کر اُن کو بازار میں لے گیا۔ اور چار سو درہم کو بیچ دیا۔ مالک نے عرصہ تک تو ان سے کچھ کام

نہیں لیا۔ آخر انھوں نے ایک روز کہا کہ تم نے مجھ کو کسی نفع کے خیال سے خرید ا ہوگا پھر کام کیوں نہیں لیتے۔ مالک نے کہا تمہارے بڑھاپے کی وجہ سے۔ انہوں نے کہا میں کام بے تکلف کر سکتا ہوں۔ مالک نے امتحاناً ایک گراں وزن پتھر اُٹھانے کی ہدایت کی۔ وہ گھر سے باہر گیا تو انھوں نے پتھر اُٹھا کر دوسری جگہ رکھ دیا۔ مالک نے آکر دیکھا تو حیرت میں رہ گیا۔ اور بے ساختہ آفرین کہی۔ ایک بار مالک باہر گیا تو کہا کہ میں تم کو متدین سمجھ کر اپنے بچوں کی نگرانی تمہارے سپرد کرتا ہوں۔ انھوں نے کہا بہتر اور کچھ کام بھی بتلائیے۔ مالک نے کہا زیادہ کام سے تکلیف ہوگی۔ انھوں نے کہا نہیں تکلیف نہ ہوگی۔ غرضکہ مالک نے اینٹیں پاتھنے کی خدمت بھی سپرد کی۔ لوٹ کر دیکھا تو مکان تیار تھا۔ حیرت زدہ ہو کر پوچھا کہ تم کون ہو اور تمہارا کیا حال ہے انھوں نے کہا کہ میں خضر ہوں۔ اس کے بعد مسکین کا قصہ کہا۔ مالک نے یہ سُنا تو معذرت کر کے اُن کو آزاد کر دیا۔ یہ حدیث حسن ہو تو اگر لفظ بقیہ عنعنہ[۱] اس میں نہ ہوتا اور اگر ثابت ہوتی تو یہ ثابت ہو جاتا کہ خضر نبی تھے۔ کیونکہ مالک نے ان سے کہا تھا "یا نبی اللہ"۔

وہ لوگ جو وفات خضرؑ کے قائل ہیں

ابو بکر نقاش نے اپنی تفسیر میں حضرت علی بن موسیٰ رضا اور امام بخاری سے یہ روایت کی ہے کہ خضرؑ مر گئے اور امام بخاری سے حیات خضر کے بابت سوال کیا گیا تو انھوں نے اس حدیث کی بنیاد پر اُن کے زندہ ہونے سے انکار کیا، "لا یبقی علی وجہ الارض ممن ھو علیہا احد" یہ حدیث انھوں نے حضرت ابن عمرؓ سے اپنی صحیح میں روایت کی ہے۔ جو لوگ وفات خضرؑ کے قائل ہیں اور اُن کی بقا کے منکر اُن کی یہ عمدہ دلیل ہے۔ ابو حیان اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ مذہب جمہور یہ ہے کہ خضرؑ نے وفات پائی۔

ابن ابی الفضل سے منقول ہے کہ خضر صاحب موسیٰ نے رحلت کی۔ اس لئے کہ اگر زندہ ہوتے تو اُن پر آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہونا آپ پر ایمان لانا اور آپ کا اتباع کرنا لازم ہوتا[۲] حالانکہ آپ سے یہ ارشاد مروی ہے کہ اگر موسیٰ زندہ ہوتے تو اُن پر بھی میرا اتباع لازم ہوتا۔ انھوں نے

---

[۱] اس جملہ سے نفحہ ۱ بی تک حیات کی نفی ثابت نہیں ہوتی۔ معین الدین [۲] اس کی نفی بھی ثابت نہیں۔

اشارہ کیا ہے کہ خضر اور ہیں اور صاحب موسیٰ اور۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ ہر زمانے کے لئے ایک خضر ہیں اور یہ دعویٰ بلا دلیل ہے۔ ابو الحسن بن المبارک نے جو کتاب احوال خضر میں جمع کی ہے اُس میں وہ ابراہیم حربی کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ خضر نے رحلت کی۔ اسی کا یقین ابن المنادی نے کیا ہے۔ انھوں نے یہ حدیث بھی نقل کی ہے۔ "عن علی بن موسی الرضا عن سالم بن عبداللہ بن عمر عن ابیہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم ذات لیلۃ بعد صلوۃ العشاء فی اخرحیاتہ فلما سلم قال ارایتکم لیلتکم ھذہ فان علی راس ماتہ سنۃ لا یبقی علی وجہ الارض احد" اخرجاہ' واخرج مسلم من حدیث جابر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم قبل موتہ بشہر تسألونی الساعۃ وانما علمہا عند اللہ اقسم باللہ ما علی الارض نفس منفوسۃ یاتی علیہا مأۃ سنۃ۔ ھذہ روایۃ ابن الزبیر عنہ وفی روایۃ نضرۃ عنہ قال قبل موتہ بقلیل او بشہر ما من نفس وزاد فی اٰخرہ وھی یومئذ حیۃ واخرج الترمذی عن طریق ابی سفیان عن جابر نحو روایۃ ابن الزبیر۔ ابن الجوزی نے جو کتاب اس موضوع پر لکھی ہے اُس میں لکھا ہے کہ ابو یعلی حنبلی کہتے ہیں کہ ہمارے بعض اصحاب سے خضر کی بابت سوال کیا گیا کہ آیا انھوں نے رحلت کی تو جواب دیا کہ ہاں وہ کہتے ہیں کہ مجھ کو بھی قول ابو طاہر عبادی کا پہونچا ہے۔ اور وہ یہ دلیل پیش کرتے تھے کہ اگر وہ زندہ ہوتے تو آنحضرت کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتے[1]۔

ابن حجر یہ لکھ کر کہتے ہیں کہ ابو الفضل بن ناصر، قاضی ابوبکر بن العربی اور ابوبکر نقاش بھی انھیں بزرگوں کے ہم خیال تھے۔ ابن جوزی وفات خضرؑ پر اس حدیث سے بھی استدلال کرتے ہیں جس کو امام احمد نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے کہ اگر موسیٰ زندہ ہوتے تو اُن کو سوائے میرے اتباع کے کچھ چارہ نہ ہوتا۔ جب آنحضرت نے حضرت موسیٰ کی نسبت یہ فرمایا تو حضرت خضرؑ کو بطریق اولی اتباع کرنا پڑتا۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو آپ کے ساتھ ضرور جمعہ و جماعت میں شریک ہوتے آپ کے علم زیر سایہ جہاد کرتے۔ جس طرح یہ ثابت ہے کہ حضرت عیسٰی اس امت کے امام

---

[1] حضرت عیسٰی بھی زندہ ہیں مگر ایک مرتبہ بھی حاضر خدمت نہیں ہوئے۔

کے پیچھے نماز پڑھیں گے۔ نیز اس آیت سے استدلال کرتے ہیں۔ "واذ اخذ اللہ میثاق النبیین" الآیہ۔ ابن عباس فرماتے ہیں کہ جس نبی کو اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا اُن سے یہ عہد لیا کہ اگر اُن کی حیات میں آنحضرت مبعوث ہوں تو وہ اُن پر ایمان لائیں اور اُن کی مدد کریں۔ پس اگر خضرؑ عہد مبارک میں زندہ ہوتے تو آپ کے پاس آتے اور آپ کی مدد ہاتھ اور زبان سے کرتے اور آپ کے علم کے نیچے جہاد کرتے۔ اور یہ بڑا سبب اہلِ کتاب کے اسلام لانے کا ہوتا۔ کیونکہ اُن کے اور حضرت موسیٰ کے قصے سے واقف تھے۔ ابن منادی کہتے ہیں کہ میں نے زندگی خضر اور اس امر سے کہ آیا وہ زندہ ہیں یا نہیں بحث کی ہے۔ اس سلسلے میں میں نے دیکھا کہ اکثر بے خبر اس دھوکے میں ہیں کہ وہ اب تک زندہ ہیں۔ اُن کے خیال کا منشا وہ روایات ہیں جو اس بارہ میں آئی ہیں۔ اُن روایتوں کا حال یہ ہے کہ احادیث مرفوعہ اس بارہ میں واہی ہیں اور اہل کتاب کی طرف جو روایتیں منسوب ہیں وہ اس لئے قابل اعتبار نہیں کہ وہ لوگ خود قابل اعتماد نہیں۔ مسلمۃ ابن مصقلہ کی روایت بمنزلہ خرافات ہے اور روایت ریاح مثل ریح (باد ہوائی) اُن کے سوا بھی جس قدر روایتیں ہیں وہ سب واہی الصدر والاعجاز (بے سروپا) ہیں۔ وہ دو حال سے خالی نہیں یا تو ثقات نے نادانستہ اُن کو روایت کر دیا ہے۔ یا بعض نے قصداً ایسا کیا ہے حالانکہ اللہ پاک ارشاد فرماتا ہے۔ "وما جعلنا لبشر من قبلک الخلد" یعنی ہم نے تم سے پہلے کسی آدمی کو بقا نہیں بخشی۔ اہل حدیث ناقل ہیں کہ حدیث انس منکر السند سقیم المتن ہے۔ اور یہ کہ خضرؑ نے ہمارے نبی سے نہ بذریعہ ایلچی گفتگو کی اور نہ ملاقات کی۔ اگر خضر زندہ ہوتے تو وہ آنحضرت سے الگ نہیں رہ سکتے تھے اور ہجرت اُن پر واجب ہوتی۔ اور مجھ کو ہمارے اصحاب نے خبر دی ہے کہ ابراہیم حربی سے حیات خضرؑ کی بابت سوال کیا گیا تو انھوں نے انکار کیا۔ اور کہا وہ پہلے ہی رحلت کر چکے۔ اُن کے سوا اوروں سے بھی سوال کیا گیا تو یہ جواب دیا کہ جو شخص زندہ غایب یا میت کا حوالہ دے اُس نے اُس کے حق میں انصاف نہیں کیا۔ اور یہ خیال انسانوں میں شیطان نے القا کیا ہے۔ انتہیٰ۔ ابن حجر کہتے ہیں کہ میں نے اُن روایات کی تصریح کی ہے جن کی طرف ابن منادی نے اشارہ کیا ہے۔ اور اُن پر بہت کچھ اضافہ کیا ہے۔ اُن کا غالب حصہ خالی از علت نہیں۔ واللہ المستعان

تفسیر اصبہانی میں ہے کہ حسن بصری سے روایت کی گئی ہے کہ ان کا مذہب یہ تھا کہ خضر نے وفات پائی۔ امام بخاری سے سوال کیا گیا تو انھوں نے خضرؑ والیاسؑ دونوں کی زندگی سے بربنا حدیث "راس مأتہ سنۃ" انکار کیا۔ ابن جوزی اُن کی وفات پر اُس دعا سے بھی استدلال کرتے ہیں جو آنحضرت نے غزوۂ بدر کے موقع پر کی تھی یعنی اے اللہ اگر تو اس گروہ (مومنین) کو ہلاک کردے گا تو پھر تیری زمین پر عبادت نہیں کی جائے گی۔ خضرؑ گروہ مذکور میں شامل نہ تھے۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو اس میں شامل ہوتے؛ اس لئے کہ وہ یقینی عبادت الٰہی کرنے والوں میں سے تھے۔ بعض نے حدیث "لا نبی بعدی" سے بھی استدلال کیا ہے۔ لیکن ابن وجیہ نے اس پر مفصل گفتگو کی ہے اور اس دلیل پر اعتراض کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ قطعاً نبی ہیں تاہم وہ آخر زمانے میں زمین پر تشریف لائیں گے اور بموجب شرع محمدی احکام جاری کریں گے۔ پس مطلب حدیث یہ ہے کہ نبی جدید مبعوث نہ ہوگا۔ جو پہلے سے نبی ہیں اُن کے وجود کی نفی نہیں۔

(یہ بیان کہ حضرت خضر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں موجود تھے اور آج تک موجود ہیں) جو روایتیں ابن حجر نے اس عنوان کے تحت میں لکھی ہیں اُن کو بہ شکل نقشہ ہم نقل کرتے ہیں۔ نقشہ کے دیکھنے سے واضح ہوگا کہ وہ روایتیں قریباً سب کی سب ضعیف و مجروح ہیں اور اُس پایہ کی نہیں جن کو بموجب اصطلاح محدثین "صحیح" کہہ سکیں؛ کوئی صحاح ستہ کی روایت نہیں بلکہ اُن کتابوں کی ہیں جو اُن کے رتبہ کی نہیں۔

نمبر	نام راوی	خلاصۂ روایت	جرح
۱	کامل[1] ابن عدی بروایت	آنحضرت نے مسجد میں ایک شخص کی دعا کی	اس روایت میں کثیر بن عبداللہ بن عاصم سے
	ابن عوف۔	آواز سنی کہ وہ یہ دعا کر رہا ہے "اللھم	صرف وضاح نے روایت کی ہے اسی روایت
	ابن[2] المنادی	اعنّی علی ما ینجینی مما خوّفتنی"	میں محمد بن سلام منفرد ہے۔ ابن المنادی کہتے
	ابن[3] العساکر	آپ نے سن کر فرمایا کہ اُس کے دوسرے	ہیں کہ یہ حدیث واہی ہے۔ بسبب وضاح
	طبرانی[4] (اوسط)	جز کو کیوں نہیں ملاتا۔ اتنے میں اُس شخص	وغیرہ کے وہ منکر الاسناد مستقیم المتن ہے۔

نمبر	نام راوی	خلاصہ روایت	جرح
.	ابن حجر کہتے ہیں کہ علاوہ ان کے دو ذریعوں سے اور بھی یہ روایت آئی ہی۔ ابن شاہین۔ دارقطنی (افراد)	انھوں نے کہا "اللهم ارزقنی شوق الصالحین الی ما شوقتهم الیه" یہ سن کر آپ نے حضرت انس سے فرمایا کہ اس شخص کے پاس جا کر کہو کہ رسول اللہ کی تم سے فرمائش ہی کہ میرے لئے استغفار کرو۔ حضرت انس نے یہ پیغام پہونچایا تو اس شخص نے کہا کہ تم رسول اللہؐ کے رسول ہو تو لوٹ کر جاؤ اور اس کو ثابت کرو۔ وہ آئے اور ماجرا سنایا آپنے فرمایا نعم (ہاں ہو) اس شخص نے جب یہ سنا تو کہا جاؤ اور یہ کہو کہ آپ کو اللہ نے انبیاء پر اسی طرح فضیلت بخشی ہی جس طرح رمضان کو اور مہینوں پر اور آپ کی امت کو ایسا فضل بنایا ہے جیسے جمعہ کو باقی ایام پر حضرت نے ان کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ خضرؑ ہیں۔	خضرؑ نے آنحضرتؐ سے نہ بالواسطہ گفتگو کی اور نہ ملاقات۔ ابن الجوزی نے اس کو اس بنا پر مستبعد سمجھا ہی کہ باوجود ملاقات کے موقع کے خضر آپ کی خدمت میں نہ آئے۔ ابن عساکر نے ابن خالد کے واسطے سے روایت کی ہی دارقطنی کی روایت میں محمد بن عبد اللہ ہے جو نہایت واہی الحدیث ہے۔
۲	(فوائد) ابن اسحٰق	اس روایت میں حضرت الیاسؑ کا بھی ذکر ہے کہ وہ ہر سال حج کے زمانے میں باہم ملتے ہیں۔ الخ	دارقطنی کا قول ہی کہ ابن جریج سے اس کو حسن بن رزین کے سوا کسی نے روایت نہیں کیا۔ ابو جعفر عقیلی کہتے ہیں کہ اس کی پیروی نہیں کی گئی اس لئے کہ وہ مجہول ہی اور اس کی حدیث غیر محفوظ۔ ابن المنادی کہتے ہیں کہ یہ حدیث واہی ہی کیونکہ اس کے راوی [illegible] ذکر ہے۔

نمبر	نام راوی	خلاصہ روایت	جرح
۳		روایت بالا طریق احمد بن عمار کے سوا اور طرح بھی آئی ہی بواسطہ مہدی بن ہلال	ابن الجوزی نے لکھا ہی کہ دارقطنی کے نزدیک احمد بن عمار متروک ہی علیٰ ہذا القیاس مہدی بن ہلال موضوعات کی روایت کرتا ہے۔
۴	بواسطہ عبید بن اسحاق	حضرت جبرئیل و میکائیل و اسرافیل و خضرؑ ہر عرفہ کو باہم ملتے ہیں۔ الخ	عبید بن اسحاق متروک الحدیث ہے۔
۵	عبداللہ بن احمد (کتاب زہد)	الیاسؑ و خضرؑ بیت المقدس میں شہر رمضان میں باہم ملتے ہیں۔ الخ	معضل ہے
۶	ابو علی (فوائد)	آنحضرت کا ارشاد کہ الیاس و یسع ہر سال حج میں ملتے ہیں۔ الخ (مقاتل کا قول ہی کہ یسع اور خضر ایک ہیں)	ابن الجوزی کہتے ہیں کہ یہ روایت یقینی موضوع ہی۔ اس کا راوی عبدالرحیم متہم ہی ابن حبان اس کی نسبت لکھتے ہیں کہ وہ حدیث وضع کرتا ہی۔
۷	ابن شاہین	مکحول از واثلہ بن الاسقع سے راوی ہیں کہ غزوہ تبوک میں حضرت الیاس سے حضرت حذیفہ و انس بحکم حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم ملے۔ الخ	ابن الجوزی نے لکھا ہی کہ شاید بقیہ نے اُس کو کسی کذاب سے سنا اور اوزاعی کے نام سے روایت کر دی۔ ابن حجر کہتے ہیں کہ اوزاعی سے بقیہ کے سوا اوروں نے بھی دوسری طرح اس کو روایت کیا ہے۔
۸	ابن ابی الدنیا	حضرت انس ایک غزوہ میں حضرت الیاسؑ سے ملے۔ الخ	اس کے رواۃ میں یزید و اسحاق ہیں جن کی نسبت ابن الجوزی نے لکھا ہی کہ وہ غیر معلوم ہیں (لا یعرفان)
۹	ابن عساکر	حضرت خضرؑ و الیاسؑ بیت المقدس میں روزہ رکھتے ہیں۔ الخ	
۱۰	عبداللہ بن احمد (زیادات الزہد)	ابن ابی رواد نے کہا ہی کہ خضر و الیاس بیت المقدس میں روزہ رمضان رکھتے ہیں۔	

نمبر	نام راوی	خلاصۂ روایت	جرح
۱۱	ابن جریر طبری (تاریخ)	حضرت خضر اولادِ فارس میں اور حضرت الیاس بنی اسرائیل میں ہیں ہر سال موسم حج میں ملتے ہیں۔	

اُن روایتوں کا ذکر جو بقاء الخضر بعد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان میں آئی ہیں اور وہ روایتیں جن میں رویت خضر مذکور ہی۔ (جس پایہ کی یہ روایتیں ہیں وہ ایک نظر میں معلوم ہو سکتا ہی)

نمبر	نام راوی	خلاصۂ روایت	جرح
۱	فاکہی (کتاب مکہ) و زبیر (کتاب النسب)	حضرت جعفر صادق اپنے والد بزرگوار حضرت امام باقر کی خدمت میں حاضر تھے وہاں ایک شخص آئے اور گفتگو کی۔ بعد کو معلوم ہوا کہ وہ خضر تھے۔	
۲	ابن عساکر	ولید بن الملک سے خدام مسجد نے بیان کیا کہ حضرت خضر ہر شب کو مسجد میں نماز ادا کرتے ہیں۔	
۳	ابراہیم الجبلی (کتاب الدیباج)	ایک شخص ساکن بیت المقدس سے روایت ہی کہ وہ حضرت الیاس سے ملا اور اُس نے اُن سے بقاء خضرؑ کا سوال کیا تو جواب ثبات میں ملا۔ وغیر ذالک۔	ابن حجر کہتے ہیں کہ اس میں جہالت ہے اور متروک الحدیث راویوں سے مروی ہے۔ (فیہ جہالۃ ومتروکون)
۴	ابن ابی حاتم و محمد بن منصور جزار و واقدی و محمد بن ابی عمر۔	حضرت خضرؑ نے بوقت غسل حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعزیت کی اس طرح کہ نگاہوں سے غائب تھے۔	ابن منصور اپنی روایت کی نسبت کہتے ہیں کہ اُس میں محمد بن صالح ہی جو ضعیف ہی۔ ابن حجر کہتے ہیں کہ واقدی نے بھی روایت کی ہی اور وہ کذاب ہی۔ ابن جوزی نے کہا کہ محمد بن ابی عمر مجہول ہی۔ ابن حجر نے محمد بن ابی عمر کے مجہول ہونے پر اعتراض کرتے ہیں کیونکہ وہ مسلم وغیرہ آئمہ کے

نمبر	نام راوی	خلاصۂ روایت	جرح
			شیخ اور ثقہ حافظ و صاحب مستند مشہور ہیں۔
۵	ابن حجر عن شیخہ ابی الفضل	قریباً مضمون بالا۔	اس میں محمد بن جعفر ہیں جن کی نسبت امام بخاری کا قول ہے آخرہ اسحاق رونق منہ۔
۶	بیہقی	بمضمون بالا۔	اس روایت میں حضرت خضرؑ کا ذکر نہیں بلکہ ملائکہ کا تعزیت کرنا مذکور رہے۔
۷	سیف بن التیمی	"	اس کی سند میں کلام ہے اور سیف کا شیخ غیر معروف ہے۔
۸	ابن ابی الدنیا	"	اس کی اسناد میں عباد ہے۔ عقیلی اور امام بخاری نے اس کی تضعیف کی ہے۔
۹	طبرانی (اوسط)	"	اس میں بھی عباد مذکور ہے۔ طبرانی کہتے ہیں تفرد بہ عباد عن انس۔
۱۰	ابن شاہین (کتاب الجنائز)	حضرت عمر کے عہد میں حضرت خضرؑ ایک جنازہ کی نماز میں شریک ہوئے۔	اس کی اسناد کی نسبت ابن جوزی کہتے ہیں کہ اُس میں مجہول ہے نیز ابن المنکدر اور عمر کے درمیان انقطاع ہے۔
۱۱	ابن ابی الدنیا	ایک شخص مال بیچنے میں قسم کھاتا تھا ایک شیخ نے اُس کو ٹوکا اور نصیحت کی آخر میں شیخ ممدوح کی نسبت لکھا ہے "کانوا یرون انہ خضرؑ"۔	
۱۲	ابو عمرو بن سماک (فوائد)	حضرت عمر نے کے شخص کو خضر کہا۔	راویوں میں علی بن عاصم ہیں جو بقول ابن الجوزی ضعیف وسئ الحفظ ہیں۔ ابن الجوزی کا قول ہے کہ اس روایت کو احمد بن محمد بن مصعب نے بھی بیان کیا ہے۔ یہ منجملہ وضاعین حدیث

نمبر	نام راوی	خلاصۂ روایت	جرح
			ہی- اور اُس کی روایتوں میں مجہول راویوں کا ایک سلسلہ ہی- ابن حجر لکھتے ہیں کہ میں نے اس روایت کا ایک جید طریقہ پایا ہی جو بیہقی کی دلائل النبوۃ میں ہی- لیکن اُس کے اخیر میں راوی کہتا ہی "کانہم کانوا یرون انہ خضرا والیاس" یعنی لوگوں کا اب خیال تھا کہ شاید وہ خضر یا الیاس تھے-
۱۳	ابن[1] ابی الدنیا و دینوری[2] (محاسبیہ)	حضرت علیؓ کو طواف میں خضر ملے-	
		(واحمد[3] بن حرب نیشاپوری ومحمد[4] بن معاذ ہروی (حضرت سفیان ثوری سے) یہ روایت کی ہے-	
۱۴	سیف (فتوح)	حضرت سعد بن ابی وقاص کا مع ایک جماعت کے ابو محجن کو جنگ کرتے دیکھنا بطوالت مذکور ہی- اخیر میں ہے "وہم لا یعرفونہ ما ہو الا الخضر"[3] یعنی اُن کے علم میں وہ سوائے خضر کے اور کوئی نہ تھے- اس سے مستنبط ہوتا ہی کہ وہ بزرگ اس وقت میں موجود خضری کا عقیدہ رکھتے تھے-	
۱۵	ابو عبد اللہ بطہ	حضرت خضر[3] نے مسئلہ قضا و قدر میں محاکمہ کیا ہی-	روایت کا راوی ابین ابن سفیان متروک الحدیث ہی-
۱۶	حماد بن عمر واحد المنزریت	ایک غلام اہل بیت نے تباہی حجاز کے بعد دریا میں خضر کو دیکھا-	

نمبر	نام راوی	خلاصہ روایت	جرح
۱۷	امام احمد (کتاب الزہد) و ابونعیم (حلیہ)	ایک شخص نے باغ میں دوسرے شخص کو نصیحت کی۔ اخیر میں معمر کا قول لکھا ہی کہ لوگوں کی رائے تھی کہ وہ (ناصح) خضر تھے۔	
۱۸	ابراہیم راوی مسلم	قاتل دجال خضر ہوں گے (آخر حدیث ابوسعید قصہ دجال)۔	
۱۹	ابونعیم (حلیہ) سوائے ابونعیم کے اوروں نے بھی یہ روایت نقل کی ہی۔	سفیان بن عیینہ کو طواف میں ایک بزرگ ہے اور اُن کو نصیحت کی انھوں نے یہ حال سفیان ثوری سے کہا تو انھوں نے کہا کہ کیا عجب ہی کہ وہ خضر ہوں یا ابدال میں سے کوئی ہو۔	
۲۰	طبرانی (کتاب الدعا)	سلیمان بن عبد الملک کے عہد میں ایک شخص پر الزام قتل تھا وہ روپوش ہوکر جنگل جنگل بھاگا پھرتا تھا صحرا میں ایک مرتاض بزرگ ہی۔ انھوں نے حال سن کر ایک دعا بتائی وہ دعا پڑھ کر سلیمان کے سامنے گئے تو وہ ملائم ہوگیا۔ تبدیل حالت پر اُس کو تعجب ہوا تو قصہ پوچھا اُس شخص نے تمام ماجرا جنگل کا بیان کیا سلیمان نے سنکر کہا کہ وہ بزرگ خضر تھے۔	
۲۱	ابونعیم (حلیہ) بسند تاریخ سراج و بروایت محمد بن ذکوان۔	رجاء بن حیوۃ تابعی مشہور سلیمان بن عبد الملک کے پاس تھے کہ ایک بزرگ نے آکر اُن کو حاجت روائی خلق کے متعلق نصیحت کی پھر غائب ہوگئے۔ تابعی مدوح کی رائے تھی کہ وہ خضر تھے۔	

نمبر	نام راوی	خلاصۂ روایت	جرح
۲۲	زبیر بن بکار	ایک بزرگ دوسرے بزرگ سے ملے۔ خاتمۂ روایت میں بزرگ کا قول ہے کہ "فظننته انه الخضر" میں نے گمان کیا کہ وہ خضر تھے۔	
۲۳	ابو الحسن المنادی	ابو عمر نصیبی سلمۃ بن مصقلہ سے (جن کا شمار ابدال میں کیا جاتا ہے) ملے انھوں نے (ایک بزرگ کو دیکھ کر حضرت الیاس خیال کرنے پر اُن سے مل کر گفتگو کرنے ساتھ کھانا کھانے پھر اُن کے غائب ہو جانے کا) قصہ بیان کیا۔	ابن جوزی اس روایت کے ایک سے زاید راویوں کو غیر معلوم بتاتے ہیں۔
۲۴	داؤد بن ہمدان	ایک بزرگ سے مل کر اُنھوں نے سوال کیا تو اُنھوں نے کہا "خضر ہوں"۔	
۲۵	"	ابو جعفر منصور نے طواف میں ایک شخص کو دیکھا جو ظہور فساد کا شکوہ کر رہا تھا پھر اُس نے مبالغہ سے ابو منصور کو نصیحت و پند کی اُس کے بعد چلا گیا اور باوجود تلاش نہ ملا۔ منصور نے کہا یہ خضر تھے۔	
۲۶	ابن عساکر	ابراہیم تیمی کو حضرت خضر نے ایک ہدیہ دیکر کہا کہ میں خضر ہوں۔	
۲۷	ابو الحسن[۱] ابن المنادی و دینوری[۲] (مجالسہ) و یعقوب[۳] بن سلیمان (تاریخ) وغیرہ و ابو نعیم[۴] (حلیہ)	حضرت عمر بن العزیز نے حضرت خضر سے ملاقات کی۔ ابن حجر کہتے ہیں کہ اس باب میں جس قدر روایتیں میں نے دیکھی ہیں اُن سب سے یہ بہتر ہے۔ و ابن حجر[۵] (فوائد ابو عبداللہ الرازی)	
۲۸	ابو عبد الرحمٰن	بلال الخواص حضرت خضر سے ملے اور امام شافعیؒ اور	

نمبر	نام راوی	خلاصۂ روایت	جرح
		امام حنبل و بشر بن الحارث کی بابت سوال کیا۔	
۲۹	ابو نعیم (حلیہ)	بلال الخواص نے خواب میں حضرت خضر کو دیکھا۔ اس میں بھی امام احمد و بشر بن الحارث کی نسبت وہی سوال و جواب ہیں جو اوپر کی روایت میں ہیں۔	
۳۰	ابو الحسن بن جہضم	حضرت بشر بن الحارث نے حضرت خضر کو اپنے حجرہ میں دیکھا۔	
۳۱	عبد المغیث	عن ابن عمر ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال ما یمنعکم ان تکفروا ذنوبکم بکلمات اخی الخضر فذکر نحو کلمات المذکورۃ فی بشر۔	
۳۲	ابو نعیم	ابو اسحق مرستانی نے خضر کو دیکھا اور ان سے دس کلمات کی تعلیم پائی۔	
۳۳	ابو الحسن بن جہضم	ابو عمران الخیاط سے حضرت خضرؑ کی ایک گفتگو نقل کرتے ہیں۔	ابن جہضم معروف بالکذب
۳۴	حسن بن غالب	اپنا ملنا حضرت خضر سے بیان کرتے ہیں۔	ابن الجوزی کا قول ہے کہ حسن بن غالب کی تکذیب محدثین نے کی ہے۔ (حسن بن غالب کذیوہ)
۳۵	ابن عساکر (بسند صحیح)	ابو زرعہ کی ملاقات حضرت خضرؑ سے۔ ابو زرعہ کے الفاظ ہیں "فخیل کی انہ الخضر"۔	
۳۶	ابن ابی حاتم (جرح و تعدیل) و نعیم بن میسرہ	عبد اللہ بن بکر نے کتاب الزہد میں ایک شخص کا کلام نقل کیا ہے جس کو انھوں نے دیکھا اور جو کلام کرکے غائب ہوگیا۔ شخص مذکور کا خیال تھا کہ وہ حضرؑ تھے "وکان یری انہ الخضر"۔	

نمبر	نام راوی	خلاصۂ روایت	جرح
۳۷	ابن حجر (اخبار ابراہیم بن ادہم)	بروایت ابراہیم بن بشار خادم حضرت ابراہیم بن ادہم کیفیت ملاقات حضرت خضر۔	
۳۸	عبدالمغیث بن زہیر (فی الکتاب الذی جمع فی احوال خضر)	تین روایتیں امام احمد بن حنبل کی ملاقات خضر کی بابت۔	عبدالمغیث کی روایتیں امام احمد سے ثابت نہیں۔ ابن الجوزی۔
۳۹	"	حضرت معروف کرخی نے کہا کہ مجھ سے خضر نے گفتگو کی۔	ومن این یصح ہذا عن معروف۔ ابن الجوزی۔

ابوحیان اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اہل صلاح میں سے بہت سوں نے مبالغہ کے ساتھ بعض صلحا کی ملاقات خضر کو بیان کیا ہے۔ امام ابوالفتح قشیری اپنے ایک شیخ کے حضرت خضر کو دیکھنے اور کلام کرنے کا تذکرہ کیا کرتے تھے۔ جب اُن سے کسی نے کہا کہ اُن کو یہ کس نے بتایا کہ یہ خضر ہیں اور تم اُس کو پہچانتے ہو تو وہ خاموش ہو گئے۔ (فقیل لہ من اعلمہ انہ الخضر وانت عرفت ذالک فسکت) انھوں نے کہا ہے کہ بعض کا قول ہے کہ ہر زمانہ کے لئے ایک خضر ہیں۔ میں (ابن حجر) کہتا ہوں کہ اس میں یہ تسلیم ہے کہ خضر مشہور رحلت کر گئے۔

ابوحیان کہتے ہیں کہ عبدالواحد حنبلی کے شاگردوں کو اعتقاد تھا کہ وہ خضر سے ملتے ہیں۔ ابن حجر سے اُن کے شیخ ابوالفضل عراقی نے نقل کی کہ شیخ عبداللہ یافعی کا عقیدہ تھا کہ حضرت خضر زندہ ہیں۔ میں نے جب کہا کہ امام بخاری اُن کی وفات کے قائل ہیں تو وہ غصہ ہوئے اور کہا جو ان کو مردہ بتائیگا میں اُس پر غصہ ہوں گا۔ یہ سن کر شیخ نے اعتقاد فوت خضر سے رجوع کیا۔ حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ بعض ایسے لوگ میں نے دیکھے جو حضرت خضر سے ملنے کا دعویٰ رکھتے تھے۔ منجملہ اُن کے قاضی علم الدین تھے جو عہد سلطان الظاہر برقوق میں مالکیوں کے قاضی تھے (خلاصۃً ما فی الباب) ملاقات حضرت موسیٰ و حضرت خضر علیہما السلام کا واقعہ بنص قرآنی ثابت ہے۔ اُن کی نبوت بقول اصح محقق ہے ذوالقرنین

کی وفات و آبِ حیات کا ذکر ضعیف روایتوں میں ہے۔ درازیٔ عمر[3] میں بہت بحث ہے۔ اُس کی موئد روایات اکثر ضعیف اور مشکوک ہیں۔ محققین[4] (جن کے سرگروہ حضرت امام علی رضا و امام بخاری ہیں) اُن کی وفات کے قائل ہیں۔ نیز اُن کی حیات جاوید بقول ابن المنادی خلاف نص قرآنی ہے۔ امام[5] ابو القاسم قشیری نے ایک گروہ اہل باطن کا یہ قول لکھا ہے کہ ہر زمانے کے لئے ایک خضر ہوتے ہیں۔ جب وہ وفات پا جاتے ہیں دوسرے اُن کی جگہ ہو جاتے ہیں۔

(رسالۂ الندوہ لکھنؤ۔ بابتہ مارچ و مئی ۱۹۰۷ء)

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

مکرمی ایڈیٹر صاحب۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ براہ کرم مندرجۂ ذیل تحریر اپنے اخبار میں شائع فرما دیجئے:

۸ر شعبان ۱۳۲۹ھ مطابق ۴ر اگست ۱۹۱۱ء جمعہ گزشتہ کو عین نماز جمعہ کے وقت میرے منجھلے لڑکے محمد عزیز عرف "چھٹو میاں" نے رحلت کی۔ یہ ایک امانتِ الٰہی تھی جو تیرہ[13] برس میرے سپرد رہی اور اب واپس لے لی گئی۔ رضینا بقضاء اللہ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

میں نے بشری کمزوریوں کے ساتھ کوشش کی تھی کہ اس امانت کا حق اپنی بساط کے مطابق ادا کروں۔ ابتدا سے تعلیم و تربیت کا اہتمام پیش نظر رہا تھا۔ مذہبی پابندی کی عادت ہوش سنبھالنے کے بعد ہی ڈلوائی گئی تھی۔ نتیجہ یہ کہ چلّے کے جاڑوں میں بھی صبح کی نماز اول وقت جماعت سے اپنے بھائیوں کے ساتھ بے تکلف اور بے تاکید ادا کرتا تھا۔ خواجہ حسن نظامی صاحب ایک مرتبہ یہاں آئے تھے۔ دلّی جا کر مجھ کو خط بھیجا تو اُس میں لکھا کہ "نمازی بچّے مجھ کو یاد آتے ہیں"۔ روزے نہایت شوق سے رکھتا تھا۔ اگرچہ کم عمری کے سبب میں روکتا تھا، تاہم جہاں تک اُس کے امکان میں ہوتا روزوں کی تعداد بڑھانے کی کوشش کرتا۔ سالِ ماسبق میں کچھ روزے میں نے نہیں رکھنے دیے تو ملول رہا۔ بہت نوعمری سے گھوڑے پر نہایت دلیری اور بے باکی سے سوار ہوتا تھا۔ سواری کی مشق

باقاعدہ کرائی گئی تھی۔ شکار کا بھی شوق تھا۔ خصوصاً کتوں کے شکار کا۔

فارسی میں کسی قدر استعداد ہو جانے کے بعد عربی شروع کرائی گئی تھی۔ اب عربی میں قال اقوال اور قدوری پڑھتا تھا۔ انگریزی میں پانچویں جماعت کی خواندگی جاری تھی۔

مرضِ وفات۔ بخار اور موتی جھارا ہوا۔ بخار شدید دو ہفتہ سے زائد رہا، ایک سو پانچ ڈگری تک پہنچ جاتا تھا۔ اس سخت موسم میں مرض کی سختیاں نہایت صبر اور خاموشی کے ساتھ برداشت کیں۔ کبھی اضطراب یا گھبراہٹ کا اظہار نہیں کیا۔ شدت بخار میں بھی کسی نے پوچھا کہ طبیعت کیسی ہے تو یہی جواب دیا کہ "اچھی ہے" سوائے اس کلمہ کے دوسرا کلمہ نہیں کہا۔ سرسامی اثر دور کرنے کے واسطے اطبا نے مرغ سر سے بندھوایا تھا۔ اُس کی گرمی سے بے قرار ہو کر اُس کے ہٹانے پر اصرار کیا۔ میں نے کہا "میاں تھوڑی دیر رکھا رہنے دو" تو کہا "بہت تکلیف ہوتی ہے"۔ یہ کلمہ دو مرتبہ ادا کیا۔ اس پر میں نے کہا کہ حکیم صاحب نے تمہارے آرام کے واسطے یہ دوا بندھوائی ہے تھوڑی دیر اور بندھی رہنے دو۔ یہ سن کر نہایت استقلال سے سکوت اختیار کیا، اور ایک کلمہ زبان سے نہیں نکالا۔ یونانی و ڈاکٹری دونوں علاج نہایت اہتمام سے ہوئے، لیکن بے سود۔ آخر میں علاج ڈاکٹری ہوا، اور غذا و دوا کی بھرمار حسب قاعدہ ہوئی۔ مگر میرے بچے نے بے دریغ اُن کا استعمال کیا۔

میں اپنے دلی احباب کی اطلاع کے واسطے یہ سطور شائع کرتا ہوں۔ اور فرداً فرداً خط نہ بھیجنے کی معافی چاہتا ہوں، جو امید ہے کہ عطا ہوگی۔

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۹ اگست ۱۹۱۱ء)

جناب چودھری نور اللہ خاں صاحب مرحوم رئیس سہاور ضلع ایٹہ

شہرت اور خوبی اکثر جمع نہیں ہوتیں - ہزاروں شہرتیں خوبی سے خالی ہوتی ہیں اور ہزاروں خوبیاں شہرت سے ناآشنا - خوبیاں شہرت سے عاری ہوں تو اُن پر کچھ حرف نہیں آسکتا - شہرت خوبی سے بے بہرہ ہو تو داغ بدنامی ہے اور بہ چشم حقیقت ناکامی - خوبیاں مشہور نہ ہونے سے دوسروں کو یہ نقصان پہنچتا ہے کہ وہ لاعلمی کے سبب اُن کی قدر اور پیروی سے محروم رہ جاتے ہیں۔

جناب چودھری نور اللہ خاں صاحب مرحوم (جن کا کچھ ذکر ذیل کی سطور میں کیا جائے گا) اُن کی ذات بہت سی خوبیوں کی جمع تھی، مگر عرفی شہرت کی کبھی ممنون احسان نہ ہوئی - وہ اس کے طالب بھی نہ تھے - اگر طالب شہرت ہوتے تو وہ حقیقی عزت جو اُن کو حاصل ہوئی ہرگز نہ ہوتی - جن دلوں میں شہرت طلبی کا ولولہ رہتا ہے اُن پر حقیقی صفات کا رنگ کم چڑھتا ہے - اعلیٰ خوبیوں کا طبیعت ثانیہ بن جانا چاہتا ہے ایک عمر کی یکسوئی اور یک جہتی کے ساتھ کوشش اور ممارست کو۔

یہ چودھری صاحب مرحوم ضلع ایٹہ کے معزز نامور رئیس تھے - ۱۲۵۵ھ میں پیدا ہوئے "مظہر علی" تاریخی نام تھا - اُن کا گھرانا پشتہا پشت سے رئیس و باعزت رہا ہے - گزشتہ رواج کے مطابق اُن کی تعلیم رسمی تو محض معمولی تھی، مگر جن بزرگوں کی انھوں نے صحبت اٹھائی اور جو مثالیں اُن کی زندگی کا سانچہ بنیں اُن کے فیضِ صحبت سے ایسی صفات کے جامع تھے کہ بڑے بڑے تعلیم یافتوں کے واسطے نمونہ بن سکتے تھے - چوہتر برس کی عمر پائی - اس طویل عمر کو جس پاکیزگی اور وضع داری سے نباہ گئے وہ ایک کارنامۂ زندگی ہے - ایک صدی کے ان تین چوتھائی حصوں نے عالم میں کس قدر عظیم الشان تغیرات دیکھے ہیں، اور کیسے کیسے انقلابوں کا تجربہ کیا ہے، مگر چودھری صاحب کی ذات اُن کی زد سے بچی ہوئی تھی - وضع، عادات و حرکات میں اپنے نیک سلف کے طریقہ پر قائم تھے - ارکانِ مذہبی کے نہایت پابند تھے - صبح، عصر، مغرب، عشاء، اور جمعہ کی نماز باجماعت پابندی

کے ساتھ مسجد میں پڑھا کرتے تھے۔ مسجد مکان سے بہت قریب نہ تھی۔ وہاں تک پہنچنے میں نشیب و فراز بھی تھا۔ تاہم اخیر وقت تک حاضری مسجد کی پابندی قائم رہی۔ رمضان مبارک کے روزے مسجد میں نمک کے ریزے یا کھجور سے افطار ہوتے تھے۔ یہ بھی ایک عادت تھی جو ساری عمر ساتھ رہی۔ تلاوتِ کلام مجید کے اوقات بھی معین تھے۔ ایک عرصہ سے تہجد کے بھی پابند تھے۔

عادات نہایت شائستہ مگر بہت مستحکم اور مضبوط تھیں۔ برآمدہ میں ایک جانب چوکی بچھی رہتی تھی، اس پر ہلکی گدا اور گاؤ تکیہ لگا رہتا۔ صبح کی نماز اور دیگر ضروریات سے فارغ ہو کر دوپہر تک اور پھر بعد ظہر اس چوکی پر نشست ہوتی تھی۔ اور آنے جانے والوں، کاروبار کے آدمیوں اور اہل حاجت کے واسطے اذنِ عام ہوتا تھا۔ کوئی موسم ہو، کیسی ہی سردی گرمی ہو، اس میں فرق نہ آتا تھا۔ عصر کی نماز کے بعد ہوا خوری کے واسطے جنگل کو تشریف لے جاتے اور مغرب کے وقت واپس آتے تھے۔ آندھی آئے، بارش ہو، اس میں تغیر نہ ہوتا تھا۔

عام میوہ جات سے شوق تھا، خصوصاً آم اور تربوز سے خاص رغبت تھی۔ موسم میں تربوز مشہور مقامات سے اہتمام کے ساتھ منگوائے جاتے، خود کھاتے اوروں کو کھلاتے۔ آم کے شوق نے فیض عام کا ایک سلسلہ جاری کر دیا تھا جو سالہا سال تک مخلوق کو آرام اور راحت پہنچائے گا۔

ریاست میں (خصوصاً قصبۂ سہاورمیں) جس نے باغ لگانے کا شوق کیا، عمدہ موقع سے اس کو بلا لگان اراضی عطا کی۔ سہاور جاؤ اور دیکھو اس کا نواح کیسا سرسبز و شاداب ہے اور پتے پتے کی زبان حال پر چودھری صاحب کے فیض کا ذکر ہے۔ خود بھی باغ لگانے اور درختوں کے پرورش کرنے کا سلسلہ اخیر دم تک جاری رکھا۔ آم کی قلم اپنے ہاتھ سے نہایت شوق سے لگاتے تھے، اور جب قلم پختہ ہو جاتا تو لوگوں کو باغ میں نصب کرنے کے واسطے عنایت ہوتا۔ آموں پر جس وقت سے بور آتا تھا، شام کی ہوا خوری کے وقت باغوں کے درختوں پر تفصیل وار نگاہ ڈالتے تھے۔ بہار کا اندازہ فرماتے کہ کس قدر آئی۔ ایک ایک درخت کی بابت جس قدر واقفیت ان کو تھی شاید خود مالکانِ باغ کو اس سے زائد نہ ہو گی۔

علاوہ میوجات کے، کھانے کی چیزوں میں دہی کا بہت شوق تھا۔ لازم تھا کہ ہر کھانے پر دہی ضرور ہو۔ جو دعوت کرتا عمدہ دہی کا اہتمام کرتا۔ دہی آ گیا ہمہ نعمت آ گئی۔

مخلوق کی رضاجوئی کا یہ عالم تھا کہ بہت کم نگاہ ملا کر بات کرتے تھے۔ اور سخت و سست کلام اُن کی زبان سے مدت العمر میں غالباً متعدد ہی مرتبہ نکلا ہوگا۔ جس کسی نے دعوت کی خواہ وہ کسی مرتبہ کا ہو اُس کے یہاں کھانا کھانے چلے جاتے تھے بلحاظ مرتبۂ ظاہری اعزہ اور متوسلین کو ہمیشہ ناگوار رہا، مگر چودھری صاحب نے کبھی اس کی پروا نہ کی۔

حلم اور استقلال ضرب المثل تھا۔ غصہ سے گویا واقف ہی نہ تھے۔ جب سخت سے سخت مخالف مقابلہ کر کے ہر طرف سے مایوس ہو جاتا، بے تکلف اُن کے پاس چلا آتا۔ معمولی معذرت چودھری صاحب کی نگاہ کو نیچا کر دیتی۔ اور سوائے عفو کے کوئی چارہ نظر نہ آتا۔ اب مخالف غالب ہوتا تھا اور چودھری صاحب مغلوب۔ وہ اپنی مرضی کی شرطیں قبول کرا کر ہٹتا۔ قصبۂ سہاور میں دو سال طاعون کی نہایت شدت رہی۔ دوسری مرتبہ شدت کے ساتھ کئی مہینے قائم رہا اور قصبہ کے بہت سے عمائد اُس کا شکار بنے۔ سینکڑوں آدمی آبادی چھوڑ کر بھاگ گئے اور بیسیوں گھر ویران ہو گئے۔ چودھری صاحب کے استقلال اور جوشِ ہمدردی ان موقعوں پر جس شان سے نمایاں ہوا وہ یادگار رہے گی۔ قصبہ سے باہر جانا کیا معنی اپنے کمرہ سے بھی نہیں ہٹے۔ دوسری مرتبہ کے طاعون میں جب خود اُن کے مکان میں چوہے مرے اور تعفن کے سبب تکلیف ہوئی تو بس اتنا کیا کہ دوسرے کمروں میں چلے گئے۔ یہ طوفان اُٹھے اور فرو ہو گئے مگر اُن کے استقلال کے لنگر نے جگہ سے جنبش نہ کی۔ اُن کی ہمت و ہمدردی ایک مخلوق کی تسلی و ہمت کا باعث رہی۔ چودھری صاحب ان امتحان کے موقعوں پر مخلوق الٰہی کی ہمدردی میں بلالحاظ قوم و ملت ہمہ تن مستعد اور محو رہے۔ تیمارداری فرماتے، تجہیز و تکفین میں شریک ہوتے۔ ایسا بھی ہوا کہ ایک جنازہ دفن کر کے لوٹے ہیں، دوسرا راستہ میں مل گیا، وہیں سے پھر واپس چلے گئے۔ شب کو سوتے سے بچارے مصیبت زدہ آدمی اُٹھا دیتے تھے اور چودھری صاحب کشادہ دلی کے ساتھ اُن کی ضرورتوں کا اہتمام فرما دیتے۔

باوجود اپنے مذہب کی پابندی کے اُن کے اخلاق وہمدردی کا دائرہ وسیع تھا۔ اُن کے دماغ یا برتاؤ میں مسلمان اور ہندو کا نیا مسئلہ (جو سخت قابل نفرت ہی) کبھی نہیں آیا اور شاید انھوں نے کبھی اس کا احساس بھی نہ فرمایا ہو۔ ہندوؤں کے ساتھ ایسا برتاؤ تھا کہ سہاور کے گرد و نواح کے ہندو اُن پر دل سے فدا تھے۔ اور اُن کے اوصاف کی عقیدت ہندوؤں کے دلوں میں بشری اوصاف سے کسی قدر بڑھ کر تھی۔ دیکھو اس روش کا نتیجہ۔ اُن کی وفات کا ماتم ہندوؤں میں مسلمانوں سے کم نہیں، بلکہ کچھ زائد ہی ہوگا۔ جنازہ جب تیار ہو چکا تو صدہا ہندو صحن خانہ میں بھرے ہوئے تھے اور رو رو کر التجا کرتے تھے کہ آخری درشن ہم کو کرادو۔ جنازے کی نماز میدان میں ہوئی۔ وہاں بھی ہندوؤں کی یہ کثرت تھی کہ نماز کی صفوں سے ہندوؤں کا علیحدہ ہونا دشوار ہوگیا، بلکہ نہ ہو سکا۔ باوجود قدیم روش کے جدید مفید باتوں سے بے لگاؤ نہ تھے۔ اخبار بینی پابندی سے ہوتی تھی۔ شروانی اسکول (چھرّہ) جب قائم ہونے لگا اور میں نے اُس کی مختصر اسکیم پیش کی اور نقشہ دکھایا، تو پسند فرمایا اور ایک سو بیس روپیہ سالانہ چندہ مقرر کر دیا۔ یہ وعدہ پتھر کی لکیر تھا۔ اخیر زمانہ تک چندہ جاری رہا۔ ریاست کورٹ ہوگئی تو کاغذات کورٹ میں اندراج کرادیا اور محکمہ کورٹ سے سالہا سال ملتا رہا۔ مسلم یونیورسٹی فنڈ کو پانسو روپے دیئے۔

اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں پر فدا تھے۔ پھوپی زاد بھائیوں (میرے والد اور عم مرحوم) کا اس درجہ پاس و ادب ملحوظ رکھتے تھے کہ حقیقی بھائیوں سے بھی (اس زمانہ میں) ممکن نہیں۔ بھائیوں کے بعد اُن کی اولاد کے ساتھ بزرگانہ شفقت قائم رکھی۔

طبیعت نہایت غیور اور فیاض تھی۔ اہل حاجت کے ساتھ سلوک کا سلسلہ علانیہ و خفیہ جاری رہتا تھا۔

ریاست میں بیش قرار اضافے کئے، اور جس قدر ریاست و جائداد اُن کو ترکہ میں ملی تھی اُس سے غالباً المضاعف اپنے ورثاء کے واسطے چھوڑی ہی۔ ایک زمانہ میں ریاست زیر بار قرضہ ہوگئی تھی۔ حکام کی مہربانی و توجہ سے کورٹ ہوگئی اور قرضہ سے پاک و صاف ہوکر واگزاشت کردی گئی۔ آخر

وقت تک صحت نہایت عمدہ رہی۔ تمام اعضا و قویٰ سے تندرستی کے آثار نمایاں تھے۔ صورت ایسی پاکیزہ اور نورانی تھی کہ اسم با مسمّیٰ تھے۔

ایک مورخ نے مادۂ تاریخ وفات "نور اللہ تربتہ" نکالا ہے۔ یہ مادہ حضور نظام مرحوم کے واسطے بھی نکالا گیا تھا، لیکن اس موقع پر زیادہ موزوں ہے۔

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۱۲ء)

علامہ سید رشید رضا اور اخبارات مصر

(بخدمت جناب ایڈیٹر صاحب علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ)

جناب من! السلام علیکم۔ مجکو اجازت دیجیے کہ امر حق کے اظہار واسطے آپکے مفید اخبار میں شایع ہونے کے لیے چند سطور ارسال کروں۔

یہ سن کر دلی قلق ہوا ہے کہ بعض اخبارات مصر (مثل ترکی۔ ایڈیٹر) نے جناب مولانا سید محمد رشید رضا صاحب کے سفر ہند کو داغ دار کرنے کی غرض سے کچھ ایسی باتیں شایع کی ہیں جس سے جناب ممدوح کے کارناموں پر حرف آنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ سخت تعجب ہے کہ اخبار "وکیل" (امرتسر) کے ایڈیٹر صاحب نے بھی ان کی تائید کی ہے اور لکھا ہے کہ لکھنؤ میں جلسہ ندوۃ العلماء کے موقع پر ان کی تقریر کا وہ حصہ جو گورنمنٹ برطانیہ کی تعریف کے متعلق تھا بے توجہی سے سنا گیا۔ لکھنؤ کے اجلاس ندوۃ العلماء اور کالج کے جلسہ میں برابر مجکو حاضری کا اتفاق ہوا، علی گڑھ میں علامہ مصری کی دو تقریروں کی ترجمانی میں نے کی۔ ان دونوں موقعوں پر ہرگز ہرگز سید صاحب نے اس خوشامدانہ پیرایہ میں گورنمنٹ برطانیہ کی تعریف نہیں کی جس کا الزام یہ مصری اخبارات دے رہے ہیں۔ کالج میں تو مطلق اس بحث کو چھیڑا ہی نہیں۔ لکھنؤ میں البتہ اس پیرایہ میں ذکر کیا تھا کہ مسلمانان مصر و ہند کو گورنمنٹ برطانیہ کے زیر سایہ جو امن و آزادی ہر قسم کی ترقیات کی حاصل ہے اس کے ہوتے ہوئے اگر وہ ترقی سے غافل

رہیں تو یہ خود اُن کا قصور ہے اور کوئی عذر اُن کا پذیرا نہیں ہو سکتا۔ اور یہ بالکل حق بجانب اور برمحل تھا۔ رہا اہل جلسہ کا اس حصّہ کو بے توجہی سے سننا، یہ بھی خلاف واقع ہے۔ میں نے اول سے آخر تک دیکھا کہ تمام جلسہ محو سماعت تھا، کثرت سے ایسے لوگ تھے جو سمجھتے نہ تھے تاہم خود دقتیں تھے۔ سمجھنے والے برابر احسنت و آفریں کی صدا بلند کرتے رہے۔ دیوبند میں حاضر ہونے کی سعادت مجھ کو حاصل نہیں ہوئی، تاہم وہاں کی اسپیچ میں نے پڑھی ہے۔ اس میں بھی کوئی ایسی بات نہ تھی جو جبار مصر کی تائید کر سکے۔

سید محمد رشید رضا صاحب نے اپنے اخلاص و اخلاق وسعت معلومات پختہ مغزی اور ہمدردی امت کا جو نقش مسلمانان ہند کے دل پر چھوڑا ہے وہ اتنا گہرا اور دیرپا ہے کہ مذکورہ بالا قسم کے بہت سے بیانات بھی اُس کو مٹا نہیں سکتے۔ علامہ سید محمد رشید رضا صاحب یقین فرمائیں کہ ان کے محاسن (اور یادداشت گزاری) کے ساتھ ہمارے دلوں میں جاگزیں ہیں اور مسلمانان مصر باور کریں کہ اُن کے علم نے دیارِ ہند میں مصر کا نام اور زیادہ روشن کر دیا ہے۔

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۱۲ اگست ۱۹۱۲ء)

مسلم یونیورسٹی

بدگمانی اور ایک عَلَم بردار علم قوم سے!!!

"اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا"

۱۹۱۱ء کی آمد مسلمانان ہند کے حق میں فصل بہار کی آمد تھی۔ اُس وقت کے نشاط و انبساط پر خیال کرو تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ قدرت نے جان فزا مستقبل کا نظارہ دکھلا کر اہل اسلام کو فرحت و سرور سے سرشار کر دیا تھا۔ جادو نگار شعراء نے فصل بہار اور بہار عید کی جو تصویریں کھینچی ہیں اُن کے دیکھنے

سے مبالغہ کا تصور آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ لیکن جن لوگوں نے لکھنؤ اور لاہور کے آغا خانی خیر مقدم کا عالم دیکھا ہے وہ کہہ سکتے ہیں کہ سارے مبالغے واقعات بن گئے تھے اور خیالی طلسم اصلیت کی صورت میں نگاہ کے سامنے جلوہ گر ہوگیا تھا۔ اس گرمیِ ہنگامہ کا اصلی باعث یہ نشاط افزا امید تھی کہ حضور ملکِ معظم جارج پنجم کی رونق افزائی کے موقع پر مسلمانوں کی پنجاہ سالہ آرزو بر آئے گی اور مسلم یونیورسٹی کا چارٹر ہلالِ عید بن کر نمایاں ہوگا۔

مسلم یونیورسٹی کی مختصر تاریخ

ہر واقعہ گزر جانے اور ہر ایجاد موجود ہو جانے کے بعد عام نگاہوں میں معمولی بات معلوم ہونے لگتی ہے، لیکن حکمت آشنا طبائع ماضی کے اہم واقعات کے پہلوؤں پر عبرت کی نظر ڈالتی اور حال و استقبال کی مشکل کشائی میں اُن سے مدد لیتی ہیں، موجودہ مشکلات پر غور کرکے ہمت کا سبق حاصل کرتی اور ترقی و ایجاد کے میدان میں قدم بڑھاتی ہیں۔ اب جبکہ ہم مشکلات میں پھنسے ہوئے ہیں، تو مسلم یونیورسٹی کی تاریخ پر نظر ڈالنا سبق آموز ہوگا۔

سر سید احمد خاں مرحوم نے جب مسلمانوں کی تباہ حالی اور آیندہ کی بہبود پر غور کیا تو اُن کی دوربین نظر نے پالیا کہ تباہی کا باعث جہالت اور آیندہ ترقی کی تدبیر علم کی اشاعت ہے۔ وہ اسی دُھن میں ولایت گئے۔ وہاں کی تعلیم گاہوں کو بہ نظر غور دیکھا اور کامل فکر و تدبر کے بعد ایک عظیم الشان تعلیمی منصوبہ لے کر واپس آئے۔ اُس منصوبہ کی شکل اُن کی تحریروں اور تقریروں میں صاف اور دلکش پیرایہ میں عیاں ہے، اور مجسم تصویر بے نظیر محمدن کالج ہے۔ سر سید نے خوب سمجھ لیا تھا (اور کیا خوب سمجھا تھا!) کہ مسلمانوں کی ترقی و بہبود وابستہ ہے اُس اعلیٰ تعلیم کے ساتھ جو جامع ہو قدیم و جدید علوم کی اور شامل ہو شریفانہ تربیت اور اصول صحت کی ممارست پر۔ انھوں نے دیکھا کہ سرکاری کالج اور اسکول ان مراتب کے لحاظ سے ناقص ہیں، اس لیے مسلمانوں کی تعلیم کا اہتمام خود اپنے ذمہ لیا۔ ابتداءً اگرچہ وہ بے یار و مددگار تھے لیکن عزم سچا تھا اور ارادہ پکا۔ تائید غیبی نے دست گیری کی۔ علی گڑھ کی پرانی چھاؤنی کے وحشت خیز خارستان میں اُس دور بیں فدائی امت کو وہ عظیم الشان درس گاہ

صاف نظر آرہی تھی جو آج چشم بد دور نونہالانِ قوم کے دم قدم سے رشکِ چمن ہے اور جس کی تکمیل کے سامان برابر ہو رہے ہیں۔ لارڈ لٹن نے جس روز بنیادی پتھر رکھا تھا اُسی روز سرسید نے اپنے ایڈریس میں کہہ دیا تھا کہ یہ بنیاد کسی اسکول یا کالج کی نہیں ہے، بلکہ ایک عظیم الشان یونیورسٹی کی ہے جو مسلمانوں کے درد کی دوا بننے والی ہے۔ اُس وقت کے محمڈن کالج کے چھپر دیکھتے ہوئے اس خیال پر "جھونپڑوں میں رہ کر محلوں کا خواب دیکھنے" کی مثل پورے طور پر صادق آتی تھی۔ لیکن وہ خواب سچا تھا اور آج اس کی تعبیر ایک عالم کے سامنے ہے۔ سرسید نے باہمہ جوانمردی و ہمت مسلم یونیورسٹی کا ایک ناتمام نقش زمین پر چھوڑا جو مشہور غنیم اور صدمات کے اثر سے مٹنے پر آمادہ تھا۔ ممالک مغربی و شمالی (حالی صوبجات متحدہ آگرہ واودھ) کا ایک حصہ، ذرا سا گوشہ صوبۂ بہار کا، ملک پنجاب، یہ وہ ممالک تھے جو وفات کے وقت سرسید کے زیرنگیں تھے۔ چونکہ جمہور امت محمدیہ سرسید کے مذہبی خیالات سے بیزار تھی اس لئے تعلیمی معاملات میں کشادہ دلی کے ساتھ اُن کی معاون نہیں ہوئی۔ لیکن اُن کے پولیٹکل خیالات کو امت نے سمع و رضا کے ساتھ سنا اور نہایت مضبوطی کے ساتھ اپنی آیندہ فلاح کا دستور العمل بنایا۔ یہ وجہ ہے کہ سرسید وفات کے وقت بمقابلہ سابق زیادہ ہر دل عزیز ہوگئے تھے مرحوم نواب محسن الملک اور مسٹر بیک نے اپنی حذاقت و فراست سے موقع کی نبض پر ہاتھ رکھا، اور یادگار سرسید کے پیرایہ میں قوم کو یونیورسٹی از سرِنو یاد دلائی۔ اس تحریک کو کامیابی ہوئی لیکن آج اُس کا ذکر وہ

گل آورد سعدی سوئے بوستاں
بشوخی و فلفل بہ ہندوستاں

کا مصداق ہے۔ تاہم اس تحریک کے ذکر کو ہماری تعلیمی کانفرنس نے گوناگوں کوششوں سے تازہ رکھا۔ کہتے ہیں کہ عالم میں رونق و گرمیٔ ہنگامہ آفتاب عالمتاب کے دم سے ہے۔ اس میں کلام نہیں ہو سکتا کہ اس دور میں مسلم یونیورسٹی کی رونق و گرم بازاری صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی سرگرم کوشش سے بہت کچھ وابستہ رہی۔ اس کوشش کا انتہائی عروج امرتسر کا وہ پر جوش جلسہ کانفرنس تھا جس میں یونیورسٹی کا رزولیوشن پیش ہو کر عہد قدیم از سرِ نو تازہ کیا گیا۔ بارہ سال کے عرصہ میں چوبیس لاکھ روپیہ فراہم

کرنا اس عہد کا سرمایہ تھا۔ مگر ہماری ہمت کا اُس وقت تک کا رنگ کہہ رہا تھا کہ کانفرنس کی کاغذی تجویزوں کی فہرست میں ایک نمبر اور بڑھا۔ یہ سب کچھ صحیح ہی کہ سرسید نے نقشِ ناتمام چھوڑا، محسن الملک اور بیک کو پوری کامیابی نہیں ہوئی، کانفرنس کی تجویز نے تکمیل کا منہ نہیں دیکھا۔ لیکن چالیس سال کی مسلسل کوشش اور کانفرنس کے صوبہ بہ صوبہ اور شہر بہ شہر جلاسوں نے اعلیٰ سے لیکر ادنیٰ تک یہ خیال دلوں میں پیدا کر دیا کہ ہمارے مرض کا علاج ہی تو تعلیم ہی۔ یہ کہنا کہ قومی ولولہ ظہور کا بہانہ ڈھونڈھتا تھا اور اتفاقاً بہ شکل مسلم یونیورسٹی ہویدا ہو گیا، واقعات کا خون کرنا اور ہمدردوں کی کوششوں پر خاک ڈالنا ہی۔ علاوہ تعلیم کے کوئی اور کوشش کرو کبھی وہ جوش پیدا نہ ہو گا۔ جن لوگوں نے مسلم یونیورسٹی کے متعلق دور افتادہ دیہات اور حلقۂ مستورات میں خدمت کی ہی وہ اس سے بخوبی واقف ہیں کہ تعلیم اور کالج کو ترقی دینا کوئی اجنبی کام نہ تھا جس کی نوعیت اور کیفیت اپنی اپنی سمجھ کے مطابق اُن کے مخاطب نہ سمجھتے۔ بلکہ جس وقت مسلم یونیورسٹی کا مفہوم اُن کے سامنے اس پیرایہ میں بیان کیا جاتا تھا کہ اس کے حاصل ہونے سے مسلمانوں کی دینی و دنیاوی تعلیم کا اعلیٰ انتظام ہو جائے گا اور محمڈن کالج تکمیل کو پہنچ جائے گا، تو وہ اس کو اپنی ایک دیرینہ مراد کا بر آنا خیال کرتے اور فوراً چندہ دینے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔

انسان کی کوشش رائگاں نہیں جاتی۔ لیکن کام تائیدِ غیبی سے بنتے ہیں اور ؎

غیرتِ حق بہانہ می جوید

چالیس سال کی متواتر سعی کے بعد وہ زمانہ آیا کہ امت کامیابی کا دلربا چہرہ دیکھے۔ ملک میں غلغلہ اٹھا کہ حضور ملک معظم جارج پنجم کے قدوم شوکت لزوم سے ہندوستان رشک گلستاں بنا چاہتا ہی اور برسوں کے بعد شاہی و شہریاری کے جلوے پھر اس سرزمین پر نظر آئیں گے۔ مسٹر محمد علی (ڈاکسن) کی فراست نے موقع شناسی کی، اور انھوں نے ٹرسٹیان محمڈن کالج کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ بادشاہ سلامت کی رونق افروزی کی یادگار میں وہ سائنس اسکول (جو ورود ولیعہدی کی یادگار ہی) دس لاکھ کے چندہ سے سائنس کالج بنا دیا جائے۔ یہ تجویز ٹرسٹیوں کے سامنے آئی لیکن اس پر جس عزم دل بستگی

سے غور ہوا اس کا میں عینی شاہد ہوں - اگر جلسہ میں خود تحرک نہ ہوتے تو اُس کا پاس ہونا محال تھا -
تجویز کے پاس ہونے کے وقت خیالات کا رجحان اس طرف تھا کہ دس لاکھ چندہ ہونا تو معلوم تاہم
کچھ نہ کچھ ہو رہے گا - صبح صادق کا نور بتدریج عالم میں پھیلتا ہے - آخر کار ہز ہائی نس سر آغا خاں نے
اس عظیم الشان تحریک کا علم ہاتھ میں لیا جس کے پرچم پر مسلم یونیورسٹی کا طغرا نقش تھا - انھوں نے
مسلمانوں کو بتایا اور یقین دلایا کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ دیرینہ مرادیں پوری ہوں اور جس آب
حیات کی قوم قرنوں سے تشنہ ہے اُس کے دریا ملک میں بہہ جائیں اور دولت برطانیہ کے زیر سایہ
خود مسلمان اپنی دینی و دنیاوی تعلیم کا اعلیٰ پیمانہ پر بندوبست کر سکیں - یہ مفہوم تھا اُن توقعات کا جو اُن
الفاظ میں پوشیدہ تھیں کہ حضور ملک معظم کے قدوم کی یادگار میں مسلمانوں کو مسلم یونیورسٹی کا چارٹر مل
جائے گا - اس تحریک کا اہل اسلام نے جس جوش و حوصلہ سے خیر مقدم کیا وہ عالم پر آشکارا ہے - سرمایہ
کی تعداد کا مطالبہ جوشِ قومی کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا گیا - دس لاکھ سے بیس لاکھ ہوئے، بیس لاکھ
سے پچیس اور پچیس سے تیس، اور یہ واقعہ ہے کہ آج تیس لاکھ سے زائد سرمایہ مسلم یونیورسٹی کمیٹی کے ہاتھ
میں ہے - اور اس میں شبہ کی گنجائش نہیں کہ اگر قومی جوش سے پورا کام لیا جاتا، تو وصول شدہ رقم کی
تعداد دگنی ہو چکی ہوتی - "اذا اراد اللہ شیئاً ھیا اسبابہ" تحریک مسلم یونیورسٹی کے واسطے نہ صرف
روپیہ ملا، بلکہ بہت سے کام کے آدمی میدان عمل میں سرگرم کوشش نظر آنے لگے - سر آغا خاں، راجہ
صاحب محمود آباد، نواب وقار الملک بہادر، ملک مبارز خاں، شوکت علی، ڈاکٹر ضیاء الدین اور بہت
سے دوسرے بزرگوں کے نام مسلم یونیورسٹی کی کتابوں پر صدہا سال تاباں رہیں گے - فراہمی سرمایہ
کے ساتھ ساتھ فدائیان ملت کی توجہ قواعد و قوانین مرتب کرنے کی جانب بھی مبذول رہی - حکام
والا مقام کے مشوروں سے نفع اٹھایا، آزاد اہل الرائے سے مشورہ لیا اور کوشش و مباحثہ کے
بعد مسلم یونیورسٹی کے قواعد مرتب کئے (اور ایسے مرتب کئے کہ مخالف بھی حیرت سے انگشت بدنداں
رہ گئے) -

مسلم یونیورسٹی کی موجودہ تحریک کی جان یہ ہے کہ ادنیٰ و اعلیٰ، اور سوسائٹی اور مذہب کے تمام طبقوں

اور فرقوں نے یکساں ہمدردی اور شوق کے ساتھ باہم مل کر اس کی تکمیل میں کوشش کی ہے۔

موجودہ مشکلات

"ہر جا کہ گل ست خارست" ایک پرانا مقولہ ہے جس کو ہزاروں تجربوں کا نظر کہنا چاہیے۔ جبکہ قوم اپنی کامیابی کے نشہ میں چور اور باغ امید کے نظارہ سے مسرور تھی اُس کو مایوسی کی مہیب شکل نظر آنے لگی۔ ٹھوکر بہ اندازہ رفتار لگتی ہے۔ اس ٹھوکر نے تمام قوم کو اس سرے سے دوسرے تک ہلا دیا۔ اب اس جنبش کو سنبھالنا اور قوم کو صراط مستقیم سے نہ بھٹکنے دینا رہنمایانِ قوم کا نازک فرض ہے۔ خداوند تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ مسلمان اس معرکہ سے خیر و خوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہو سکیں گے۔ جو سرکاری مراسلے حال میں شائع ہوئے ہیں اُن سے ان تمام توقعات کو صدمہ پہنچا ہے جو مسلم یونیورسٹی کے ساتھ وابستہ تھیں۔ اندرونی انتظام آزاد نہ ہوگا، دائرہ الحاق کا پرکار صرف سرزمین علی گڑھ پر گردش کرے گا "مسلم" کا نعم البدل "علی گڑھ" ہوگا اور ہماری یونیورسٹی کا نام بجائے "مسلم یونیورسٹی" کے "علی گڑھ یونیورسٹی" ہوگا۔ عزیز توقعات کے صدمے سے مسلمانوں پر ایک عالم پریشانی طاری ہے۔ قوم کے کارآزمودہ ہمدرد ثابت قدم ہیں اور کوشش کر رہے ہیں کہ اُس کو مایوسی کی ظلمات سے نکال کر پھر امید کے نور میں لے آئیں۔ لیکن افسوس ہے کہ ایک طبقہ ایسا ہے جس کی تحریروں اور رایوں سے اضطراب اور گھبراہٹ کے آثار نمایاں ہیں۔ ناصحان شفیق میں بعض وہ حضرات سب سے زیادہ بلند آہنگ ہیں جنھوں نے مسلم یونیورسٹی کی تحریک کو کامیاب بنانے میں بہت ہی کم تکلیف گوارا فرمائی تھی (بلکہ ایک حد تک جدا رہنا پسند فرماتے تھے) اہل خرد کے نزدیک ایسے ناصحوں کی نصیحت کیا وقعت حاصل کر سکتی ہے؟ اس وقت سب سے اعلیٰ فرض سرکاری تجاویز پر کشادہ دلی اور اطمینان کے ساتھ غور کرنا اور قوم کو صراط مستقیم کی جانب رہنمائی کرنا ہے۔

مسئلہ الحاق کے خلاف سرکاری مراسلات میں حسب ذیل دلائل پیش کی گئی ہیں:

(۱) موجودہ یونیورسٹیوں کے ساتھ مناقشہ کا اندیشہ۔

(۲) معیار تعلیم کا پست (یا تنزل) ہو جانا (۳) نگرانی کی عدم قابلیت۔

ہمارے نزدیک گورنمنٹ نے جن امور کا اندیشہ ظاہر کیا ہے وہ ضرور قابل لحاظ ہیں، لیکن مسلمانوں

کی یونیورسٹی سے یہ اندیشہ ظاہر کرنا خلافِ حقیقت ہے۔ تعلیم جدید کے متعلق نصف صدی اور تعلیم قدیم کے متعلق تیرہ صدیوں کا تجربہ کافی ضمانت اس امر کی ہے کہ مسلمان ان خطاؤں کے مرتکب نہ ہوں گے۔

اسلام نے جس وقت اس عالم میں قدم رکھا، اشاعت علم کا پرچم اُس کے ہاتھ میں تھا۔ قرآن مجید کی جو آیتیں سب سے اول نازل ہوئیں اُن میں پڑھنے اور لکھنے کا حکم اور ذکر ہے۔ کلام ربانی اور احادیث نبوی میں کثرت سے علم اور اہل علم کا فضل و شرف بیان فرمایا گیا ہے۔ احادیث سے ثابت ہے کہ مسجد نبوی میں ایک سائبان تھا جس میں صحابہ کرام کا ایک پاک گروہ رہتا تھا جن کی ضروریات کا اہتمام خود حضرت سرورِ عالم صلعم فرماتے تھے، اور یہ بزرگ خدمت بابرکت میں حاضر رہ کر علم دین کا فیض حاصل کرتے تھے۔ ان ہی بزرگوں میں سے ایک صحابی حضرت ابوہریرہؓ تھے جن کی شان سے اہلِ علم واقف ہیں۔ یہ قدسی گروہ "اصحابِ صُفّہ" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ ہی بنیاد اُن عظیم الشان درس گاہوں کی ہے جو صدہا سال تک ممالک اسلامیہ میں قائم ہوتی رہیں۔ ہر بڑی مسجد کے ساتھ مدرسہ لازم تھا۔ جامع مسجد دہلی کے ساتھ جو مدرسہ تھا اُس کا نام "دار البقاء" تھا، اور آج قاہرہ میں اُس کا نمونہ جامع ازہر موجود ہے۔ اپنے علوم کے سوا اور قوموں کے علوم کی طرف بھی مسلمانوں نے نہایت اولوالعزمی سے توجہ کی۔ یونان، روم، ہندوستان و ایران کے علوم ترجمہ کے ذریعہ سے مسلمانوں نے اپنی زبانوں میں منتقل کئے۔ جس ملک میں مسلمانوں کے قدم گئے وہ ملک دولتِ علم سے مالا مال ہو گیا۔ ہماری تاریخ کا یہ شاندار واقعہ ہے کہ صدیوں تک مسلمانوں نے علم کو صرف علم کی خاطر حاصل کیا۔ جب مشہور نظامیہ یونیورسٹی قائم ہوئی، تو علمائے ماوراءالنہر نے ایک ماتم کا جلسہ منعقد کیا اور اس پر تأسف کیا کہ اب علم علم کی خاطر نہ پڑھا جائے گا، بلکہ اُس سے ادنیٰ منافع پیشِ نظر رہیں گے۔ یورپ میں صدیوں تک مسلمانوں کے علوم زیر درس رہے۔ ابن رشد اور ابن سینا کا فلسفہ بیکن کے اجتہاد تک پڑھایا جاتا رہا تھا۔ جب مسلمان انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے تو سر سید احمد خاں مرحوم نے انگلستان کی بہترین درسگاہوں کو نمونہ قرار دیا یعنی کیمبرج اور آکسفورڈ کو۔ کیا مسلمانوں کے واسطے یہ مقام فخر نہیں ہے کہ خود وہ قوم جس کے کارنامے آکسفورڈ اور کیمبرج ہیں، ہندوستان میں لاکھوں کروڑوں روپے

خرچ کرنے پر یہ اعلیٰ نمونۂ تعلیم قائم نہ کر سکی، پچاس برس کے تجربہ کے بعد اب ماہرانِ تعلیم بالاعلان تسلیم کر رہے ہیں کہ جو چیزیں انھوں نے چھوڑیں وہی دراصل تعلیم کی جڑ تھیں۔

مذہبی تعلیم، تربیت، جسمانی صحت کی نگہداشت، یہ وہ امور ہیں جو ہمارے کالج کی خصوصیات خاصہ میں سے ہیں اور باوجود یونیورسٹیوں کی جکڑ بند کے مسلمان اپنے حسن تدبیر سے ان کو نباہتے رہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہمارے کالج کے طلبار قابلیت و لیاقت کا معیار تسلیم کئے جاتے ہیں۔ جب کہ ہم بورڈنگ ہاؤس قائم کر رہے تھے اور تربیت کے مسائل کے حل میں مصروف تھے، دوسرے کالج اس سے بالکل غافل و بے خبر تھے۔ ان کالجوں میں جو بنگلے یا مکانات طلبار کی سکونت کے واسطے تھے، وہاں تربیت کا عدم وجود برابر تھا۔ خود مجھ کو اس صوبہ کے ایک نامور کالج میں پڑھنے کا فخر حاصل ہے۔ اس کے بورڈنگ ہاؤس کے بنگلے ایک وسیع میدان میں پھیلے ہوئے تھے۔ مگر وہ سلسلہ مفقود تھا جو کیریکٹر کا سانچے میں ڈھالنے والا ہے۔ میری موجودگی میں نواب محسن الملک مرحوم نے ایجوکیشن کمیشن کے سامنے ایسے بورڈنگ ہاؤسوں کو "سرائے" سے تعبیر کیا تھا۔ یہ تعریف ایسی جامع و مانع تھی کہ مدت تک کمیشن کے کاغذات میں دائر و سائر رہی۔ جن لوگوں کو ہمارے کالج کے جلسے دیکھنے کا موقع ملا ہے وہ جانتے ہیں کہ مسٹر بیک ہمارے ہردلعزیز پرنسپل کس جوش اور فصاحت کے ساتھ سرکاری یونیورسٹیوں کے نقائص علی گڑھ تشریف لانے والوں وائسرایوں اور دیگر بلند پایہ وزیروں کے سامنے اسٹریچی ہال میں بیان کیا کرتے تھے۔ ان گزشتہ اور موجودہ واقعات کے ہوتے ہوئے ہماری جانب سے یہ اندیشہ کہ ذی اختیار ہونے پر ہم معیار تعلیم پست کر دیں گے کس قدر حیرت خیز ہے۔ ہم نے اور صرف ہم نے چالیس سال انگریزی تعلیم و تربیت کا معیار ہندوستان میں بلند رکھا۔ اب جبکہ ہمارے رفیق اور بھی پیدا ہو گئے ہیں ہم اس پرچم کو نیچا کر دیں! انّ ھذا لشیئ عُجاب!!! رہا دوسری یونیورسٹیوں کے ساتھ مناقشہ۔ جب سرکاری یونیورسٹیوں میں باہم مناقشہ پیدا نہیں ہوتا تو مسلم یونیورسٹی کا (جو مثل مذکورۂ بالا یونیورسٹیوں کے اصول و قواعد کی پابند ہوگی) سرکاری یونیورسٹیوں سے مناقشہ کرنا بعید از قیاس ہے۔ ایک ہی کالج کے طلبار دو دو یونیورسٹیوں میں

امتحان دیتے ہیں اور کامیاب ہوتے ہیں، مگر کبھی مناقشہ پیدا نہیں ہوتا۔ تو جو کالج صرف ایک ہی یونیورسٹی کے ماتحت ہوں گے وہ نزاع کا دنگل بن جائیں، یہ ناممکن ہی۔ اگر کبھی اتفاق سے کوئی امر اختلافی ہوگا (جیسا اور تمام باقاعدہ جماعتوں میں بھی پیدا ہوتا رہتا ہی) تو اُس کو ہمارا عالی مرتبہ چانسلر فیصل کر سکے گا۔

بعض اہل الرائے کا خیال ہی کہ جب کہ ہمارے پاس اس وقت متعدد کالج نہیں ہیں، تو الحاق پر اصرار بے معنی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ کالجوں کا ہونا مقتضی ہے اس امر کا کہ الحاق کا اختیار ضرور حاصل کیا جائے۔ میں نے اوپر عرض کی ہو کہ گزشتہ واقعات سے سبق حاصل کرنا چاہیے، اور اسی لئے پہلے مسلم یونیورسٹی کے متعلق مختصر واہم واقعات گزارش کر دیئے ہیں۔ اُن پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہی کہ باوجود سالہا سال کی مسلسل کوشش کے مسلم یونیورسٹی کی تحریک کا ایک پیادہ پا آدمی کی رفتار چلنا اور ۱۹۱۱ء میں موٹر کی تیزی اور ہوائی جہاز کی پرواز اختیار کر لینا محض اس وجہ سے تھا کہ مسلمانوں کے دلوں میں یہ امید پیدا ہو گئی تھی کہ وہ اس اعتماد کے قابل ہیں کہ اپنی تعلیم کا اپنی ضروریات کے مطابق خود انتظام کر سکیں۔ "کامریڈ" کے لائق ایڈیٹر نے اعداد سے ثابت کیا ہی کہ ہندوستان کے مختلف صوبوں کے مسلمانوں نے خود اپنے کالجوں اور اسکولوں کو سالہا سال میں اتنا روپیہ نہیں دیا جتنا چند مہینے میں مسلم یونیورسٹی کو دے دیا۔ اس طرح برسوں کی میعاد سمٹ کر مہینوں کی شکل میں آ گئی۔ اس صورت میں اگر الحاق کا اختیار نہیں ملے گا، تو سالہا سال تک بھی کالج قائم نہ ہوں گے۔ وجہ یہ کہ قیام کالج کے اصلی دونوں سبب مفقود ہوں گے، یعنی امید اور مرکزی قوت۔ لیکن اگر اختیار الحاق حاصل ہوتا ہی، تو یہی دونوں سبب مل کر حیرت خیز عجلت کے ساتھ ہر صوبہ میں کالج قائم کر دیں گے۔ یہ اندیشہ کہ مختلف صوبوں میں کالج قائم کرنے سے قوت متفرق ہو جائے گی اگر صحیح ہی تو اس کا یہ مطلب ہے کہ برسوں کالج قائم نہیں ہونے چاہئیں دسی کے ساتھ اس پر بھی غور کرنا چاہیے کہ جب مرکزی قوت ہر صوبہ میں کالج قائم کرے گی تو قوت متفرق نہ ہوگی بلکہ متفقہ کوشش کام کر جائے گی۔ یہ محض بحث یا مناظرہ نہیں ہی، بلکہ ایک دقیق پہلو اس معاملہ کا ہی جس پر مسلمانوں کو پوری توجہ سے غور کرنا ضروری ہے۔

الحاق کے خلاف ایک یہ دلیل بھی بیان کی جاتی ہے کہ سرسید احمد خاں نے بیرونی کالجوں کا الحاق اپنی اسکیم میں نہیں رکھا تھا۔ اس دلیل پر غور کرنے کے وقت ہم کو یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ سرسید نے اپنی اسکیم میں ایک ہزار طلبہ کی تعداد لکھی ہے۔ اُن کے زمانہ میں جو حالت جدید تعلیم کی اشاعت اور محمدن کالج کی مقبولیت کی تھی وہ اوپر گزارش ہو چکی ہے۔ اُس کے لحاظ سے ایک ہزار طلبار کی تعداد کافی تھی اور جو یونیورسٹی صرف ایک ہزار طلبار کے واسطے بنے اُس کے واسطے علی گڑھ سے باہر جانے کی ضرورت نہ تھی۔ ہمارے کالج کی بنیاد جس پیمانہ پر رکھی گئی وہ ایک ہزار طلبا کے واسطے کافی تھی۔ آج حالات بالکل متغیر ہو چکے ہیں اور مسلمانوں میں علوم جدیدہ کا شوق اُس حد تک پہنچ گیا ہے کہ ایسے مرکز تعلیم میں (جیسا مسلم یونیورسٹی ہو گی) ایک ہزار طلبہ کی تعداد مضحکہ خیز ہے۔ سرسید احمد خاں کے زمانہ میں کالج کا دائرہ بہت ہی محدود تھا۔ اب ہندوستان جنت نشان کے چاروں کونوں میں جو اولوالعزم طالب علم آنکھ کھولتا ہے وہ علی گڑھ کی طرف دیکھتا ہے۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ دیگر ممالک کے متلاشی ترقی مسلمان بھی علی گڑھ ہی کا خواب دیکھتے ہیں۔ اندریں صورت قدیم اسکیم کے اس حصہ کو آنکھیں بند کرکے کافی و شافی سمجھ لینا خودکشی کا مرتکب ہونا ہے۔ دیکھو جو لوگ خود علی گڑھ میں دائرۂ یونیورسٹی محدود کرنا چاہتے ہیں وہ بھی کہتے ہیں کہ متعدد کالج قائم کرو۔ اُن سے پوچھو کہ سرسید کی اسکیم میں متعدد کالجوں کا علی گڑھ میں بنانا کہاں تھا؟

نگرانی

ایک یہ اعتراض بھی ہے کہ مسلمان نگرانی بیرونی کالجوں کی نہ کرسکیں گے۔ اول دریافت طلب یہ امر ہے کہ جو لوگ علی گڑھ کے متعدد کالجوں کی نگرانی کرسکیں گے وہ باہر کے کالجوں کی نگرانی سے کیوں قاصر رہیں گے؟ جو گروہ علی گڑھ کے متعدد کالجوں کے واسطے طریقۂ تعلیم نصاب اصول تربیت وغیرہ اہم اور عظیم الشان امور تجویز اور مدوّن کرسکتا ہے امتحان لے سکتا ہے سندیں دے سکتا ہے وہ یہی کام باہر کیوں نہیں کرسکتا؟ صرف فاصلہ کا سوال باقی رہ جاتا ہے۔ جس طرح سرکاری یونیورسٹیاں دور دراز فاصلہ پر کالجوں کی نگرانی کرسکتی ہیں اسی طریقہ سے مسلم یونیورسٹی کرسکے گی۔ بقدر ضرورت پیش قرار انسپکٹر رکھے جاسکتے ہیں۔ بیرونی کالجوں کی نگرانی کے متعلق جو قواعد ہماری

کانسٹی ٹیوشن کمیٹی نے تجویز کئے ہیں اُن کے پڑھنے سے واضح ہو سکتا ہی کہ کیسا مفید اور مضبوط طریقہ تجویز کیا گیا ہی۔ مجوزہ طریقے میں جو خامیاں اور کوتاہیاں آیندہ تجربہ سے ثابت ہوں اُن کی اصلاح بتدریج ہوتی رہی گی۔ اب صرف یہ امر باقی رہتا ہی کہ ہم قصداً معیار تعلیم پست کر دیں۔ اس کا جواب اوپر عرض کیا جا چکا ہی۔ علاوہ ازیں اگر ہم ایسا کریں گے' اپنا اعتبار کھو دیں گے اور گورنمنٹ کو سلب اختیارات کا حق ہر وقت حاصل ہوگا۔ مسئلۂ الحاق پر غور کرتے وقت ایک اور پہلو قابل لحاظ ہے۔

تھوڑی دیر کو مان لیجئے کہ مسلم یونیورسٹی کا دائرہ اثر صرف علی گڑھ تک محدود ہو۔ اس صورت میں وہ کالج اسلامیہ جو مسلم یونیورسٹی کے زیر اثر نہیں آئیں گے اُن کی مذہبی و دینی تعلیم اور اُن کی نگرانی کا کیا اہتمام ہوگا؟ اُن کی تربیت (جس میں مذہبی و قومی زندگی کا لحاظ رہی) کس کے متعلق ہو گی؟ ظاہر ہی کہ سرکاری یونیورسٹیاں (جو مذہبی تعلیم کی ذمہ داری سے جدا ہیں اور جدا رہیں گی) یہ بار اپنے ذمہ نہیں لے سکتیں۔ دوسری شکل یہ ہی کہ خود ان کالجوں کے مہتمم ان امور کے نگراں بنیں، اور ضروری ہوگا تو اس صورت میں غور کرنا چاہئے کہ مسلم یونیورسٹی کی نگرانی ناقص خیال کی جائے اور اُس سے متفرق اشخاص کی نگرانی اعلیٰ ہو' یہ کیسا خیال ہی! ظاہر ہی کہ مسلمانوں کی مذہبی اور قومی تعلیم و تربیت صرف اسلامی گروہ کر سکتا ہی اور اسلامی گروہ مسلم یونیورسٹی سے بہتر دستیاب ہونا بھی عرصہ تک ممکن نہیں۔

نام

نام کی خوبی یہ ہی کہ سادہ، متعارف اور مسمیٰ کے ساتھ مناسب ہو۔ جو یونیورسٹی مسلمانوں کے واسطے دینی و دنیوی اعلیٰ تعلیم گاہ ہو' اُس کا نام "مسلم یونیورسٹی" سے بہتر دوسرا نہیں ہو سکتا۔ سر سید احمد خاں مرحوم نے جب مسلمانوں کے واسطے کالج قائم کیا تو اُس کا نام "محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج" رکھا۔ علاوہ کالج کے اُس زمانہ میں جو اور تحریکیں مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ تعلق رکھتی تھیں اُن کے نام کے ساتھ بھی "محمڈن" کا لفظ ضرور تھا، مثلاً "محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس" "محمڈن لٹریری سوسائٹی کلکتہ"۔ چونکہ انگریزی میں اُس زمانہ میں "مسلم" کے واسطے "محمڈن" کا لفظ تھا اس لئے انگریزی نام میں اس لفظ کا رواج لابد تھا' ورنہ مسلمانوں نے خود اس لفظ کو اپنے واسطے پسند نہیں کیا۔ چنانچہ سر سید نے اپنے کالج کا نام ہندوستانی "مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ" رکھا تھا۔ مابعد کی تحریکوں میں

یہ رجحان عام رہا اور بجائے "محمدن" کے "مسلم" "اسلامی" الفاظ زیادہ رائج ہوئے چنانچہ "انجمن حمایت اسلام، لاہور" "اسلامیہ کالج، لاہور" "انجمن اسلامیہ پنجاب" "مسلم لیگ" "مسلم ڈیپوٹیشن"۔ جو کالج پشاور میں مسلمانوں کے واسطے قائم ہو رہا ہے اُس کا نام بھی "اسلامیہ کالج" تجویز کیا گیا ہے۔ اسی بنا پر مسلم یونیورسٹی کی کمیٹی نے اُس عظیم الشان درس گاہ کا نام مسلم یونیورسٹی تجویز کیا جو ہزاروں، لاکھوں مرتبہ اس عرصہ میں پبلک کی زبانوں پر آیا اور بے مبالغہ لاکھوں ہی مرتبہ قلم بند ہوا۔ اس تحریک کے متعلق اخباروں، کتابوں، رسالوں، رسیدبہیوں، خط و کتابت اور مراسلت میں بھی یہی نام پبلک سے روشناس رہا ہے۔ اور پبلک کو اس تحریک کے حامیوں نے بتایا ہے کہ جو درسگاہ مسلمانوں کی دینی اور دنیوی تعلیم کی متکفل ہوگی اُس کا نام "مسلم یونیورسٹی" ہوگا۔ کوئی شبہ نہیں کہ پبلک کا عام رجحان اس طرف ہونا اسی وجہ سے تھا کہ اُن کو انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم سے بھی اطمینان دلایا گیا اب اس نام کا بدلنا پبلک میں یہ بدگمانی پیدا کرے گا کہ مقاصد یونیورسٹی میں کچھ تغیر تبدل ہوا جو یہ نام بدلا جاتا ہے۔ علاوہ اس کے جب ہماری تمام تعلیمی و پولیٹکل تحریکیں اپنے نام کے ساتھ اسلامی نشان رکھتی ہیں، تو اس سارے مجمع میں اس عظیم الشان درس گاہ کا اس نشان سے محروم رہنا کس قدر بدنما ہوگا! پبلک میں مذکورہ بالا بدگمانی پیدا ہونا اُس عام ہمدردی کو اس تحریک سے جدا کر دے گا جو اب تک اُس کے ساتھ ہے۔ یہ محض وہمی اندیشہ نہیں ہے، واقعی اندیشہ ہے۔ ابتداءً لاہور میں کانسٹی ٹیوشن کمیٹی میں علماء کے شامل نہ ہونے سے جو ناراضی پیدا ہوئی تھی اس کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ نام آخر نام ہے۔ اُنھوں نے غالباً معاملے کے تمام پہلوؤں پر غور نہیں کیا ہے۔

اب کیا کرنا چاہیے؟

اب اہم سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کو آیندہ کیا کرنا چاہیے؟ اس کے متعلق سب سے زیادہ ضروری امر یہ ہے کہ ہر قسم کے کوتہ اندیشانہ جوش و خروش سے اور شور و غوغا سے احتراز کیا جائے۔ گورنمنٹ کی جانب سے نہ خود بدگمانی کرنی چاہیے اور نہ دوسروں میں پھیلانی چاہیے۔ سربرآوردہ مسلمانوں کا اہم فرض ہے کہ وہ اس نازک موقع پر قوم

کی کشتی کو فہم و فراست کے ساتھ کھے کر کنارہ پر لگا دیں۔ مع ہذا استقلال و ادب کے ساتھ اپنی ضرورتوں کو گورنمنٹ کے سامنے پیش کرتے رہنا چاہیے، اور ظاہر کرنا چاہیے کہ مسلم یونیورسٹی تحریک کی جان وہی امور ہیں جو اس وقت زیر بحث ہیں۔ اور مسلم یونیورسٹی کے سلسلے کا درہم برہم ہونا حضور ملک معظم کی سات کروڑ رعایا کی تعلیم کے سلسلے کا درہم برہم ہونا ہے۔ اگر سر برآوردہ مسلمان یہ امور گورنمنٹ کے ذہن نشین نہ کر سکے، تو وہ اپنے فرض کے ادا کرنے میں قاصر رہیں گے۔ جب تک ایسی یونیورسٹی نہ ملے جو ہمارے مقاصد کو مفید ہو اُس وقت تک قبول نہیں کرنی چاہیے۔ سرمایہ کو برابر ترقی دی جائے۔ جو وعدے ہیں وہ پورے ہوں۔ جو لوگ وعدے پورے کر چکے وہ از سرِ نو چندہ دیں۔ تیس لاکھ آخر ایک قلیل رقم ہے۔ جو مسلم یونیورسٹی کی تکمیل کے لئے چندہ پھر ہوتا، پھر ہوتا وہ اب اس فرصت میں ہونا چاہیے۔ جس قدر سرمایہ جمع ہوگا ہم منزل کے قریب تر پہنچتے جائیں گے۔ جو سرمایہ جمع ہے اُس کے یا اُس کے منافع کے خرچ کرنے کا اُس وقت تک خیال بھی نہیں کرنا چاہیے جب تک کہ مسلم یونیورسٹی کی منظوری نہ ہو جائے۔ کمیٹی اس سرمایہ کی امین ہے اور شرط امانت یہ ہے کہ چندہ دہندوں کی شرائط کا لحاظ رہے۔ بدوں منظوری مسلم یونیورسٹی محمدن کالج علی گڑھ میں روپیہ لگانا امانت کے خلاف ہوگا۔ رہا واپسی سرمایہ کا خیال، میرے نزدیک کوئی ذی حمیت مسلمان اس کا خواب بھی نہ دیکھے گا۔ جب روپیہ بلا شرط واپسی کے دیا گیا ہے، تو اب واپسی کیسی؟ آخر میں یہ عرض ہے کہ اس وقت ناصحانِ مشفق بہت پیدا ہو گئے ہیں۔ پبلک کو اُن کی نصیحت سننے سے پہلے یہ اندازہ کر لینا چاہیے کہ ان حضرات نے اس تحریک کے کامیاب بنانے میں کس قدر جاں فشانی کی ہے۔ جو لوگ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہے وہ پہلے بھی تماشا دیکھتے تھے، اب بھی تماشا دیکھ رہے ہیں۔ جن دلوں میں اس تحریک کا درد ہے صرف اُن کی نصیحت قابل قبول ہے۔

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۲۳ راکتوبر ۱۹۱۲ء)

مرحومی علامہ شبلی نعمانی

۱۳۳۲ھ ہجری کا خاتمہ ایک ایسے حادثہ پر ہوا جو ہماری تاریخ میں مدت دراز تک حسرت و افسوس کے ساتھ یاد رہیگا۔ ۲۸ ذی حجہ کو جب سال مذکور کی زندگی میں صرف دو یوم باقی تھے۔ یہ اندوہناک خبر شائع ہوئی کہ آج صبح شمس العلما علامہ شبلی نے رحلت فرمائی حیف کہ صبح کے وقت جو طلوع و ظہور نور کا وقت ہی آفتاب علم غروب ہوگیا اور عالم علم پر ظلمت چھا گئی۔ ہماری علمی زندگی کا مدت ہوئی خاتمہ ہوچکا ہی اس لئے شاید یہ صدمہ اس قدر محسوس نہ ہو جس قدر ہونا چاہیے۔ لیکن جب ہم زندہ تھے اُس وقت اہل کمال کا ماتم بھی اُسی جوشِ عقیدت سے ہوتا تھا جو اُن کے کمال کی قدرشناسی میں عیاں ہوتی تھی۔ امام طبری نے وفات پائی تو تین مہینے تک لوگ دور دراز مقامات سے آکر نماز جنازہ ادا کرتے رہے۔ ماتم کی شان یہ ہی کہ رحلت کرنے والوں کے اوصاف یاد کرکے دل پر صدمہ ہو صدمہ سے وہ بجلی چمکے جو زندگی کی اساس ہی اس برقی روشنی میں اوصاف بالا منزل مقصود دکھلائیں۔ اور اس طرح وہ موت زندوں کے لئے حیاتِ فرید کا باعث بن جائے۔

اس قحط الرجال کے زمانہ میں ہم میں سے جو با کمال اُٹھ جاتا ہی اُس کی جگہ خالی پڑی رہتی ہی جس طرح ایک کہنہ عمارت کا جو حصہ گرتا ہی ویرانہ میں اضافہ کرتا ہی۔ پہلے کامل کی جگہ پر کامل تر بیٹھتا تھا بزم حمادبن امام ابو حنیفہ زیب مجلس بنے۔ امام الحرمین کی مسند کمال امام غزالی سے آراستہ ہوئی فیضی کی ملک الشعرائی کی کرسی پر طالب آملی جلوہ افروز ہوا۔

ایک عالم کا ماتم یہ ہی کہ اُس کے کمالات کی صدا مدت تک ملک و ملت میں گونجتی رہے۔ اُس صدا سے رہ روانِ شوق کو تلاش منزل میں مدد ملے۔ اُن کا نمونہ نو واردوں کے واسطے شمع ہدایت بنے۔ جن شاندار اور مفید کاموں کی بنیاد انھوں نے ڈالی ہو اُن کی تکمیل کی جائے۔ ان کی تصانیف اُن کے حالات ملک میں شائع ہوں، تاکہ پڑھنے والے اُن کو پڑھیں اور نفع حاصل کریں۔ انسان کا ظاہر گوشت پوست

ہی۔ مگر اُس کی اصل زندگی اوصاف ہیں (خواہ اچھے ہوں یا برے) صفات کا نور حرکات سکنات، رفتار گفتار، غرض زندگی کے ہر جلوے سے عیاں ہوتا ہی۔ ایک بدکار کی بدکاریاں ہر قول و فعل سے نمایاں ہوتی ہیں۔ کاملین کی زندگی کے ہر شعبے میں کچھ نہ کچھ کمال کی جھلک ضرور نظر آتی ہی۔ اس لئے اہلِ کمال کے حالات کو نگاہ تبصّر سے دیکھنا خود اپنے آپ میں آثارِ کمال پیدا کرتا ہی۔

علامہ شبلی مرحوم کی زندگی میں بہت سے پہلو ایسے ہیں جو قدیم و جدید دونوں طبقوں کے علماء کے واسطے سبق آموز ہو سکتے ہیں۔ اس لئے اُن کے سوانح عمری اگر محنت کے ساتھ لکھے جائیں تو بے حد مفید ہوں گے۔[1]

ضروری حالات

اس مضمون میں ہم کسی قدر تفصیل سے بعض پہلوؤں پر بحث کرنا چاہتے ہیں۔ علامہ شبلی اعظم گڈھ کے ایک مشہور خاندان کے فرد اور نامور باپ کے بیٹے تھے۔ میرا ذاتی علم نہیں، لیکن اس عرصہ میں جو مضامین اخبارات میں شائع ہوئے اُن سے معلوم ہوتا ہی کہ ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے۔ فطرۃً ذہن ثاقب اور طبع سلیم اُن کو عطا ہوئی تھی۔ اسباب ترقی استعداد یہ ہوئے کہ شفیق باپ نے پوری توجہ اُن کی تعلیم پر صرف کی۔ مولانا محمد فاروق صاحب سا استاد وقت اشتادی کو ملا۔ مولانا فاروق باہمہ آزادی بہت سے ایسے اوصاف کے جامع تھے جو آج طبقۂ اساتذہ میں کمیاب ہیں۔ خاص جوہر یہ تھا کہ شاگرد کے دل میں علم کا ذوق پیدا کر دیتے تھے۔ طلباء کو کتاب کا کیڑا نہیں بناتے تھے بلکہ علم کا جویا اور شائق بنا دیتے تھے۔ فنونِ معقول و ادبیات میں کامل ماہر تھے۔ اس کے ساتھ فارسی اور اردو کے لٹریچر کا پاکیزہ مذاق تھا۔ ایسے استاد کی تربیت نے علامہ شبلی کے دل و دماغ میں بھی علاوہ استعداد علم کے کاوش و ذوقِ فنونی اور انتقال ذہنی کی قوت پیدا کر دی۔ علم حدیث کا استفادہ مولانا احمد علی صاحب مرحوم محدث سہارنپوری سے کیا تھا۔ فراغ تحصیل کے بعد چند روز ابن دیوانی رہی۔ مگر یہ ملازمت اُن کے واسطے مصیبت تھی۔ جس جگہ تعمیل کے واسطے جاتے وہاں کا کھانا پینا سب حرام۔ آخر نہ چل سکی۔ تو جوانی ہی میں علی گڈھ تشریف لائے۔

---

[1] الحمد سال حال میں حیاتِ شبلی بہت مفصل مؤلفہ مولوی سید سلیمان ندوی دارالمصنفین اعظم گڈھ نے شائع کی۔ حبیب الرحمٰن

۱۶ جمادی الثانی ۱۳۶۳ھ

خان بہادر محمد کریم[1] صاحب اُس زمانے میں یہاں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ اُن کے توسّل سے مولوی سمیع اللہ خاں صاحب مرحوم سے ملے۔ مولوی صاحب ممدوح کو خداوند تعالیٰ نے جوہر شناسی کا ملکہ بخشا تھا کتنے آدمی اُن کی جوہر شناسی کی بدولت کیا سے کیا ہو گئے۔ مولوی سمیع اللہ خاں صاحب نے اُن کو کالج کی پروفیسری کے لئے انتخاب کرکے سرسید احمد خاں مرحوم کے سامنے پیش کیا۔ یہ راستہ تھا "مولوی شبلی" کے "علامہ شبلی" بننے کا۔ میں نے بہت ابتدائی زمانہ میں اُن کو علی گڑھ کی نمائش کے موقعے پر کشتی کے دنگل میں دیکھا تھا۔ خوب توانا تھے۔ سر کے بال پریشان ایک سیاہ گول ٹوپی سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ عرصہ تک شہر میں رہے۔ پھر سرسید کے پڑوس میں ایک چھوٹا سا بنگلہ لیکر آرہے۔ سرسید مرحوم کو خداوند تعالےٰ نے ایسا دماغ عطا فرمایا تھا جو صحیح اصول کا اخذ کرنے والا تھا۔ ذوق علم اُن کے رگ و پے میں ساری تھا اُن کی مجلس میں علمی چرچے رہتے تھے۔ مختلف مسائل پر جرح و قدح ہوتی تھی۔ جدید و قدیم اصول باہم ٹکراتے تھے۔ بڑی خوش قسمتی علامہ شبلی کی یہ تھی کہ اُس عہد میں پروفیسر آرنلڈ سا عالم دوست استاد کالج میں تھا۔ یہ دونوں دلدادگان علم باہم ملے اور اس طرح ملے کہ جس طرح مختلف اللون نور کی شعاعیں باہم مل کر عالم کی روشنی کا باعث بنتی ہیں۔ پروفیسر آرنلڈ نے علامہ شبلی کو جدید اصول سے آگاہ کیا۔ یہ بتایا کہ جدید علمی مجلس کے کیا ساز و سامان ہیں۔ قدیم علوم پر کیا کیا اعتراض اور حملے ہیں۔ علامہ شبلی کی حذاقت اور قوت دماغی یہ تھی کہ وہ جدید اصول کے طمطراق سے مرعوب نہیں ہوئے بلکہ اُن پر اطمینان سے غور کیا۔ جو اصول عمدہ تھے اُن کو اخذ کیا (نہ صرف اخذ کیا بلکہ اُن کو اپنی زندگی کا رہبر بنایا) نمائشی چیزوں کو رد کر دیا۔ پروفیسر آرنلڈ نے عربی کا استفادہ علامہ شبلی سے کیا اور یہ سیکھا کہ پرانی زمینوں میں بھی جواہر آبدار موجود ہیں' اگرچہ گرد آلودہ ہو کر نگاہوں سے پوشیدہ ہوگئے ہیں۔ اس واقفیت کا نتیجہ پروفیسر آرنلڈ کی بے نظیر تصنیف "پریچنگ آف اسلام" کی صورت میں عیاں ہوا۔ علامہ شبلی نے پروفیسر آرنلڈ سے کسی قدر فرنچ بھی سیکھی تھی۔ علامہ ممدوح کی زندگی کا یہ دور بہت کچھ سبق آموز اور ایک بڑے تعلیمی مسئلہ کا حل کرنے والا ہے۔ پروفیسر آرنلڈ سالہا سال محمدن کالج میں رہے'

---

[1] رئیس محمد آباد ضلع اعظم گڑھ۔ حبیب الرحمٰن ۳ شوال ۱۳۶۲ھ

اور بیسیوں طلبار نے اُن سے پڑھا۔ وہ محض ضابطے کے پروفیسر نہ تھے جو بائسکوپ کی تصاویر کی طرح حرکات وصورت دکھا کر نظر سے اوجھل ہو جاتی ہوں۔ وہ استاد شفیق اور شفقت کے اثر سے شاگردوں کے دل میں گھر کرنے والے تھے۔ اس پر بھی اُن کے کسی شاگرد نے اُن سے وہ فیض حاصل نہ کیا جو مولانا شبلی کے حصہ میں آیا حالانکہ اور شاگرد بھی اُن کے خام عقل بچے نہ تھے کالج کلاسوں کے طلبار تھے۔ خود علامہ شبلی سولہ برس کالج میں رہے۔ مگر کسی شاگرد کے قلب میں ان کے کمال کی وہ قدر و محبت پیدا نہ ہوئی جو استاد کی پیروی پر آمادہ کرتی۔ فیض حاصل کیا تو صرف اس قدر کہ ڈگریوں کا امتحان پاس کر لیا۔ اس میں علامہ شبلی کی کیا خصوصیت تھی۔ یہ تو ہر کالج میں ہوتا آیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جو سلسلہ تعلیم جدید کا ہمارے دیار میں مروج ہے اس کا نظام و ترتیب اس قسم کی ہے جو طلبار میں شوق علم پیدا کرنے سے ہمیشہ قاصر رہی۔ وہ ایک سیلاب ہے جس میں پڑ کر طلبار اضطراری حالت میں ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے ڈگریوں کے ساحل پر جا پڑتے ہیں۔ کچھ خود ٹھہرتے ہیں بہت کچھ سیلاب کا زور اُن کو بہا کر کنارہ پر جا ڈالتا ہے۔ جب ساحل پر پہنچ کر آنکھیں کھولتے ہیں تو نجات پانے پر شکریہ ادا کرتے ہیں اور عہد کرتے ہیں کہ پھر اس بحر ناپیدا کنار کی طرف رخ نہ کریں گے۔ بارہ برس پڑھ کر جب ڈگری مل جاتی ہے تو کتابوں سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جاتے ہیں۔ اس تعلیم سے وہ قوت مطالعہ بھی نہیں پیدا ہوتی جو ترقی علم کے واسطے لازم ہے۔

اس زمانہ میں جو کام جدید سلسلہ میں بھی ہوئے ہیں، وہ بھی بہت کچھ تعلیم قدیم کے زیر بار احسان ہیں۔ بنگالی کی ترقی ہمیشہ راجہ رام موہن رائے آنجہانی کی ممنون رہے گی۔ یہ واقعہ ہے کہ وہ عربی تعلیم کے فیض یافتہ تھے۔ سرسید احمد خاں مرحوم پرانے مکتب و مدرسہ سے اسکول اور کالج کے میدان میں آئے تھے۔ بلگرامی خاندان کی عظمت تعلیم جدید میں مسلم ہے۔ یہ خاندان بھی تعلیم قدیم کے آغوش شفقت میں تربیت پا کر انگریزی مدارس میں پہنچا تھا۔ اس بحث سے مقصود ہمارا کوئی اعتراض یا الزام نہیں۔ تعلیم قدیم میں بہت سے نقائص ہیں جن کو خود علمار نے تسلیم کیا ہے۔ غرض صرف اس قدر ہے کہ یہ ایک اہم مسئلہ قومی تعلیم کا ہے اور رہبرین کی توجہ کا محتاج۔

علامہ شبلی ۱۸۹۸ء تک محمڈن کالج میں رہے۔ سرسید مرحوم کی وفات کے بعد جلد کالج چھوڑ کر حیدرآباد

چلے گئے۔ یہ نواب وقار الامرار بہادر کی وزارت کا زمانہ تھا۔ سید علی بلگرامی مرحوم کی سرپرستی میں سلسلۂ آصفیہ قائم ہوا۔ علامہ شبلی کے دو سو روپیہ ماہوار بطور وظیفہ تصنیف مقرر ہوئے۔ عرصہ تک وہاں مقیم رہ کر تصنیف و تالیف میں مصروف رہے تقرر وظیفہ کے بعد کی جملہ تصانیف سلسلۂ آصفیہ کے عنوان سے معنون ہیں۔ مولوی عزیز مرزا مرحوم کے عروج کے زمانے میں علامہ مرحوم نے اورنٹیل یونیورسٹی کی اسکیم تیار کی۔ حال میں وظیفہ میں ترقی ہو کر وہ تین سو روپیہ ماہوار ہو گیا تھا۔

حیدرآباد سے واپس آکر کچھ دن تک ندوۃ العلمار اور محمڈن کالج کی کشمکش میں رہے۔ نواب محسن الملک مرحوم ہمیشہ اس فکر میں رہے کہ کسی طرح علامہ شبلی پھر کالج میں آ جائیں لیکن ندوۃ العلمار کی کشش غالب آئی اور وہ مستقل طور پر لکھنؤ جا کر قیام پذیر ہوئے۔

ندوۃ العلمار کے ساتھ علامہ شبلی کو ابتدار قیام مجلس مذکور سے تعلق خاص تھا اور وہ اُن چند مخصوص ارکان میں تھے جنھوں نے ندوہ کے مقاصد کو پوری طرح سمجھ کر اس کی کامیابی کو نصب العین قرار دیا تھا۔ مولانا سید محمد علی صاحب ناظم اول کی دوربین اور مردم شناس نظر نے ابتدار سے یہ امر محسوس کر لیا تھا کہ ندوۃ العلمار کے بعض مقاصد ایسے ہیں جن میں علامہ شبلی کی رہبری کی ہمیشہ ضرورت ہوگی۔ دارالعلوم کی اسکیم اُن ہی کے دماغ کا نتیجہ تھی۔ جو رسالہ ندوۃ العلمار نے اس کے متعلق شائع کیا وہ اُن ہی کے قلم کا لکھا ہوا تھا جب تک مولانا سید محمد علی صاحب کی نظامت رہی مختلف خیال کے ارکان اپنے اپنے دائرے میں کام کرتے رہے۔ اور باہم تصادم نہیں ہوا مولانا کی علیحدگی کے بعد پھر کوئی ایسا ناظم نہ ملا جو مختلف الخیال ارکان سے کام لے سکتا۔ علامہ شبلی چونکہ سالہا سال تک کالج میں رہے تھے ایک حد تک اُن کے خیالات آزاد تھے علمار کے مروجہ رسمی طریقوں کو وہ لوازم دین نہیں خیال کرتے تھے۔ اعتراض کرنے میں بے باک تھے۔ اُن کی وسیع نظر کے سامنے متقدمین کا دور اور اُس کے آثار تھے لہذا متاخرین کے انداز کے زخم خوردہ نہ تھے۔ یہ اسباب تھے جن کی وجہ سے قدیم علمار کو اُن کی جانب سے شبہات تھے بعض کا عرصہ تک یہ خیال رہا کہ وہ کالج کے سفیر بن کر ندوہ میں آئے تھے تاکہ یہاں بھی الحاد کا رنگ جمائیں۔ خلاصہ یہ کہ آخر وقت تک علامہ شبلی

قدیم طبقہ کے علماء میں شیر وشکر نہ ہو سکے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اُن کی خدمات نے ندوۃ العلماء کے قالب میں ایک تازہ روح پھونکی۔ بہت سے مرحلے طے کئے۔ لیکن جو کامیابی حاصل ہونی چاہیے تھی وہ باہمی تصادم خیالات نے حاصل نہ ہونے دی۔ ہماری بہت سی محرومیوں میں ایک یہ بھی ہے۔

رسالہ الندوہ (جو اردو کے مہتم بالشان رسالوں میں سے ایک رسالہ تھا) علامہ شبلی کے قلم کے دم قدم کے ساتھ تھا۔ جب اس رسالے کے اجرا کی تجویز مجلس انتظامیہ نے منظور کی تھی تو ایڈیٹری میں میرا نام صرف اس وجہ سے ضم کیا گیا تھا کہ میری جہالت کی تاریکی علامہ شبلی کے خیالات کی تیز روشنی کی چکا چوند کو کچھ کم کرتی رہے گی، اور بدگمانی کا زیادہ موقع نہ رہے گا۔ علامہ شبلی کے دورِ ایڈیٹری میں الندوہ میں جس پایہ کے مضامین نکلے اُن سے اہل ذوق واقف ہیں۔ یہ مضامین ادب اردو کے لئے بہترین سرمایۂ ناز رہیں گے۔ قیام ندوۃ العلماء سے قبل جدید و قدیم طبقہ میں باہم جس قدر مغائرت اور نفرت تھی آج اُس کا اندازہ بھی مشکل ہے اور اب جب کہ وہ منافرت دور ہو چکی، تو اُس کی یاد بھی خالی از ضرر نہیں۔ اس لئے ہم اُس کی تفصیل سے گریز کرتے ہیں۔ تاہم اس قدر کہنا بیجا نہ ہوگا کہ علامہ شبلی کی ذات واسطہ تھی، قدیم و جدید سوسائٹی کی صلح و آشتی کا (جس کی بنیاد پٹنہ کے اجلاس ندوۃ العلماء میں مولانا سید محمد علی صاحب اور مولانا منور علی صاحب مرحوم سے قدیم محترم علماء اور آنریبل مولوی سید شرف الدین صاحب اور آنریبل سر سید علی امام صاحب سے جدید نامور تعلیم یافتوں کے ہاتھ سے رکھی گئی) اس صلح اور باہمی تبادلۂ خیالات کا ثمرہ وہ بے نظیر متفقہ کوشش تھی جو مسلم یونیورسٹی کی تحریک کے زمانہ میں خیال ہوئی۔ دورانِ قیام لکھنؤ میں علامہ شبلی نے بیحد کوشش کی کہ دارالعلوم کے منصوبے کو قوت سے فعل میں لائیں۔ لیکن افسوس کہ مذکورۂ بالا اختلاف نے اُن کی کوششوں کو بارآور نہ ہونے دیا۔ دونوں فریق کا زور بجائے ترقی دارالعلوم میں صرف ہونے کے باہمی کسرِ وانکسار میں صرف ہوتا رہا۔

اگر دارالعلوم نے کسی وقت ایک قدم آگے بڑھایا تو دوسرے وقت دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس وسیع تجربہ کی رو سے جو ندوہ کی نسبت مجھ کو سالہا سال سے حاصل ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ کسی فریق کا عمل

بدنیتی پر مبنی نہ تھا۔ اختلاف کا منشا کم تر بعض اصول اور زیادہ تر اختلاف طبائع تھا۔ اگر کوئی زبردست ناظم ندوۃ العلماء کو ملا ہوتا تو وہ دونوں متضاد قوتوں کو ملا کر اسی خوبی سے کام چلاتا جیسے انجن میں آگ اور پانی کی مدد سے قوت رفتار پیدا کی جاتی ہے۔

سفر تعلق علی گڑھ کے زمانہ میں علامہ شبلی نے ممالک اسلامیہ کا سفر کیا۔ اس سفر کا ایک مقصد الفاروق کے واسطے مواد تاریخی فراہم کرنا اور ان کتابوں کا دیکھنا تھا جو ہندوستان میں موجود نہ تھیں اس رحلت کے دلچسپ حالات سفرنامہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ مراجعت کے بعد وہ خوب تندرست تھے۔ ایسی تندرستی پھر کبھی ان کو نصیب نہیں ہوئی۔ کچھ عرصہ کے بعد سیر کشمیر کے لئے گئے۔ افسوس ہے کہ گل گشت کشمیر کا وقت بلحاظ آب و ہوا موزوں انتخاب نہیں کیا گیا۔ جولائی اگست کا زمانہ تھا۔ وہاں کے ملیریا نے سخت نقصان پہنچایا اور صحت ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ گئی۔ بلبل شیراز عرفی نے تو تعریفِ کشمیر میں یہ نواسنجی کی ہے ؎

ہر سوختہ جانے کہ بکشمیر درآید
گر مرغِ کباب ست کہ با بال و پر آید

مگر بلبل ہند کو وہاں کے بخار نے بالکل سوختہ جاں کر دیا۔

پانوں کا واقعہ علامہ شبلی کی زندگی کا ایک سخت واقعہ پانوں کا بندوق سے اڑ جانا تھا۔ مردانِ جنگ آزما جس تمنا میں ساری عمر رہتے ہیں وہ اُن کو گھر بیٹھے مل گئی ؎

قسمت نگر کہ کشتۂ شمشیر عشق یافت
مرگے کہ زندگاں بہ دعا آرزو کنند

شعر العجم کی تالیف کا زمانہ تھا۔ شاہنامہ پر ریویو ہو رہا تھا۔ یہ اشعار لکھ کر قلم رکھا ؎

بروز نبرد آں یلِ ارجمند ق بہ تیغ و بہ تیر و بہ گرز و کمند
برید و درید و شکست و ببست یلاں را سر و سینہ و پا و دست

زنانہ میں تخت پر آکر بیٹھے۔ اتفاقیہ بیوی کے ہاتھ سے بندوق سر ہو گئی۔ نشانہ علامہ کا پانوں تھا۔ زانو کے

نیچے سے قریباً سارا پاؤں اُڑگیا۔ اہلِ علم کی زندگی کا ہر پہلو علمی دلچسپی کا سامان بن جاتا ہے۔ یہ حادثہ بھی بہت سے ادبی نکات و لطائف کا باعث ہوگیا۔ فارسی اور اُردو کی بیسیوں نظمیں اس کے متعلق لکھی گئیں جن میں "لنگ" کے خصائص شاعرانہ لطف کے ساتھ موزوں ہوئے۔ سال میں ایک بار کالج میں اگر کسی اسلامی موضوع پر لکچر دینے کا معمول کئی برس رہا۔ واقعہ مذکور کے بعد جب علی گڑھ تشریف لائے تو تاخیر حاضری کا سبب زخم بندوق بیان کیا۔ اور فرمایا "امید ہے کہ یہ میرا عذر عذرِ لنگ نہ خیال کیا جائے گا۔"

آخری زمانہ آخر زمانہ میں ندوۃ العلماء کے واقعات سے پریشان رہے۔ اور لکھنؤ چھوڑنے پر مجبور ہوگئے لیکن میں نے دیکھا کہ مخالفت کے تلاطم میں بھی باطمینان سیرت کی تصنیف میں مصروف تھے۔ اور فرصت کا عمدہ وقت خصوصاً صبح کا اسی کام میں صرف کرتے تھے۔ افسوس ہے کہ آخر عمر میں مولوی محمد اسحٰق صاحب مرحوم وکیل ہائی کورٹ سے قابل و عزیز بھائی کی وفات کا صدمہ اُن کو برداشت کرنا پڑا۔ اور کچھ شبہ نہیں کہ بھائی کی موت اُن کے لئے پیامِ اجل لیکر آئی۔ جو مرثیہ اس حادثہ کے متعلق لکھا ہے اُس کا ہر ایک بند دل تڑپانے والا ہے۔ وفات سے چند روز پہلے اس کے تین نسخے میرے پاس پہنچے تھے۔ جس دل سے یہ شعر نکلے ہوں وہ خون ہونے سے کب بچ سکتا تھا ایک دوسرے بھائی مہدی مرحوم کے حادثہ کو یاد کرنے کے بعد لکھتے ہیں ؎

آج افسوس کہ وہ نیّرِ تاباں نہ رہا — میری جمعیتِ خاطر کا وہ سامان نہ رہا
اب وہ شیرازۂ اوراقِ پریشاں نہ رہا — عتبۂ والدِ مرحوم کا دربان نہ رہا

گلۂ خوبیٔ تقدیر رہا جاتا ہے
نوجواں جاتے ہیں اور پیر رہا جاتا ہے

یہ بھی اے جانِ برادر کوئی جانے کا ہے طور — اپنے بچوں کی نہ کچھ فکر، نہ تدبیر نہ غور
ابھی آنے بھی نہ پایا تھا ترے اوج کا دور — کیا ہوا تجھ کو کہ تو ہوگیا کچھ اور سے اور

چھوڑ کر بچوں کو بےصبر و سکوں جاتا ہے
کوئی جاتا ہے جو دنیا سے تو یوں جاتا ہے

ایک بند کا آخر شعر ہے ؎

اب وہ مجموعۂ اخلاق کہاں سے لاؤں
ہائے افسوس میں اسحٰق کہاں سے لاؤں

آخر نوجوانوں کے قدم پر قدم پیر نے بھی سفر کیا - ہزاروں پیر و جوان اپنے ماتم میں نوحہ خواں چھوڑے۔ اسہال خونین بہانۂ موت ہوئے - پندرہ روز علالت کا سلسلہ رہا - ١٩ ؍ نومبر کو میرے مکرم دوست اور علامہ مرحوم کی عزیز شاگرد مولوی سید سلیمان صاحب نے مجھ کو لکھا:

"آپ کا حبیب صمیم (مولانا شبلی) اس وقت موت و حیات کی کشمکش میں ہے پیچش سے آنتوں میں زخم ہے - دس روز سے غذا نہیں - حالت مایوس کن ہے"

مولوی اسحٰق صاحب مرحوم نے ۵ ؍ اگست ۱۹۱۴ء کو وفات پائی - اس حادثے کے بعد علامہ شبلی اعظم گڑھ گئے کہ مرحوم بھائی کے جو منصوبے اور تجویزیں اپنے ابنائے وطن کی تعلیم و تربیت کے متعلق تھیں اُن کی تکمیل و انصرام کی کوشش کریں - ۱۶ ؍ ستمبر کے والانامہ میں مجھ کو لکھا تھا :-

"عزیز مرحوم کے واقعہ نے مجھ پر اس قدر سخت اثر کیا کہ تمام عمر کبھی نہیں ہوا تھا حالانکہ مہدی مرحوم کا واقعہ اسی درجہ کا گزر چکا تھا - بہر حال میں اعظم گڑھ چلا آیا - محمدن شبلی اسکول جو ۳۰ برس ہوئے میں نے قائم کیا تھا پرائمری اسکول سے مڈل اسکول تک آگیا - عزیز مرحوم اس کو انٹرینس تک پہنچانا اور تمام برادری کے قصبات میں اسکول اور مکتب قائم کرنا چاہتے تھے - دو مہینہ کا دورہ رکھا تھا اور پانسو روپیہ مصارف دورہ کے لئے الگ کر دئیے تھے - اشتہارات اور رسید بہیاں سب چھپ گئی تھیں -

مجھ کو اس کام کے علاوہ دار المصنفین اور دار التکمیل کی فکر ہے - ندوہ میں کام کرنا ممکن نہ تھا - ۶ برس تک کشاکش میں گزرے - جو ہو گیا وہی تعجب انگیز ہے - بہر حال صورت موجودہ یہ ہے کہ اسکول کے پاس ہی میرا اور میرے خاندان کا باغ ہے جس کا کل رقبہ ۱۱ بیگہ پختہ ہے - اس کو وقف کر رہا ہوں - اور شہر کا بھی اضلی سہو گئے ہیں - مسودہ لکھا جا چکا رجسٹری کرانا ہے - دو بنگلے پہلے سے موجود ہیں - کتب خانہ (دوبارہ) بقدر معتد بہ مہیا ہو گیا ہے اور بڑھتا جاتا ہے - دفتر سیرت کا کل سرمایہ اس طرف منتقل ہو جائے گا - بنگلہ

صرف کتب خانے کے لئے کافی ہوگا۔ ضروری طور سے فرنشڈ کر دیا ہے۔ دارالمصنفین کی عمارت کے لئے کچھ اضافہ ہوگا۔ چاہتا ہوں کہ اس کے چار کمرے ۴ عناصر اردو کے نام سے تعمیر ہوں اور عمارت پر تمام موجودہ معززین ارباب قلم کے نام کندہ ہوں۔ چندہ مشروط نہیں۔ میر صاحب قلم چندہ دے بھی نہیں سکتا۔

اسی کے ساتھ دارالتکمیل کھول رہا ہوں یعنی ادب اور تفسیر کی تکمیل کے طلباء کو تیار کروں۔ وہ مددگار ہوں گے۔ انتہائی صفحوں کو خود پڑھاؤں گا۔

سر دست طلبہ تصنیف کی تعلیم کا یہ طریقہ ہوگا کہ پہلے چھوٹے چھوٹے عنوانات اور ان کے متعلق ذخیرہ معلومات اور کتابیں اُن کو دی جائیں گی۔ جو کچھ لکھیں گے اُن کا عیب و ہنر بتایا جائے گا۔ پھر پمفلٹ، رسالے اور پھر تصنیف کرائی جائے گی۔ وظائف تصنیفی مقرر ہوں گے۔ جو کم از کم ۲۰، ۲۵ روپیہ ماہوار ہوں گے۔

دستاویز کی رجسٹری ہو جائے تو باغ کی کاٹ چھانٹ اور عمارت کی داغ بیل ڈالی جائے۔ ایک کمرہ مرحوم کے نام سے بھی تعمیر کرانا مقصود ہے۔

یہ اخیر عمر کا خواب ہے اور امید ہے کہ ؎

چوں ہنرہائے دگر عیب جرماں نشود

اب عماد الملک نے دارالمصنفین کی صدر انجمنی قبول کر لی ہے۔ تکمیل دستاویز کے بعد انجمن کے قواعد اور ممبروں اور عہدہ داروں کے نام شائع ہوں گے۔ والتسلیم شبلی

۱۶ ستمبر ۱۹۱۴ء اعظم گڑھ"

اس تحریر میں دو امر خصوصاً قابل لحاظ ہیں۔ ایک پاک اور کارآمد منصوبے۔ دوسرے یہ کہ شدت غم میں بھی دماغ علم کی غمخواری میں مصروف تھا۔ سید سلیمان صاحب کی تحریر سے (جو بعد وفات علامہ مرحوم آئی) ہی معلوم ہوا کہ بنگلہ اور باغ از روئے وصیت وقف کر دیا ہے اور بلند حوصلہ اعزہ تعمیل وصیت پر آمادہ ہیں۔ قبر اسی باغ میں بنی ہے اور وہیں تکمیل سیرت کے سامان ہو رہے ہیں۔

شدیم خاک ولیکن ز بوے تربتِ ما
تواں شناخت کزیں خاک مردمے خیزد

عادات وخصائل

علاّمہ مرحوم سے میری سب سے اول ملاقات اندازاً ۱۹۰۴ء میں ہوئی۔ آغاز تعارف اختلاف سے ہوا۔ کتاب المامون جب شائع ہوئی تو میں نے ریویو لکھا۔ بعض اہم مسائل پر اعتراض کیا۔ غالباً صرف یہی ایک ریویو تھا جس کا علاّمہ شبلی نے جواب لکھا۔ یہ بے نیازانہ شعر بھی جواب مذکور میں تھا ؎

رسی آنگہ بدرد ما کہ چو ما خامہ گیری و حرف بنگاری

یہی اختلافی تعارف باعث ملاقات ہوا۔ ملاقات بڑھ کر سرحد نیازمندی تک پہنچی۔ نیاز مخلصانہ محبت سے مبدّل ہوا اور الحمد للہ کہ وہ اخلاص علاّمہ ممدوح کی رحلت تک قائم رہا، اور اب بھی ہے۔ اور یقین ہے کہ میری حیات تک دل سے محو نہ ہوگا۔ موت نے اخلاص میں کمی نہیں کی بلکہ حسرت کا اضافہ کردیا۔ قریباً سنّی سالہ مودّت کے دوران میں صدہا ملاقاتیں ہوئیں۔ بارہا پاس رہنے کا اتفاق ہوا۔ حبیب گنج بھی چند مرتبہ قدوم سے مشرّف ہوا۔ ہر قسم کے مسائل پر بحث ومباحثے رہے۔ اس تمام تجربہ کے بعد میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ علامہ مرحوم سچے اور بااخلاص دوست تھے۔ اس زمانہ کی سوسائٹی کی بہت سی کمزوریوں سے پاک اور صاف تھے۔ اُن کے اخلاق کا معیار بہت بلند تھا۔ نظر میں بلندی تھی۔ مزاج میں استغنا، حوصلے میں عزم تھا۔ مزاج میں نفاست تھی۔ دوستی اور مخالفت دونوں شدید تھیں۔ لیکن دوستوں کی مروت کبھی اُن کو رسمی تملق وچاپلوسی پر آمادہ نہیں کرتی تھی۔ عزیز سے عزیز دوست کی خاطر وہ اپنی رائے سے نہیں ہٹتے تھے۔ مخالفین کی مخالفت سے دب نہیں رُکتے تھے۔ مگر اُن کے پس پشت بیان اختلاف میں بھی اُن کی زبان سے ایسے الفاظ نہیں نکلتے تھے جو نفسانیت اور معاندانہ عیب جوئی پر دلالت کرتے۔ مخالف کی رائے کی تردید سختی کے ساتھ کرتے تھے۔ اپنی رائے کے دلائل کا زور شور سے اظہار کرتے۔ باوجود اس کے یہ کبھی نہیں ہوتا تھا کہ مخالف کے ذاتی یا صفاتی عیوب پیش کرکے اس کو ذلیل ورسوا کرتے۔

صحبت نہایت پاکیزہ و شگفتہ تھی۔ انسان خواہ کسی درجہ کا ہو اُن کی باتوں سے محظوظ ہوتا تھا۔ جس مسئلہ پر گفتگو کرتے اُن کے کمال کی خوبیاں نظر آتیں۔ عقلی پیرایہ، مورخانہ انداز، شاعرانہ نکتہ سنجی اُن کے بیان کے رفیق و ہمدم تھے۔ جب کبھی کسی علمی مسئلہ پر گفتگو ہوئی بعض نادر اور نازک پہلو ضرور بیان کئے۔ فضول باتیں میں نے اُن کی زبان سے کبھی نہیں سُنیں۔

اعزّہ کے ساتھ بہت الفت تھی۔ اپنے بھائی مہدی مرحوم کا ذکر برسوں دل گیری کے ساتھ کیا۔ دوسرے بھائی کی موت تو اُن کی جان ہی لے گئی۔

احساس بہت شدید تھا، اس لئے رنج والم سے بہت متاثر ہوتے تھے۔ ۱۹۰۲ء میں کانفرنس کے اجلاس کلکتہ کے زمانہ میں وہ اور میں ایک مکان میں مقیم تھے۔ ایک روز ایک نیم مردہ بھڑ نے اُن کے پاؤں پر ڈنک مار دیا۔ اس قدر بیتاب ہوئے کہ مجکو حیرت ہو گئی۔ اس قدر زمانہ گزرنے پر آج تک اُس اضطراب کی تصویر آنکھوں میں ہے۔ یہ احساس شاعری کا لوازمہ تھا۔ ہر ذوق میں شدت چاہتے تھے۔ نمک کھانے میں تیز ہو۔ دسترخوان پر نمک رکھ لیتے اور کھانے میں ڈالتے جاتے۔ شیرینی بھی گلوسوز مرغوب تھی۔ یہ عام منظر تھا کہ کاغذ پر قند رکھی ہوئی ہے۔ باتیں کرتے جاتے ہیں۔ قند کے دانے منہ میں ڈالتے جاتے ہیں۔ وہ قند سے اور سامع اُن کے کلام سے شیریں کام رہتے ہیں ؎

سخن ہاے شیریں تر از قند ہست

مرچ کی تیزی کی تاب نہ تھی سفر اتنے تجھے میں سے نہیں ہتیار ڈالے ہیں۔ ایک مرتبہ جلسۂ ندوۃ العلماء کے سلسلے میں بریلی اُن کا میرا ساتھ ہوا۔ اُس زمانہ میں تندرست تھے۔ قریباً ہر اسٹیشن پر شیرینی خریدی اور چکھی، بلکہ کھائی۔ محض شیریں ہونا کافی تھا، اُس کے حسن و قبح سے بحث نہ تھی۔ پانی تیز سرد پیتے تھے جاڑوں میں بھی یہی ہوتا۔ اس کے ساتھ سردی و گرمی بہت محسوس کرتے۔ ایک مرتبہ جاڑوں میں جیب گنج تشریف لائے، متعدد رضائیاں اوڑھیں، تسلی نہ ہوئی۔ دوسرے روز خاص اہتمام سے لحاف خوب روئی بھروا کر تیار کیا گیا۔ گرمیوں میں ہندوستان چھوڑ کر سرد یا کم گرم مقام پر چلے جاتے تھے اِس سلسلہ میں بمبئی کے سفر فارسی شعروسخن کے لئے یادگار رہیں گے۔ چائے سادہ اور گاڑھی پیتے تھے۔ صبح کو نماز کے اول وقت چائے پی کر فارغ ہو جاتے تھے۔ عادات میں سادگی تھی۔ لباس

عمدہ اور نفیس پہنتے تھے۔ مذابہت کم تھی۔ آخر آخر میں اُس کی قلت سے حیرت ہوتی تھی۔

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۲۰ و ۲۷ جنوری ۱۹۱۵ء)

علی گڑھ کالج میں تکبیر و تہلیل

ایڈیٹر صاحب۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ ۱۰ فروری سنہ حال کے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں جو مضمون بعنوان "علی گڑھ کالج میں تہلیل و تکبیر" رسالہ خطیب سے نقل کیا گیا ہے اُس میں بعض بیان ایسے ہیں جو واقعات کے صریح خلاف ہیں۔ اور چونکہ وہ مضمون آپ کے اخبار میں نقل ہوا ہے اس لئے اگر اُن کی تصحیح نہ کی جائے تو غلطیاں زیادہ سنگین ہو جائیں گی۔ اس لئے مجھ کو اجازت دیجئے کہ میں مفصلۂ ذیل سطور کے شائع کرنے کی درخواست آپ سے کروں۔

(۱) جلالت مآب امیر کابل نے جو امتحان دینیات رونق افروزی کالج کے وقت لیا تھا وہ قرأت کا نہ تھا بلکہ عقائد و فقہ کا تھا۔ جس تحقیق کے ساتھ یہ امتحان لیا گیا اُس سے وہ صاحب واقف ہیں جو طلبہ امتحان میں شریک تھے۔ منجملہ سوالات ایک یہ سوال بھی تھا کہ "دم مسفوح" کس کو کہتے ہیں؟ اسی امتحان کی مصروفیت کی وجہ سے ہز مجسٹی اسٹریچی ہال میں وقت مقررہ سے بہت بعد تشریف لیجا سکے تھے۔ اس کے ساتھ یہ امر بھی غور طلب ہے کہ پہلے سے طلبا انتخاب کر کے پیش نہیں کئے گئے تھے بلکہ فی الوقت امیر صاحب نے قصد امتحان ظاہر فرمایا اور اُسی وقت جس قدر طلبا پیش نظر تھے وہ حاضر کردیے گئے۔ اور اُن ہی کا امتحان مذکورۂ بالا مضامین میں ہوا۔ آخر امتحان میں جب ہز مجسٹی نے قرآن کی تعلیم کی بابت سوال کیا تو چند طلبا قرآن سنانے پر آمادہ ہو گئے۔ اُن میں سے علی الدین کو طلب فرمایا۔ یہ بیشک حسن اتفاق تھا کہ وہ فن تجوید سے واقف تھے اور اُن کی قرأت کا یہ اثر ہوا کہ امیر صاحب کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ بہرحال اصلی امتحان فقہ و عقائد کے مسائل کا تھا جس کی نسبت پوری تحقیق کے بعد امیر صاحب نے اپنا اطمینان الفاظ ذیل میں ظاہر فرمایا تھا۔

"من بحضور خود و زبان خود از شاگردان کالج موصوف امتحان بعض عقائد ضروری اسلامی و مسائل نماز و روزہ گرفتم تمام سوالہائے مرا بطریق عقائد اہل اسلام جواب گفتند۔"

اس امتحان کے بعد جو اندازہ دینیاتِ کالج کا امیر صاحب نے فرمایا وہ صریح راست تھا نہ "صریح غلط" اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ جو ترقی دینیات آج خدا کے فضل سے کالج میں نمایاں ہے اُس کی بنیاد نواب محسن الملک بہادر مرحوم کے عہد میں پڑ چکی تھی اور جناب ممدوح دل سے ترقی دینیات کے جویا تھے۔

(۲) نواب وقار الملک بہادر کے زمانہ میں دینیات نے بہت زیادہ ترقی کی۔ پروفیسر دینیات کا عہدہ قائم ہو کر مولانا سید سلیمان اشرف صاحب کا تقرر عمل میں آیا۔ درسِ قرآن و تفسیر کی جماعت قائم ہوئی۔ اُس کا ایک دَور ختم بھی ہو گیا تھا۔ اُس وقت بھی علمائے کرام مدعو ہوئے تھے۔ مولانا احمد رضا خاں صاحب، مولانا ولایت حسین صاحب الہ آبادی اور دیگر بزرگوں سے درخواست قدوم کی گئی تھی۔ چنانچہ مولانا عبدالحق صاحب حقّانی تشریف لائے اور چند گھنٹے امتحان لیا۔ جو تحریر بعد امتحان میرے نام بھیجی تھی اُس سے واضح ہوتا تھا کہ نتیجۂ امتحان سے ممدوح کو حیرت انگیز اطمینان تھا۔

(۳) صیغۂ تجوید کی بنیاد نواب اسحٰق خاں صاحب بہادر کے عہد میں قائم ہوئی ہے۔ تکمیل مسجد کا سہرا کارکنانِ قضا و قدر نے نواب صاحب ممدوح کے واسطے محفوظ رکھا تھا۔ ذٰلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم۔

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۳ مارچ ۱۹۱۵ء)

زنانہ مسلم اسکول علی گڑھ میں تعلیم قرآن مجید

جناب ایڈیٹر صاحب۔ السلام علیکم۔ آپ کے اخبار مورخہ ۳ مارچ میں مدرسۂ نسواں علی گڑھ کی سالانہ رپورٹ کے خلاصہ میں یہ پڑھ کر خاص مسرت ہوئی کہ پردہ کے انتظام کے ساتھ "قرآن پاک کی تعلیم اور نماز روزے کی پابندی نہایت سختی کے ساتھ ہوتی ہے۔" اس سلسلہ میں آپ مجکو اجازت دیں کہ میں منتظمان اسکول کی توجہ اس جانب مائل کروں کہ تعلیم قرآن پاک میں قرآن مجید کا ادب اور احترام ملحوظ رہنا عین مقتضائے ایمان ہے۔ کلام مجید جہاں پڑھا جائے وہ پامال اور مبتذل جگہ نہ ہو۔ کلام مجید رحل یا کسی اور بلند جگہ پر رکھا جائے۔ اگر یہ اہتمام نہ ہوگا تو بچیوں کے دل میں کلام مجید کا ادب اسلامی شعار کے مطابق نہ رہیگا۔

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۱۷ مارچ ۱۹۱۵ء)

جناب خواجہ عزیزالدین صاحب "عزیز" لکھنوی

ایک اور باکمال نے رحلت فرمائی۔ اس مرتبہ ادب فارسی کا خاتمہ ہوا۔ خواجہ صاحب مرحوم اُن اہل کمال میں سے تھے جن کی ذات سے آج سے دو سو برس پہلے کی ادبی مجالس کو زینت و عزت حاصل ہوتی۔ یہ پختگی و متانتِ کلام (جو متقدمین کا سرمایۂ ناز ہے) خواجہ عزیز کے حصہ میں آئی تھی۔ جہاں تک مجھ کو معلوم ہے غزل و قصائد کا مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ لیکن تازشِ فن دو مثنویاں عرصہ ہوا شائع ہو چکی ہیں۔ ایک قیصر نامہ، دوسری ید بیضا۔ قیصر نامہ میں ۱۸۵۴ء کی جنگ روم اور روس کا حال ہے اور سکندر نامہ کا انداز۔ متانت و سنجیدگی میں سکندر نامہ کے نہ ہم پلہ ہے اور نہ ہو سکتی تھی۔ مگر اس کو پڑھ کر یہ حیرت ضرور ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں ایسی فارسی مثنوی لکھی گئی۔ فارسی ادب کی صدہا برس کی عمر

میں غزل و قصائد کے مقابلے میں مثنوی کے استاد بہت کم ہوئے ہیں۔ مشہور مثنوی گو اساتذہ کی تعداد غالباً بیس سے زیادہ نہ ہوگی۔ اس سے مثنوی لکھنے کا اشکال ذہن میں آسکتا ہے۔ ید بیضا اہلی شیرازی کی مشہور معرکۃ الآرا مثنوی سحر حلال کا جواب ہے۔ سحر حلال ذو قافیتین صنعتِ تجنیس کے ساتھ ہے۔ خواجہ صاحب نے ید بیضا میں صنعتِ ذو بحرین اضافہ فرما دی ہے۔ اس کا مطلع یہ ہے۔ ؎

ای ز تو اندر سخن شورہا
نام تو شد زینتِ منشورہا

قیصر نامہ کی حمد و نعت کے کچھ اشعار بطور نمونہ درج ذیل کئے جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ حسرت دل میں ہی کہ اخبار پڑھنے والوں میں سے کتنے اس مذاق لطفِ سخن سے آگاہ ہوں گے۔ یہ کمال کا نقص نہیں جنگل میں کتنے پھول ہیں جن کے رنگ نگاہ سے اور بو دماغ سے آشنا نہیں تاہم وہ پھول ہیں ؎

شاخِ گل ہر جا کہ روید ہم گل ست
خُمِّ مُل ہر جا کہ جوشد ہم مُل ست

حمد

بنام خداوند کار آفرین — ہزار آفرین صد ہزار آفرین
جہاں پادشاہ خدیواں خدیو — ازو ایں کششِ او چہ گاؤ چہ گیو
ازل تا ابد بارگاہ و لیست — گراں تا گراں در پناہ و لیست
درش را پدیدار سرو کار نیست — شبے تا کسانش بہ اتش بار نیست
قضایش بر آرد بہر جا کہ تیغ — کہ آرد کہ دارد سر از وے دریغ
اگر از جلالش زند دم زماں — بلرزد سپہر و بجنبد جہاں
بجنبش دریا ہل چوں پر زند — صفِ شیر و پیلاں بہم بر زند
کند قطرہ را در صدف دُرِّ ناب — دہد سایہ را پایۂ آفتاب
دل و جاں ما را بے طاقت دہد — عجب ایں کہ بے خدمت اجرت دہد

نعت

فروزندۂ خورشید شب زندہ دار — شب افروز شمع رہِ کردگار

بہ معنی زر رحمت نخست آیتے | بظاہر زد ولت پسیں رایتے
زمیں تا فلک روشن از دین او | ز آئینہ روشن تر آئینِ او
بشنبہ شرف دادہ آدینہ را | ہم برزدہ دینِ دیرینہ را
ز مُہر نبوت کہ بر پشت زد | بہ مُہر سلیماں زد انگشتِ رد
حبش از غلامی او داغدار | ببویش سوادِ یمن مشکبار
جہاں سایہ دار د سراپائے نور | بلے سایہ از نور دارد ظہور

ایک نعتیہ شعر غزل کا قابل شنید ہے ؎

دہد حق عشق احمد بندگانِ چیدۂ خود را
بخاصاں شاہ می بخشد مئی نوشیدۂ خود را

حالات و اوصاف خواجہ صاحب کشمیری الاصل تھے سلطنت اودھ کے زمانے میں بزرگوں کا شال بنانے کا بڑا کارخانہ تھا۔ لکھنؤ کی رونق کے ساتھ کاروبار میں رونق تھی۔ لکھنؤ مٹا تو کارخانہ بھی مٹ گیا۔ مبدأ فیاض نے شال کشمیری کی نزاکت و رنگینی کلام میں عطا فرمادی۔ بقول غالب مرحوم ؎

آنچہ از دستگہ پارس بہ نیغما بردند
تا بنالم ہم ازاں جملہ زبانم دادند

خواجہ صاحب کی پیدائش لکھنؤ کی تھی۔ یہیں نشو و نما ہوئی یہیں علم و کمال حاصل کیا۔ عمر غالباً ستر اور اسی کے درمیان تھی۔ علاوہ کمالِ سخن جناب مرحوم کے اخلاق ایسے پاکیزہ و پختہ تھے کہ ملنے والوں کا دل مسخر ہو جاتا تھا۔ روش نہایت مہذب و متین تھی۔ شفقت اس درجہ تھی کہ حضوری ایک طرف غیبت میں بھی دل اُس کا اثر محسوس کرتا۔ باوجود شانِ کمال تواضع اس قدر تھی کہ ملنے والوں کا قلب اثر خجالت محسوس کرتا۔ مہماں نوازی مقتضائے اخلاق تھی۔ جب جاؤ ممکن نہیں کہ چار کی مدارات نہ ہو۔ شام کو سادہ، صبح کو ناشتہ کے ساتھ۔ اپنے ہاتھ سے سماوار میں کوئلہ ڈالتے آگ روشن کرتے۔

چار تیار کر کے عنایت فرماتے۔ ناممکن تھا کہ کوئی اصرار اس سے باز رکھتا۔ سماوار میں کوئلہ ڈال دیا ہے۔ آگ پنکھے سے روشن ہو رہی ہے۔ اسی میں فارسی کے اشعار یا ادبی نکات بیان فرما رہے ہیں۔ حیف اب وہ لطف کہاں۔ وہ بافیض صحبت کہاں۔ مجکو دیرینہ نیاز حاصل تھا۔ جب لکھنؤ گیا ضرور حاضر ہوا۔ ایک آدھ مرتبہ حاضری ناغہ ہوئی ہوگی۔ ہر مرتبہ لطف و شفقت کا تازہ لطف پایا۔ چند سال اُدھر علامہ شبلی بھی ہوتے۔ اُس وقت مضمون "قند مکرر" و "لطف دوبالا" ہوتا۔ جب حاضر ہوا کسی نہ کسی مہمان کو فروکش دیکھا۔ جب بادشاہ سلامت بحیثیت ولی عہد رونق افروز لکھنؤ تھے تو میں نے دیکھا کہ دیوان خانہ کا بڑا کمرہ مہمان خانہ بنا ہوا تھا۔

خواجہ صاحب عرصہ تک کیننگ کالج (لکھنؤ) کے فارسی پروفیسر رہے۔ اب بہت دن سے خانہ نشین تھے۔ نہایت آن بان کے ساتھ بسر کرتے تھے۔ خواجہ صاحب کی خوش قسمتی سے صاحبزادے سب لائق و برسر کار ہیں۔

ایک بار خواجہ صاحب فرماتے تھے کہ ابتدائے عمر میں ایک سفر کے سلسلہ میں دلی جانے کا اتفاق ہوا۔ مرزا غالب مرحوم کا اخیر زمانہ تھا۔ میں حاضر ہوا تو پلنگ پر لیٹے تھے۔ حال دریافت کرکے کلام سنانے کی فرمائش کی۔ میں نے اپنا یہ شعر سنایا:

مہِ مصر ست داغ از رشک مہتابے کہ من دیدم
زلیخا کور شد از حسرتِ خوابے کہ من دیدم

سُن کر تامل کیا اور فرمایا ماہِ کنعان مسلّم، ماہِ مصر نئی ترکیب ہے۔ میں نے مرزا صائب کی سند پیش کی۔ سند سُن کر میرے شعر کی داد دی۔

خواجہ صاحب کی خدمت میں مجکو سب سے آخر مرتبہ گزشتہ ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس کے موقع پر حاضر ہونے کا اتفاق ہوا۔ کھانسی اور خارش کی شکایت زیادہ تھی۔ ضعف بھی بڑھ گیا تھا۔ میں نے علامہ شبلی مرحوم کا ذکر عمداً نہیں کیا کہ صدمہ ہوگا۔ ایک اور صاحب نے چھیڑ دیا۔ بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ بہت ہی دلگیر الفاظ میں مرحوم کو یاد فرمایا۔ جو

تاریخ وفات لکھی تھی اُس کا مادہ سنایا ؎

از سخن تاج جہاں بانی رفت

مولوی شبلی نعمانی رفت

۱۳۳۵ - ۳ = ۱۳۳۲ ہجری

میں نے بقیہ اشعار کی درخواست کی فرمایا لکھ کر بھیج دوں گا۔ حیف کہ اس کی نوبت نہ آئی اور خود مرحوم کا پیام اجل آپہنچا۔ (یہ مکمل نظم انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۳ فروری ۱۹۱۵ء میں شائع ہو چکی ہے۔ ایڈیٹر)

صاحبزادگان والاشان کو غیر مطبوعہ کلام کی ترتیب و اشاعت کی جانب توجہ مائل فرمانی چاہیے فارسی ادب کا نادر مجموعہ[1] ہوگا۔

مانا کہ یہ بھی ہوا۔ خواجہ عزیز کی شفقت کو آنکھیں ترسیں گی، دل ڈھونڈیگا نہ پائے گا۔ ہاں یادحیات کا ساتھ دے گی۔ فیضی ؎

اے ہم نفسانِ محفلِ ما

رفتید ولے نہ از دلِ ما

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۱۴ اگست ۱۹۱۵ء)

کلام مجید کے دو نئے ترجمے

کلام مجید کے پارۂ اول کے دو ترجمے حال میں قادیان سے اُس پارٹی کی طرف سے شائع کئے گئے ہیں جو قادیانی فرقہ کی گرم پارٹی خیال کی جاتی ہے۔ ایک ترجمہ اردو کا ہے، دوسرا انگریزی کا۔ یہ ترجمے عمدہ کاغذ پر اہتمام کے ساتھ چھاپے گئے ہیں۔ نوٹ بھی کثرت سے دلچسپ ہیں۔ انگریزی ترجمہ کا اہتمام خصوصاً قابل لحاظ ہے۔ ٹائپ ایسا عمدہ ہے کہ کسی استاد نسخ کا قلم معلوم ہوتا ہے۔

لیکن افسوس ہے کہ ساری خوبیاں صرف اہتمام طبع پر ختم ہو جاتی ہیں۔ مضامین کے اعتبار سے پوری طرح معانی قرآنی کی تحریف کی گئی ہے۔ جو معنی کلام مجید کے عہد رسالت سے آج تک سمجھے گئے

---

[1] وصی الدین صاحب (فرزند خواجہ صاحب) نے بڑے اہتمام و شوق سے دیوان کلام طبع کرا کے شائع کر دیا۔ حبیب الرحمن

تھے وہ سب غلط قرار دیکر خلاف سیاق قرآنی نئے معنی اپنے فرقہ کی تائید میں اختراع کرکے درج کئے گئے ہیں

مثلاً سورہ فاتحہ میں "غیر المغضوب علیھم" کی تفسیر میں آج تک مفسرین نے یہ سمجھا تھا کہ:

"مغضوب علیھم" (وہ لوگ جن پر غضب الٰہی نازل ہوا) سے یہود مراد ہیں۔ اس جدید ترجمہ میں لکھا ہے کہ وہ مسلمان بھی مراد ہیں جو مرزا غلام احمد قادیانی پر ایمان نہ لائیں اور اس طرح زمرۂ یہود میں داخل ہو جائیں (ملاحظہ طلب صفحہ ۳ کالم ۴) سورہ بقرہ میں "وبالآخرۃ ھم یوقنون" سے مراد تمام مفسرین کے نزدیک عالم آخرت ہے اور اس پر کثرت سے آیات قرآنی شاہد ہیں (جیسا کہ خود ترجمہ جدید میں تسلیم ہے لیکن ترجمہ قادیانی میں بتلایا گیا ہے کہ "آخرت" سے مراد "قادیانی مرزا صاحب" ہیں۔ اس کی بابت ایک لفظ نہیں لکھا کہ "الآخرۃ" کا موصوف مقدر کیا ہے جس سے ادّعائے معنی کی تائید ہوتی۔ سورہ فاتحہ کے الفاظ "انعمت علیھم" کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ نبی ہونے کی دعا مانگے۔ ظاہر ہے کہ دعا اسی مقصد کے لئے مانگی جائے گی جو ممکن الحصول ہو۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہر مسلمان نبی ہو سکتا ہے۔ اس طرح نبوت کا دروازہ نہایت فیاضی کے ساتھ کشادہ کیا گیا ہے۔ حالانکہ کلام مجید نے بالاعلان ختم نبوت کا اظہار فرما دیا ہے۔ سورہ جمعہ کی آیت "ھو الذی بعث فی الامیین الخ" کے معنی عام مفسرین نے یہ لکھے ہیں کہ حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت آپ کے معاصرین اور بعد کے آنے والوں کے واسطے یکساں تھی۔ یہی عامۂ مسلمین کا عقیدہ ہے۔ مگر نیا ترجمہ بتلاتا ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بعد کے آنے والے لوگوں کے لئے رسول نہ تھے بلکہ وہ شخص ہے جو آپ کی محبت میں اور فرماں برداری میں فنا ہو کر صاحب وحی ہوگا اور یہ کہ اُس شخص کا نام مرزا غلام احمد خاں قادیانی ہے۔" اس سے صاف ظاہر ہے کہ مذہب قادیانی کے ظہور کے بعد حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا (معاذ اللہ) خاتمہ ہو چکا۔ دریافت طلب لطیفہ یہ ہے کہ عہد صحابہ کے بعد سے ظہور قادیانی تک مسلمان کس کی رسالت میں رہے؟

خلاصہ یہ کہ یہ ترجمے اسی قسم کے ادّعائی مضامین اور بلا دلیل دعووں سے بھرے ہوئے ہیں اور مسلمانوں کے واسطے سراسر مضر ہیں۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس مضمون کو عام مسلمانوں تک پہنچا دے

مسلمان ایڈیٹروں سے بالخصوص ہماری درخواست ہے کہ اس ریویو کو اپنے اپنے اخبارات میں طبع فرما دیں، تاکہ مسلمان مالی اور دینی نقصان سے محفوظ رہیں۔

زیادہ افسوس انگریزی ترجمہ کا ہے۔ انگریزی صحیح ترجمہ کی جیسی ضرورت ہے ظاہر ہے۔ یہ ترجمہ ظاہری اہتمام کے لحاظ سے قابلِ تحسین ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ فرقہ بندی کے مسلمات نے اس کو بالکل بیکار کر دیا۔ اور ویسا ہی غلط رہا جیسے پہلے ترجمے سیل وغیرہ کے ہیں۔ ہم کو اندیشہ ہے کہ انگلستان میں اسلامی تحریک کو اس ترجمے سے نقصان پہنچے گا۔ اور وہاں کی پبلک اس کے بے دلیل دعووں کو پڑھ کر خود اسلام کو بے دلیل دعوٰی خیال کرنے لگے گی۔ اس کے علاوہ یہ بھی اندیشہ ہے کہ (جس طرح بعض صاحبوں کا پہلے بھی گمان تھا) یہ خیال عام نہ ہو جائے کہ خواجہ کمال الدین صاحب کا مقصود در پردہ قادیانی عقیدہ کی اشاعت ہے۔ ہم کو امید ہے کہ خواجہ صاحب موصوف اور مولوی صدر الدین صاحب اس امر کا اعلان فرما دیں گے کہ وہ ان عقائد کے مؤید نہیں اور انگلستان کی پبلک کے سامنے وہ صرف عام اسلامی مطالب کی اشاعت کر رہے ہیں، نہ مخصوص فرقہ قادیان کی۔

قادیانی ترجمائے قرآنی پر جو ریویو محض جمہور اہل اسلام کی آگاہی کے واسطے میں نے لکھا تھا اس پر اخبار "الفضل" قادیان نے جرح و قدح کی ہے۔ بعض مطالب پر مزید بحث کی ضرورت ہے، اس لئے سطور ذیل کی اشاعت کی درخواست کی جاتی ہے۔ ریویو میں میں نے لکھا تھا کہ مفسرین نے اب تک یہ سمجھا تھا کہ "غیر المغضوب علیھم" سے مراد یہود ہیں۔ قادیانی ترجمہ میں وہ مسلمان بھی متوجب غضب الٰہی قرار دیئے گئے ہیں جو قادیانی مذہب پر ایمان نہ لائیں۔ اس بیان کو مضمون نگار اخبار "الفضل" نے محض ادعائے اور بے سند قرار دیا ہے۔ مگر جلیل القدر مفسرین کے اقوال ذیل میرے بیان کی تائید کریں گے:۔

۱۔ امام المفسرین ابن جریر طبری تفسیر "جامع البیان" میں فرماتے ہیں:

فان قال لنا قائل فمن ھؤلاء المغضوب علیھم الذین امرنا اللہ جل ثناءہ مسئلتہ ان لا یجعلنا منھم قیل ھم الذین وصفھم اللہ	اب اگر کوئی دریافت کرے کہ المغضوب علیھم سے وہ کون لوگ مراد ہیں جن کی نسبت اللہ تعالیٰ نے ہم کو یہ حکم دیا ہے کہ ہم اس سے یہ دعا کریں کہ وہ ہم کو ان میں شامل

جل ثنائه فی تنزیله فقال قل هل انبئکم بشر من ذالك مثوبة عند الله من لعنه الله وغضب علیه وجعل منهم القردة والخنازیر وعبد الطاغوت اولئك شر مکانا واضل عن سواء السبیل فاعلمنا جل ذکره بمنه ما احل بهم من عقوبته بمعصیتهم ایاه ثم علمنا منته علینا وجه السبیل الی النجاة من ان یحل بنا مثل الذی حل بهم من النقمات ورافته بنا فان قال وما الدلیل علی انهم الذین وصفهم الله وذکرهم فی تنزیله علی ما وصف قیل حدثنی احمد بن الولید الرملی

(۰۰۰ اسناد)

عن عدی بن حاتم قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم المغضوب علیهم الیهود۔

نہ فرمائے تو کہا جائے گا کہ وہ وہ لوگ ہیں جن کو بیان اللہ تعالیٰ نے اپنی اس آیت میں فرمایا ہو ترجمہ آیت، تو کہہ میں تم کو بتاؤں ان میں کس کی بری جزا ہے اللہ کے یہاں وہی جس کو اللہ نے لعنت کی اور اُس پر غضب ہوا اور اُن میں بعض بندر کئے اور بعض سور ۔۔۔ پوجنے لگے شیطان کو وہی بدتر ہیں درجے میں اور بہت بہکے سیدھی راہ سے۔ اس طرح خداوند تعالیٰ نے اپنے کرم سے ہم کو جتا دیا کہ اُن پر خدا کا عذاب نافرمانی الہٰی کی سبب نازل ہوا تھا پھر اپنے فضل رحمت سے یہ بھی بتا دیا کہ جو عذاب اُن پر نازل ہوا اُس سے بچنے کی کیا سبیل ہے۔ اب اگر یہ سوال ہو کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ المغضوب علیهم سے مراد وہی لوگ ہیں جن کا ذکر آیت میں ہوا تو جواب دیا جائے گا کہ مجھ سے حدیث بیان کی احمد بن الولید رملی نے (میں باقی اسناد بخوف طول حذف کرتا ہوں)

عدی بن حاتم سے انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ المغضوب علیهم یہود ہیں۔

اس کے بعد امام طبری نے تیرہ اور حدیثیں اسی قول کی تائید میں روایت کی ہیں اور سوائے اس معنی کے کہ ”المغضوب علیهم“ سے مراد یہود ہیں اور کوئی معنی اپنی تفسیر میں نہیں لکھے (ملاحظہ ہو تفسیر جامع البیان امام طبری الجزء الاول صفحہ ۷۹ مطبوعہ مطبع المیمنیہ مصر)

۲- امام ابن کثیر اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں (یہ بیان کر کے کہ المغضوب علیهم سے مراد یہود ہیں :

ولا اعلم من المفسرین فی هذا اختلافا

اور میں نہیں جانتا کہ مفسرین سے کسی نے اس سے اختلاف

وشاهد ما قاله هؤلاء الائمة من ان الیهود مغضوب علیهم والنصاری ضالون الحدیث المتقدم وقوله فی خطابه مع بنی اسرائیل فی سورة البقرة بئس ما اشتروا به انفسهم (الآیه) وقال فی المائدة قل هل أنبئکم بشر من ذالك مثوبة عند الله من لعنه الله وغضب علیه (الآیه) وقال تعالے لعن الذین کفروا من بنی اسرائیل علی لسان داؤد وعیسیٰ بن مریم (الآیه)

کیا ہو اور ان اماموں کے اس بات کے قائل ہونے کی دلیل کہ المغضوب علیہم سے مراد یہود ہیں وہ حدیث ہے جو اوپر گزری اور یہ آیتیں ہیں بئس ما اشتروا به انفسهم الخ اور هل انبئکم بشر من ذالك الخ اور لعن الذین کفروا الخ (ملاحظہ طلب تفسیر امام ابن کثیر مطبوعہ مطبع المیسریہ مصر ۱۳۰۰ھ بر حاشیہ فتح البیان صفہ ۵۲)

۳- امام ابن حیان تفسیر البحر المحیط میں (یہ قول نقل کر کے کہ المغضوب علیہم سے مراد یہود ہیں) فرماتے ہیں:

قاله ابن مسعود و ابن عباس ومجاهد والسدی وابن زید۔

یہی قول حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما) اور مجاہد اور سدی اور ابن زید کا ہے (ملاحظہ ہو البحر المحیط مطبوعہ مطبع السعادۃ مصر ۱۳۲۸ھ صفہ ۳۰)

۴- تفسیر کبیر میں امام رازی لکھتے ہیں (غیر المغضوب علیہم کی تفسیر میں) "المشهور ان المغضوب علیهم هم الیهود لقوله تعالیٰ من لعنه الله وغضب علیه والضالین هم النصاریٰ لقوله تعالیٰ قد ضلوا من قبل واضلوا کثیراً فضلوا عن سواء السبیل وقیل هذا ضعیف" (ملاحظہ طلب تفسیر کبیر امام رازی صفہ ۱۳۵)

۵- علامہ ابو سعود اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں۔" وبالمغضوب علیهم ولا الضالین الیهود والنصاریٰ کما ورد فی مسند احمد والترمذی" (تفسیر علامہ ابو سعود بر حاشیہ تفسیر مذکور صفہ ۱۴۳ الجزء الاول مطبوعہ مطبع حسینیہ مصر)

۶۔ تفسیر السراج المنیر میں ہے:

غیر المغضوب علیهم وهم الیهود لقوله تعالٰی فهم من لعنه الله وغضب علیه ......

وقال صلی الله علیه وسلم ان المغضوب علیهم الیهود ولا الضالین النصارے رواه ابن حبان وصححه۔

المغضوب علیهم یہود ہی ہیں اس کی دلیل خداوند تعالیٰ کا قول ہے اُن کے حق میں من لعنه الله وغضب علیه۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے بیشک المغضوب علیهم یہود اور الضالین نصاریٰ ہیں۔ اس حدیث کو ابن حبان نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ (ملاحظہ ہو تفسیر السراج المنیر صفحہ ۱۰ و ۱۱ جلد اول مطبوعہ مطبع النجایہ مصر ۱۳۱۱ھ)

تفسیر السراج المنیر میں سوائے اس قول کے کہ المغضوب علیهم یہود ہیں کوئی دوسرا قول نقل نہیں کیا۔

۷۔ تفسیر جلالین میں ہے غیر المغضوب علیهم وهم الیهود۔ المغضوب علیهم یہود ہی ہیں)۔ (الجلالین صفحہ ۴۹۴ مطبوعہ مطبع احمدی ۱۲۵۷ھ)

۸۔ امام جلال الدین سیوطی تفسیر الدر المنثور میں فرماتے ہیں (اصل عربی عبارت طول کے خیال سے چھوڑ دی گئی ہے)۔

ربیع بن انس، ابن عکرمہ، مجاہد، سعید بن جبیر (ان سب تفسیر کے اماموں) کا یہ قول ہے کہ المغضوب علیهم سے مراد یہود ہیں۔ عبد الرزاق، امام احمد، عبد بن حمید، ابن جریر، بغوی، ابن صدر اور ابو الشیخ (ان تمام محدثین) نے یہ حدیث عبد اللہ بن شقیق سے روایت کی ہے کہ المغضوب علیهم یہود ہیں۔ ابن مردویہ نے بھی یہ روایت کی ہے۔ نیز امام بیہقی نے شعب الایمان میں، امام سفیان بن عیینہ نے اپنی تفسیر میں اور سعید بن منصور نے بھی یہ روایت کی ہے۔ امام احمد، عبد بن حمید اور ترمذی (ترمذی نے اس حدیث کو حسن بتایا ہے) ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابن حبان نے (صحیح میں) حضرت عدی بن حاتم سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ المغضوب علیهم یہود ہیں۔ ابن جریر نے حضرت عبد اللہ بن مسعود کا اور مجاہد کا یہ قول روایت کیا ہے کہ المغضوب علیهم یہود ہیں۔ ان

تمام اقوال کو نقل کر کے امام جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں:

قال ابن ابی حاتم (محدث مشہور) ابن ابی حاتم نے فرمایا ہے کہ میں نہیں جانتا کہ مفسرین میں سے

لا اعلم خلافا بین المفسرین فی تفسیر المغضوب علیھم بالیھود والضالین النصاریٰ | کسی نے بھی اس میں اختلاف کیا ہو کہ المغضوب علیھم سے مراد یہود ہیں۔

(ملاحظہ ہو الدر المنثور صفحہ ۱۶ الجزء الاول مطبوعہ مطبع المیمنیہ مصر ۱۳۱۴ھ)

۹۔ تفسیر ابن عباس میں ہے:

غیر المغضوب علیھم غیر دین الیھود الذین غضب علیھم۔ | دین یہود کے سوا جن پر غضب نازل ہوا

(تفسیر ابن عباس صفحہ ۲ حاشیہ الدر المنثور مذکور)

۱۰۔ معالم التنزیل میں ہے (غیر المغضوب علیھم کی تفسیر میں):

وغضب اللّٰہ تعالیٰ لا یلحق عصاۃ المؤمنین انما یلحق الکافرین | خدا تعالیٰ کا غضب گنہ گار مسلمانوں پر نازل نہیں ہوتا بلکہ صرف کافروں پر نازل ہوا ہے۔

(ملاحظہ ہو تفسیر معالم التنزیل صفحہ ۱۰ مطبوعہ بمبئی مطبع صالحی ۱۲۶۹ ہجری)

مذکورۂ بالا اقوال کے پڑھ لینے کے بعد خصوصاً امام ابن کثیر اور امام محدث ابن ابی حاتم کی اس تصریح کے بعد کہ مفسرین میں سے کسی کو اس قول سے اختلاف نہیں ہے قارئین کرام کو یہ اطمینان ہو جائے گا کہ میرا یہ کہنا کہ "سلف سے اب تک المغضوب علیھم سے مراد یہود ہیں" محض ادعا نہ تھا بلکہ تفاسیر معتبرہ کے عین مطابق تھا۔

اب امام بیضاوی کا وہ قول رہ جاتا ہے جو اخبار "الفضل" نے نقل کیا ہے۔ اول یہ مناسب ہے کہ ہم تفسیر بیضاوی کی عبارت بجنسہٖ نقل کر کے اس کا ترجمہ کر دیں۔ امام بیضاوی لفظ غضب و ضلال کے معنی اور عبارت غیر المغضوب علیھم ولا الضالین کی ترکیب نحوی بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

وقیل المغضوب علیہم الیہود لقولہ تعالیٰ
فیہم من لعنہ اللہ وغضب علیہ و لا
الضالین النصاریٰ لقولہ تعالیٰ قد ضلوا
من قبل واضلوا کثیرًا وقد روی مرفوعًا
ویتجہ[1] ان یقال المغضوب علیہم العصاۃ
والضالون الجاہلون باللہ لان المنعم
علیہ من وفق للجمع بین معرفۃ الحق لذاتہ
والخیر للعمل بہ فکان المقابل لہ من اختل
احدیٰ قوتیہ العاقلہ والعاملۃ والمخل
بالعمل فاسق مغضوب علیہ لقولہ تعالیٰ
فی القاتل عمدًا وغضب اللہ علیہ والمخل
بالعلم جاہل ضال لقولہ تعالیٰ فماذا
بعد الحق الا الضلال۔

اور کہا گیا ہے کہ المغضوب علیہم یہود ہیں۔ کیونکہ خداوند
تعالیٰ فرماتا ہے من لعنہ اللہ وغضب علیہ ولا الضالین نصاریٰ
کیونکہ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے قد ضلوا من قبل واضلوا
کثیرا اور یہ قول روایت کیا جاتا ہے بطور حدیث مرفوع
کے۔ اور ذہن میں یہ بات بھی آتی ہے کہ یہ کہا جائے کہ
المغضوب علیہم گنہگار ہیں اور ضالون وہ جو خدا کو نہیں
جانتے۔ اس واسطے کہ نعمت یافتہ وہ شخص ہیں جن کو خداوند
تعالیٰ کی ذات کی معرفت کی اور خیر پر عمل کرنے کی توفیق
بخشی گئی ہو۔ لہذا اس کا نعمت یافتہ کا مقابل وہ ہوگا جو
اپنی قوت عاقلہ و عاملہ میں سے ایک کو بیکار کرے۔ عمل
میں خلل انداز فاسق مغضوب علیہ ہے اس لئے کہ خداوند تعالیٰ
قاتل بالارادہ کی نسبت فرماتا ہے وغضب اللہ علیہ
اور علم میں خلل انداز جاہل گمراہ ہے بموجب قول الٰہی۔
فماذا بعد الحق الا الضلال۔

لہ اتجاہ۔ روئے دادن یقال اتجہ لہ رأیٌ اے سنح ۱۲ منتہی الارب۔

(ملاحظہ ہو تفسیر بیضاوی صفحہ ۱۱ مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی سنہ نامعلوم)

یہ ہیں تمام وہ معنی جو امام بیضاوی نے تحریر فرمائے ہیں۔ اور اس میں غیر المغضوب علیہم کے صرف دو معنی بیان کئے ہیں، نہ پانچ (جیسا کہ "الفضل" نے لکھا ہے اور انعمت علیہم کے معنی المغضوب علیہم کے معنوں میں شامل کرکے دو کے پانچ قول بنا دیئے ہیں) اول یہود اور اس کی دلیل کلام الٰہی اور کلام نبوی دونوں سے نقل فرمائی ہے دوسرے معنی اس عنوان سے بیان کئے ہیں کہ ذہن میں آتا ہے کہ کہا جائے (اور یہ معنی خود امام بیضاوی کی رائے ہیں جیسا کہ علامہ سیالکوٹی کی عبارت منقولہ الفضل سے

معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ اس معنی کی نسبت تقریر اعتراض معترض میں کہتے ہیں "والمخترعی للرائے" کہ مغضوب علیہم سے مراد فاسق اور ضالین سے مراد جاہل گمراہ ہوں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بیضاوی اس قول کی نسبت ظاہر کر دینا چاہتے تھے کہ یہ میری ذاتی رائے ہے۔ اسی لئے فرمایا ویتجاہ (یعنی یہ معنی ذہن میں آتے ہیں) اس سے معلوم ہوا کہ یہ قول عامۂ مفسرین کا قول نہیں ہے ورنہ امام بیضاوی اُس کو اپنے ذہن کی جانب منسوب نہ کرتے۔

رہا یہ امر کہ المغضوب علیہم سے مراد یہود ہونے کے قول کو انھوں نے "قیل" کر کے لکھا ہے لہذا اُس کو ضعیف بتلایا ہے تو اس کا پہلا جواب یہ ہے کہ اگر یہ قول ضعیف ہے تو دوسرا بھی ضعیف ہے اس لئے کہ وہ "ان یقال" کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ قیل ویقال دونوں بصیغۂ مجہول ہیں۔ لیکن اصلی جواب یہ ہے کہ یہ تمام بحث قیل کے مجہول ہونے سے پیدا ہوئی ہے۔ یہ اصطلاح منطق اور معقول کی ہے کہ صیغۂ مجہول کے ساتھ قول ضعیف نقل کرتے ہیں۔ کلام مجید میں بہت سے مقامات میں قیل اور یقال کے ساتھ احکام ارشاد ہوئے ہیں، وہاں تضعیف کس طرح مراد ہو سکتی ہے؟ محدثین جو کہتے ہیں کہ رُوِیَ اُس سے مراد روایت ضعیف نہیں ہوتی۔ اہل لغت جب کوئی سند لاتے ہیں تو کہتے ہیں یقال کذا۔ اس سے قوت سند مراد ہوتی ہے نہ تضعیف۔ جو عبارتیں اوپر نقل کی گئی ہیں اُن سے معلوم ہوا ہوگا کہ قول منصور ومقبول قیل کر کے بیان فرمایا ہے (دیکھو امام جلیل ابن جریر طبری کا قول) اس لئے یہ کہنا کہ جو قول قیل کر کے نقل کیا ہے اُس کو امام بیضاوی ضعیف خیال کرتے ہیں، صحیح نہیں خصوصاً جب کہ وہ اُس کو قول الٰہی وحدیث نبوی سے مدلل فرماتے ہیں اور اس کے مقابلہ میں دوسرا قول اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ذہن میں آتا ہے کہ کہا جائے۔ امام رازی نے تفسیر کبیر میں جو لکھا ہے اُس سے معلوم ہوگا کہ وہ امام بیضاوی کے قول ثانی کی تضعیف کرتے ہیں اور اُس مذہب کو قول مشہور مفسرین کا بیان کرتے ہیں جس کو امام بیضاوی نے قیل کر کے نقل کیا ہے۔ اب رہا علامۂ سیال کوٹی کا حاشیہ۔ میرے یہاں یہ حاشیہ نہیں ہے اس لئے پوری عبارت دیکھنے سے مجبور رہا۔ تاہم جو عبارت اخبار الفضل میں نقل ہوئی ہے اُس کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک محشیانہ توجیہ ہے (جیسا کہ لفظ یجوز کے

استعمال کرنے سے واضح ہی، نہ مفسرانہ یا محدثانہ تحقیقات - اکابر محدثین و مفسرین کے اقوال بالا سے روشن ہو چکا ہی کہ کلام رسالت سے مراد تخصیص یہود ہی -

یہ بحث تو ختم ہوئی اب ایک سوال مترجم قادیانی سے باقی رہتا ہی - وہ یہ کہ اگر اُن کا ترجمہ مطابق تفاسیر سلف ہی تو وہ بتلائیں کہ اُن کا یہ قول کہ المغضوب علیہم میں وہ مسلمان بھی داخل ہیں جو مسیح قادیانی پر ایمان نہ لائیں کس تفسیر میں درج ہی ؟ یہ امر بھی غور طلب ہی کہ میں نے اسی مضمون میں لکھا تھا کہ آج تک مفسرین نے یہ سمجھا تھا کہ المغضوب علیہم سے مراد یہود ہیں - الفضل کے مضمون نگار لکھتے ہیں :-

"شروانی صاحب نے اپنے مضمون میں المغضوب علیہم کی تفسیر کے متعلق جو یہ دعویٰ کیا ہی کہ عہد رسالت سے آج تک المغضوب علیہم سے صرف یہود ہی سمجھے گئے ہیں" یہ دو تخصیص کے لفظ "صرف" اور "ہی" میرے کس کلام سے مستنبط ہوئے ؟

دوسری بحث

اب دوسری بحث "وبالآخرۃ ھم یوقنون" کی تفسیر کے متعلق ہی - "الفضل" میں یہ اعتراض ہی کہ میں نے یہ غلط لکھا ہی کہ قادیانی ترجمہ میں وبالآخرۃ سے مراد قادیانی مرزا صاحب ہیں - مجکو بھی حیرت ہی کہ صاحب مضمون اس امر سے کس طرح انکار کرتے ہیں کہ بالآخرۃ سے مراد ترجمہ قادیانی میں وہ نہیں ہی جو میں نے اپنے ریویو میں نقل کی - خود مضمون کی ان عبارتوں کو ملا کر پڑھیے - "اور الآخرہ میں اُس وحی کا ذکر ہی جو پیچھے نازل ہونے والی ہی اور یہ وہ وحی ہی جو سورۂ الجمعہ ...... میں موعود ہی - سورہ جمعہ میں دو بعثت فرمائے گئے ہیں ایک تو وہ بعث جس میں قرآن کریم نازل ہوا - اور ایک دوسرا بعث جو آخری زمانہ میں ہونا مقدر تھا ...... چنانچہ احادیث اور قرآن شریف کی دیگر آیات سے ثابت ہی کہ وہ صاحب وحی شخص مسیح موعود و مہدی موعود ہی جس کی وحی پر یقین لانا ایسا ہی ضروری ہی جیسا دوسری وحیوں پر" گیا اس عبارت سے وہ مطلب صاف عیاں نہیں ہی جو میں نے سمجھا ؟ اگر "مسیح موعود و مہدی موعود" سے مترجم قادیانی کے نزدیک پیشوائے قادیانی کے سوا کوئی اور صاحب مراد ہیں تو

میں اپنی غلطی کو واپس لینے کے لئے تیار ہوں۔

صاحب مضمون نگار الفضل نے میری نسبت یہ بیان خواہ مخواہ منسوب کرکے کہ میں یہ کہتا ہوں کہ (قادیانی فرقہ آخرت کا قائل نہیں) جرح و قدح کی ہے، حالانکہ میں نے کہیں یہ نہیں لکھا۔

اب سوال یہ ہے کہ الاٰخرۃ سے مراد وحی قادیانی کا ہونا کس تفسیر کے حوالے سے لکھا گیا ہے؟ جس طرح بیضاوی کا قول اوپر نقل کیا گیا ہے۔ براہ مہربانی اپنے اس قول کی تائید میں بھی کسی مفسر کا قول مع حواشی نقل کیا جائے۔ اگر کوئی قول اس مذہب کی تائید میں نہیں ہے (اور یہ درست ہے) تو ہمارا یہ کہنا کہ یہ قول خلاف مسلک سلف صالحین ہے، بالکل صحیح ہے۔ رہا اس قول کا بیان قرآنی کے مطابق ہونا اس کی تردید خود ترجمۂ قادیانی کے اس بیان سے ہوتی ہے کہ کثرت سے الاٰخرۃ سے کلام مجید میں الدار الاٰخرۃ مراد ہے۔

تیسری بحث

میں نے ریویو میں لکھا تھا کہ قادیانی ترجمہ میں لکھا ہے کہ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ نبی ہونے کی دعا مانگے۔ مضمون نگار الفضل لکھتے ہیں کہ یہ میرا ایجاد ہے، ترجمہ میں نہیں ہے۔ حالانکہ جو عبارت ترجمہ خود مضمون مذکور میں ہے وہی میرے قول کی شاہد ہے (ملاحظہ ہو عبارت مذکورہ مندرجۂ ذیل):

> "غرض اس دعا کے ذریعہ سے ہر ایک مسلمان کا فرض رکھا گیا ہے کہ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ انعامات (جن میں نبوت بھی ہے) اللہ تعالیٰ سے طلب کرے۔"

کیا خداوند تعالیٰ سے نبوت طلب کرنا اور نبی ہونے کی دعا مانگنا الگ الگ چیزیں ہیں؟ اسی ضمن میں ختم نبوت کی بحث میں حضرت امام ربانی اور حضرت ابن عربی اور امام شعرانی کے اقوال نقل کرکے یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ ان بزرگوں نے تصریح فرمادی ہے کہ نبوت ختم نہیں ہوئی، حالانکہ ان عبارتوں کے پڑھنے سے جو خود صاحب مضمون نے نقل کی ہیں صاف آشکارا ہوتا ہے کہ ان حضرات نے یہ فرمایا ہے کہ کمالات نبوت ختم نہیں ہوئے اور ان کا جلوہ متبعین اسلام میں پایا جاتا ہے۔ ان اقوال کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے:۔

"العلماء ورثة الانبیاء" امام شعرانی کی عبارت میں جو حدیث سنداً پیش کی ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک حافظ قرآن جو سینہ میں کلام الٰہی کو محفوظ رکھتا ہے نبوت کو اپنے سینہ میں لئے ہوئے ہے۔ لیکن ان اقوال سے یہ کہاں ثابت ہے کہ صاحب وحی نبی مبعوث کے ہونے کی بھی گنجایش ہے۔ قادیانی ترجمہ تو صاحبِ وحی نبی کا اعلان کر رہا ہے جیسا کہ اُس عبارت سے واضح ہے جو ہم ابھی ابھی مضمون الفضل سے نقل کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ساری بحث کا ابھی خاتمہ ہوتا ہے اگر مضمون نگار الفضل اس امر کو تسلیم کر لیں کہ وہ اپنے پیشوا میں ایسے ہی نبوت کے جلوے دیکھتے اور مانتے ہیں جیسے کہ ہر حافظ قرآن کے سینے میں ہیں اور جو ہر ایک عالم ربانی کو ورثہ میں حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے ہیں۔ لیکن اگر اس سے ماورا اور جلوے ہیں جو صاحب وحی ہونے کے لوازم ہیں تو اُس کی تائید قول حضرت امام ربانی یا حضرت ابن عربی یا امام شعرانی سے ہونی درکنار کسی معمولی مسلمان عالم کے قول سے بھی نہیں ہو سکتی۔

تعجب ہے کہ بحث ترجمہ کلام مجید کی تھی اور اُس کی تائید میں کسی تفسیر کا قول نقل نہیں کیا گیا۔

چوتھی بحث

چوتھا اعتراض میرے اُس قول کے متعلق ہے جو دو بعثتوں کے متعلق ہے "وبالآخرة هم یوقنون" کی تفسیر میں سورۂ جمعہ کی آیت کا جو مطلب ترجمۂ قادیانی میں نقل کیا گیا ہے اُس کے پڑھنے سے ضرور میں نے وہ مطلب اخذ کیا جو اپنے ریویو میں لکھا ہے۔ اگر مضمون نگار الفضل کا اُس سے دل دکھا تو مجھ کو افسوس ہے۔ اور بہت ممکن ہے کہ میں نے یہ غلط معنی اخذ کئے ہوں۔ لیکن یہ میں بالاعلان کہتا ہوں کہ سورۂ جمعہ کی آیت "هو الذی بعث فی الامیین رسولا منهم الخ" سے دو بعثت مراد لینا (ایک وہ بعثت جس میں قرآن کریم نازل ہوا۔ دوسرا وہ جو آخر زمانہ میں ہونا مقدر تھا) قطعاً تفسیر سلف صالحین کے خلاف ہے اور کسی معتبر مفسر نے یہ مطلب نہیں بیان کیا۔ اگر کوئی سند اُس کی ہے تو بیان کی جائے۔

آخر میں یہ اور عرض ہے کہ میرا مدعا ریویو لکھنے سے قادیانی فرقہ کی تردید یا تکذیب نہ تھی بلکہ صرف

یہ مقصود تھا کہ جمہورِ اہل اسلام کو اس سے آگاہ کر دوں کہ ترجمۂ قادیانی ایک خاص فرقہ کے عقائد کا آئینہ ہے۔ سلف صالحین و اکابر مفسرین کے مسلک کے مطابق نہیں ہے۔ یہ میرا اب بھی قول ہے اور عامۂ مسلمین کو مغالطہ سے بچانے کے لئے ہی یہ مضمون میں نے لکھا ہے۔ اس لئے مجھ پر یہ لازم نہ تھا کہ میں اس بحث میں پڑتا کہ قادیانی مسیح موعود سچے تھے یا نہ تھے۔

ضروری جوابات مضمون الفضل کے ختم ہوئے۔ رہی مضمون مذکور کی سخت کلامی و درشتی زبان، اُس کے متعلق اس کلام ربّانی کے آگے سر جھکانا لازم ہے۔ "واذا مرّوا باللغو مرّوا کراماً۔" "والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ"۔

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۱۶ اگست و ۴ اکتوبر ۱۹۱۶ء)

خطبۂ صدارت اجلاس ندوۃ العلماء بمقام مدراس[۱]

حضرات علمائے کرام و معززین امت! بغداد شریف کے مدرسۂ نظامیہ کا سالہ عالم میں شہرہ ہے۔ امام فخر الاسلام جب اوّل مرتبہ وہاں مسند درس پر بیٹھے تو انھیں وہ اکابر یاد آئے جن سے مسند مذکور رونق پذیر رہ چکی تھی۔ مثلاً شیخ ابو اسحٰق شیرازی و امام غزالی۔ اس خیال سے امام ممدوح کے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ آنکھوں پر عمامہ رکھ کر بے اختیار روئے اور فرمایا ؎

---

[۱] یہ مضمون بطور خطبہ صدارت مدراس کے اجلاس ندوۃ العلما کے لئے لکھا گیا تھا جہاں سیاسی ہلچل کی وجہ سے میری شرکت نہ ہو سکی۔ البتہ خطبہ وہاں پڑھا گیا۔ حبیب الرحمٰن

خلت الدیار فسدت غیر مسود

زمانہ اہل کمال سے خالی ہوگیا تو مجھ سا بے مایہ سر گروہ بنا

ومن العناء تفردی بالسؤدد

مجھ سے آدمی کا سالار یگانہ بنا کیا اندوہ افزا ہے

آج کا حسرت انگیز سماں اس مثال سے کس قدر مطابق ہے۔ جو کرسی جناب استاذ العلماء مفتی محمد لطف اللہ صاحب مغفور اور مولانا احمد حسن صاحب مرحوم سے بزرگوں کی صدارت سے شرف حاصل کر چکی ہو اس پر ایک ایسے شخص کا بیٹھنا جو نہ عالم ہے نہ کسی علمی خاندان کا فرد فی الحقیقت حیرت خیز اور عبرت انگیز منظر ہے۔ میں کبھی اس مقام پر قدم رکھنے کی جرأت نہ کرتا اگر میرے تحیر کو ایک میرے مخدوم یہ کہہ کر دور نہ فرما دیتے "کبّرنا موت الکبراء"۔ اس مشہور مقولہ نے مجھ کو یہ اطمینان دلا دیا کہ میرا کوئی شرف باعث انتخاب نہیں ہوا بلکہ بزرگانِ اُمت نے میری کم مائگی کو نظر قبول سے ملاحظہ فرمایا ہے۔ اب یہ بے سروسامانی میرے واسطے سرمایۂ فخر ہی اور میں اپنی بے بضاعتی کے اعتراف و اقرار کے ساتھ تعمیل ارشاد اور خدمت کے واسطے حاضر ہوں

بنازم بہ بزم محبت کہ آنجا

گدائے بہ شاہے مقابل نشیند

با ایں ہمہ سمجھتا ہوں کہ یہ شرف ایسا ہے جو نازش عمر اور کارنامۂ زندگی مانا جا سکتا ہے۔ پس جن بزرگوں نے یہ اعزاز عطا فرمایا ہے اُن کے شکر و سپاس سے میرا دل مالا مال ہے۔

جَزَاھُمُ اللہُ عَنّیِ خَیْرَالْجَزاء۔ یہ عرض بھی ضروری ہے کہ بدون آپ کے کرم اور توجہ کے میں اس خدمت کا حق ادا نہ کر سکوں گا۔

بزرگانِ قوم! مجلس ہذا کے مقاصد و اغراض کے اعتبار سے نیز اس لحاظ سے کہ زمانۂ حال میں عموماً مسلمان علوم عربیہ سے بے پروا نظر آتے ہیں، مناسب ہو گا کہ میں اس موقع پر علوم عربیہ کی مختصر تاریخ عظمت اور وسعت بیان کروں تاکہ معلوم ہو کہ کیسی شان دار امانت (جو اسلاف کی محنتوں کا نتیجہ اور حق و صداقت کا ذخیرہ ہے) ہمارے ہاتھ میں ہے اور ہم کو کیسے بے مثل سرمایہ کی حفاظت و ترقی کا حق ادا کرنا ہے۔ کلام ربانی اور احادیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دین الٰہی کے اہم مقاصد میں سے ایک مقصد علم کی ترویج و اشاعت بھی تھا۔ کلام مجید میں بار بار اور مختلف پیرایوں میں علم اور علماء کی فضیلت بیان فرمائی ہے اور حصول علم کی تاکید۔ مثالاً چند آیتیں نقل کرتا ہوں۔

ویرفع اللہ الذین اٰمنوا منکم والذین اوتوا العلم درجات	اور بلند کرے گا اللہ تم میں سے ان لوگوں کے جو ایمان لائے ہیں اور اُن کے جو علم والے ہیں بہت سے درجے۔
ومن یوت الحکمۃ فقد اوتی خیراً کثیراً۔ انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء	جس کو حکمت دیدی گئی اُس کو بڑی بھاری دولت بخش دی گئی۔ اللہ سے ڈرنے والے صرف علماء ہیں۔

خشیتِ الٰہی (جو ذریعہ ہے نجات اور اجر کریم اور ہدایت پانے کا) اُس کو گروہ علماء میں حصر فرما دینا علماء کی انتہائی شان پر دلالت کرتا ہے۔

بسبب سے زیادہ علمی ترقی کی محرک وہ آیتیں ہیں جن میں آیات ربانی اور مظاہر قدرت پر غور و تدبر کی تاکید فرمائی گئی ہی اور یہ مظاہر قدرت اس قدر وسیع ہیں کہ طبعیات، زرعیات، برقیات، فلکیات، ارضیات وغیرہ تمام علوم اُن کے لانہایت دائرے میں آجاتے ہیں۔

ارباب تفسیر نے لکھا ہی کہ حضرت آدم کو ملائکہ کا سجدہ کرنا تعظیم علم کے سبب سے تھا۔ نہ صرف حصول علم کی تاکید ہی بلکہ علم میں برابر ترقی کرنے کا حکم ہی۔ چنانچہ حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دعا تلقین فرمائی گئی:۔

ربِّ زدنی علما۔	یارب میرے علم کو بڑھا۔

حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کلام ربانی کی تائید اسی اہتمام سے فرمائی۔ ارشاد ہی:۔

العلم حیات الاسلام وعماد الدین العلم سلطان اللہ فی الارض فمن وقع فیہ فقد ھلک۔	علم اسلام کی جان اور دین کا ستون ہی علم زمین پر خدا کی قوت ہے جو اس سے مقابل ہوا تباہ ہوا۔
العلم خلیل المومن والعقل دلیلہ۔	علم مومن کا دوست اور عقل اس کی رہنما ہے۔
العلماء مصابیح الارض وخلفاء الانبیاء و ورثتی وورثۃ الانبیاء۔	علماء زمین کی روشنی ہیں اور انبیاء کے نائب اور میرے اور انبیاء کے جانشیں۔
وزن حبر العلماء بدم الشھداء فرجح علیہ ماتصدق الناس بصدقۃ افضل من علم	علماء کی روشنائی شہداء کے خون سے وزن کی گئی تو اس کا پلہ بھاری رہا۔ علم پھیلانے سے بہتر کوئی صدقہ نہیں۔

وہ علم باعثِ بربادی ہے جس پر عمل نہ ہو۔

مثل العالم الذی یعلم الناس الخیر وینسی نفسہ کمثل السراج یضیئ للناس ویحرق نفسہ

جو عالم اوروں کو نیکی سکھائے اور خود اپنے نفس کو بھول جائے وہ مثل چراغ کے ہے جو لوگوں کی روشنی بنتا ہے مگر اپنے آپ کو خاک سیاہ کر دیتا ہے۔

اشد الناس عذابا یوم القیامۃ عالم لم ینفعہ علمہ۔

جس عالم کو اُس کا علم نفع نہ پہنچائے اُس کو قیامت میں سب سے زیادہ شدید عذاب ہوگا۔

علم لا ینفع ککنز لا ینفق بہ۔

علم غیر نافع ایسا خزانہ ہے جو صرف نہ کیا جائے۔

علاوہ قولی تاکید کے عملاً بھی علم و علماء کی شان و فضیلت کا اظہار فرمایا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ مسجد میں حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ وہاں دو حلقے تھے ایک میں کچھ آدمی خدائے تعالیٰ سے دعا مانگ رہے تھے دوسرے میں درس تدریس جاری تھی۔ آپ نے ارشاد فرمایا "انما بعثت معلّماً" یعنی میں تو تعلیم دینے آیا ہوں۔ یہ فرما کر درس تدریس کے حلقہ میں تشریف فرما ہو گئے۔ اس پاک تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ صحابۂ کرام میں علم کا ذوق سرایت کر گیا۔ اور وہ قدسی گروہ علوم کی ترویج پر کمربستہ ہو گیا۔

سب سے اول کلام الٰہی اور حدیث و فقہ کی حفاظت و اشاعت پر توجہ فرمائی اُس سعی کا یہ نتیجہ ہے کہ صدہا برس گزر جانے پر بھی علم کے یہ دونوں سرچشمے تحریف و تصحیف کے گرد و غبار سے پاک اور صاف اپنے فیض سے عالم کو سیراب کر رہے ہیں۔ علاوہ دینی علوم کے دوسرے علوم کی خدمت کی بنیاد مسلمانوں میں خود صحابۂ کرام کے زمانہ میں پڑ چکی تھی۔ باب مدینۃ العلم حضرت علی مرتضیٰ کی ہدایت و مشورہ سے ابوالاسود دؤلی نے علم نحو کے اصول قائم کئے۔ علمی مذاق صحیح جو مشکوٰۃ نبوت سے سینوں پر چمکا تھا اُس کا اثر تھا کہ صحیح علم کا ذوق صحابۂ کرام میں تھا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ سے علم نجوم کی بابت پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا اُس کا وہ حصہ سیکھنا چاہیے جو راہ نمائی میں کام آئے۔ یعنی عملی پہلو لو وہمی اور بے اصل حصہ چھوڑ دو۔ حضرت ابن عباسؓ کا حلقۂ درس بہت وسیع تھا۔ اہل تاریخ نے لکھا ہے کہ اُن کی علمی تقریر کی قوت کا یہ عالم تھا جیسے سیلاب بلندی سے گرے۔ ہفتے میں ایک دن اُن کے درس میں صرف ادب عربی کی تعلیم کے واسطے مخصوص تھا اور اُس کا لقب انھوں نے "خِصْبی" رکھا تھا۔

حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں بعض غیر زبانوں کے علوم کا اضافہ عربی میں ہوا۔

اسلام جس سرعت و قوت سے پھیلا اسی سرعت و قوت سے علم کا شوق مسلمانوں کے دلوں میں ترقی کرتا گیا۔ پہلی ہی صدی ہجری میں ممالک اسلامیہ دار العلوم بن گئے۔ اس میں کسی قوم یا رنگ کی خصوصیت نہ تھی۔ تابعین کے طبقے میں ہی عرب کی جگہ عجمیوں نے لے لی۔ عکرمہ، امام مکحول، امام ابو حنیفہ وغیرہ ائمہ جلیل القدر عجمی تھے۔ حدیث میں ارشاد ہے "الحکمۃ ضالۃ المومن من حیث وجدہا جذبہا" (علم مسلمان کا گم شدہ سرمایہ ہے جہاں پاتا ہے لے لیتا ہے) اس گم شدہ سرمایے کی تلاش میں مسلمانوں نے دنیا کا کوئی گوشہ نہیں چھوڑا جہاں سے خزانہ علم حاصل نہ کیا ہو۔ کوئی علمی زبان نہیں چھوڑی جس کا سرمایہ عربی میں منتقل نہ کیا ہو۔ علامہ ابن ندیم نے کتاب الفہرست تقریباً چوتھی صدی کے وسط میں لکھی ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یونانی، رومی، قدیم فارسی، سریانی، کلدانی، سنسکرت وغیرہ تمام قدیم زبانوں کے علوم ترجمہ ہو کر عربی میں آئے۔ علامہ ممدوح ہر زبان کے مترجمین کا اور ان کی ترجمہ کی ہوئی کتابوں کا مفصل ذکر کرتا ہے۔ سنسکرت کے مترجمین میں منکہ، کنکہ، جودر، منجھل، نہق، ابن دھن ہیں۔ ان ناموں کی ترکیب صاف کہہ رہی ہے کہ عربی برقع میں ہندی صورتیں مستور ہیں۔ ابن دھن کی نسبت لکھا ہے کہ برامکہ کے شفاخانہ کا مہتمم تھا۔ اور ہندی سے عربی میں ترجمہ کیا کرتا تھا۔ ابن ندیم کہتا ہے جن علماء ہند کی کتابیں نجوم اور طب کے متعلق ہم تک پہنچی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:۔

باکھر، راجہ، جنکر، واہو، آکہ، زنکل، اریکل، جہبر، اندی، جباری۔ جو کتابیں طب کی سنسکرت سے عربی میں ترجمہ ہوئیں ان کی مفصل فہرست دی ہے۔ صفحہ ۳۴۵ پر لکھتا ہے کہ ہارون رشید کے وزیر یحییٰ بن خالد نے ہندوستان ایک آدمی کو بھیجا تاکہ وہ دوائیں لائے جو ہندوستان میں پیدا ہوتی ہیں اور اس ملک کے مذاہب کی تحقیقات کر کے لکھے اس کے بعد یحییٰ مذکور نے ایلچی بھیج کر ہندوستان سے علماء طب و حکمت کو بغداد طلب کیا۔ اتنا لکھ کر ابن ندیم نے خود بھی ہندوؤں کے مذہب کا ذکر مفصل کیا ہے اور ان کے معابد اور مذہبی فرقوں کی تفصیل لکھی ہے۔ ہندوستان کے علوم کی جو تحقیقات مسلمانوں نے کی اس کی بہترین یادگار کتاب الہند ابو ریحان بیرونی کی ہے جس میں تمام علوم ہندوستان سے مفصل بحث کی ہے۔ کتاب مذکور کے دیباچہ

نیز تاریخ مروج الذہب مسعودی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ چوتھی پانچویں صدی ہجری میں علمائے اسلام کا ایک بڑا طبقہ تھا جس نے علوم ہندوستان کی تحقیق اپنا وظیفہ قرار دے رکھا تھا۔ کیسی حیرت ہے کہ جس وقت سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملہ کیا اُسی وقت ابوریحان علمی فتوحات کے واسطے ہندوستان آیا اور اُس ہنگامہ جنگ و جدال میں برسوں ہندوستان میں رہ کر علوم سنسکرت حاصل کئے اور بالآخر ایسا زبردست فاضل ہوگیا کہ خود ہندوستان سے مشکل مسائل اُس کے پاس حل کرنے کے واسطے بھیجے جاتے تھے۔ جن ممالک میں مسلمان گئے علم اور علم کا شوق ساتھ لے گئے۔ حجاز، شام، یمن، عراق، ماوراءالنہر، ایران خراسان، کابل، ترکی، مصر، ٹیونس، مراکو، اندلس (اسپین) چین، صقالیہ (سسلی) اور بحر روم کے دوسرے جزائر، جاوا وغیرہ جزائر بحر ہند، ہندوستان غرض وہ کون سا ملک تھا جہاں مسلمان گئے اور وہ دارالعلوم نہ بن گیا۔ ان ممالک کے شہر اور قصبے درکنار گاؤں تک مرکز علوم بن گئے تھے۔ مکۂ مکرمہ، مدینۂ طیبہ، بغداد، اصفہان، نیشاپور، ہرات، طوس، دہلی، لکھنؤ، قیروان، قرطبہ، قاہرہ، قونیہ، بیت المقدس، بخارا سطح ارض پر کہاں کہاں بکھرے ہوئے ہیں لیکن اُن میں سے جس مقام پر جاکر گوشِ عبرت سے سنئے گا ذرہ ذرہ کی زبان پر علوم اسلامیہ کا تذکرہ پائے گا۔ الاصابہ کے مقدمے میں ڈاکٹر اسپرنگر نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کے علم اسماء الرجال کی کتابوں میں کم سے کم دس لاکھ علماء کا ذکر ہے۔ معجم البلدان، یاقوت مستعصمی کی ضخیم جلدیں مطالعہ کیجئے اور دیکھئے کہ وہ کونسا قریہ تھا جہاں مسلمان گئے اور وہاں نامور علماء پیدا نہ ہوئے۔ اسلام کی خصوصیت یہ تھی کہ علم ظاہر اور معرفتِ باطن دونوں دوش بدوش تھے۔ سرزمین اندلس کو ابن عربی اور ابن رشد دونوں پر ناز ہے۔ ملک ایران ابن سینا، اور حضرت بایزید بسطامی پر فخر کرتا ہے۔ بغداد کو جہاں کندی اور بنی موسیٰ پر فخر ہے وہاں حضرت جنید و شبلی کی ذات مبارک سے بھی شرف حاصل ہے۔ علیٰ ہذا القیاس یاد ش بخیر ہمارا ہندوستان بھی ترقی علوم میں کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ ہندوستان میں علوم عربیہ دوسری صدی ہجری میں اسلامی فتوحات کے ساتھ ساتھ ماوراءالنہر و خراسان سے داخل ہوئے۔ قدرتاً سب سے اول ملک سندھ اس نور سے روشن ہوا اور ہندوستان میں پہلا مدینۃ العلم ملتان تھا۔ علماء کا ایک گروہ عظیم وہاں سے پیدا ہوا۔ ملتان کے بعد لاہور دورِ غزنویہ میں مرکز علم تھا۔ لاہور کے بعد دہلی مرحوم گہوارۂ

علوم بنی۔ کیا کسی قلم میں یہ طاقت ہی کہ وہاں کے گوناگوں علوم اور گروہا گروہ علمار کی شمار کرسکے؟ آہ دہلی مٹ گئی لیکن اب بھی اُس کا نام فضل وکمال کی چمکتی ہوئی بجلیاں لپنے اندر مخفی رکھتا ہی! سلطنت دہلی میں عہد تغلق کے بعد جب ضعف ہوا تو علم کی مسند جونپور میں جاکر بچھی۔ جونپور کا نور لکھنؤ پر چمکا اور فرنگی محل اُس وقت بھی دار العلم تھا جب دار السلطنت لکھنؤ کا وجود بھی نہ تھا۔ لکھنؤ میں آفتاب علم کس آب وتاب سے چمکا جس نے وہاں کے ہر قصبے کو انوار علم سے منور کردیا۔ علمی دنیا میں بلگرام، سندیلہ، گوپامئو، خیرآباد وغیرہ سے کون واقف نہیں؟ شاہ جہاں فخریہ لہجہ میں کہا کرتا تھا "پورب شیراز ماست" میر غلام علی آزاد نے مآثر الکرام میں لکھاہے کہ دیار پورب سے اودھ اور ضلع الہ آباد کا کچھ حصہ مراد ہی۔ صوبۂ بہار کو دہلی ولکھنؤ سے فیض پہنچتا رہا۔ بنگالہ بھی شیراز سے دور نہ تھا۔ حافظ شیرازی کو خطۂ بنگالہ نے بھی دعوت دی تھی جو اگرچہ ناتمام رہی تاہم لسان الغیب کی زبان پر بنگالہ کا ذکر تھا:

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند

زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

ایک دوسرا مرکز علم گجرات تھا۔ وہاں علم براہ راست دار الحکمۃ یمن اور شیراز سے سمندر کے راستے سے پہنچا اور علامہ الہدیٰ اور خطیب گازرونی سے کمالات وقت وہاں سے اُٹھے۔ گجرات سے علم کی شعاعیں دکن اور مالوہ تک پہنچیں۔ ابھی اُس سرزمین کا بیان باقی ہی جہاں آج ہم سب جمع ہیں۔ مدراس تعلیم جدیدہ کے اثر سے دماغوں میں ایک ایسی نوعیت رکھتا ہی کہ بظاہر اُس کا علوم عربیہ کا کبھی مرکز رہنا بعید از قیاس سا معلوم ہوگا۔ لیکن نہیں، وہ علوم عربیہ کے فیض سے پوری طرح بہرہ یاب رہ چکا ہی۔ ابن بطوطہ جب آج سے تقریباً چھ سو برس پہلے اس خطے میں آیا تو سواحل ملابار کو علم عربی اور علماء سے معمور پایا۔ وہ اپنے سفرنامے میں قالقوط (کالیکٹ) ہنوز، منجرور (منگلور) جرفتن وغیرہ اُس زمانے کے تمام مشہور مقامات کا ذکر کرتا ہے ساتھ ساتھ ہر جگہ کے علماء عربی کا اور مدرسوں کا تذکرہ کرتا ہی۔ قالقوط کی نسبت کہتا ہی یہاں امیر التجار ابراہیم شاہ بندر ہی جو ایک بحرین کا فاضل ہی۔ قاضی یہاں فخر الدین عثمان ہیں اور صاحب خانقاہ شیخ شہاب الدین گازرونی۔ منجرور (منگلور) کی نسبت لکھتا ہی۔ یہاں کے قاضی ایک فاضل کریم شافعی

ہیں جن کا نام بدر الدین ہے۔ اُن کے یہاں مجلس درس گرم رہتی ہے۔ بندر ہیلی کی نسبت لکھا ہے یہاں کی مسجد ہندو مسلمان دونوں کے نزدیک محترم و واجب التعظیم ہے تجار کثرت سے اس میں روپیہ بھیجتے ہیں جس کی وجہ سے مسجد کا خزانہ معمور ہے۔ طلبار کی ایک جماعت اُس میں ہے جن کو وظائف ملتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ یہ تمام مقامات خاص ہندو راجاؤں کے قبضے میں تھے۔ مسلمانوں کے مفتوحہ نہ تھے آخر زمانہ میں شہر مدراس دار العلوم بنا۔ بارھویں صدی ہجری میں قاضی ابوبکر شافعی قاضی مدراس تھے۔ اس سلسلے میں سب سے بڑا شرف اس شہر کو مولانا بحر العلوم کے قدوم سے حاصل ہوا۔ جس طرح مدراس کا بندر سمندر کو اپنے آغوش میں لیے ہوئے ہے اسی طرح شہر مدراس کو یہ شرف حاصل ہے کہ علوم کے سمندر مولانا بحر العلوم اُس کے آغوش میں آرام فرما ہیں۔ مولانا بحر العلوم نے ان ممالک میں فیض علمی کے دریا بہا دیے۔ ملا علار الدین، ملا جمال الدین، مولانا عبد الواحد اور بہت سے بزرگ اُس فیض کی یادگار تھے۔ آخری یادگاروں میں حضرت شاہ عبد اللطیف صاحب دیلوری تھے جن کی ذات سے دیلور کی مشہور خانقاہ مشرف تھی۔ ہندوستان میں کثرت علمار کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ہمارے محترم ناظم نے جو تاریخ ہندوستان کے علمار کی لکھی ہے وہ دس جلدوں میں ہے اور پانچ ہزار سے زیادہ مشہور علمار کا اُس میں ذکر ہے۔

اس قدر بیان سے آپ یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ علوم عربیہ نے عالم کو کس قوت و وسعت سے ساتھ اپنے انوار سے روشن کیا۔ علوم عربیہ کی تاثیر قوت اس سے ثابت ہوتی ہے کہ جس قوم اور ملک میں پہنچے وہیں علم و کمال کی بنیاد جما دی۔ امام عکرمہ حبشی۔ امام ابو حنیفہ فارسی اور حکیم ابونصر فارابی ترک تھے۔ علوم عربیہ کا اثر صرف مسلمانوں تک محدود نہیں رہا دوسرے مذاہب کے پیرو بھی ان سے فیضیاب ہوتے رہے ہیں۔ خلافت اندلس اور حروب صلیبیہ کے سلسلے میں جب یورپ کی اقوام کو مسلمانوں سے ملنے کا موقع ملا تو علمی شوق نے اُن میں بھی ایک تحریک پیدا کر دی۔ ابوسینا اور ابن رشد کا فلسفہ صدیوں تک یورپ کے درس میں شامل رہا۔ اندلس مدت تک اہل یورپ کی تعلیم کا مرکز رہا۔ انگریزی ہیئت کی کتابیں دیکھیے اصطلاحی الفاظ اُن کی عربیت پر صاف شہادت دیتے ہیں۔ ہمارے ملکی بھائی ہندوؤں نے

ہمیشہ علوم عربیہ سے استفادہ کیا۔ راجہ کندن لال اشکی کی کتاب منتخب تنقیح الاخبار، راجہ رتن سنگہ زخمی کی حدائق النجوم اور رائے منولال فلسفی کی کتاب سدید الاستخراج فی تقویم ان کے علم کی بہترین شاہد ہیں۔ بنگال میں جدید دور ترقی کا سنگ بنیاد راجہ رام موہن رائے کے قابل ہاتھوں سے رکھا گیا ہے یہ واقعہ ہے کہ انھوں نے پٹنہ میں عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ گزشتہ موسم سرما میں ایک نامور بنگالی بابو صاحب نے مجھ سے کہا کہ ان کے باپ اور چچا کے زمانہ تک کلکتہ سے بہ کثرت بنگالی، عربی پڑھنے پٹنہ جایا کرتے تھے۔ چنانچہ اُن کے چچا نے پندرہ برس میں علوم عربیہ کی تکمیل کی تھی۔ اُس عہد کے ہندو مسلمانوں کے تعلقات و ربط کی یہ ایک سبق آموز مثال ہے کہ جناب مفتی محمد لطف اللہ صاحب مرحوم کے استاد فارسی منشی سوہن لال تھے اور مولانائے مغفور کے تلامذہ میں جے بہاری لال کایستھ تھے میں نے بچشم خود دیکھا کہ مولانا کے دوسرے رشید تلامذہ اُن کے ساتھ برادرانہ برتاؤ کرتے تھے۔

ہمارے علماء کی شان ہمیشہ یہ رہی کہ انھوں نے علم کو علم کے لئے حاصل کیا۔ علوم دین سے انھوں نے خدا اور اُس کے رسول کی خوشنودی مقصود رکھی۔ علوم دینویہ جن کو بہت کم ذریعۂ جاہ و حشمت بنایا اُن کی خدمت بھی بہ حیثیت علم کرتے رہے یہ واقعہ زرین تاریخی کارنامہ ہے کہ جب بغداد میں مدرسۂ نظامیہ قائم ہوا اور وہاں علماء کے گراں قدر مشاہرے اور طلباء کے لئے بیش قرار وظائف اور سامان آسائش مہیا کئے گئے تو علمائے بخارا نے علم کی مجلس ماتم منعقد کی اور رو کر کہا کہ اب علم علم کے لئے نہیں بلکہ جاہ و حشمت کے لئے حاصل کیا جائے گا۔ اسی یکسوئی اور وحدت مقصود کا اثر تھا کہ ہمارا علمی گروہ تغیرات زمانہ سے بہت کم متاثر ہوا۔ اگلے زمانے میں امن و امان زیادہ ارزاں نہ تھی۔ سلاطین کا انقلاب، امراء کا عروج و تنزل، ملک میں تزلزل پیدا کرتا رہتا تھا۔ لیکن اس کا اثر ترقی علوم پر بہت کم ہوا۔ اسی کی آخری مثال دہلی کے محدثین کا خاندان ہے۔ مغلیہ سلطنت کے خاتمے کے وقت جب تخت گاہ حوادث کی آماج گاہ بنی ہوئی تھی اور تخت و تاج تاخت و تاراج ہو رہا تھا شاہ ولی اللہ صاحب کا خاندان انتہائی سکون و وقار کے ساتھ علم دین کی خدمت میں منہمک تھا اور اسی دور نے شاہ ولی صاحب کی خدمت

لے سر بھیپندر ناتھ باسو ۱۲

میں ایک ایسا حکیم الامت پیش کیا جس کی مثال امام غزالی کے بعد مشکل سے مل سکتی ہے، اور ایک اسی خاندان پر کیا حصر ہے کہ دہلی مرحوم کی آخری بہار نے کمال کے بہت سے گل سرسبد نمایاں کیے۔

اس بے تعلقی ویکسوئی کے ساتھ علوم عربیہ عملی دماغ اور کاروباری ذہن پیدا کرنے میں کبھی قاصر نہیں رہے۔ ائمۂ مجتہدین کی معاملہ فہمی پر فقہ کے مسائل زبردست گواہ ہیں جو آج بھی قانون کا بہترین سرمایہ خیال کیے جاتے ہیں۔ جن بزرگوں نے خالص دنیاوی کاروبار کی جانب توجہ کی وہ کامیابی کی اعلیٰ منزل پر پہنچے، امام یحییٰ ابن اکثم امام حدیث ہیں۔ مامون الرشید کی تاریخ پڑھیے۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اُس یادگار روزگار خلافت کے انتظام میں امام ممدوح کا کیا حصہ تھا، امام ابن ماکولا (علم الرجال کی بے مثل کتاب اکمال کے مصنف) جس طرح نامور امام حدیث تھے اُسی طرح ایک کامیاب مدبر وزیر، ابن ابی دواد، نظام الملک طوسی، صاحب ابن عباد وغیرہ وزرائے نامور کی ذات سے ایوان وزارت اور قصر علم دونوں یکساں زینت کے ساتھ مزیّن تھے۔ ہندوستان کی تاریخ میں عہد اکبری سلطنت کی اعلیٰ نظم ونسق اور مشکل مسائل کے حل کے لحاظ سے ہمیشہ یادگار رہے گا۔ امرائے اکبری کے نورتن کی آب وتاب ابوالفضل، فیضی، میر فتح اللہ شیرازی، حکیم ہمام، خانخانان کے دم سے تھی۔ کیا اس کے یاد دلانے کی ضرورت ہے کہ ان میں سے ہر ایک عربی مدرسوں میں بوریا نشیں رہ چکا تھا۔ اس دور آخر میں بھی جن دماغوں نے تعلیم جدید کا مسئلہ حل کیا وہ قدیم مدارس کے تربیت یافتہ تھے اور ابھی یہ امر بحث طلب ہے کہ ہمارے جدید تعلیم یافتہ گروہ نے ان سے بہتر کہاں تک مسئلہ تعلیم کو سمجھا ہے۔ اس زمانے میں ہمارے قدیم علوم کے اساتذہ اور طلبار دونوں میں یہ خیال دل نشیں ہے کہ اگلے علمار کی کامیابیوں کا سنگ بنیاد وہ فراغ خاطر اور فراخ دستی تھی جو اس عہد کی قدردانی کا نتیجہ تھی۔ میں بالاعلان کہتا ہوں کہ یہ خیال گزشتہ اہل کمال کی جناب میں گستاخی بلکہ اُن پر ظلم ہے۔ اُن بزرگوں کے حالات پڑھنے سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ہم اُن سے بہت زیادہ فارغ البال اور امن میں ہیں۔ مثلاً سنئے۔ امام بخاری کو ایام طالب علمی میں ایک مرتبہ تہی دستی کے ہاتھوں مجبور ہو کر تین روز متواتر جنگل کی بوٹیاں کھانی پڑیں۔ امام ابوعلی بلخی جب عسقلان میں تھے تو خرچ سے اس قدر تنگ ہوئے کہ کئی فاقوں کی نوبت پہنچی۔ جب بھوک نے بہت

ستایا تو نان بائی کی دکان پر اس غرض سے جا بیٹھے کہ اس فقدان قوت کی حالت میں کھانے کی خوشبو ہی سے کچھ قوت حاصل کروں۔ یہ تو مثالیں فراخ دستی کی ہیں۔ فارغ البالی ملاحظہ ہو۔ علوم عقلیہ میں شفاء و اشارات کا جو درجہ ہے اُس سے ہر طالب علم واقف ہے شیخ الرئیس نے اشارات اس حالت میں لکھی کہ جان کے خوف سے ایک لوہار کے گھر میں چھپا ہوا تھا۔ اسی لوہار سے سامان تحریر منگوا کر یہ بے نظیر کتاب لکھدی۔ ہمارے علماء کے حالات میں یہی ایک واقعہ نہیں ہے۔ ہزاروں واقعات ایسے گزرے ہیں۔ اصل راز علمائے قدیم کی کامیابی کا وہ شوق طلب تھا جو علمی شیفتگی سے پیدا ہوتا تھا اور یہی شوق منزل کی ہر دشواری کو آسان کر دیتا تھا۔ امام ابو حاتم رازی نے شوق طلب میں نو ہزار میل سفر پیادہ پا کیا۔ نو ہزار تک شمار کر کے انھوں نے میلوں کو شمار کرنا چھوڑ دیا۔ کتاب النفس ارسطو کا ایک نسخہ کسی کے ہاتھ لگا جس پر حکیم ابو نصر فارابی کے ہاتھ کی یہ عبارت تحریر تھی "انی قرأت ھذا الکتاب مأتہ مرۃ" یعنی میں نے اس نسخے کو سو بار پڑھا۔ امام مزنی نے کتاب الام شافعی کا مطالعہ مسلسل پچاس برس تک کیا اور اُن کا بیان ہے کہ ہر دفعہ کے مطالعہ میں نئے فوائد حاصل ہوئے۔ یہ کھلا ہوا راز ہے کہ اب اُس علمی شیفتگی کا نشان بھی نہیں الا ما شاء اللہ۔ اسی لئے مدرسوں میں ہر طرف کمال کا زوال ہے۔

ہمارے علم و کمال کی تصویر کا یہ روشن پہلو تھا۔ دوسرا پہلو ابھی دیکھنا باقی ہے۔ زمانے کے انقلاب نے ہماری تعلیم قدیم کا شیرازہ پریشان کر دیا۔ پرانی درس گاہیں مٹ گئیں۔ سلسلۂ تعلیم درہم برہم ہو گیا۔ قدیم اساتذہ کے ساتھ اُن کا طریقۂ تعلیم بھی رخصت ہوا۔ علمی خزانے یعنی کتاب خانے (جن کی ملک میں کچھ انتہا نہ تھی) تباہ و برباد ہو گئے۔ جو سرمایہ بچا وہ یورپ و امریکہ کی قدردانی کی بدولت وہاں کے کتاب خانوں کی زینت بن گیا۔ ان تمام اسباب کا یہ نتیجہ ہوا کہ ارادوں میں سستی، حوصلوں میں پستی پیدا ہو گئی۔ تعلیم کی غرض و غایت بجائے حصول علم و کمال کے چند کتابوں کی عبارت و الفاظ میں منحصر ہو گئی جن میں کثیر حصہ تخیلات کا تھا۔ اس تعلیم کے اثر نے بحث و مباحثے کی نوبت نزاع و خصومت تک پہنچا دی۔ اور ہر طرف جھگڑوں اور مخالفتوں کے معرکے گرم نظر آنے لگے۔ اسی کے ساتھ جدید تعلیم کے اثر نے جدید و قدیم خیال کے دو گروہ علیحدہ علیحدہ ہم میں پیدا کر دیئے۔ ہندوستان کے قدیم شرفا

کے خاندان جو علوم قدیمہ کے ملجا و ماوا تھے۔ زمانہ کی ضرورتوں سے مجبور ہو کر خانقاہوں اور مدرسوں سے نکل کر اسکولوں اور کالجوں میں جا پہنچے۔ ایک زمانہ میں میں نے عربی مدارس کے طلبہ کی مردم شماری بلحاظ وطن اور مسکن کے کی تھی۔ اُس سے معلوم ہوا کہ خاص ہندوستان کے طلبہ کا وجود اُن مدرسوں میں مفقود تھا صرف آفاقی طلبہ کے دم سے اُن کی رونق باقی تھی۔ میں نے اوپر عرض کی ہے کہ ہندوستان میں علوم عربیہ مختلف ممالک سے آئے تھے۔ قدرتی طور پر اُن ملکوں میں جن علوم کا چرچا تھا وہی ہندوستان کے مختلف حصوں میں رائج ہوئے۔ سندھ میں سلسلۂ علم خراسان اور ماوراء النہر (ترکستان) سے آیا۔ ان ممالک میں فقہ اور معقولات کو بہت ترقی تھی۔ لہٰذا جب ملتان مرکز علم بنا تو وہاں کی درس تدریس میں ان علوم کا عنصر غالب تھا۔ دو سو برس تک یعنی ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں نصاب تعلیم اسی رنگ میں رہا۔ اُس عہد میں علم نحو، بلاغت، فقہ، تصوف اور تفسیر معیار فضیلت خیال کئے جاتے تھے۔ حدیث، ادب وغیرہ برائے نام پڑھائے جاتے تھے۔ نویں صدی ہجری میں دار العلوم ملتان کو زوال ہوا۔ یہاں سے علماء ملک کے مختلف حصوں میں گئے۔ ان بزرگوں میں سے مولانا عبد اللہ تلنبی نواح دہلی میں آئے اور اُن کے شاگرد مولانا عزیز اللہ سنبھل پہنچے۔ یہ زمانہ سکندر لودی کی سلطنت کا تھا۔ سلطان مذکور نے ان دونوں بزرگوں کی تشریف آوری ایک نعمت غیبی سمجھی اور اُن کے واسطے درس گاہیں مہیا کیں۔ اُس کو اُن کے درس سے اس قدر شوق تھا کہ کبھی کبھی مدرسہ میں آتا اور کسی گوشہ میں چھپ کر اُن کا پڑھانا سنتا۔ ان دونوں اہل کمال نے قدیم نصاب تعلیم میں تغیر کیا۔ مولانا عبد اللہ تلنبی، مولانا عبد اللہ یزدی شارح تہذیب کے شاگرد تھے اس لئے قدرۃً منطق کا پلہ زیادہ بھاری ہوا۔ نیز علامہ تفتازانی اور میر سید شریف کی تصانیف شامل درس کی گئیں۔ دسویں صدی ہجری کے آخر میں محقق دوانی، صدر شیرازی اور مرزا جان شیرازی کی تصانیف ہندوستان میں پہنچ کر داخل درس ہوئیں۔ اور معقولات کی تعلیم کا دور دورہ پہلے سے بھی زیادہ ہوگیا۔ اس ترقی علمی میں نمایاں حصہ میر فتح اللہ شیرازی کا ہے جو اکبری نورتن میں تھے۔

اسی طبقۂ علماء میں علامہ قطب الدین سہالی تھے جو علمائے فرنگی محل کے مورث ہیں۔ اسی زمانہ میں بعض

اہل علم ملک عرب تشریف لے گئے اور وہاں سے علم حدیث حاصل کرکے ہندوستان واپس آئے۔ ان بزرگوں میں شیخ محمد بن طاہر صاحب مجمع البحار، شیخ یعقوب کشمیری اور شیخ عبدالنبی گنگوہی قابل ذکر ہیں۔ چونکہ گجرات میں علم ملک یمن سے بھی آیا تھا اس لئے وہاں علم حدیث کا درس جاری تھا۔ ہندوستان سے کچھ علمار گجرات گئے اور وہاں سے علم حدیث پڑھ کر مراجعت کی۔ غرض اس طرح دسویں صدی ہجری میں علم حدیث کو بھی ایک حد تک رواج ہوا (مگر معقولات میں علما اور طلبار کی محویت کی وجہ سے بہت کم ہوا) بالآخر شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی مساعی جمیلہ نے فیض کے دریا بہائے اور ایک مخلوق کو علم حدیث سے بہرہ یاب کیا۔ بلحاظ نظام درس یہ تیسرا طبقۂ علمار تھا۔

بارہویں صدی ہجری میں چوتھے طبقے کا آغاز ہوا۔ استاذ الہند ملا نظام الدین صاحب نے نصاب تعلیم میں جدید تغیر کیا اور وہ نصاب مرتب فرمایا جو آج تک درس نظامی کے نام سے مشہور اور تمام مدارس میں کمی بیشی کے ساتھ رائج ہے۔ اس نصاب تعلیم سے زیادہ تر مقصود یہ تھا کہ اُس سے طلبار میں دقتِ نظر اور قوت مطالعہ پیدا ہو۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ بوجہ احسن یہ مقصد درس نظامیہ سے حاصل ہوا۔ اسی دور میں دہلی میں شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم نے علم حدیث کی ترویج پر کمر ہمت باندھی۔ اور ہمارے ملک کا بچہ بچہ اس سے واقف ہے کہ شاہ صاحب کی کوشش میں خداوند تعالیٰ نے برکت عظیم عطا فرمائی اور اس خاندان کی سعی سے ہندوستان دارالحدیث بن گیا۔ ملا نظام الدین صاحب کے بعد درس نظامی میں کتب منطق کا اضافۂ کثیر کیا گیا اور وہ کتابیں پڑھائی گئیں جو درس نظامیہ کی تدوین کے وقت تصنیف بھی نہ ہوئی تھیں مثلاً حاشیہ غلام یحییٰ، قاضی مبارک، حمداللہ وغیر ذالک۔ اس کے متعلق ایک عجیب واقعہ ہے۔ شارحین سُلّم العلوم کے تلامذہ اپنے استادوں کے شروح پڑھتے پڑھاتے تھے اور ان میں باہم اس پر نزاع رہتا تھا کہ کس کی شرح بہتر ہے۔ مدرسین جب اس سے تنگ آگئے تو انھوں نے سب شرحیں داخل درس کر دیں۔ اس طرح سُلّم العلوم کے شروح و حواشی گویا تمام درس نظامی پر حاوی ہو گئے (ان تمام معلومات کے لئے میں اپنے محترم حکیم سید عبدالحی صاحب ناظم[1] ندوۃ العلمار کا ممنون ہوں۔

---

[1] مؤلف تاریخ علمائے ہند مذکور بالا۔ حبیب الرحمٰن

مذکورۂ بالا بیان سے آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ کس طرح صدیوں تک منطق و حکمت کا اضافہ ہمارے عربی مدارس کے نصاب میں ہوتا رہا۔ ان فنون کی خالص کتابیں درکنار قریباً تمام باقی علوم کی بھی وہی کتابیں داخل درس ہونے کے قابل سمجھی گئیں جو علوم معقول سے مالا مال تھیں اور اس طرح اول سے آخر تک منطق کا سکہ مدارس عربیہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ ندوۃ العلماء جس وقت قائم ہوا اُس وقت نظام درس کی یہ حالت تھی کہ طلباء کی عمر کا کثیر حصہ منطق کی تحصیل میں صرف ہوتا تھا۔ فن منطق کی تحصیل میں بھی اُن سنگلاخ کتابوں کی تحصیل میں جو گو شامل منطق تھیں مگر اُن میں وہ مسائل تھے جن کو منطق کے مسائل نہیں کہہ سکتے مثلاً وجود، علم وغیرہ کے متعلق مباحث) ادب عربی کی بہت سی معرکۃ الآرا کتابیں داخل درس تھیں اور طلباء اُن کو نہایت جاں فشانی سے پڑھتے تھے تاہم عربی عبارت لکھنے یا بولنے سے عاری رہتے تھے۔ قرآن مجید کی خدمت بہت کم تھی یہ کھلا ہوا راز ہے کہ جو دماغ ذوق معقول میں سرشار تھے وہ منقول کو اس نظر سے دیکھتے تھے کہ اس سے ذہن میں سطحیت پیدا ہوتی تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگلے اساتذہ کی طرز تعلیم اور صحبت کی برکت بہت کچھ نشۂ معقول کے حق میں ترشی کا کام دیتی تھی۔ اسی کے ساتھ ساتھ قریباً ہر درس گاہِ عظیم کے ساتھ خانقاہ بھی لگی ہوتی تھی جو اخلاق کی صفائی اور باطن کی بیراستگی میں اکسیر کا حکم رکھتی تھی اور طلباء مدرسوں سے فارغ ہو کر خانقاہوں سے فیض حاصل کرتے تھے۔

انقلاب زمانہ سے یہ سامان اصلاح تو مفقود ہو گئے۔ منطقی کتابوں کا بار گراں طلباء کے دوش پر رہ گیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ زمانے کی جدید ضرورتیں اس امر کی متقاضی تھیں کہ طلباء کا کچھ بوجھ ہلکا کیا جائے تاکہ وہ ان ضرورتوں کی جانب توجہ کر سکیں۔ یہ اسباب تھے جنھوں نے ندوۃ العلماء کے مقاصد میں اصلاح نصاب تعلیم کو داخل کیا۔

(ماخوذ از علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۲۵ اپریل ۱۹۱۷ء)

آل انڈیا محمدن ایجوکیشنل کانفرنس

(جدید آنریری جائنٹ سکرٹری کا اعلان)

آل انڈیا محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کی خدمت جناب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کی کنارہ کشی پر میرے سپرد فرمائی گئی ہے۔ میں نے کبھی اپنے آپ کو اس بارگراں کے تحمل کا اہل نہیں سمجھا۔ اس لئے میرے حاشیۂ خیال میں بھی یہ نہ تھا کہ "قرعۂ فال" میرے نام نکلے گا۔ لیکن اب کہ انتخاب ہو چکا تو میں صداقت اور اعتراف بے مائگی کے ساتھ اپنی خدمت پر حاضر ہو گیا ہوں۔ سب سے اول میں نے بارگاہ ربانی میں عاجزانہ دعا کی کہ مجھ کو امت کی خدمت گزاری کی توفیق اور قوت عطا فرمائی جائے۔ وما توفیقی الا بہ۔ کام جس قدر اہم اور وسیع ہے اُس کے بیان کی حاجت نہیں۔ "عیاں را چہ بیان"۔ اسی کے ساتھ مسئلہ تعلیم اس قدر نازک اور غور طلب ہے کہ اُس کے ہر ایک شعبہ اور پہلو کا حل صرف ماہرانہ نظر اور رائے کا محتاج ہے۔ مجکو اول قدم پر بے مائگی کا اعتراف ہے۔ اس طرح آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ میں قدم قدم پہ کس قدر مشورہ ہمدردی اور امداد کا محتاج ہوں۔ یقین ہے کہ بزرگان ملّت ہمدردی اور مشورہ میں کبھی توجہ دریغ نہ فرمادیں گے۔ مجھ کو حاضر خدمت ہوئے ابھی چند ہفتے ہوئے ہیں اس لئے ظاہر ہے کہ آیندہ کی کارروائیوں کا کوئی نظام پیش کرنا یا اپنے ارادے کا اظہار بالکل قبل از وقت ہے لیکن اتنی گزارش کی جسارت کرتا ہوں کہ کوئی فریقانہ اصول یا خیال میرا النصب العین نہیں ہے اور میں صدق دل سے بدون شائبہ کسی ذاتی غرض کے ادائے خدمت اور کارآمد و مفید مشورے کے قبول کرنے اور اُس پر عمل پیرا ہونے کے لئے تیار ہوں۔ البتہ اہل نظر سے یہ استدعا ضروری ہے کہ اظہار رائے کے وقت کانفرنس کی قوت، مشورہ کے عملی پہلو اور ذمہ داری پر لحاظ فرمایا جاوے۔

مابداں منزل عالی نتوانیم رسید   ہاں مگر پیش نہد لطف شما گامے چند

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۱۹ ستمبر ۱۹۱۷ء)

شکریہ اور عرضِ حال

جناب ایڈیٹر صاحب: - السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ - میرے بڑے لڑکے مولوی محبوب الرحمن خاں کی وفات میں جن بزرگوں نے ازراہ اخوت اسلامی تعزیت فرمائی ہے۔ میں آپ کے اخبار کے ذریعہ سے اُن کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ فرداً فرداً جواب لکھنے سے بمقتضائے ضعف بشریت مجبور ہوں۔ امید ہے کہ یہ عذر قابل پذیرائی ہوگا۔

برخوردار موصوف کی پیدائش ۱۳ رمضان المبارک ۱۳۱۳ھ کو ہوئی تھی۔ تعلیم ابتدائی کلام مجید اور فارسی کی ہوئی۔ فارسی کی پختگی کے بعد عربی شروع کرائی گئی؛ عربی صرف ونحو کی استعداد کے بعد انگریزی۔ عربی میں قطبی تک معقولات پڑھ لی تھی۔ دینیات میں قدوری ومنیۃ المصلّی اور مشکوٰۃ المصابیح ان کے علاوہ تاریخ الخلفاء امام جلال الدین سیوطی کی۔ انگریزی میں میٹرک کا دو مرتبہ امتحان محمدن کالج علی گڑھ سے دیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ دوبارہ فیل ہونے کے صدمہ نے اُس کی صحت کو صدمہ پہنچایا اور اُس کا اثر پھیپھڑے تک پہنچا۔ قریباً ایک سال لکھنؤ اور بھوالی اس مرض کا علاج ڈاکٹری پوری پابندی کے ساتھ ہوا۔ (اور ایسا اچھا کہ مرض بالکل جاتا رہا، صحت کے زمانہ سے زیادہ توانائی اور تنومندی حاصل ہوگئی) میں اس علاج کے سلسلے میں ڈاکٹر ماشاء اللہ خاں صاحب سول سرجن مراد آباد میجر اسپراسن میڈیکل کالج لکھنؤ اور کرنیل کا کرین سول سرجن بھوانی کی توجہ اور کوشش کا تہ دل سے ممنون ہوں۔ ان صاحبوں نے جس توجہ اور ہمدردی سے مشورہ دیا اور معالجہ کیا وہ فی الواقع شفقت کا ایک نمونہ تھا۔ میرے پاس الفاظ نہیں جو اُن کے شکریہ کے واسطے کافی ہوں۔ لیکن افسوس ہے کہ موت کے سامنے ساری کوششیں بے کار رہیں۔ وفات سے ٹھیک ۱۳ دن پہلے پیٹ میں شدید درد ہوا اور عرصہ تک رہا۔ جب درد فرو ہوا تو بخار ہوگیا۔ مزید تشخیص سے معلوم ہوا کہ پیٹ میں پھوڑا ہوگیا ہے اور شگاف کی ضرورت ہے۔ ۸ ذی الحجہ بروز چہارشنبہ کو دوپہر کے وقت تین سول سرجنوں نے مل کر عمل جراحی کیا۔ پورا پھوڑا نکلا

جس میں مواد بہت تھا۔ اس صدمہ سے جاں بری نہ ہوسکی، اور روز پنج شنبہ ۹ ذی حجہ ۱۳۲۵ھ کو عصر کے وقت بمقام بینی تال رحلت کی۔ خداوند تعالیٰ کے فضل سے آخر وقت کے گھنٹے ایسے تھے جن سے اہل ایمان کو تسکین بلکہ مسرت ہو سکتی ہے۔ پنج شنبہ کے دوپہر سے پہلے سانس پر اثر تھا اور ضعف زیادہ تھا۔ دوپہر کو مجھ سے کہا کہ قرآن شریف سنو۔ میں سمجھا کہ سناؤ کہا۔ چنانچہ میں نے سورۂ ملک شروع کی۔ روک کر کہا کہ میں پڑھتا ہوں، آپ سنیں۔ میں نے کہا۔ بہتر۔ چنانچہ خود سورۂ ملک شروع کی۔ چند آیتیں پڑھی تھیں کہ ضعف کا اثر زیادہ ہونے لگا۔ میں نے بشریت کے غلبہ سے کہا کہ پوری سورت کے پڑھنے سے ضعف زیادہ ہوگا، آیۃ الکرسی پڑھ لو۔ چنانچہ آیت الکرسی پڑھی۔ آیت الکرسی کے بعد سورۂ ملک اس مقام سے پھر شروع کی جہاں سے چھوڑی تھی۔ جب آیہ" ماکنا فی اصحٰب السعیر" پڑھی تو مجھ کو تشابہ ہوا اور میں نے کہا کہ "من اصحاب السعیر" ہے۔ ایک دفعہ پھر پڑھ کر سوچا اور کہا کہ نہیں۔ "فی اصحاب السعیر" ہے۔ میں نے اصرار کیا۔ کہا۔ قرآن شریف منگوائیے۔ قرآن شریف بھوالی رہ گیا تھا۔ برخوردار موصوف کے ماموں مولوی خلیل الرحمٰن خاں صاحب سے پوچھا۔ انھوں نے کہا۔ "فی اصحاب السعیر" ہے۔ غرض دوم مرتبہ سورۂ ملک کا دور کیا۔ پھر سورۂ نون شروع کی۔ مجکو یہ سورت حفظ نہیں ہے۔ اس لئے میں نے سننے سے معذوری ظاہر کی۔ پھر کہا قرآن شریف منگواؤ۔ چنانچہ حافظ کلا کے پاس سے قرآن شریف منگوایا گیا۔ اور قرآن شریف کے آنے پر نصف سورۂ نون سنائی۔ سنانے میں پوری ترتیل اور ادائے مخارج کا لحاظ تھا۔ دوسرے جلسہ میں سورۂ بقر کا اخیر رکوع پڑھا۔ آیہ ربنا ولا تحملنا مالا طاقتہ لنا بہ" تین مرتبہ پڑھی۔ لہجہ میں صاف مناجات کا رنگ تھا، اسی طرح دعا لیا" واعف عنا واغفر لنا وارحمنا"۔ علاوہ تلاوت کے خاموشی میں اللہ کا نام تھا۔ میں نے متعدد بار پوچھا کہ اللہ کا نام لیتے ہو۔ جواب میں الحمدللہ ہر مرتبہ اشارہ سے کہا ہاں۔ سوا تین بجے کے قریب میں پڑھا ہوا پانی لے گیا۔ اور پوچھا کہ پڑھا ہوا پانی پیو گے؟ پڑھے ہوئے پانی کا لفظ سن کر مرحوم پر ایک کیفیت شوق طاری ہوئی اور مسکرا کر پوچھا کہ پڑھا ہوا پانی کہاں سے آیا؟ میں نے کہا تمہارے خالو جی نے پڑھ دیا ہے۔ چنانچہ پیا اور پی کر کچھ کہا جو میں نہ سمجھا۔ دریافت کیا تو آواز سے کہا۔ الحمد للہ الذی اطعمنی

وسقانی وارد انی وجعلنی من المسلمین"۔ یہ اخیر الفاظ تھے۔ اس کے بعد نیم خوابی کی سی حالت پیدا ہوگئی۔ چار بجے کے بعد میں نے یٰسین شریف پڑھی۔ تیسری مرتبہ جب میں نے ختم کی اور کہا۔ "سبحان الذی بیدہٖ ملکوت کل شیٔ والیہ ترجعون"۔ جس وقت "ترجعون" کا لفظ میری زبان سے نکلا۔ میرے نور نظر محبوب الرحمٰن کی روح اپنے رب کی جانب مراجعت کر گئی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ مرحوم نے جس اطمینان سے قرآن پاک پڑھ کر جان دی اس کے لحاظ سے میری عاجزانہ تمنا ہے کہ اس نے "یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ" کی صدا سنی ہو۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز۔ اخیر وقت میں جب طبیعت کا حال پوچھا۔ جواب میں کہا۔ اچھی ہے۔ دوپہر سے قبل خشکی پیاس کی شکایت تھی۔ دوپہر کے بعد میں نے کئی بار دریافت کیا تو کہا کہ اب خشکی پیاس بالکل نہیں ہے۔ مرحوم صوم صلوٰۃ اور جماعت کا بچپن سے پابند تھا۔ صبح کی تلاوت کلام مجید مرض میں بھی جاری رہی۔ نہایت حلیم، مستقل مزاج، باادب۔ اور ملنسار تھا۔ آج اس کے معالج ڈاکٹر استاد، ہمجولی طلبا، ان اوصاف کو تعزیت ناموں میں لکھتے ہیں اور افسوس کرتے ہیں، عزیزوں کا کیا ذکر۔ اخیر وقت تک (سوائے آخری ایک گھنٹے کے) ہوش و حواس بالکل درست رہے۔ استقلال واطمینان کا جو عالم تھا اس کو دیکھنے والے جانتے ہیں۔ نبض چہارشنبہ سے خراب تھی پنجشنبہ کو تو قریباً ساقط تھی۔ دوپہر کو میں نے نبض دیکھی تو سارے ہاتھ میں کہیں پتہ نہ تھا۔ سارے عزیز اور ڈاکٹر پریشان تھے۔ تاہم مرحوم کے پاس جو گیا یا بات کی اس کا اطمینان اور استقلال دیکھ کر اپنی پریشانی پر دل میں ایک گونہ ندامت محسوس کی۔ میں اس صدمہ عظیم میں جب اس کے اطمینان و استقلال کا تصور کرتا ہوں خداوند تعالیٰ کی جانب سے ثبات و صبر کی توفیق ہوتی ہے، والحمد للہ علی ذالک۔ میں نینی تال کے ان جملہ مسلمان بھائیوں کی ہمدردی و مدد کا دل سے ممنون ہوں اور شکرگزار جنھوں نے اس واقعہ کے وقت عید کا تیوہار چھوڑ کر ہمدردی فرمائی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ اس اثر کا نتیجہ تھا جو اب بھی مسلمانوں میں تعلیم اسلام کا باقی ہے۔ اس لئے میرے کسی شکریہ کی ضرورت ان بزرگوں کو نہیں ہے۔ تاہم چونکہ اس وقت مجکو بے انتہا مدد ملی اس لئے شکریہ مقتضائے ایمان ہے ناظرین کرام سے میری

عاجزانہ التجا ہے کہ برخوردار مرحوم کی مغفرت کی دعا فرمائیں۔

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۱۷ء)

بجلی

کل سہ پہر کو دو بجے کے بعد میں تلاوت میں مصروف تھا مینھ زور سے برس رہا تھا یکایک آنکھوں کے سامنے ایک تیز مگر صاف روشنی چمک گئی گویا دو چار مہتاب روشن ہوگئے اور نہایت زور سے بادل گرجا اس گرج میں دو طرز کی آواز تھی ایک دونک اور دوسری چیخ میری زبان سے بے اختیار "یسبح الرعد بحمدہ" نکلا اور کلام پاک ہاتھ میں لیکر کھڑا ہوگیا اور چند قدم ایک طرف کو چلا گیا یہ تمام حرکتیں بے اختیاری تھیں جب مجھ کو تنبہ ہوا اور دل پر قابو کر کے سنبھل گیا وہشتناک آواز ختم ہو چکی تھی لیکن گرج اور زمین میں ایک گونہ جنبش سی محسوس ہوتی تھی۔ بادل کے دھمکنے اور زمین کے دہلنے اور مخلوق کے فوری اضطراب سے "دکّ الارض" کا مسئلہ (جس کا وعید کلام اللہ میں ہے) دل غافل کی سمجھ میں کچھ آگیا۔ اپنی حالت درست کر کے فوراً آ بیٹھا اور قرآن شریف پھر شروع کر دیا تلاوت سے فارغ ہو کر سنا کہ پاس ہی بیچ کے ہال کے منارہ پر بجلی گری ہے اور منارہ پاش پاش ہوگیا میری جائے نشست اور بجلی گرنے کی جگہ سے قریب پندرہ قدم کے فاصلہ تھا جتنے آدمی مکان کے اندر تھے یہ حس کسی کو نہیں ہوا کہ یہ آسمانی زد ان کے سر دل پر پڑی ہے باہر سے ایک لڑکے نے دیکھا کہ منارہ گرا اور وہ چلایا کہ خاں صاحب کی انگیٹھی گر پڑی میں نے باہر نکل کر ٹوٹا ہوا منارہ دیکھا اور ہال کے اندر گیا ہال میں جلی ہوئی گندھک کی بو بہت تیز بس رہی تھی اور میرے جانے سے پہلے کچھ دھوئیں کی کیفیت بھی تھی میرے والد اسی ہال کے دوسرے کنارہ پر آتش خانہ کے مقابل جیب گھڑی ملاحظہ فرما رہے تھے۔ منارہ کا بالائی حصہ ریزہ ریزہ ہو کر چھت پر آرہا۔ چھت اور چھت کا پانی خوب گرم تھا۔ اطمینان ہو جانے کے بعد میں نے موقع صدمہ کو بغور مشاہدہ کیا منارہ کے نیچے دیوار کا چونا تین چار جگہ ایسا اکھڑ گیا تھا جیسا توپ کے گولے سے گر جائے اینٹیں جو نکل آئی تھیں ان پر جلی ہوئی بارود کی چھینٹ لگی معلوم ہوتی تھی میں نے سونگھا تو جلی ہوئی گندک کی بو تھی چھت پر کوئی صدمہ نہ تھا دیوار کے بیرونی جانب صرف یہی آثار تھے اندرونی طرف پانچ چھ ہاتھ نیچے کو ایک ایسا نشان تھا جیسے کسی گولی نے ٹھپہ کھایا ہو اس کے چند انگشت کے بعد بھاوری کو توڑا یہاں سے اس کی حرکت ایک پہلو کی طرف مائل ہوگئی دیوار میں ایک نقشہ آویزاں تھا اس کی پشت پر دیوار میں لمبا سا گولی کے ٹھپے کا سا اثر تھا مگر نقشہ کو کچھ نقصان نہیں پہنچا اس سے تھوڑی دور پر ایک اور نشان تھا اس نشان کے بعد دروازہ کے پہلو میں ایک گڑھا تھا یہ دروازہ بند تھا کواڑ کا ایک ٹکڑا علیحدہ ہوگیا نشان جتنے ہیں سب کا ایک حصہ تو گہرا ہے اور کچھ حصہ

ایسا ہی گویا کوئی چیز رگڑ لی گئی ہو۔ دروازہ کے سامنے گچ میں تین چار انگل کا گہرا گڈھا تھا اس گڈھے کے بعد کوئی اثر محسوس نہ تھا سامنے کے دروازے سب کھلے ہوئے تھے لیکن جس دروازہ کے کواڑ کو توڑا ہی وہ بند تھا اسی دروازہ کے نیچے ایک بیچہ اور اخبار پڑا تھا بیچہ کی نے پچک گئی اور اس کا کپڑا اور اخبار ایسے پارہ پارہ ہوگئے جیسے چوہوں نے کتر لیا ہو۔ میرے والد کے دماغ پر گرمی کا سا اثر ہوا اور پانوٴ کے اعصاب رد کرنے لگے بعض آدمیوں کی آنکھوں میں سے چمک کے اثر سے پانی نکلنے لگا۔ جس لڑکے نے منارہ گرتے دیکھا اُس کا بیان ہی کہ اُس میں سے دھواں بھی نکل رہا تھا۔ خدا کا شکر ہی کسی جان کا نقصان نہیں ہوا۔

حبیب گنج ۲۰ ذی قعدہ ۱۳۰۷ھ پنجشنبہ
مطابق ۱۷ جولائی ۱۸۹۰ء
ساون ۱۹۴۷ بکرمی

بجلی گرنے کے تھوڑی دیر بعد گھرا ہوا بادل پھٹ کر منتشر ہو گیا بجلی نے کمرے سے نکل کر جنوبی جانب قلعے میں جو پانی بھرا تھا اُس میں ایک ٹپہ لیا اور پھر آسمان کو چلی گئی۔

(غیر شائع شدہ)

تغلق نامہ

(بہ خدمت جناب اڈیٹر صاحب)

جناب والا! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، تغلق نامہ کی نسبت (فقرہ ۳ و ۴) اہل نظر نے کامل غور و فکر کے بعد جو رائے قائم کی ہی اُس کی صحت میں خلاصۃ التواریخ کے بیان سے کسی قسم کا شبہ پیدا نہیں ہوتا اور نہ میرے نزدیک کوئی خدشہ پیدا ہوتا ہی بلکہ ایک جدید اور مفید اطلاع ملتی ہی۔ یعنی یہ کہ حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ نے غازی الملک اور خسرو خاں کی لڑائی کے واقعات کو پنجابی زبان میں بھی نظم فرمایا ہی۔ چونکہ مؤلف خلاصۃ التواریخ سجان رائے پنجابی ہی اور بٹالہ کا رہنے والا ہی اور یہ کتاب اُس نے ۱۱۰۷ھ عالم گیری میں تالیف کی ہی اس لئے میرے نزدیک اُس کا بیان بالکل معتبر ہونا چاہیے اور یہ کہ کم از کم اواخر عہد اورنگ زیبی میں لوگ اس واقعہ سے واقف تھے کہ حضرت امیر کی ایک نظم پنجابی زبان میں بھی اس موضوع پر ہی۔ سجان رائے کے الفاظ کو اگر غور سے دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہی کہ اُس نے اس نظم کو دیکھا ہی ورنہ ذیل کے الفاظ ہرگز اُس کے قلم سے نہ نکلتے:

"چنانچہ امیر خسرو بزبان پنجاب بہ عبارت مرغوب مقدمہ جنگ غازی الملک تغلق شاہ و ناصر الدین خسرو خاں گفتہ کہ آں را بزبان ہندوار گویند۔"

چونکہ یہ اطلاع ایک معتبر اور مستند ذریعہ سے حاصل ہوئی ہی اور نیرا ورنگ زیب کے عہد کو کچھ زیادہ زمانہ نہیں گزرا، اس لئے اگر اضلاع پنجاب میں اس کی کافی تلاش اور جستجو کی جائے تو اس کا دستیاب ہونا کچھ بعید از قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ اس لئے میری رائے میں بہت ضروری ہی کہ اس امر میں حتی الوسع کوشش کی جائے۔

(اول) یہ کہ اس کتاب کو بھی کتب زیر تلاش کی فہرست میں شامل کیا جائے۔

(دوم) یہ کہ پنجاب کے ادبار اور اہل ذوق کو خلاصۃ التواریخ کے اس فقرہ کی نقل بھیجی جائے اور ان سے درخواست کی جائے کہ وہ اس نظم کی تلاش میں کوشش کریں اور اس معاملہ میں اپنی رائے سے مطلع فرمائیں۔ جس طرح ہمارے اضلاع میں (آلہا، ودھل) عام طور پر گایا جاتا ہی اسی طرح پنجاب میں (ہیر، رانجھہ، سسی، پنوں، مرہتی سوال) اور بہت قصے ہیں جو گائے جاتے ہیں اور صدیوں سے زبان زد چلے آتے ہیں۔ ممکن ہی کہ قصہ زیر بحث اب تک وہاں لوگوں کی زبان پر ہو۔ اس میں اگر کامیابی ہوئی تو یہ ایک عجیب وغریب کامیابی ہوگی۔

(فقرہ ۶ و ۷) سلطان علاء الدین کے بیٹوں اور ان کے ناموں کی نسبت کتب تواریخ میں بہت اختلاف پایا جاتا ہی۔ فرشتہ نے صرف تین نام لکھے ہیں، فرید خاں، عمر خاں و علی خاں۔ مگر سبحان رائے نے صرف دو ہی ناموں پر اکتفا کی ہی، فرید خاں اور منگو خاں۔

سبحان رائے کا یہ بیان ضیاء برنی سے ماخوذ معلوم ہوتا ہی۔ افسوس ہی کہ فیروز شاہی اس وقت میرے پاس موجود نہیں ہی۔ مگر جہاں تک مجھے یاد ہی منگو خاں کا نام سوائے فیروز شاہی کے اور کسی کتاب میں میری نظر سے نہیں گزرا۔ حضرت امیر خسرو نے پانچ کی تعداد لکھی ہی۔ ع

زبعد آں سریا رائے مرحوم
بماند پنج دیگر ماند مظلوم

اور ان ناموں کے ساتھ ان کی عمر اور مقدار تعلیم و تربیت بھی کافی تفصیل کے ساتھ لکھی ہی۔ اس لئے حضرت امیر کا بیان نہایت مستند اور قابل یقین ہی اور یہی تعداد سلطان فیروز شاہ تغلق کے بیاج سے

بھی ثابت ہوتی ہی۔ اب رہا ناموں کا اختلاف تو یہ میرے نزدیک کچھ زیادہ قابل لحاظ نہیں۔ اس لئے کہ ہندوستان میں عام رواج ہی کہ بچوں کے کئی کئی نام ہوتے ہیں اس لئے ناموں میں اختلاف ہوجانا بعید از قیاس معلوم نہیں ہوتا ناموں کے اس اختلاف سے اس امر پر استدلال کرنا کہ سلطان علاء الدین کے بیٹوں کی تعداد پانچ سے زیادہ تھی، میری رائے میں صحیح نہیں ہی۔

ظفر حسن صاحب کا یہ قیاس بھی میرے نزدیک صحیح نہیں ہی کہ شہاب الدین خاں کے نام کو حضرت امیر نے ضرورت شعری کی وجہ سے بہا خاں کر لیا ہوگا۔ اس لئے کہ اس قسم کی تخفیف ضرورت شعری کی وجہ سے امیر صاحب تو کیا کوئی ادنٰی درجہ کا شاعر بھی گوارا نہیں کر سکتا۔ اور دوسری بات یہ ہی کہ شہاب الدین خاں بہت پیشتر خضر خاں اور شادی خاں کے ساتھ قلعہ گوالیار میں قتل ہو چکا تھا۔ حضرت امیر عشقیہ میں فرماتے ہیں:۔

شہابے کز سرش بود گردے
چشید او نیز ازاں جو آب خوردے

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۱۲ نومبر ۱۹۱۸ء)

مسلم یونیورسٹی

(فوری تکمیل کے لئے پُرجوش اپیل)

رزولیوشن نمبر ۱ متعلق قیام مسلم یونیورسٹی آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے بتیسویں ۳۲ سالانہ اجلاس منعقدہ سورت میں بماہ دسمبر گزشتہ تمام ارکان اور حاضرین اجلاس کی متفقہ رائے سے پاس ہوا ہی جس کی نقل اس مختصر گزارش کے ساتھ آپ کی توجہ کی غرض سے ارسال خدمت کرتا ہوں کہ تاخیر قیام مسلم یونیورسٹی کی وجہ سے جو عالم گیر مایوسی قوم میں پھیلی ہوئی ہی، اس حوصلہ شکن حقیقت پر آپ جلد سے جلد توجہ فرمائیں اور ذیل کے واقعات و حالات پر غور کرکے شکر گزاری کا موقع دیں۔

۱۹۱۰ء میں جب ناگپور میں یہ تعلیمی کانفرنس منعقد ہوئی تو ہز ہائی نیس سر آغا خاں بالقابہ انگلستان سے تشریف لاکر اس قومی مجلس میں شریک ہوئے اور مسلم یونیورسٹی کے خیالِ کہن کو پیامِ اُمید کی شکل میں قوم کے سامنے پیش کیا ۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۲ء یہ دونوں سال حسنِ عمل اور جوشِ قومی کے لحاظ سے نواب وقار الملک بہادر مرحوم کے عہد کے ہمیشہ تاریخی سال شمار ہوں گے۔ یونیورسٹی کے وجود میں لائے جانے کی کوشش میں قوم کے ہر برنا و پیر نے حصہ لیا۔ امرار قوم نے فیاضی کے ساتھ ہز ہائی نیس ممدوح کی اپیل کا خیر مقدم کیا۔ لاکھوں روپیہ سے مدد دی۔ غریب اور اوسط درجہ کے طبقہ نے بھی اپنی اپنی ہمتوں سے کام لیا اور جس سے جس قدر مالی امداد بن پڑی اُس نے مدد کی۔ نہ صرف شہروں بلکہ قصبوں اور قریوں میں مسلم یونیورسٹی کی صدا لگاتے ہوئے وہ لوگ نظر آئے جن کا اپنی آرام گاہوں سے قدم باہر نکالنا دشوار معلوم ہوتا تھا۔

دنیا دار جماعت سے گزر کر علماء اور صوفیا کے مقدس گروہ تک نے اس تجویز کو قوم کے حق میں آیۂ رحمت سمجھ کر خود اس علمی کوشش میں شریک ہو کر یونیورسٹی کی ضروریات پر مُہر کی جس کا نتیجہ ڈیڑھ سال کی کوشش میں یہ نکلا کہ جو مجوزہ رقم قیام مسلم یونیورسٹی کے واسطے قوم سے طلب کی گئی تھی وہ ستائیس اٹھائیس لاکھ نقد کی شکل میں فراہم ہو گئی۔

غرض اس آہنگِ عمل نے قوائے عملی کے بیدار کرنے میں اس سرعت اور تیزی کے ساتھ حصہ لیا کہ مسلمانوں کو خوابِ غفلت و جہالت سے چونکتا ہوا دیکھ کر ملک کی دوسری زندہ اقوام نے بھی اُن کے طرزِ عمل کو حیرت کے ساتھ دیکھا اور اُن کے احساسِ ملی پر غور کے ساتھ توجہ کی۔

لیکن کوشش اور عمل کا یہ ایک بادل تھا کہ گرجا اور برسا اور پھر ایسا کھلا جس کے دوبارہ امنڈنے کی شکل سے امید ہوتی ہی، یا جد و جہد کا ایک طوفان تھا جو آناً فاناً آیا اور نکل گیا، یا قوتِ عمل اور قوتِ اتحاد کا ایک سیلاب تھا کہ دفعتہً اٹھا اور اپنے ساتھ دوسری خصوصیات کو بھی بہا لے گیا۔ اور جس کے پھر اُٹھنے کا خیال بھی نہیں آتا۔

یونیورسٹی کے متعلق جو حوادث و افکار سامنے سے گزرے اُن کا نتیجہ محمڈن یونیورسٹی کی شکل میں

ظاہر ہوتا تو مسلمانوں کی زشتیِ اعمال کی وجہ سے کارِ اہم تھا ہی اُن کی وجہ سے دوسری قومی تحریکوں کو جیسا دھکا لگا وہ اس امر سے ظاہر ہے کہ مسلمانانِ ہندوستان کے ہر حصہ میں مایوسی اور ناامیدی کے خیالات جاگزیں ہو گئے ہیں، اُن کی حرکت بند ہو گئی ہے اور جن سوتوں سے کشتِ امید کی آبیاری کی توقع کی جا سکتی تھی اُن کے منہ تک بند ہو گئے ہیں۔ خود مدرسۃ العلوم علی گڑھ جس کی ترقی کی کوشش میں آدھی صدی گزر چکی ہے اور جس کو یونیورسٹی کے درجہ تک پہنچانے کا خیال پچاس برس سے اُس کے بانیوں اور اُس کے کارفرماؤں کے دل و دماغ میں گردش کرتا رہا ہے اور جس کے وجود میں لانے کے لئے یہ جد و جہد اور تگ و دو جاری تھی) یہ خیال اب ایک مایوسی کی شکل میں آشکارا ہو کر خود کالج کو اُس کے درجہ سے گرانے کی شکل میں تبدیل ہو گیا۔ اور جس کی یہ حالت اب مخفی نہیں رہی کہ وہ علی گڑھ جس کی شہرت اور تعلیم کی خوبی نے چار چاند لگا کر قوم کی قوت کو ایک مرکز بنا کر اُس کے گرد جمع کر لیا تھا، اب اس کا شیرازہ تتر بتر ہونے کے قریب آ گیا ہے اور اس کالج کو (جس کی اعلیٰ تعلیم و تربیت پر نہ صرف قوم کو اعتماد کلی حاصل ہو چکا تھا، بلکہ حاکمانِ وقت کی رائیں اس کے اوصافِ تعلیم و تربیت کی خوبی کو برملا ظاہر کرتیں اور اس کی مدد کرنے میں بیش از بیش نظر آتی تھیں) اب خود قوم کی توجہ کا یہ حال ہے کہ سینکڑوں طلبا کالج سے جدا ہو گئے۔ جس درس گاہ کے بورڈنگ ہاؤسوں میں قلتِ تعداد کی ہمیشہ شکایت رہتی تھی، جس میں طلباء کی گنجائش نکالنے کے واسطے منتظمانِ کالج کی کوشش ہر وقت سرگرم نظر آتی تھی، وہاں بیسیوں اور سینکڑوں طلبہ کی سکونت کے مکان خالی پڑے ہوئے جانے والوں کو یاد کر رہے ہیں۔ اور اس پر بے اعتمادی اور اس کی خرابیِ تعلیم کی شکایتیں ہر جگہ سنی جاتی ہیں۔ کیا یہ حالت اب اس حد تک نہیں پہنچ گئی کہ ہم اس پر غور کر کے اصلی مرض کے دفعیہ کی کوشش کریں؟ حالت یہ ہے کہ بہت ہی بے سر و پا باتوں اور بے بنیاد واقعات کی اصلاح کرنا اور صحیح خیالات کا ظاہر کرنا بھی ایک ایسا امر اہم ہو گیا ہے جس کے سننے کے لئے لوگ تیار نہیں ہیں۔ جو خیالات تعلیم کی طرف سے بے توجہی کے پھیلے ہوئے ہیں، جس طرح رفتہ رفتہ اس چھ سات سال کے دوران میں فیاض اور ہمدرد اصحاب نے تعلیمی امداد سے دست کشی اختیار کر رکھی ہے اور جس طرح تمام قوم میں ایک پُر معنی خاموشی طاری ہے کہ بے اعتمادی اور بدگمانی کا جس بلند آہنگی کے

ساتھ اعلان ہوا ہے، میری ناچیز رائے میں اس سرد مہری کے دوسرے اسباب فرع ہیں ان اصلی واقعات کے جو اس زمانہ میں پیش آئے ہیں۔ اصلی سبب اور حقیقی بنیاد کا سراغ لگانے میں اگر توجہ کی جائے گی تو مسلم یونیورسٹی کے امکان کا ظہور میں نہ آنا قوم میں پژمردگی اور تعلیمی کوشش کی رفع ترقی کا سبب دیگر اسباب سے قوی تر ثابت ہوگا جس کے حاصل ہو جانے کی بہت سی ذمہ دار تقریروں میں گنجائش نکال کر یونیورسٹی کے امکان کو یقین کے درجہ تک حاصل کرنے کی قوم سے ضمانت کر لی گئی تھی۔

مسلم یونیورسٹی کا چارٹر حاصل کرنے کا جوش اور سرخوشی کا زمانہ جو ایک حرکتِ مذبوحی سے زیادہ ثابت نہ ہوا، گزر گیا تو دوسری طرف پڑوسیوں میں کام کا حقیقی جذبہ پیدا ہوا۔ ان پر بھی موافق اور ناموافق دونوں حالتیں گزریں، لیکن انجام بینی اور مصلحت اندیشی چونکہ ان کے ضمیر فطرت میں داخل ہو چکی ہے، انھوں نے اپنی منزلِ مقصود کا راستہ تلاش کر لیا۔ جس منزل کی اُن کو تلاش تھی وہ وہاں پہنچ گئے اور پہنچ کر آباد بھی ہوگئے۔ اُن کی ترقی نسل کی بیل بھی پھلنی اور پھولنی شروع ہوگئی۔ ہندو یونیورسٹی قائم ہوگئی اس کے کانووکیشن کا جلسہ بھی گزشتہ مہینے میں ہو چکا (جس کی مبارکباد ہم برادرانِ وطن کی خدمت میں پیش کرتے ہیں) اور ہم ابھی تک ہست و نیست کی مباحث سے فارغ نہ ہوئے ؎

یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

مسلم یونیورسٹی ملتی یا نہ ملتی یہیں تک خیر تھی۔ ہم نے اس چیز کو بھی متزلزل کر دیا جس کی ترقی میں پچاس برس صرف کئے گئے تھے۔ یہ وہ مظاہرۂ حقیقت ہے جس پر توجہ کرنے سے ہمارے ضعف اور غفلت کا اصلی راز کھلتا ہے۔ اب تھکے ماندوں کے لئے بسترِ راحت و عالمِ سکون کا درجہ باقی تھا جس میں ہم پورے اطمینان و راحت کے ساتھ مبتلا نظر آتے ہیں۔ مولانا "حالی" کا یہ قول جیسا ہماری حالت پر منطبق ہے شاید ہی دنیا کے کسی خطہ کی قوم کے مناسب حال ہو ؎

ایسے کچھ بیٹھے ہیں فارغ یار سب بے فکر
جو مہم درپیش تھی وہ کر چکے گویا کہ سر
قوم میں تعلیم پھیلائی تھی سو پھیلا چکے
ہوگیا وہ بیج جو بویا تھا نخلِ بارور

پر جو سچ پوچھو تو ہم اب تک اُسی منزل میں ہیں   باندھ کر اُٹھے تھے جس منزل سے احرام سفر

مخدومانِ من! قوم میں تعلیمی تحریک کو مسلم یونیورسٹی کے معرضِ ظہور میں نہ آنے سے جو صدمہ پہنچا اور پہنچ رہا ہے اور اس سبب سے جو مایوسی کے خیالات عالم گیر طور پر پھیل رہے ہیں اور جن کا اظہار قومی مجلسوں میں، آپس کی ملاقاتوں میں، گھروں میں بیٹھ کر کیا جاتا ہے، میں نے اس حالت کی طرف اس لئے جناب کی توجہ چاہی ہے کہ جو وقت گزرنا تھا گزر گیا، اور جو حالت پیدا ہونی تھی وہ ہو گئی۔ میری رائے ناقص میں اس غفلت اور سکون کا علاج اب بھی اگر ہو سکتا ہے تو مسلم یونیورسٹی کے حصول چارٹر سے ہی ہو سکتا ہے۔ یہی چیز ایسی ہو گی جو بیداری کی پھر حرکت پیدا کرے گی۔

لہٰذا آپ کی قومی ہمدردی اور جوش سے اپیل کر کے رزولیوشن پاس کردہ اجلاس کانفرنس کے آخری جلسے پر اس ناچیز گزارش کو ختم کرتا ہوں کہ اس مقصد کے حصول کے واسطے جلد تر قانونی کارروائی کی تکمیل میں کوشش فرمائیے۔ اس کے لئے یہ مناسب ہو گا کہ باہمی مشورہ سے فاؤنڈیشن کمیٹی کا جلسہ طلب کر کے اس میں یہ مسئلہ پیش کیا جائے۔ اصل رزولیوشن کی عبارت بغرض ملاحظہ و توجہ درج ذیل کی جاتی ہے:

(رزولیوشن نمبر ۱ (محولۂ بالا): "بلحاظ اس تاخیر کے جو مسلم یونیورسٹی کے قائم ہونے میں واقع ہوئی ہے اس کانفرنس کا یہ مضبوط خیال ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لئے جلد تر قانونی کارروائی کی تکمیل میں کوشش کی جاوے۔"

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۵ مارچ ۱۹۱۹ء)

علمی خزانوں کی تباہی

(قدیم قلمی کتابوں اور فرامین کی حفاظت کے لئے اپیل)

ہندوستان میں سلطنتِ مغلیہ کے زوال اور بربادی کے ساتھ ساتھ جہاں مسلمانوں کی دولت اور ثروت کا خاتمہ ہونا شروع ہوا، اُن کی جاگیریں اور زمینداری کے علاقے برباد ہوئے، اُن کی اخلاقی اور دماغی قوتیں فنا ہونی شروع ہوئیں، اسی کے ساتھ ساتھ ان کا علم و فضل اور تحصیل علوم کا سرمایہ یعنی بیش بہا کتاب خانے جو جواہرات سے بھی زیادہ قیمتی تھے تباہ ہونے شروع ہوئے۔

جو اسلاف مسند علم کی زینت دینے والے تھے اُن کے اخلاف اور قائم مقام ایسے ہوئے جنہوں نے ان انمول موتیوں کی سنگریزوں کے برابر بھی قدر نہ کی۔ غدر ۱۸۵۷ء کے واقعہ کو ابھی پون صدی بھی نہیں گزری، اہل بصیرت کو اس کا علم ہے۔ اُس زمانہ میں شہر تو شہر صدہا قصبے بھی ایسے تھے جہاں یہ علمی سرمایہ بہت کچھ موجود تھا۔ دہلی، لکھنؤ، لاہور، پٹنہ آگرہ، سورت، احمد آباد، بنارس، بلگرام، کاکوری، پانی پت، مارہرہ، امروہہ اور مثل ان کے اور بہت سے مقامات تو گویا اس بازار علم و عمل کے دساور تھے، جس میں متاعِ حدیث، فقہ، تفسیر، منطق، معانی، تاریخ، طب، حکمت، فلسفہ اور عربی فارسی ادب کی کتابیں، نامی شعراء کے دواوین، قلمی بے بہا نسخوں، مشہور خطاط استادوں کے قطعات اور قلمی مرقعوں کی شکل میں انبار کے انبار نظر آتے تھے۔ اُن کے مکانات کی الماریاں اور بڑے بڑے صندوق ان جواہرات سے معمور تھے۔

کتاب خانے ایک طرف، رہنے کے مکانوں کا یہ عالم تھا کہ جہاں آج مکانات کی زینت اور آرائش میں یورپ کی نت نئی اشیاء نے جگہ حاصل کی ہے، وہاں اب سے پچاس ساٹھ برس پہلے تک مسلمانوں کے دیوان خانوں اور گھروں کے معمولی سے دالانوں کی آرائش میں جو چیزیں دیگر اشیاء نمائشی میں نمایاں نظر آتی تھیں، وہ ان خوش نویس اور صاحبِ کمال خطاطوں کی وصلیاں اور طغرے

ہوتے تھے جن میں نہایت پر معنی اور پُر کیف بیتیں، پر نصیحت قطعے، پُر اخلاق جملے، دل آویز فقرے، حدیث شریف اور کلام پاک کی آیات مبارکہ کے پُر تاثیر جملے اس خوبی اور کمال تحریر کے ساتھ چوکھٹوں میں لکھ کر آویزاں کیے جاتے تھے، جن کے در و دیوار سوتے جاگتے اخلاق آموزی حکمت پژوہی اور خوبی مذاق کی طرف زبانِ حال سے تعلیم دینے میں مصروف رہتے تھے۔ اس دستور کی وجہ سے صدہا اقوال مسلمانوں کے علمی لٹریچر کی جان بن کر جاہلوں تک کی زندگی کے دستور العمل بن گئے۔

جن علمی جواہرات کو ہماری جہالت نے خزف ریزوں کی طرح پامال کرنا شروع کیا، یورپ نے اپنے دامنِ امید میں اُن موتیوں کو رول کر بھرنا شروع کر دیا۔ آج بڑے سے بڑے مسلمان عالم کی نادر اور نایاب کتابوں کا مسلمانوں کے علوم و فنون سے دلچسپیوں کا، بڑے بڑے مسائل علمی پر اُن کی مجتہدانہ اور محققانہ موشگافیوں کا، اُن کے میدانِ علم کی تلاش و جستجو میں پُر مغز کارناموں کا پتہ لگانا چاہو تو اُس کا نشان یورپ کے سوا کہیں اور نہ ملے گا۔ جب قوم میں قومی علوم کی یہ قدر افزائی رہ جائے تو پھر قومی خصوصیات کا ذکر اور اُس کی بقا کی امید ایک قصہ پارینہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ جب اُن کے کتب خانے اپنے معلّمانِ اخلاق کی تصنیفات سے خالی ہو جاویں تو اس جذبہ اور کیفیت کی تلاش تحصیل حاصل ہے کہ کبھی ہماری قوم بھی علوم و فنون کی دنیا میں اخلاق پھیلانے کی اور تہذیب و شائستگی کو اس عالم میں رواج دینے کی کفیل تھی اور ہم نے بھی یہ سبق ایک عالم کو پڑھایا تھا۔

امید کی جھلک نمایاں ہونے میں پس و پیش کی ضرورت نہیں۔ بہت سے قومی بھلائی چاہنے والے، قوم سے مختلف امراض کو دور کرنے میں اور اُس کے ضعیف قوائے عقلی و دماغی کو قوت پہنچانے میں ساعی ہیں۔ ان کی تمام تر کوششیں مفید ہیں اور اس غرض کے تحت میں متفرق طور پر جہاں جہاں جس جس قسم کی رفتار عمل جاری ہے وہ نتیجہ خیز ہے۔

لیکن ایسی کوشش جو مسلمانوں کے قدیم قلمی اور علمی ذخیرہ کو، فن خوش نویسی اور خطاطی کے کمال کو، اُن کی انشاء کے عمدہ عمدہ نمونوں کو قدیم قسم اپنی آئندہ کی تباہی اور بربادی سے محفوظ رکھ سکے (جہاں تک میری محدود معلومات کا ذریعہ ہے) کسی ذمہ دار جماعت کے اہتمام سے اب تک باقاعدہ

طور پر عمل میں نہیں لائی گئی اور نہ اس وقت تک لائی جا رہی ہے، لہذا اس کی حفاظت کی تدبیر کی عملاً اختیار کرنے کا وقت حد سے زیادہ گزر چکا ہے اور ضرورت اس امر کی ہے کہ بقیہ نقیہ جس طرح بن پڑے سمیٹ کر اکٹھا کیا جائے اور اس کو درست حالت میں رکھنے کی توجہ کے ساتھ کوشش شروع کی جائے۔

قومی پستی کے اس آخری دور میں سر سید احمد خاں مرحوم کے دل و دماغ میں قومی ترقی اور بہبودی کے مختلف وسائل اور خیالات گردش کرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ اُن کا دماغ منزلِ مقصود پر پہنچنے کے لئے بہت سی تدبیریں سوچتا تھا جس کے مختلف خاکے وہ کھینچتے رہتے تھے۔ اُن کے اکثر مجوزہ خاکوں نے اُن کی زندگی میں مستقل نقشوں کی صورت حاصل کر کے عمارت کی شکل اختیار کی، بعض نقشے ناتمام اور ادھورے رہ گئے اور بعض خاکوں کو نقشوں کی صورت بھی دیکھنا نصیب نہ ہوئی، جن کا قدم خیال اور تصور کی سرحد سے بھی آگے نہ بڑھنے پایا۔ منجملہ اور تدبیروں کے قوم میں زندگی پیدا کرنے کی ایک تدبیر اُن کے ذہن میں یہ بھی تھی جس کا میں نے ذکر کیا، یعنی یہ کہ مسلمانوں کے علمی سرمایہ کی حفاظت کا اہتمام بھی ایک ذمہ دار انجمن کے ذریعہ سے ہو۔ نایاب اور قلمی ذخیرہ کتب کی بربادی انھوں نے بہت کچھ اپنی آنکھوں سے زوال دہلی کے آخری زمانہ میں دیکھی تھی اور اس بربادی سے جو اثر قوم کی حالت پر اور اس کے احساسِ قومی پر اپنی علمی کم مائگی کی وجہ سے پڑنے والا تھا، اُن کی دوربین نگاہ اس خرابی کو تاڑ چکی تھی۔ چنانچہ ۱۸۸۶ء میں جب انھوں نے آل انڈیا محمدن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی اور اس جماعت کے قیام سے انھوں نے تعلیمی مشن کے کام لینے کا ارادہ کیا اور انجمن کے مقاصد و قواعد ترتیب دے کر چھاپے، تو مقاصد مذکورہ کی دفعہ (۷) ضمن (د) میں یہ غرض بھی شامل کی کہ:

"مسلمان مصنفوں کی تصنیفات جو نایاب ہیں اُن کے بہم پہنچانے کی تدبیر کرنا یا پتہ لگانا کہ وہ کس جگہ موجود ہیں۔"

اس کے بعد دفعہ مذکور ضمن (ز) میں یہ اضافہ کیا کہ

"فرامین شاہی کو بہم پہنچا کر ان سے ایک کتاب انشار کا مرتب کرانا اور اُن کے مواہیر و طغرے کے نمونے فوٹوگراف سے قائم کرنا۔"

بتیس ۳۲ برس گزرے کہ مذکورۂ بالا خیال مقاصد کانفرنس کے حروف میں محفوظ چلا آتا ہی جس پر کسی قسم کا عملی تصرف نہیں ہوا۔ اس کا بڑا سبب کانفرنس کے سرمایہ اور مکان کا مستقل نہ ہونا تھا۔

عرصۂ دراز سے مرحوم کا یہ خاکہ میرے بھی پیش نظر تھا اور مدت سے میرے دل میں اس تصور کی چٹک موجود تھی، لیکن جب میرے ممتاز دوست آنریبل صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب (جن کی مساعی جمیلہ اغراض کانفرنس کی مقصد برآری میں بہت کچھ کامیابی حاصل کر چکی ہیں) ۱۹۱۷ء میں جناب وزیر ہند کی کونسل کے ممبر بن کر انگلستان تشریف لے جانے لگے اور اہل حل وعقد نے کانفرنس کا نظام عمل میرے کمزور ہاتھوں میں دینا پسند کیا، تو اسی وقت سے (جبکہ عملاً مقاصد کانفرنس کا پورا کرنا میرے ذمہ ہوا) یہ خیال میرے دل میں آیا کہ مشرقی کتاب خانہ کی بنیاد (سلطان جہاں منزل (صدر دفتر کانفرنس) میں پڑ چکی ہی)، اس کی توسیع کی بھی خاص طور پر کوشش ہونی چاہیے۔ قدیم کتابوں کے مکمل اور نامکمل پھٹے پرانے نسخے تلاش کئے جائیں، فرامین شاہی اور اُن کے پرزوں کو جہاں تک دستیاب ہو سکیں ایک جا جمع کر کے اُن کی اصلاح اور درستی کی جاوے۔ سر سید مرحوم کے خاکہ کے موافق اگر پوری کامیابی حاصل نہ ہو، تاہم تھوڑی بہت اس خاکہ میں رنگ آمیزی کر کے کم سے کم ایسا نقشہ تو تیار کر دیا جائے جس پر کوئی اور خدا کا بندہ اضافہ کر سکے۔

خدا کے فضل سے اور علیا حضرت سرکار عالیہ ہرہائی نیس بیگم صاحبہ والیہ بھوپال کی قومی اور تعلیمی ہمدردی کی وجہ سے کانفرنس کا صدر دفتر اب ایسی دل چسپ، وسیع اور خوش نما عمارت میں موجود ہی جس میں ایسی ہی دل چسپ اور قیمتی کتب کے سرمایہ کی ضرورت ہی اور جو حاصل ہونے پر دست برد زمانہ سے ایک حد تک زمانہ دراز کے لئے محفوظ رہ سکتا ہی۔ میرے اس خیال نے بھی اس وقت تک کوئی عملی صورت نہیں ظاہر کی، البتہ برائے نام چند عمدہ کتابوں کا اور فرامین شاہی کا اضافہ ہوا ہی جو ہونے نہ ہونے کے برابر ہی یا یوں خیال کیجیے کہ ایک خیال کمن کی کارروائی کا آغاز کا ہی جس کا تمام ہونا خدا کے فضل اور قوم کی مدد پر منحصر ہی۔

سب سے بڑی رکاوٹ کا باعث سرمایہ کا نہ ہونا ہی۔ یہ کام اپنی اہمیت کے لحاظ سے مستقل

فنڈ چاہتا ہی۔ کانفرنس کی آمدنی بہت محدود ہی جس کے فقط دو ذریعہ ہیں۔ چند والیان ملک اور امرا کی اعانت مستقل گرانٹ کی شکل میں ہی جس میں سب سے بڑا حصہ اعلیٰ حضرت محی الملت والدین خسرو دکن خلداللہ ملکہ کی اور سرکار عالیہ حضور بیگم صاحبہ فرمانروائے بھوپال و دربار بھاولپور کی دست گیری شامل ہی۔ دوسرے درجہ میں جناب سر راجہ صاحب محمود آباد، خان بہادر نواب محمد مزمل اللہ خاں صاحب او۔ بی۔ ای رئیس بھیکن پور وغیرہ کی مستقل امدادیں ہیں۔ اس کے بعد تیسرا درجہ کانفرنس کے سالانہ ممبروں کی فیس کا ہی جو پانچ روپیہ سالانہ کی شکل میں حاصل ہوتی ہی ممبران کانفرنس کی آمدنی دو تین سال کے زمانہ میں اس قدر قلیل ہوئی ہی کہ اس سے سالانہ رپورٹ کانفرنس کی چھپائی اور سفیران کانفرنس کی تنخواہوں کی بھی مشکل سے نکاسی ہوتی ہی۔ وظائف میں بھی آمدنی کے بہت کم وصول ہونے سے اس قدر رقم صرف نہ کی جا سکی جو ہمیشہ ہونہار اور قابل امداد طلبہ پر صرف کی جاتی تھی۔ اب رہی دفتر کے دیگر اخراجات، اُن کو بھی مشکل سے بچت کی تدبیریں نکال کر عملہ کانفرنس میں تخفیف کر کے پورا کرنے کی کوشش کی گئی اور اس طرح بجٹ سالانہ کی منظور شدہ رقوم میں بھی کفایت شعاری سے کام کر کے اخراجات پورے کئے گئے۔ تعلیم کی طرف سے اور اس مقصد میں اعانت کرنے سے عام دلچسپی میں کئی سال سے جو نمایاں تنزل ہو رہا ہی وہ ابھی تک رواں ہی۔ ایسی حالت میں ایسے اہم کام کا جاری کرنا ظاہر ہے کہ بغیر خاص سرمایہ کے حصول کے نہایت دشوار ہی۔ قومی خیالات میں سکون نہ ہونے کی وجہ سے اس غرض کے لئے قوم سے درخواست کرنے اور اپیل کرنے کی بھی ہمت نہ پڑتی تھی۔ جمہوری اغراض کے واسطے جمہور کی مدد کا حاصل ہونا ہی لابد امر ہی۔ وقت کا انتظار پیش نظر رہا۔

اس مرتبہ سورت میں کانفرنس کا سالانہ اجلاس ہوا اور انتظام و اہتمام کانفرنس کی غرض سے مجھے صوبۂ گجرات جانے کا اتفاق ہوا۔ اثنائے قیام گجرات میں بہت سی اسلامی یادگاریں، عالی شان ایوانوں کے کھنڈروں، شکستہ مسجدوں، بے مثل تفریح گاہوں، بلند میناروں، ویران خانقاہوں کی شکل میں نظر سے گزریں۔ سورت، بڑودہ، احمد آباد میں اکثر نادر قلمی کتابوں اور فرامین شاہی کے دیکھنے کا بھی موقع ملا۔ جس حالت میں میں نے یہ چیزیں دیکھیں اور جو بے توجہی اُن کے ساتھ برتی جا رہی

تھی آثار قدیمہ بصورت تعمیر کے اثر انگیز حالات سے گزر کر علمی ذخیروں کی تباہی اور بربادی نے میرے قلب پر خاص اثر پیدا کیا جس کا ذکر درد انگیز داستان ہوگی۔

میں نے اچھی طرح دیکھا کہ اگر جلد سے جلد اس سرمایہ کی حفاظت کا سامان نہ ہوا تو عنقریب وہ دن آنے والا ہے کہ جو سامان اس وقت خطۂ گجرات میں موجود ہے اُس کا پتہ لگانے سے بھی نشان نہ ملے گا۔ کچھ حریفوں کے دامنِ مقصود کی زینت ہوگا باقی کیڑوں اور دیمک کی غذا بنے گا۔ افسوس ہے کہ بہت سا سرمایہ تلف ہو چکا بہت کم باقی ہے جواب بھی بہت ہے۔

مسلمانانِ ہندوستان میں علوم و فنون کے مجتہد اور محقق مدتوں تک پیدا ہونے کی توقع مشکل سے کی جا سکتی ہے۔

ایسی حالت میں اسلاف جو علمی سرمایہ چھوڑ گئے ہیں اور جو پورے طور سے برباد ہو چکا ہے اب اُس کے بقیہ حصہ کو بطور یادگار اور نشانی کے رکھنا ہمارا فرض ہونا چاہیے۔

اگر اس مقصد کے لئے کافی روپیہ حاصل ہو جائے تو میرے نزدیک تلاش اور جستجو کے بعد اور معاوضہ کی معقول رقم ادا کرنے پر کامیابی دشوار نہیں معلوم ہوتی، کیونکہ جن لوگوں کے پاس یہ ذخیرہ ہے وہ اس کے قدرداں نہیں، تنگی اور عدم فراغت خالی کاغذوں کو پاس رکھنے کی روادار نہیں، تھوڑے بہت معاوضہ زر نقد کی شکل میں ایسی چیزوں کا ملنا اب دشوار نہیں ہے۔ لہٰذا ارباب کرم اور حامیانِ علم اور پرستارانِ کمالاتِ اسلاف کی خدمت میں یہ حقیر درخواست بطور اپیل کے شائع کر کے استدعا کرتا ہوں کہ وہ اس کام میں میری مدد فرمائیں۔ کام شروع کرنے کے واسطے سرِ دست دس ہزار روپیہ کی ضرورت ہے، جس کی عملی صورت یہ ہوگی کہ ایک لائق شخص جو اس کام کے لئے موزوں ہو سَو روپیہ ماہوار پر مقرر کیا جائے گا۔ وہ ایسے مقامات میں سفر کرے گا جہاں سے کتابوں کا ذخیرہ فراہم کر سکے، تخمیناً پچاس روپیہ اس کو مصارف سفر کے واسطے دئے جائیں گے سرِ دست دو سال کے تجربہ کے واسطے قریباً چار ہزار روپیہ سفیر کی تنخواہ و سفر خرچ میں صرف ہوں گے باقی روپیہ خریداری کتب و فراہمی میں اُن کے درست کرانے اور جلدیں بندھوانے میں صرف ہوگا۔ یہ تمام سامان سلطان جہاں منزل

صدر دفتر کانفرنس کی عمارت میں رکھا جائے گا جس کی ذمہ داری آنریری جائنٹ سکرٹری کانفرنس کے متعلق ہوگی - دو سال کے تجربہ کے بعد انشاءاللہ تعالیٰ مستقل سرمایہ کے لئے قوم اور ملک سے اپیل کی جاوے گی اس لئے کہ عرصہ تک اس سلسلہ کا جاری رہنا لازم ہے، تاکہ ہندوستان بلکہ بیرونی ممالک سے بھی ذخیرۂ علمی فراہم ہو سکے -

آخر میں یہ دردانگیز حکایت ختم کر کے پورے طور سے امید کی جاتی ہے کہ ہمدردانِ قوم اس تجویز کو عملی صورت میں لانے کے لئے معین و مددگار ہوں گے - ایسے اہم اور مفید مقصد کے واسطے دس ہزار روپیہ کا سرمایہ فراہم کر دینا قومی خودداری کے سامنے دشوار بات نہیں - امرار قوم اور علم دوست احباب کے طبقہ سے گزر کر اوسط درجہ کے تعلیم یافتہ اصحاب بھی اس کارِ خیر میں شریک ہو سکتے ہیں -

اس مقصد کے حصول میں مجھ کو سب سے بڑی امید اعلیٰ حضرت تاجدار دکن خلد اللہ ملکہٗ اور علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال دام اقبالہا کی توجہ شاہانہ سے ہے جن کی ذات ستودہ صفات علم و عمل کی سب سے بڑھ کر کفیل اور ضامن ہے -

جو صاحب زرِ چندہ عنایت فرمائیں وہ مہربانی کر کے رجسٹرار صاحب ایم اے او کالج علی گڑھ کے نام بھیجیں اور اُن کو تحریر فرماویں کہ یہ روپیہ (فنڈ فراہمی کتب قدیمہ) میں جمع کیا جاوے - سپرنٹنڈنٹ صاحب دفتر کانفرنس کو ارسال چندہ سے براہ مہربانی اطلاع دیں - رسید عطیہ دفتر کانفرنس سے آنریری جائنٹ سکرٹری کانفرنس کے دستخط ہو کر معطی صاحبان کی خدمت میں باضابطہ ارسال ہوا کرے گی - معطیان گرامی قدر کے نام نامی معہ تعداد عطیہ ہر مہینے کانفرنس گزٹ میں شائع ہوا کریں گے - اس کے صرف سے کام کی نوعیت اور کتابوں کی کیفیت اور حالت سے بذریعہ رسالہ مذکورہ اطلاع دی جایا کرے گی -

آخر میں خداوند تعالیٰ کے حضور میں التجا ہے کہ وہ ہمارے نیک ارادوں میں ثابت قدمی بخشے اور اُن میں کامیابی دے، آمین!

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۱۲ / مارچ ۱۹۱۹ء)

فارسی کے دو نایاب دیوان

میرے مختصر سے کتاب خانہ میں فارسی کے دو دیوان قلمی ہیں جو اپنے اوصاف اور خصوصیات کے لحاظ سے نایاب خیال کئے جا سکتے ہیں۔ ان دونوں کو مرحوم علامہ شبلی کی یاد سے تعلق ہے۔ نیاز منزل دل کا تقاضا ہے کہ معارف کے ناظرینِ کرام سے ان کا تعارف ہو۔ اس طرح "استادِ محترم" کی یادتازہ ہو جائے گی اور "تلمیذ مکرم" کی فرمائش کی تعمیل۔ مانا کہ یہ ہدیہ ؎

پائے ملخے پیش سلیمان بردن ٹھہرے

تاہم مور ضعیف کا یہی تحفہ ہو سکتا ہے۔ حسرت شروانی

(۱) دیوانِ عرفی شیرازی

عرفی شیرازی نے وفات کے وقت اپنے مسودات کا مجموعۂ پریشان خانخانان کی خدمت میں بھجوا دیا تھا کہ اُس کی سرپرستی میں مدوّن ہو جائے۔ چنانچہ عرفی کی یہ تمنا پوری ہوئی۔ علامہ شبلی "شعر العجم" میں فرماتے ہیں "افسوس۔ یہ نسخہ آج نایاب ہے۔ ورنہ بہت سی دلچسپ باتیں معلوم ہوتیں"۔ اثر نیاز دیکھو۔ علامہ مرحوم کی آرزو حسرت کے حق میں پوری ہوئی۔ وہ نسخہ اُن کے نیاز مند کے ہاتھ آگیا۔ پارسال دلی کے ایک بزرگ (قدیم خاندان ہنر کی یادگار) بہت سے قطعات اور یہ نسخہ فروخت کے لئے لائے۔ میں نے دیکھا تو خوبی خط وغیرہ کے لحاظ سے نادر معلوم ہوا۔ لے لیا۔ ثابت ہوا کہ یہ نسخہ اُسی دیوان کا ہے جو وفاتِ عرفی کے بعد خانخانان کے حکم سے محمد قاسم سراج نے مدوّن کیا تھا۔ اور مآثر رحیمی کے مؤلف عبد الباقی نے اُس پر دیباچہ لکھا تھا۔ اس کا سنہ کتابت ہے ۱۰۰۰ ہجری، محب علی بن حاجی یوسف شیرازی کاتب ہے۔

خانِ خاناں کے حکم سے جو نسخہ مرتب ہوا تھا، وہ تقریباً ۱۰۲۶ھ ہجری میں مکمل ہوا۔ اس طرح میر النسخہ اصل دیوان کی ترتیب سے چوالیس (۴۴) برس بعد لکھا گیا، جو بہت زمانہ نہیں ہے۔ خط، کاغذ اور نقاشی کے لحاظ سے یہ نسخہ اس عہد کی قلمی کتابوں کا ایک عمدہ نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ اوسط تقطیع پر باریک قلم سے لکھا ہوا ہے۔ جو صفحہ پورا لکھا ہے اُس میں ۱۶ سطریں ہیں حجم ۲۴۴ صفحات کا ہے۔ قصائد کے چند صفحات درمیان میں معدوم ہیں۔ ترتیب کلام حسبِ ذیل ہے:-

دیباچہ عبد الباقی[1]	۱۵ صفحہ	رسالہ نفسیہ[2]	۱۳ صفحہ	مثنوی مجمع الابکار[3]	۵۰ صفحہ
مثنوی فرہاد و شیریں[4]	۲۷ صفحہ	قصائد[5]	۶۲ عدد	ترکیب بند[6]	ایک
ترجیع بند[7]	ایک	قطعات[8]	۳۲ عدد	ساقی نامہ[9]	ایک
غزلیات[10]	۵۱۹	رباعیات[11]	۲۳۲	(جن میں بعض ناقص ہیں)	

کل تعدادِ اشعار ۸۱۱۲ ہے۔ اصل دیوان میں ۱۴۰۰۰ اشعار تھے۔ اس طرح عرفی کے چھ ہزار شعر چند ہی سال میں پھر معدوم ہو گئے۔ چھ ہزار کا دیوان اُس کی زندگی میں تلف ہو چکا تھا جس کے افسوس میں اُس نے کہا تھا۔

رصدِ شمعِ ہنر چوں نشود محو کہ من
شش ہزار آیتِ احکامِ ہنر باختہ ام

دیباچہ میں عبد الباقی نے لکھا ہے کہ "عرفی نے وفات کے وقت اپنے مسودات کا پریشان مجموعہ خانِ خاناں کے پاس اس التماس کے ساتھ بھجوا دیا تھا کہ مدون کرا دیا جائے۔ یہ اوراق عرصہ تک خانِ خاناں کے کتاب خانہ میں (جو "کتب خانۂ اہل عرفان" تھا) محفوظ رہے۔ اور مختلف موانع کی وجہ سے خاناں کو اُن کی طرف توجہ کرنے کی مہلت نہ ملی۔ آخر ۱۰۲۴ھ ہجری میں۔ عرفی کی وفات کے پچیس برس بعد۔ عرفی کے حقوق یاد آئے۔ اور "اس مربی کمال و اہلِ کمال" نے محمد قاسم۔ خلفِ خواجہ محمد علی اصفہانی کو جو سراجا کے لقب سے مشہور تھا حکم دیا کہ مسوداتِ مذکورہ کی تدوین کرے۔ سراجا کی تعریف عبد الباقی نے ان الفاظ میں کی ہے۔ "از آدمی زادگانِ اصفہان است" ڈیڑھ برس کی سخت محنت کے بعد اُس نے

دیوان ترتیب دیا - اس دیوان میں قصیدہ، غزل، رباعی، قطعہ، مثنوی، ترکیب بند اور ترجیع بند کے چودہ ہزار شعر تھے - عبدالباقی نے ترتیب و مقابلہ کے زمانہ میں مسودات کو دیکھا تھا - اُس کا بیان ہے کہ نہایت ابتر تھے - اسی بنیاد پر سراجا کی محنت کی داد ان الفاظ میں دی ہے "الحق دریں کار ید بیضا نمود"۔ بعد ترتیب سراجا نے یہ مجموعہ خانخانان کے ملاحظہ میں بمقام برہان پور (خاندیس) پیش کیا - اُس وقت عبدالباقی بھی "حواشی نشینان بزم فیاض" میں سے تھا - خانخانان نے دیکھ کر پسند کیا اور انواع و اقسام کے صلے اور انعام دے کر سراجا کی عزت افزائی کی - یہ نسخہ خانخانان کے کتاب خانہ میں رکھا گیا - اہلِ استعداد کو نقل کا شوق ہوا تو وہیں سے نقلیں حاصل کیں - اس عہد میں "مستعدانِ ہندوستان" کے نزدیک جو نسخہ معتبر تھا وہ اسی نسخہ کی نقل تھی - (انتہیٰ خلاصۃً)۔

عرفی کے واقعات حسب ذیل اس دیباچہ سے معلوم ہوتے ہیں :-

عرفی کا نام خواجہ سیدی محمد تھا - باپ کا نام خواجہ زین الدین علی شیرازی - اُس کا خاندان ولایت فارس میں صاحبِ قدر و منزلت تھا - خواجہ زین الدین علی عہدہائے "پیشوائے حرسہ شیراز" اور "وزیر داروغہ شہر" پر ممتاز رہا - اسی زمانہ میں عرفی نے "بعض مقدماتِ علمی" حاصل کیے اور "حیثیات عالیہ"۔ خط منح خوب لکھتا تھا - فنِ موسیقی میں دخل تھا - اسی دوران میں شعرا کی ہمنشینی کا شوق پیدا ہوا - اور شعر و شاعری کے میدان میں قدم رکھا - چونکہ اُس کے والد وزیر داروغہ شہر تھے اس لئے شرعی و عرفی کی مناسبت پر لحاظ کر کے عرفی تخلص پسند کیا - دارالافاضل شیراز کے موزوں طبعوں کی صحبت میں تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ عرفی کے جوہر چمک اٹھے - اور اشعار آبدار سامعہ افروز ہونے لگے - چونکہ طبیعت ایجاد پسند پائی تھی اس لئے تازہ گوئی کے میدان میں اُتر آیا - اب اُس کو ایک اُستاد و مرشد درکار تھا جو شیراز میں نہ تھا اسی اثنا میں اُس نے ہندوستان کی سخن سنجی و نکتہ دانی کا غلغلہ سنا اور اُسی کے ساتھ اس کو یہ بھی معلوم ہوا کہ شکیبی اصفہانی، نظیری نیشاپوری، انیسی، شریعت کاشی، کامی سبزواری، بقائی خراسانی، محوی، غنی ہمدانی اور اور مستعدان روزگار کے جوہر خانخانان کے دربار میں جلا پا کر عالم افروز ہو رہے ہیں - اور سپہ سالار کی خدمت میں جس طرح ان نکتہ دانوں نے تربیت پائی تھی اُس کی حقیقت بھی منکشف

ہوئی- یہ حالات سُن کر عرفی نے ہندوستان آنے اور خان خانان کی ہمنشینی سے فیض حاصل کرنے کا قصد مصمم کر لیا اور اسی شوق میں وارد ہندوستان ہوا اول چند روز حکیم ابو الفتح گیلانی کی خدمت میں رہا- اس زمانہ میں حکیم ابو الفتح کی بزم ادب حسین ثنائی، سید محمد نجفی حیاتی گیلانی اور بہت سے اور شعرائے نامی سے آراستہ تھی- عرفی نے اس انجمن میں اپنی قادر الکلامی کا سکہ بٹھا دیا- اور صدر نشین سے لیکر ارکان تک سب نے اُس کے کلام کو پسند کیا- اسی عرصہ میں اُس کی ملاقات فیضی سے ہوئی- جو شاہزادوں کا اُستاد اور بادشاہ کا مقرب تھا- اُس کو بھی عرفی کی طرز جدید مرغوب ہوئی- ان منازل کو طے کرتا ہوا عرفی خان خانان کی بارگاہ میں باریاب ہوا اور اس بزم گرامی کے شعرائے نامور کی صحبت سے فیض یاب- خان خانان نے عرفی کی پوری قدر کی- چنانچہ معمولی آداب اور کورنش سے اُس کی باریابی مستثنیٰ تھی اور مجالس میں نشست بالاتر- اس زمانہ میں عرفی کا میلانِ طبع کلام عاشقانہ عارفانہ کی طرف رہا- اور اُسی میں ترقی کرتا رہا- نہایت بلند ہمت اور عالی فطرت تھا- اور اہلِ زمانہ بلند ہمتی اور حُسن کلام کی وجہ سے اُس کا اعزاز کرتے تھے- ۹۹۹ ہجری میں بمقام لاہور رحلت کی- کسی نے تاریخ کہی "استاد البشر" لاہور ہی میں دفن ہوا- ۱۰۲۸ ہجری میں میر صابر اصفہانی نے اُس کی لاش نجفِ اشرف میں لیجا کر دفن کر دی- یہ اُس حُسنِ عقیدت کا صلہ تھا جس کا ظہور اس شعر میں ہوا ؎

بکاوشِ مژہ از گور تا نجف بروم
اگر بہ ہند بخاکم کنند وگر بہ تتار (انتہیٰ خلاصتہً)

عجیب اتفاق ہے- تقریباً ۱۰۲۶ ہجری میں عرفی کا کلیات مرتب ہوا ۱۰۲۸ ہجری میں اُس کے جسم نے بھی ہندوستان کو خیرباد کہدی- گویا وہ اس انتظار میں تھا کہ اُس کا ادبی کارنامہ پایۂ تکمیل کو پہنچ لے تو وہ اس سرزمین سے قطع تعلق کرلے-

عرفی کا اندازِ سخن

مؤلفِ دیباچہ عبد الباقی نے مختلف ادوار کے طرزِ سخن سے بحث کی ہے- لکھتا ہے کہ شعراء کے طبقہ میں عنصری، رودکی وغیرہ نے کوس اُستادی بجایا- اس طبقے کے بعد سلسلۂ بیان مولانا نظامی اور امیر خسرو تک پہنچا دیا ہے- اس طبقے کے بعد اور اساتذہ ہوئے-

یہاں تک کہ "بادشاہ دانا دلِ سخن شناس" سلطان حسین مرزا فرمانروائے ہرات کا زمانہ آیا۔ اس عہد کے اساتذہ مولانا جامی۔ میر علی شیر نوائی۔ بابا فغانی۔ اہلی شیرازی۔ لگسی۔ خواجہ آصفی۔ اور میر شاہی نے اندازِ کلام میں ایک گونہ جدت پیدا کر کے ایسی طرز ایجاد کی جو روشِ متقدمین سے متجاوز اور اس عہد کے مستعدوں کی طرز سے ملتی جلتی ہے۔ واضح ہو کہ اس موقع پر دیباچہ نگار نے خلطِ مبحث کر دیا ہے در اصل تجدیدِ روش کا سہرا فغانی کے سر ہے۔ باقی جن اساتذہ کا نام لیا گیا ہے اُن کی طرز عرفی وغیرہ کے کلام سے بالکل جدا و متغائر تھی۔ بابر خواجہ آصفی کے کلام کی بے نمکی سے سخت نالاں ہے) اس طرز کو اہلِ ذوق نے پسند کیا اور طرزِ قدما طاق و صندوق میں آرام گزیں ہوگئی۔ اس طبقہ کے بعد ایک اور طبقہ بزمِ سخن میں آیا۔ مثلاً مرزا اشرف جہاں لسانی۔ شریف تبریزی۔ محتشم کاشی۔ وحشی یافقی۔ ان استادوں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ اور انداز متاخرین سے قریب تر آگئے۔ اب نوبت مرزا علی قلی میلی۔ خواجہ حسین ثنائی۔ ولی دشت بیاضی۔ ملک قمی۔ مرزا حسابی۔ نظیری۔ عرفی وغیرہ شعرائے بلادِ خراسان کی آئی۔ یہ طبقہ یکسر طرز متقدمین سے منکر ہوگیا۔ خواجہ حسین ثنائی نے سب سے زیادہ طرز تازہ میں کام زنی کی۔ تمام ایران اس طرز کا دلدادہ ہوگیا۔ اور اس طبقہ کے اشعار کو سفینۂ سینہ میں ثبت کر لیا۔ جو کلام اُن کی زبان سے نکلتا تھا بادِ صبا کی طرح ایران کے اس سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ جاتا تھا مولانا عرفی کا دور آیا تو اُنہوں نے طرز متقدمین و متاخرین دونوں کو منسوخ کر کے وہ طرز اختیار کی جس کے سننے سے گوشِ اہلِ ہوش مخزنِ دُرِ عدن بن گئے۔ اور وہ اندازِ سخن رائج ہوگیا جس کا سکہ اب ربع مسکوں میں رواں ہے۔ ہندوستان میں فیضی نے اور ایران میں حکیم رکنائی مسیحی، حکیم شفائی، شانی تکلو نے اپنی اپنی طرز کو طرزِ عرفی سے آشنا کر دیا۔ اس طرز میں عرفی سے پہلے کسی نے استقلال پیدا نہیں کیا تھا۔ ابتداءً عرفی کی جدت طرازی کو نہ صرف لوگوں نے ناپسند کیا تھا بلکہ اُس پر اعتراض کرتے تھے۔ خان خاناں کی تربیت و سرپرستی نے اُس کا سکہ سارے عالم کے دلوں پر بٹھا دیا۔ "ایں چراغ از فکرتِ طبع او افروخت۔ وایں نامِ نامی بدولتِ تربیت و اصلاحِ ایشاں بہم رسانید۔"

رسالہ نفسیہ

عبدالباقی کے دیباچہ کے بعد کلیات عرفی شروع ہوتا ہے۔ اول رسالہ نفسیہ ہے۔

"اے نفس" "اے نفس" کہہ کر نفس کو نصیحتیں کی ہیں۔ فرصت کو غنیمت سمجھنے، ریا و مکر و خود پسندی سے بچنے، ہمت کو بلند رکھنے، معرفتِ الٰہی خالصاً لوجہ اللہ حاصل کرنے۔ وغیرہ مطالب کی تاکید و تشویق پر زور الفاظ میں ہے۔

مثنوی رسالۂ بالا کے بعد دو مثنویاں ہیں۔ ایک مجمع الابکار مولانا نظامی کی "مخزن الاسرار" کے جواب میں۔ مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ یہ چھپ گئی ہے۔ دوسری فرہاد و شیریں بجواب شیریں خسرو مولانا نے لکھا ہے کہ آتشکدہ اور مجمع الفصحا میں اس کے اشعار نقل کئے ہیں۔ حق یہ ہے کہ یہ چھوٹی سی مثنوی عرفی کی شیوا بیانی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ گرمیِ سخن ملاحظہ ہو ؎

خداوندا۔ دلم بے نور تنگ است — دلِ من سنگ و کوہ طور سنگ است
دلم را غوطہ دہ در چشمۂ نور — تجلی کن کہ موسیٰ ہست در طور
دگر۔ زیں ناسزا دل۔ عار داری — کرم بسیار و دل بسیار داری
دلے دہ۔ چوں محبت۔ پاکدامان — دلے۔ پاکیزہ گوہر تر۔ ز ایماں
دلے۔ مرہم گداز۔ آرام نشناس — لبش مست مکید نہائے الماس
دلے۔ ریشے۔ کہ وقت کاوش نیش — نہ او از نیش۔ نیش از وے شود ریش
برافروز آتشے در سینۂ من — کہ سوز و راحتِ دیرینۂ من
در آں آتش فگن جانِ ہراوش — ولیکن شو پناہِ فرش تا عرش
بر دنم ز آتشِ دل۔ دار در تب — ق — درو ں۔ بحرے کن از آتش لبالب
در آں بحر لبالب ز آتشِ تیز — ۲ — چناں طوفانِ بے تابی برانگیز
کہ ہنگام ہجوم موج بر موج — ۳ — حضیضش مضطرب تر باشد از اوج
بنوشاں چہرہ ام را خلعتِ زرد — ق — بنوشاں سینہ ام را شربت درد
چہ شربت! آبِ کوثر آمنت او — ۲ — گلو سوزِ محبت لذتِ او

قصائد قصیدے تعداد میں چھیاسٹھ ہیں۔ مطبوعہ نسخہ (مدراس ۱۲۶۶ ہجری) میں باون ہیں۔ اس طرح قلمی نسخہ میں چودہ قصیدے زائد ہیں۔ ان میں سے بعض ناتمام ہیں۔ قصائد کے بعض ورق

بھی درمیان میں سے تلف ہوگئے ہیں - مگر معلوم ہوتا ہے زیادہ نہیں -

غزلیات

غزلیں ۵۱۹ ہیں - مطبوعہ نسخہ مدراس میں ایک غزل بھی نہیں ہے[1] - عرفی کی اصل سحر آفرینی غزل میں ہے - نمونہ ملاحظہ ہو ؎

گفتگوے غمِ یعقوب بود پیشۂ ما — بوے پیراہنِ یوسف بود اندیشۂ ما

اندر آں بیشہ - کہ با شیر و شیم آفت نیست — روبہ - از بیجگری - رم کند از بیشۂ ما

کوہکن صنعتِ ما داشت و لے خرق بسے — قوتِ بازوے دل - می طلبد - تیشۂ ما

در دلِ ما - غمِ دنیا - غمِ معشوق شود — بادہ گر خام بود - پختہ کند شیشۂ ما

عرفی افسانہ تراشی بخموشی بفروخت — للہ الحمد - کہ آزاد شد از پیشۂ ما

دیگر

مرو بہ بادیہ گردی - کہ زرق و شیدائی است — برہنگی مطلب - کاں لباسِ رعنائی است

زباں ببند - و نظر باز کن - کہ - منعِ کلیم — کنایت از ادب آموزئ تقاضائی است

دماغِ یوسف اگر تر کنند - کف ببرد — ازاں شراب - کہ در ساغرِ تماشائی است

نقاب می کشد اے دل - تمام حوصلہ شو — کہ باز وقتِ شراب کرشمہ پیمائی است

چنیں کہ بردم تمشیر و دشنہ می غلطم — حسو درا رسد - ار گویدم کہ "ہر جائی است"

شہید عاطفتِ آں کرشمہ ام - کہ بہر — تمام نقش طرازی و مشہد آرائی است

بشوقِ دوست چہ سازم ؟ کہ در شریعتِ عشق — خیال بے ادبی و نگاہ رسوائی است

مگو "کہ نیست گنہگار تر ز من" عرفی — کہ - ایں حدیثِ گرانمایہ - لافِ یکتائی است

دیگر

مرا - ز غمکدۂ سینہ - داغ می روید — ز بزمگاہ محبت - چراغ می روید

تو پائے کعبہ رو - آمادہ کن - کہ در ہر گام — ہزار خضر - براہ سراغ می روید

---

[1] نسخہ مطبوعہ مطبع منشی نولکشور لکھنؤ سنہ ۱۲۹۷ھ میں ۴۲۲ غزلیں ہیں جن کے اشعار کی تعداد ۳۰۲۵ ہے - قلمی نسخے میں ۹۶ غزلیں زیادہ ہیں -

بہشت۔کو۔کہ۔ تماشا کند کہ حسنِ ترا — زباغ لالہ و از لالہ باغ میروید
صبح گو گہر آفتاب را مفروشش — کہ از خرابۂ ما۔ شب چراغ میروید
نسیم باغ کہ بر مغز۔ آستیں افشاند — کہ روضہ روضہ۔ گُلم از دماغ میروید
مگر۔ ترانۂ عُرفی کسے بہ گلشن بُرد — کہ بانگِ درد ز دستانِ زاغ میروید

دیگر

نفسے کہ غمزۂ او بہ صفِ بلا نشستہ — بہ ہوائے دل۔ مسیحا بہ رہِ فنا نشستہ
چو رہی بہ تربتِ ما۔ مفشاں نیاز دامن — کہ غبار درد و حسرت بمزار ما نشستہ
شود آشکار فردا۔ کہ براہِ وعدۂ او — ز غمِ بہشت و دوزخ دو جہاں جدا نشستہ
ز رہِ وفا دریں کو کہ گزشتہ دامن افشاں — کہ غبارِ کوچۂ ما بر توتیا نشستہ
روم از جہانِ شادم کہ۔ براہ۔ تا قیامت — ز خیالِ غمزۂ او۔ خشمِ بلا نشستہ
ز دعا چہ کام جویم کہ میانِ تنگدستاں — بہزار نا امیدی۔ اثرِ دعا نشستہ
تو بہ بزمِ عیش۔ عُرفی۔ من و کوچۂ۔ کہ ہر سُو — سرِ خوں چکاں فتادہ دلِ بینوا نشستہ

یہ غزل حضرت امیر خسرو کی طرح پر ہے۔ اُن کا مطلع ملاحظہ ہو۔ دوسرے مصرع میں ندرت تشبیہ قابلِ داد ہے ؎

بحوالیِ دو چشمش حشمِ بلا نشستہ
چو قبیلہ۔ گردِ لیلیٰ ہمہ جا بجا نشستہ

رُباعی

رفتم بہ جنازۂ کسے تن۔ کہ فسُرد — صد سال زباغ عیش گل چید و بمُرد
گفتم۔ چہ بروں بُردی ازیں باغ و بہار؟ — گفتا "دلِ پُر خوں۔ و تو ہم خواہی بُرد"

دیگر

نگاہ ہوس افروز غنیمت بینم — گہ مضطرب از بیم جہیمت بینم
با دوست در آویز و بیاسا تا چند — بازیچۂ دستِ ہزیمت بینم

دیگر

جدے - کہ گستنِ نفس نزدیک است — فریادے کن کہ دادرس نزدیک است
گر قافلہ بگزشت - قدم سست مکن — بشتاب - کہ آوازِ جرس نزدیک است

دیگر

جمعے بہ درت گریہ و آہ آوردند — جمعے ہمہ دیدند و نگاہ آوردند
جمعے دیدند - خواہشِ عفوت را — رفتند - و جہاں جہاں گناہ آوردند

شوخ چشمی معاف - مصرع اول میں "خواہش" کی جگہ "عالم" ہوتا تو کیا خوب ہوتا - جناب باری عزاسمہ کے لئے خواہش کا لفظ مناسب نہیں معلوم ہوتا پھر "جہاں جہاں" کے لئے عالم کس قدر مناسب و موزوں ہے۔

حال میں طاہر نصیر آبادی کا تذکرۂ نایاب دستیاب ہوا - واغستانی اور میر آزاد بلگرامی نے اکثر اس تذکرے کا حوالہ دیا ہے - طاہر نے (جو نظیری و عرفی کا ہم عصر ہے) معاصرین کا تذکرہ لکھا ہے۔ اس لئے واقعات کے لحاظ سے خاص پایہ رکھتا ہے - عرفی کے حال میں لکھا ہے "صفائے ذہن" اور "ذکائے طبع سلیم" میں تمام شعرائے فارس و خراسان سے ممتاز تھا - غیرتی - قیدی - قدری کے ہم صحبتوں میں سے تھا - اس کی ابتدائی عمر شیراز میں گزری - آغازِ کار میں شعرا اور علماء کی صحبت میں مباحثہ اور مناظرہ کے موقعے اس کو ملے اور قوانینِ شعر میں مہارت حاصل کی اور حل و عقد نظم اور فنون سخن سے زائد وصف آگاہی سنہ ۹۹۲ ہجری میں ہندوستان روانہ ہوا (گویا ۲۹ برس کی عمر میں ہندوستان آگیا) جن لوگوں نے اسے دیکھا ہے ان کا بیان ہے کہ خوش طبع - ظرافت دوست تھا باوجود دعوئے شاعری کے معاصرین سے ملاقات کے وقت خوش طبعی کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتا تھا۔ (اس تعدیل سے "کم بینی" اور "غرور" کی جرح کی تلخی کم ہو جاتی ہے) امید ہے کہ رفتہ رفتہ سلامت نفس بھی پیدا کر لے گا - اس لئے کہ "طبعِ مستقیم" کو "نفسِ سلیم" درکار ہے - طاہر نے "گویند" کر کے عرفی کی تاریخ وفات سنہ ۱۰۰۲ ہجری لکھی ہے - جو صحیح نہیں۔

لکھا ہے کہ مرض موت میں یہ دو رباعیاں زبان پر تھیں ؎

(۱)

اے مرگ - مرا ز یار شرمندہ مکن | نومیدم ازاں گوہر ارزندہ مکن
یار آید و جاں رود - خدایا نفسے | مہلت دہ و در قیامتم زندہ مکن

(۲)

عرفی - دم نزع ست و ہماں مستی - تو | آیا بہ چہ مایہ؟ - بار بستی - تو
فرداست کہ دوست نقد فروش بہ کف | جویائے متاع ست و تہیدستی - تو

دوسری رباعی کا جواب مرزا یوسف خاں مشہدی نے دیا ہے

عرفی! رفتی - بدوست پیوستی تو | وز کشمکشِ زمانہ وارستی تو
آنجا - غمِ دوست - مایہ دست تہی ست | خوش باش - کزیں مایہ - قوی دستی تو

اول رباعی میں دیکھو کہ ایک دم کے مشاہدۂ جمال پر عمر ابد کو قربان کر گیا - دوسرا پہلو نہیں چاہتا کہ دم آخر جو مشاہدۂ جمال کی نعمت حاصل ہوئی اُس کے سُرور میں ہنگامۂ قیامت خلل انداز ہو[1]۔

نگاہ روبرو - واقعات ختم ہوئے - افسانہ نہیں - واقعات - واقعات کے نتائج پر غور ہمیشہ سبق آموز ہے آج "تعلیم و تربیت" بچہ بچہ کی زبان پر ہے اور گردنِ غرور کی بلندی حقیقت کے مشاہدے سے معذور کر چکی ہے انصاف سے دیکھو کہ آج کوئی تربیت گاہ ایسی ہے جہاں عرفی کی قابلیت کے ادیب پیدا ہوں - نہ کہنا کہ عرفی کی کیا ضرورت ہے بیسیوں یونیورسٹیاں آج بھی خاقانی - و عرفی کا کلام پڑھا رہی ہیں عرفی و خاقانی درکنار - اُن کے کلام کے اہل ذوق سمجھنے والے بھی پیدا نہیں کر سکتیں - مانو گے کہ عرفی کا مربی فن خان خاناں تھا - جو جواہر ایران نہ چمکا سکا بلکہ جن جوہروں کی آبداری سے ایرانیوں کی آنکھیں خیرگی کرتی تھیں وہ ہندوستان کے ایک امیر کے دیوان خانے میں آکر اس آب و تاب سے چمکے

---

[1] قیامت میں دوبارہ زندہ کیا جانا بھی ایک بڑی طولانی زندگی ہے عرفی اب مرتے وقت محض دیدار یار کی خاطر ذرا سی مہلت مانگتا ہے اور اس مہلت کے معاوضہ میں وہ دوسری زندگی جو قیامت میں ملنے والی ہے دے دینے کو تیار ہے مطلب یہ ہے کہ اے پروردگار مجھے اس وقت ذرا سی مہلت دیدے کہ دیدار یار کر لوں اور اس مہلت کا معاوضہ میں یہ دیتا ہوں کہ قیامت میں تو مجھے دوسری بار زندہ نہ کرنا۔
معین الدین

کہ ایک عالم روشن ہوگیا۔ خانؔ خانان میدان میں ایک فاتح ہے، اپنے وقت کا بہترین سپہ سالار۔ بزم میں ایک اولوالعزم، فیاض مربیِ علم وفن۔ امیر ابن امیر۔ اس بوقلمونی کو دیکھو۔ تلوار اور قلم۔ دونوں جوہر یہ ہیں۔ کلام پڑھو ندرت میں ممتاز ہے ؎

بہ سنگ رخنہ شد از بس گریستیم بے تو
ز سنگ سخت ترم بس کہ زیستیم بے تو

دیگر

بہ کیشِ مہر و وفا حرفِ عہد بیکار است
نگاہِ اہلِ محبت۔ تمام سوگند است

ہمہ گیری ملاحظہ ہو۔ ایک طرف عرفیؔ و نظیریؔ اور بہت سے ایرانی شعرا فیضِ تربیت سے مدارج ترقی حاصل کر رہے ہیں۔ دوسری طرف بھاشا کے کیشر اصلاح لے رہے ہیں۔ بھاشا کا ادب ترقی پا رہا ہے۔ جن لوگوں نے بھاشا کے علم ادب کی تاریخ لکھی ہے اس کا ایک دور خان خانان کے زیر تربیت قائم کیا ہے۔ تیسری طرف واقعات بابری کا ترجمہ ترکی سے فارسی میں ہو رہا ہے۔ یہ زمانہ تو کمالاتِ انسانی کی معراج کا ہے۔ میری تنگ اور محدود معلومات میں قابل شکر اضافہ ہو اگر ان حیثیات کا جامع زندہ انسان بتایا جائے جو خانؔ خانان میں جمع تھیں۔

طلسم کدۂ حیرت ہنوز ختم نہیں ہوا۔ عرفیؔ و نظیریؔ کے کمال کا مربّی (یعنی خان خانان خود) کس کے دامنِ تربیت میں پلا تھا؟ جلال الدین اکبر کے جو اُمّیِ محض تھا۔ بیرم خاں، عبدالرحیم (خان خانان) کو چار برس کا چھوڑ کر اس عالم سے راہی ہوا تھا۔ تاریخ دیکھو۔ اکبر نے دشمن کی یادگار کو دریا میں شامل کر کے اپنی نگاہ کے سامنے پرورش کیا۔ سترہ برس کی عمر میں پہلے معرکۂ جنگ میں سرخرو ہوا۔ اکبر کی تربیت نے علم و ہنر کے جو دریا بہائے تاریخ فارسی تو اس سے بے بہرہ نہیں۔ مگر حریفوں نے ایک سبق ہم کو یاد کرا دیا ہے "اکبر مسلمان نہ تھا اس لئے ملک نے ترقی کی"۔ مسلمانوں کی تاریخ اس قدر مردم خیز ہے کہ اس میں نہ اکبر عجیب ہے، نہ خانؔ خانان۔ مگر عجیب امر یہ ہے کہ مسلمان اپنی ہی تاریخ

ے سب سے زیادہ بدگمان ہیں۔ وجہ، جہل ولا علمی۔ فاعتبروا یا اولی الابصار فقط

(رسالہ معارف اعظم گڑھ بابتہ ماہ نومبر ۱۹۲۲ء)

(۲) دیوان طالب آملی

طالب آملی۔ دربار جہانگیری کا ملک الشعرا تھا۔ اس کا کلام عام طور پر نایاب ہے۔ مجھ کو دیوان طالب کے دو نسخے ملے۔ ایک ابتدا میں دلّی سے[۱] یہ نسخہ معمولی خط کا بہت غلط ہے۔ مگر اکثر جگہ غلطی سمجھ میں آجاتی ہے۔ کثرت کلام کے لحاظ سے قابلِ قدر ہے۔

دوسرا نسخہ لکھنؤ سے دستیاب ہوا۔ اہتمام تحریر کے لحاظ سے نادر ہے۔ میں بہت اس کی قدر کرتا تھا۔ مرحوم علامہ شبلی نے طلب فرماکر عرصہ تک زیر مطالعہ رکھا۔ ان کی جوہر شناس نظر نے اس کا خاص جوہر پرکھا۔ ع   قدر جوہر شاہ داند یا بداند جوہری

واپس فرمایا تو لکھا۔ "کہ یہ نسخہ خود طالب آملی کی تحریروں سے مزین ہے"۔ میں نے بھی اسی خیال سے دیکھا تو علامہ کی رائے کو صحیح پایا۔ دلائل حسب ذیل ہیں :۔

اس نسخہ کے کاتب نے اپنا نام میرزا جان اجمیری لکھا ہے۔ سنہ کتابت نہیں لکھا۔ عموماً قصائد وغیرہ کے عنوان اصل کاتب نے نہیں لکھے۔ جا بجا خصوصاً غیر مانوس ردیفوں کے موقع پر متن میں ایک غزل دو غزل کے انداز سے بیاض چھوٹی ہوئی ہے۔ اصل کاتب کی تحریر باستثنائے آخر کی چند رباعیوں کے پختہ نستعلیق ہے۔ جو عنوان قصائد کے خالی ہیں ان کے عنوان۔ بعض رباعیوں کے عنوان ان بیاضوں میں (جو اصل کاتب نے چھوڑیں) بعض غزلیں ایک اور قلم کی لکھی ہوئی ہیں جو اصل کاتب کے قلم سے صاف طور پر ممتاز ہے۔ قصائد کے عنوان اس نہج سے لکھے گئے ہیں کہ یہ واضح ہوتا ہے کہ کاتب ممدوح کا ہم عصر اور متوسل ہے۔ مثلاً "طالب" کے مربی میرزا غازی ترخان (امیر جہانگیری) کی شان میں جو قصائد ہیں ان کے عنوان میں کسی جگہ سرخ روشنائی سے تحریر ہے "در مدح مرحومی میرزا غازی ترخان"۔ ایک جگہ لکھا ہے "در مدح

---

[۱] مولوی سلیم الدین خاں مرحوم تاجر کتب قلمی سے خریدا۔ غفرلہ شروانی

نواب مرحومی غازی ترخان"۔ جہانگیر بادشاہ کی مدح کے ایک قصیدے کا عنوان ہے "در مدح حضرت ظلِ الٰہی مد اللہ ظلہٗ"۔ ایک اور قصیدے کا عنوان "بمدح مدظلہٗ" اعتماد الدولہ وزیرِ جہانگیر۔ طالب کا رشتہ دار تھا۔ کی مدح کے قصیدے کا عنوان ہے "در مدح نواب قبلہ گاہی ام اعتماد الدولۃ العلیتہ مدظلہٗ"۔ دوسرے قصیدہ کا عنوان ہے "بمدحہ مدظلہٗ"۔ نور جہاں کے ایک مدحیہ قصیدے کا عنوان ہے "در مدح مہد علیا نور محل بیگم گفتہ شد"۔ علیٰ ہذا القیاس۔ ان عنوانوں سے معاصرت اور تعلق دونوں ثابت ہوئے ہوں گے۔ نور جہاں کی مدح کے قصیدے کا عنوان اُس وقت لکھا گیا جب کہ وہ نور محل تھی، نور جہاں نہوئی تھی۔ یہ تمام عبارتیں سُرخ قلم سے ایک ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں۔ ایک اور خصوصیت ہے۔ بعض ردیفوں کی تکمیل اسی قلم سے اُن بیاضوں میں ہے جو کاتب نے چھوڑ دی تھیں۔ معلوم ہوا کہ اصل کاتب کو یہ غزل نہ ملی تھی۔ یا موزوں نہ ہوئی تھی۔ اور اُس کے انتظار میں یہ بیاض چھوڑ دی گئی تھی۔ اسی قلم سے جا بجا اصلاحیں ہیں۔ اصلاح کی بحث تفصیل سے آگے آتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خط و قلم کس کا ہے۔ جواب قطعی یہ ہے کہ "خود طالب آملی کا" کیوں؟ اس وجہ سے کہ حاشیہ پر جا بجا متن ہیں۔ اسی قلم کا لکھا ہوا "طالب" کا کلام ہے جس پر لکھا ہے۔ نیز "لراقمہ طالب" معلوم ہوا کہ قائل کلام اور راقم کلام ایک ہی ہے۔ اور یہ مانی ہوئی اصطلاح ہے۔ ان غزلوں کے مقطعوں میں لفظ "طالب" کی شانِ تحریر عموماً یہ ہے "طلب" دوسری دلیل یہ ہے کہ بہت سی اصلاحیں اسی قلم کی ایسی ہیں جو تصحیح کتابت نہیں بلکہ اصلاحِ کلام ہیں۔ معلوم ہوا کہ خود طالب نے اپنے کلام میں اصلاحیں نظرِ ثانی کے وقت کی ہیں۔ ان دلائل کی بنیاد پر یہ کہنا بجا ہے کہ یہ دیوان بطور بیاض کے خود طالب کے لئے لکھا گیا تھا جو اُس کے پاس رہا اور وقتاً فوقتاً اُس کے قلم سے فیضیاب ہوتا رہا۔ ایسے نسخہ پر ہر کتاب خانہ فخر کر سکتا ہے۔ میرے کتاب خانے کو یہ سرمایہ فخر علامہ شبلی مرحوم کی جوہر شناس نظر کے فیض سے حاصل ہوا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔ طالب کا خط پختہ شفیعہ ہے اور قلم باریک۔

اصلاحیں اصلاحیں بجائے خود سرمایۂ ندرت ہیں۔ بعض تو محض کتابت کی تصحیح ہیں۔ کہیں کاتب سے لفظ چھوٹ گیا تھا اضافہ کر دیا ہے۔ کہیں لفظ غلط لکھ گیا تھا کاٹ کر صحیح کر دیا ہے۔ کہیں

مصرعے ردّوبدل ہوگئے تھے وہاں خط کھینچ کر ایک شعر کے دونوں مصرعوں کو مربوط کر دیا ہے۔ علیٰ ہذالقیاس۔ قابلِ دید وہ اصلاحیں ہیں جو کلام میں کی گئی ہیں۔ ان اصلاحوں نے پایۂ کلام بلند سے بلند تر کر دیا ہے۔ اس سے غالب کی قوتِ طبع کا اندازہ ہوتا ہے۔

مثالاً دو چار نمونے ملاحظہ ہوں:۔

ایک قطعہ ہو جس کا قافیہ ہے۔ تاجداری۔ خاکساری۔ اُس کا ایک شعر ہے ؎

تپِ غیرتم سوخت یاراں چہ سازم
بلا ئیست در آدمی جزوِ ناری

ایک دو بار پڑھ کر دیکھئے کہ کہیں جوڑ بند ڈھیلے تو نہیں۔ اب اصلاح دیکھئے۔ مصرعہ اوّل:۔ "تپِ غیرتم در عرق دارد آرے" اندازہ کیجئے۔ گرمی کلام کس درجہ پر پہنچ گئی۔ تپ کے واسطے "عرق" مصرعہ، جوئے بلاغت میں غوطہ کھا کر نکھر گیا۔

ایک اور شعر ؎

دستِ ہوس قوی شدہ در کشورِ وجود
ترسم کہ عیش رخنہ بناموسِ غم کند

اول مصرع میں اصلاح ہوئی۔ ع "دستِ ہوس قوی شدہ بازوئے دل ضعیف" ایک بار غیر اصلاحی مصرع کو مکرر پڑھ کر اصلاح شدہ سے مقابلہ کیجئے۔ کڑی کمان کا زور محسوس ہونے لگے گا۔

تیسرا شعر ؎

چناں گداختہ جوشِ خیالِ غالب را
کہ مُو بہ مو شدہ چوں طبعِ خویشتن نازک

اصلاح میں "طبع" کا لفظ "فکر" سے بدل دیا گیا۔ نزاکتِ فکر داد طلب۔

چوتھا شعر ؎

گردید آبِ دیدۂ غالب چمن شناس
زیں پس حرام گشت بہ شبنم وضوئے گل

مصرعہ اول میں اصلاح ہوئی۔ بجائے "گردید" "شد باز"۔ اب مصرع یہ ہے۔ "شد باز آب دیدۂ طالب چمن شناس"۔ غور کیجئے۔ مضمون میں کس قدر وسعت پیدا ہوگئی۔ "گردید" سے یہ مفہوم ہوتا تھا کہ آب دیدہ اوّل مرتبہ چمن شناس ہو رہا ہے۔ اور آغاز گریہ وزاری ہے۔ "شد باز" سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ پہلے بھی یہ چشمہ رواں رہ چکا ہے۔ درمیان میں خزاں تھی تو رُک گیا تھا۔ بہار آئی تو پھر جاری ہوا۔ جب رکا ہوا تھا تو مجبوراً پھول شبنم سے وضو کرتے تھے۔ اب روانی آگئی تو دار الافتائے محبت سے فتویٰ جاری ہوا کہ "آب آمد، تیمّم برخاست" مارکثیر کے ہوتے ہوئے "اوس" سے پیاس کیوں بجھائی جائے روانیٔ آب کے لئے باز۔ للّٰہ درّہ! اگر آپ "چمن شناس"۔ "شد باز"۔ "وضوئے گل"۔ "شبنم"۔ ان الفاظ پر فرداً فرداً دوبارہ بحیثیتِ مجموعی غور کریں گے تو پورے مضمون کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجائے گی۔

اب طالب کی دو غزلیں پوری سُن لیجئے۔ اُس کے بعد طالب رخصت ہوتا ہوں۔

علامہ شبلی نے طرز طالب کی خصوصیت حسب ذیل الفاظ میں بیان فرمائی ہے۔ "ندرتِ تشبیہہ و لطفِ استعارہ"۔ میرا خیال ہے کہ "سرخوشی و نزاکت"۔ (جو دربار جہانگیر و نور جہاں کا طرۂ امتیاز تھی) کلامِ طالب کی شانِ امتیاز ہے۔ دیکھو عرفی و طالب دونوں کشمیر دیکھتے ہیں۔ اُس کی روح پرور ہوا۔ اور رنگ بہار سے متاثر ہوتے ہیں۔ دلی خیال الفاظ شعر میں تراوش کرتا ہے۔ عرفی کہتا ہے ؎

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر درآید　　　گر مرغِ کباب است کہ با بال و پر آید

طالب زمزمہ سنج ہوتا ہے ؎

فیضِ پیالہ بخشد آب و ہوائے کشمیر
از خشتِ خم نہادند گویا بنائے کشمیر

دو غزلیں سنائی تھیں۔ مضمون میں مضمون پیدا ہوگیا۔ ان غزلوں میں طالب کا اصلی رنگ صاف نمایاں ہے ؎

غزل

بہار آمد کہ گردد جسم و جاں مست　　　شود دل مست چوں بلبل زباں مست

بہار آمد کہ از بوئے گل وے | زمیں بیہوش گردد آسماں مست
چرا مستانہ می غلطد بہر سُوئے | بجز دل نیست گر آبِ رواں مست
ازاں پیمانہ - کا مد اولیں دَور | زکم ظرفی شدم از بوئے آں مست
نشد تغئیر - در کیفیتم - ہیچ | ہماں مستم ہماں مستم ہماں مست
زمانے نیست - کز گلبانگِ شوقم | نیفتد بلبلے از آشیاں مست
چو بر مستاں نہ باشد ہیچ تکلیف | چرا طالب نباشم جاوداں مست

مقطع سے اوپر کا شعر کس قدر نادر اور بلیغ ہے۔ بلبل کے مست کرنے کے واسطے جو نوا ہے وہ بھی گلبانگ ہی۔ نظیری نے بھی اس مضمون کو لیا ہی۔ مگر اپنے رنگ میں ؎

بزیر شاخِ گل - افعی گزیدہ بُلبل را | نواگرانِ نخوردہ گزند را چہ خبر

غزل

کرشمہ نازک، ولب نازک وسخن نازک | زفرق تا بقدم ہمچو طبع من نازک
کسے کہ دید بنا گوشِ اُو شبے در خواب | نیایدش بنظر برگ یاسمن نازک
بعہدِ نازکی لالہ زارِ عارضِ او | گماں مبر کہ گلے رُوید از چمن نازک
ہزار سوزنِ اشکم فرود بر مژگاں | کسے کہ بر تنِ او دوخت پیرہن نازک
فغاں - کہ از گل و آبِ صنم نمی جوشد | کرشمہ کہ شود طبع برہمن نازک
مگر ز غمزہ شیریں بہ تیشہ داد الماس | کہ لوح فتنہ تراشید کوہکن نازک
چناں گداختہ جوشِ خیال طالب را | کہ موبمو شدہ چوں فکرِ خویشتن نازک

دیکھنا - پانچویں شعر میں کتنی دور کی بات کہہ گیا - والسلام بالاکرام - فقط

(رسالہ معارف اعظم گڑھ بابتہ ماہ دسمبر ۱۹۲۲ء)

اتفاقاتِ حسنہ

(شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی ایک قلمی تحریر)

گزشتہ محرم الحرام (۱۳۴۲ھ) کی ساتویں تاریخ کو میں نے اول مرتبہ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی قدس سرہٗ العزیز کے مزار پرانوار پر فاتحہ پڑھنے کا شرف حاصل کیا۔ ۶ صفر المظفر کو صبح کے وقت تفاؤل شرعی کے طور پر دیوان حافظ دیکھا تو یہ شعر سرِ صفحہ نکلا ؎

ستارۂ بدرخشید و ماہِ مجلس شد
دلِ رمیدۂ ما را انیس و مونس شد

اسی روز دوپہر سے پہلے حضرت شیخ کی "اشعۃ اللمعات" شرح فارسی "مشکوٰۃ" کا قلمی نسخہ[1] دیدہ افروز ہوا جو آبخوردہ اور بوسیدہ ہے۔ مگر خوشخط اور اہتمام سے لکھا ہوا۔

آگے بڑھنے سے پہلے "ستارۂ بدرخشید اور ماہِ مجلس کا مقابلہ اشعۃ اللمعات اور مشکوٰۃ سے کرلو۔ نورٌ علیٰ نور۔ سرِ صفحہ کے بائیں میں یہ عبارت تحریر ہے۔ "ترجمہ مشکوٰۃ الشریف تصنیف حضرت شیخ عبدالحق قدس سرہٗ کہ در خاتمۂ کتاب دستخط حضرت شیخ درج است۔ بہ ہدیہ یک ہزار و دو صد روپیہ گرفتہ نواب صاحب قبلہ مدظلہ اللہ تعالیٰ"۔ یہ خط گھسگی کی شان لئے ہوئے ہے۔ مہریں مٹ گئی ہیں۔ اس لئے "نواب صاحب قبلہ" کون تھے معلوم نہیں ہوتا۔ آخری صفحہ کے آخر میں جو بیاض تھی اس میں حضرت شیخ کے قلم کی عبارت جلوہ افروز ہے خط صاف اور پختہ ہے۔ جملہ بارہ سطریں ہیں۔

میر غلام علی آزاد نے سبحۃ المرجان میں حضرت شیخ کی وفات سنہ ۱۰۵۲ ہجری میں لکھی ہے۔ تاریخ وفات "علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل" سے برآمد ہوتی ہے۔ علماء اور انبیاء کی "ہمزوں" کے دو عدد محسوب ہیں۔

---

[1] چند سال پہلے "مشکوٰۃ المصابیح" کا نسخہ ملا تھا جس پر شیخ نورالحق فرزند شیخ محدث کے ہاتھ کی عبارت تحریر ہے ۱۲
بعد کو معلوم ہوا کہ یہ انتساب صحیح نہیں۔ شروانی

سنہ ولادت ۹۵۸ھ ہجری ہے۔ حضرت شیخ نے ۹۴ برس کی عمر پائی۔ عبارتِ زیرِ بحث کی تحریر کے وقت سن شریف ۹۱ برس کا تھا اگر خط میں ہاتھ کی کمزوری یا نگاہ کے ضعف کا بال برابر اثر نہیں ہے!۔

کاتبِ کتاب نے اپنا نام محمد علی دہلوی لکھا ہے۔ سنہ کتابت ہندسوں میں لکھا تھا جو محکوک ہو چکے تاہم ۴ کا ہندسہ درمیان میں نگاہِ انداز دیکھ سکتی ہے۔ اس طرح ۱۰۴۰ھ تک سنہ کتابت ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ ۱۰۲۹ھ میں ختم ہوئی ہو۔ جو حضرت شیخ کی عبارت کا سال تحریر ہے۔ حاشیۂ کتاب پر حضرت شیخ کے خط سے ملتی جلتی تحریر میں اصلاحی الفاظ لکھے ہوئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نسخۂ ہذا حضرت کے مطالعہ میں رہا ہے۔ کیا عجب ہے کہ خانقاہِ قادریہ کے کتاب خانے کے لئے لکھا گیا ہو۔

چلتے چلتے قیمتِ کتاب پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔ بارہ سو روپیہ قیمت ہے۔ جامعہ عثمانیہ نے جو تاریخ ہند شائع کی ہے اس میں اعداد شمار سے ثابت کیا ہے کہ آج کا روپیہ عہد مغلیہ کے روپیہ سے قیمت میں دس گنا کم ہے۔ لہذا مخطوطہ ہذا[۵] آج کل کے حساب سے دس ہزار روپیہ قیمت کہی جاسکتی ہے مصرع "یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا"۔ اب کہ شیرازۂ جمعیت بکھر چکا ہے، یورپ اور امریکہ کے مقابلہ پر مسلمانوں سے (معارف کے شذرات میں) قدردانی کا سوال جرح، نمک بر جراحت کا کام دے جاتا ہے۔

حضرت شیخ کی عبارت یہ ہے:۔

"تمام شد تسوید ایں کتاب عشیۂ یوم الاربعاء بیست و چہارم ربیع الآخر سنہ ہزار و بیست و پنج از ہجرت سید المرسلین و خاتم النبیین صلی اللہ علیہ و علی آلہ و اصحابہ و اتباعہ اجمعین و بود ابتداء تالیف سیزدہم ذی الحجہ سنہ یک ہزار و نوزدہ۔ و بہ تحقیق در آمد درمیان مشائخ دیگر از تالیفات دیگر کہ مجموع سہ سال و کسرے باشد و تمام شد در خانقاہ قادریہ در دہلی کہ ایں بندہ خدمت میکند و را و جاروب (می کشد) می افروزد چراغ آں را۔ و بود ابتدا و ختم در یک مکان گویا در مجلس واحد تمام شد مقصود بیان توفیق الٰہی ست سبحانہ و اعطاے وے استقامت مرا و تخصیص وے تعالیٰ بندۂ مسکین را بسلامت و عافیت و الحمد للہ۔ اولاً و آخراً و ظاہراً و باطناً حررت ہذہ الاسطر علی ید مؤلفہ الفقیر الحقیر عبد الحق

۵ل قیاساً ۱۲ سے ۱۵ حرف پڑھے نہیں گئے۔ بعد کو مکرر غور سے "مجلس واحد" الفاظ پڑھے گئے، تو در اصل مضمون میں بڑھا دیے گئے۔

بن سیف الدین القادری الدہلوی البخاری ضحوۃ یوم الجمعہ ۱۰۴۹ھ سنہ الف وتسع واربعین وآخر دعوائی ان الحمد للہ رب العالمین"۔

آخر میں سوال یہ ہے کہ حاضری درگاہ۔ فرد ۂ لسان الغیب اور اس نعمت کے حاصل ہونے میں کوئی بشارتِ ارتباط ہے؟ مصرع ؎

آن کس ست اہلِ بشارت کہ اشارت داند

(رسالہ معارف اعظم گڑھ بابتہ ماہ اکتوبر ۱۹۲۳ء)

مکرر:۔ یہ نسخہ اس حالت میں ہاتھ آیا تھا کہ آب رسیدگی سے تمام اوراق چسپیدہ ہو کر کتاب ایک تودۂ کاغذ بن کر رہ گئی تھی۔ کوئی ورق جدا نہ تھا آخیر ورق کا نصف حصہ جس پر حضرت شیخ کی تحریر تھی بصد دشواری جدا کر کے عبارت پڑھی گئی تھی۔

کتاب خانہ آصفیہ حیدر آباد کے نوجوان صحاف غلام حسین مرحوم نے اُن تمام اوراق کو نہایت صفائی سے علٰحدہ کیا۔ اور عہد جہانگیری کے نمونے کی جلد باندھ دی۔ میں نے اوراق کی علٰحدگی پر حیرت ظاہر کی تو کہا بہت آسانی سے کھل جاتے ہیں۔ دیگچی میں پانی بھر کر آگ پر خوب جوش دیا جائے۔ اُس کے منہ پر باریک کپڑا ڈھک کر کتاب کپڑے پر رکھدی جائے۔ بخارات نفوذ کر کے رطوبت پہنچاتے ہیں اور ورق اس کے اثر سے علٰحدہ ہو جاتے ہیں۔ غفرلہ

حبیب الرحمٰن

۱۳ ربیع الاول ۱۳۶۱ھ (مطابق ۳۱ مارچ ۱۹۴۲ء)

تذکرۂ مخزن الغرائب

ملا احمد علی ہاشمی سندیلہ کے باشندے گزشتہ صدی ہجری کی ابتدا کے فارسی اہلِ قلم میں سے ہیں۔ میرزا قتیل کے شاگرد تھے۔ خادم تخلص تھا۔ انھوں نے فارسی کے شعرا کا ایک ضخیم اور حجیم تذکرہ لکھا ہے۔ تین ہزار سے زائد شعرا کا کلام اور حال ہے۔ سنہ ۱۲۱۸ ہجری میں ختم ہوا "ختم صحف" تاریخ اختتام ہے۔ حال میں ایک عزیز کے ہاتھ آیا ہے۔ خریداری لطیفہ ہے۔ گفت وشنود کے بعد فی شاعر ایک پیسہ قیمت ٹھری۔ اس شرح سے

کتاب تو چونّی روپے کی ہو گئی۔ مگر شاعر بیچارے "پیسہ اخبار" کے اسٹاف میں بھرتی ہو گئے۔

آمدم برسر مطلب:۔ تذکرہ میں ذکر اور انتخاب تو معمولی ہے۔ معاصرین کے حالات البتہ وقیع ہیں۔ اُس عہد کے علم و فن کا ذکر ہو، اور دہلی مرحوم کی یاد تازہ نہ ہو، ممکن نہیں۔ ملّا احمد علی، نواب ذوالفقار الدولہ نجف خاں کی سرکار میں ملازم تھے۔ وہاں اہل کمال کا مجمع تھا۔ ان کو بھی استفادہ کا موقع ملا۔ اسی فیض صحبت کا نتیجہ یہ تذکرہ ہے۔

سرسری مطالعہ میں انشاء اللہ خاں۔ انشا کا حال نظر سے گزرا۔ حالات گرانقدر محسوس ہوئے آبحیات سے مقابلہ کیا۔ بعض واقعات کے لحاظ سے ظلمات اور نور کا فرق معلوم ہوا۔ ہدیۂ اہلِ نظر ہیں:۔

انشا۔ مخیر الدولہ حکیم ماشاء اللہ جعفری کے بیٹے تھے۔ نجفی الاصل۔ اُن کے والد نور اللہ نجفی۔ ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ درویش منش تھے۔ ماشاء اللہ خاں نے دنیا کا جاہ و جلال پیدا کیا۔ طب میں کمال حاصل کرکے بنگالہ میں معرکہ کے علاج کئے۔ لڑائی کے معرکوں میں بھی نام پایا۔ سارا جسم جراحت گاہ تھا۔ مرشد آباد کی سرکار میں معزز تھے۔ اس دربار کو تنزل ہوا تو قاسم علی خاں کے عہد میں، نواب شجاع الدولہ کے دربار میں آئے۔ اُنیس ہاتھی ساتھ تھے۔ اگرچہ بے سروسامان تھے (یہ ہماری بے سروسامانی تھی) آج سر ہے اور سامان کا سودا۔ سودا وروں کا ہے زیاں ہمارا۔ آہ! "لسان العصر" (اکبر) تیری قبر رحمت سے مالامال ہو۔ کیا کہہ گیا ہے۔ ؎

محفل اُن کی، ساقی اُن کا

آنکھیں میری، باقی اُن کا

خیر۔ قدردانی نہ ہوئی۔ ناقدری نے گوشہ نشیں کر دیا۔ پٹھانوں کے حال پر کرم فرمایا۔ فرخ آباد میں سکونت اختیار کی۔ منظفر جنگ خدمت کرتے رہے۔ وہیں رحلت کی۔ اور دفن ہوئے۔ نہایت فیاض اور سیر چشم تھے۔ اسی کے ساتھ بہت سادہ روش۔ زمین پر سوتے تھے۔ شب بیدار تھے۔ تذکرہ کی تالیف سے چند سال بیشتر انتقال کیا۔

سیاقِ کلام سے واضح ہوتا ہے کہ چند روز دہلی میں بھی محمد بیگ خاں ہمدانی کی سرکار میں رہے تھے۔

اور عزت سے رہے تھے۔ دربار شاہی سے تعلق ثابت نہیں ہوتا۔

انشاء اللہ خاں نے لڑکپن میں صرف و نحو، منطق اور حکمت کی کتابیں صدرا تک پڑھیں۔ سولہ برس کے سن میں نواب شجاع الدولہ کے دربار میں پہنچ کر ندیموں میں شامل ہوئے۔ اسی سن میں بے مدد اُستاد ہندی کا دیوان ردیف وار مرتب کر چکے تھے۔ عربی فارسی اشعار بھی بقدر چند اوراق کے لکھ لئے تھے۔ صورت جمیل تھی تقریر دل پذیر۔ سارے دربار میں کوئی حسنِ کلام میں اُن کا حریف نہ تھا۔ شجاع الدولہ کی عنایتوں نے محسود دربار بنا دیا تھا۔ چند روز کے بعد نواب نے وفات پائی۔ نواب آصف الدولہ کے دربار میں اراذل کا دَور دورہ ہوا تو یہ کنارہ کش ہو گئے۔ چندے نواب نجف خاں کی سرکار میں رہے۔ کچھ دن بُندیل کھنڈ میں۔ باپ کے ساتھ کچھ زمانہ دلی میں محمد خان ہمدانی کی سرکار میں بسر کیا اور عزت سے بسر کیا۔ لڑائی کے معرکوں میں توپ، بندوق، اور تیر و تبر سے بے جگری سے سینہ سپر ہوتے رہے۔ زندگی تھی بچ بچ گئے۔ جے نگر میں کسی بات پر بگڑ کر محمد بیگ ہمدانی کے بھائی میرزا اسمٰعیل بیگ پر کٹا۔ نکال لی۔ اور جو زبان سے نکلا کہا۔ مرنے سے بال بال بچے۔ بالآخر لکھنؤ پھر آئے۔ عرصہ تک مرزا سلیمان شکوہ بہادر کی سرکار میں توسل رہا۔ نازک مزاجی نے وہاں بھی نباہ نہ ہونے دیا۔ وہاں سے علیحدہ ہو کر الماس علی خاں کی رفاقت میں رہے۔ بعد چندے یمین الدولہ مرزا سعادت علی خاں بہادر مبارز جنگ نے اپنے مصاحبوں میں شامل کر لیا۔ تذکرہ کی تحریر کے وقت اسی دربار میں تھے۔ دونوں وقت خاصے میں شریک ہوتے تھے۔ مؤلف تذکرہ کو انشا کی خدمت میں نیاز تھا، اور آغاز ملاقات سے شفقت فرمائی کا سلسلہ قائم۔ عالم آشنا پرستی میں انشا بے نظیر تھے۔ شعر ہندی میں طرز جدید کے موجد۔ اُن کی صحبت میں آدمی سارے غم بھول جاتا تھا۔ باوجود اس شجاعت و جوانمردی کے (جن کا امتحان میدانِ رزم میں بارہا ہو چکا تھا) بزم میں اپنے آپ کو ایک چیچے سے بھی زیادہ کم ہمت خیال کرتے تھے۔ کبھی مذاق سوجھتا ہے تو ناچیز سے آدمی سے دل لگی شروع کر دیتے ہیں۔ وہ چپ رہا تو خیر ورنہ وہ گالیاں دیتا ہے یہ ہنستے ہیں۔ کم مرتبہ آدمیوں سے یہ برتاؤ تھا۔ رئیس کے ساتھ ہفت ہزاری کی یہ مجال نہ تھی کہ خلاف مزاج کوئی بات زبان سے نکالے۔ ایک مرتبہ سالار جنگ کے بیٹے میرزا قاسم علی خاں کو بھرے دربار

جناب عالی کے رُوبرو ایک شعر پر رُسوا کر ڈالا۔ چار زبانوں میں شعر کہتے تھے: ہندی، فارسی، عربی، ترکی۔ عربی عبارت، بے نقط۔ بتائے ہوئے مضامین پر چار چار ورق لکھتے چلے جاتے تھے۔ چند سورتوں کی تفسیر بھی بے نقط لکھی تھی۔ شعرائے معاصرین میں کبھی کسی سے نگاہ نیچی نہیں کی۔ صرف میرزا قتیل کو مانا۔ اُن سے الفاظ کی تحقیق کرتے تھے، اور اپنے اشعار کے حسن و قبح دریافت۔ احباب میں اُن کو ممتاز مانتے اور جانتے تھے۔ تحریر تذکرہ سے چند سال پہلے مُصحفی ریختہ گو کو رسوائے کوچہ و بازار کیا۔ گدھے پر سوار کرنا رہ گیا تھا۔ اور کوئی ذلت باقی نہ رہی تھی۔ خلاصہ عجیب آدمی ہیں۔ خدا سلامت رکھے۔

فارسی کلام کا نمونہ ۵ رباعی

گیرم کہ مدام دیدہ ات پُر آب ست　　　وز سوز دروں جان و دلت بیتاب ست

"انشاء اللہ" کام دل سے یابی　　　خوش باش۔ خدا مسبب الاسباب ست

"انشاء اللہ" کا لطف ماشاء اللہ۔ تذکرۂ آبحیات پر بیانِ بالا سے حسب ذیل اضافہ ہوسکتا ہے:-

انشا کے دادا کا ذکر۔ انشا کا سولہ برس کی عمر میں صاحبِ دیوان اور عربی فارسی شعر پر قادر ہونا۔ تعلیم کا اندازہ اُن کا مرد میدان اور نبرد آزما ہونا۔ زندگی کی بعض اور جزئیات۔ امور ذیل میں اختلاف ہے:-

اُن کے کشمیری الاصل ہونے کا ذکر نہیں۔ دربار شاہی سے اُن کا یا اُن کے والد کا تعلق ہونا نہیں پایا جاتا۔ لکھنو شجاع الدولہ کے عہد میں گئے نہ کہ آصف الدولہ کے عہد میں۔ بلکہ آصف الدولہ کے دربار سے ناقدری کے ہاتھوں کنارہ کشی کی۔ چونکہ مخزن الغرائب کے مؤلف انشا کے دوست قدیم اور ہمدم تھے اس لئے اُن کی تحقیقات پر وثوق بیجا نہ ہوگا۔ فقط

(رسالہ معارف اعظم گڑھ بابتہ ماہ مارچ ۱۹۲۴ء)

ایک شروانی

امسال ہنگامۂ نمائش علی گڑھ کی چہلپہل میں دلچسپی کی ایک زندہ جلتی پھرتی تصویر نظر پڑی۔ میرے دل کو یہ دیکھ کر ایک روحانی مسرت حاصل ہوئی کہ ہمارے خاندان شروانی کا ایک شخص گھوڑوں کی سوداگری کرتا وہاں وارد تھا۔ مجھ سے ملاقات ہوئی اور بوقت مکالمت معلوم ہوا کہ سوداگر مذکور شروانی تھا جن کی قرابت قریبہ سلیمان خیل وغیرہ سے (شاخہائے غلزئی) سے ہے۔ اس بیان سے اُس روایت کی تصدیق ہوئی جو حیات افغانی وغیرہ میں شروانیوں کی نسبت درج ہے۔ اُس کا بیان تھا کہ ماں کی طرف سے ہماری قوم میں سید کا میل ہے۔ یہ لوگ ضلع قندھار میں دو مقام پر آباد ہیں۔ ایک چار منزل قندھار سے بجانب ہرات۔ اس مقام کا نام گرم سیر ہے اور اس جگہ قریب تین ہزار کے شروانی آباد ہیں۔ شروانی مذکور اسی مقام کا باشندہ تھا اور اُس کے گانو کا نام شلگر ہے۔ یہ لوگ اکثر زراعت پیشہ ہیں۔ کچھ اونٹوں کے ذریعہ سے معاش حاصل کرتے ہیں۔ دوسرا مقام ان کی سکونت کا قندھار کی جانب آخر یعنی اول الذکر آبادی کی سمت مقابل پر ہے۔ یہاں بھی اسی قدر نفوس رہتے ہیں اور وہی طرز زندگی ہے۔ شروانی مذکور کی حالت تمدنی عام افغانیوں سے بہت ممتاز تھی۔ گفتگو نشست برخاست کے آداب کا لحاظ بہت کچھ اُس کو تھا۔ یہ غالباً قرب خراسان کا اثر ہے۔ شروانیوں کے پڑوس میں دُرانی واتُنگ بستے ہیں۔ دُرانیوں سے معاندت ہے اور اُتنگ ان کے حلیف ہیں اور جب درانیوں سے معرکہ ہوتا ہے تو شروانی و اُتنگ متفق ہو کر اُن کے مقابل ہوتے ہیں۔ فقط

۷ رمضان مبارک ۱۳۱۱ھ

(غیر شائع شدہ)

مسلم یونیورسٹی اور اسلامی آرٹ

ایڈیٹر صاحب انسٹی ٹیوٹ گزٹ! آپ کے ۱۲ر نومبر سنہ حال کے اخبار میں ایک عالم خاتون کے مسلم یونیورسٹی میں آنے اور اسلامی آرٹ پر اُن کے لیکچر ہونے کا تذکرہ ہے۔ اسی سال کے شروع میں ایک ہندو صاحب ذوق نے مسلمانوں کی مصوری پر مسلم یونیورسٹی میں لیکچر دیا تھا۔ قدرتی طور پر یہ پُرحسرت سوال دل میں پیدا ہوتا ہے کہ عیسائی اور ہندو اہل ذوق کی گرم فرمائی کے بعد خود مسلم یونیورسٹی نے اسلامی آرٹ کے متعلق اپنے فرض کا احساس کیا۔ صرف بیرونی اہل ذوق کے لیکچر سُن لینا شاید ایک یونیورسٹی کی علم پروری کی واضح دلیل نہیں ہے مسلم یونیورسٹی میں اسلامی آرٹ کے متعلق علم، تعلیم، ذوق اور نمونوں کا ایسا ذخیرہ ہونا چاہیے تھا کہ اس ہنر کے قدردان اور طالب علم، اکتساب علم اور حصول ترقی کے لئے دور دراز ممالک سے یہاں آتے۔ یہاں کے لیکچر دینے والے دنیا کی یونیورسٹیوں میں بلائے جاتے۔ یہ تو ایک اعلیٰ معیار ہے۔ کم از کم ذوقِ ہنر ہی کارفرما ہوتا، اس سے بھی کمتر (بلکہ کمترین) درجہ یہ ہے کہ ذوق پیدا کرنے کی فکرِ صحیح ہوئی ہوتی۔ افسوس ہے کہ یہ بھی نہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ جو لیکچرار اسلامی آرٹ پر لیکچر دینے ہماری یونیورسٹی میں آئے ہیں انھوں نے ہمارے ذوقِ ہنر کی بے مائگی پر دل میں رحم کھایا ہے یا نفرت کی ہے۔ جب انھوں نے مسجد اور سر سید کورٹ کو دیکھ کر منٹو سرکل کی عمارت دیکھی ہوگی تو ذوق ہنر کی ترقی کی داد بے ساختہ اُن کے دل سے نکلی ہوگی!!

آخر مضمون میں یہ مژدہ ہے کہ لیکچرار خاتون آرٹ کی ایک سوسائٹی بھی مسلم یونیورسٹی میں قائم کر گئی ہیں۔ معلوم نہیں بر سر موقع اس سوسائٹی سے کیا توقعات ہیں۔ مگر تجربہ نے تو گزشتہ کانفرنس کے اجلاس میں ایک نکتہ سنج لیکچرار سے یہ کہلوایا تھا کہ "ہمارے کالج میں سوسائٹیوں کا گورستان انسانی گورستان سے کم آباد نہیں"۔ خاتون لیکچرار نے اپنا لیکچر "فانوسِ جادو" کی اعانت سے ذہن نشیں کیا تھا۔ فانوس جادو کے نقش و نگار سپید چادر پر اسی وقت تک نمایاں رہتے ہیں، جب تک روشنی کی محاذات

رہتی ہے۔ جب روشنی ہٹی تاریکی اور سادہ چادر کے سوائے کمرہ میں کچھ نہیں رہتا۔ مجھ کو اندیشہ ہے کہ کہیں یہی تماشا ہماری جدید آرٹ سوسائٹی نہ دکھائے۔ کاش کوئی یہ سمجھا دیتا کہ صرف فانوس جادو کی جلوہ گری ہنر پرور نہیں۔ فانوسِ سینہ میں شوق اور ذوق کی شمع روشن ہو تو کالج کے تمام در و دیوار ہنر کی نقش و نگار چادر بن جائیں گے اور وہ نقش "نقشِ حجر" ہو گا۔ اب جن لکچراروں کا تم منہ دیکھتے ہو وہ تمہاری چشم و ابرو کی جنبش سے، حرکات و سکنات سے ہنر کے نکتے حل کرنے آئیں گے اور تمہاری شاگردی پر نازاں جائیں گے۔

اسلامی آرٹ کا مفہوم بھی تفصیل طلب ہے۔ سب سے بڑا اسلامی آرٹ وہ "حسین زندگی" ہے جو عالم انسانی میں خالق جمیل کے جمال کامل کے پرتو سے جلوہ فرما ہوئی۔ اسلام ہی نے مخلوق کو بلا واسطہ خالق کے سامنے بٹھا کر یہ حسن و زیبائی زندگی میں پیدا کی۔ حبیب کبریا (روحی فداہ) کی حیات طیبہ حسن و جمال سے لبریز ہے اور اسلامی آرٹ کا اعلیٰ اور اشرف نمونہ۔ اس کے بعد قرآن اور خالص اسلامی علوم ہیں۔ پھر اسلامی تاریخ ہے جو دلوں پر تصرف و فرماں روائی کی دل کش مثالوں سے معمور ہے۔ اس فرماں روائی کا کمال وہاں جلوہ افروز پاؤ گے جہاں ایک شخص تنہا بہ یک بینی و دو گوش جان بچانے کو اجنبی ملک[1] میں جاتا ہے، مگر وہاں جا کر ایک سلطنت قائم کر دیتا ہے جو پشتوں تک اور صدیوں تک قائم رہتی ہے، اور خوش حالی و فارغ البالی سے ملک کو رشک گلزار بنا دیتی ہے۔ کمال یہ ہے کہ دس بارہ برس کے لڑکے بھی ان فرماں رواؤں کے گروہ میں آن بان سے قدم جمائے کھڑے ملیں گے۔

اس کے بعد شاعری ہے، پھر عمارت و صنعت ہے، پھر خطاطی، سب سے آخر میں مصوری۔ چونکہ تصویر بنانا شرع میں ممنوع ہے اس لئے کم طبیعتیں اس جانب مائل ہوئیں۔ مگر اہل کمال نے حرفوں کے نقوش میں عالم تصویر دکھا دیا۔ ایک استاد خطاط کا قطعہ ہنر بین نگاہ کو وہی ذوق بخشتا ہے جو ایک کامل مصور کی تصویر۔ عماد اور میر علی کے "عین" اور "صاد" میں انسانی حسین آنکھ کی دلربائی عیاں ہے۔

آپ کے اخبار میں عالم لکچرار خاتون کے لکچروں کا اعادہ یا خلاصہ نہیں۔ اس لئے معلوم نہیں

---

[1] اندلس اسپین امیر عبدالرحمٰن داخل ۱۲

ہوتا کہ اُن کے موضوع بیان کو وسعت کہاں تک تھی اور حقیقت سنجی کس حد تک۔ تقلیدی اور فیشن کے خیالات سے کہاں تک اُن کا تخیل آزاد تھا۔ تاج کا طرۂ امتیاز اٹلی کے سر پر رکھنے یا کم از کم اُس کا ذکر ہی کرنے سے تو فیشن زدہ ہی کی بو آتی ہے۔ دلی اور آگرہ میں اس خیال کی تردید مجسم موجود ہے۔ ہمایوں کا مقبرہ اور سکندرہ کے دروازہ کے چاروں مینار تاج کا نقش اول بنا رہے ہیں۔ یہ نکتہ یہاں کے آثار قدیمہ کے باخبر ناظم نے مجکو بتایا۔ شاہجہاں کی پاکیزگی مذاق نے ترتیب بدل کر کچھ ایسا طلسم باندھا کہ آگرہ میں اٹلی نظر آنے لگی۔ شاید یہی فانوس جادو کی جلوہ گری ہے۔ اگر دہلی اور آگرہ کے ساتھ کلکتہ بھی ملا لیا جائے تو ثبوت کامل ہو جاتا ہے۔ کلکتہ کا اضافہ کیوں ؟ اس کو ارباب فہم سوچیں۔

خلاصۂ کلام۔ جب تک مسلم یونیورسٹی میں علم پرور آب و ہوا اور ہنر آفریں فضا پیدا نہیں ہوتی اُس وقت تک "آرٹ کے لکچر اور سوسائٹیاں، فانوس جادو" سیمیائی جلوے ہیں جو نگاہوں کو خیرہ اور فیشن کے مذاق کو مسرور کرنے میں ضرور کامیاب ہو سکتے ہیں۔ مگر حقیقی ذوق پیدا نہیں کر سکتے۔ جب تک زمین قابل اور آب و ہوا راس نہ ہو کوئی قلم ممکن نہیں، اُس کو رشک گلزار بنا دے۔ ؎

حافظؔ

نشانِ مہر و وفا نیست در تبسّمِ گل
بنال بلبلِ بیدل کہ جائے فریاد ست

(مسلم یونیورسٹی گزٹ علی گڑھ مورخہ ۳ دسمبر ۱۹۲۴ء)

لہ اشارہ بہ عمارت وکٹوریہ میموریل۔

تعلیم و تربیت

(مضمون ذیل ۲۰ فروری ۱۹۳۵ء کو حسب فرمایش محبوب علی صاحب ناظم حیدرآباد دکن میں براڈ کاسٹ کیا گیا)

آدمی دنیا میں قابلیت کے خزانے لے کر آیا ہے۔ اسی قابلیت کی بدولت وہ ساری مخلوق سے اعلیٰ ہے۔ آسمانی کتاب میں فرمایا ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ تمہارے واسطے ہے۔

قدرت نے آدمیوں میں طرح طرح کی قابلیتیں رکھی ہیں۔ کوئی ڈاکٹر بن جاتا ہے، کوئی حکیم۔ ایک شاعر ہو جاتا ہے تو دوسرا فلسفی۔

آپ دیکھتے ہیں کہ خزانے زمین کے اندر چھپے ہوئے ہیں۔ جواہرات، سونا، چاندی، کوئلہ، تیل غرض بیسیوں قسم کی کانیں ہیں جو زمین کے پردوں میں چھپی ہوئی ہیں۔ معدنیات کے ماہر زمین کو کھودتے ہیں۔ اس کے اندر سے کچی دھاتیں نکالتے ہیں۔ ان کو پکاتے ہیں۔ صاف کرتے ہیں جب ان کے جوہر چمکتے ہیں۔ اور کام کے قابل ہوتی ہیں۔

کچھ ایسا ہی حال ان خزانوں کا ہے جو انسان کے اندر ہیں۔ تعلیم کا اصلی کمال انہی خزانوں کا نمایاں کرنا اور ان کو کارآمد بنانا ہے۔ ایک ماہر استاد دیکھتا ہے کہ اس کے شاگرد میں قدرت نے کیا خاص قابلیتیں رکھی ہیں۔ وہ کاوش کرتا ہے کہ ان قابلیتوں کو صاف اور ظاہر کرے۔ بڑھائے۔ ترقی دے۔ اور کارآمد کرے تاکہ اس کا شاگرد اور دوسرے آدمی اس سے فائدہ حاصل کریں۔

انسان میں دو طرح کی قابلیتیں ہیں۔ ایک علم کی۔ دوسری عمل کی۔ علم ہی کی شان تھی کہ انسان کو فرشتوں نے سجدہ کیا۔ شیطان نے غرور سے سر نہ جھکایا مردود ٹھہرا۔

ایک استاد کی تعلیم کی عظمت اس میں ہے کہ وہ شاگرد کی دونوں قابلیتوں کو پروان چڑھائے علم بھی سکھائے اور عمل پر بھی قائم کر دے۔ علم کے سکھانے کے یہ معنی نہیں کہ کسی فن کے مسائل حافظہ میں جمع ہوں اور زبان پر رواں۔ بلکہ اس سکھانے کا کمال یہ ہے کہ علم نہ صرف شاگرد کے حافظہ میں

اور زبان پر ہو بلکہ اُس کا ذوق وشوق دِل کے راستہ سے روح تک پہنچے۔ اور دل و دماغ کا جزو بن جائے۔ اس کی مثال ایسی ہی کہ ایک انسان کے دامن میں لذیذ اور جزوِ بدن ہونے والی غذائیں بھری ہوئی ہوں۔ نہ صرف بھری ہوئی ہوں بلکہ وہ وقتاً فوقتاً اُن کو دکھاتا بھی ہو۔ اُن کے فائدے بھی خوب بیان کرتا ہو۔ لیکن اُن کو کھا کر جزوِ بدن نہ بنائے اور اس طرح اُن کے فائدوں سے محروم رہی۔ یہ مثال اُن آدمیوں کی ہی جن کی تحصیل علم کی حد یہ ہو کہ علم کے مسائل حافظہ میں ہوں۔ اُن کا بیان زبان پر ہو۔ لیکن اُسی کے ساتھ دل اور روح علم کی لذت سے آشنا نہ ہوئے ہوں۔ اور علم دِل اور دماغ کے اندر پیوست ہو کر اُن کا جوہر نہ بن گیا ہو۔ ظاہر ہی کہ یہ لوگ علم کی اصلی نعمت سے محروم رہی۔ جس طرح عمدہ غذاؤں کا دامن میں جمع رکھنے والا اور اُن کی تعریف کرنے والا اُن کے حقیقی فائدہ سے محروم رہا۔

دوسرے انسان وہ ہیں جو عمدہ اور کارآمد غذاؤں کا ذخیرہ فراہم کرتے ہیں۔ حفظانِ صحت کے قواعد کی پابندی کے ساتھ اُن کو معدہ میں پہنچاتے، صحت آفریں ورزشوں کے ذریعہ سے اُن کو ہضم کر کے جزوِ بدن بناتے اور قوت وصحت حاصل کرتے ہیں۔ یہ مثال اُن طلبار کی ہی جو اپنے ماہر اُستاد کی تعلیم سے صحیح علم کا سرمایہ حافظہ میں محفوظ کرتے ہیں۔ علمی مسائل کی مشق اور تکرار سے نہ صرف اُن کو یاد کرتے ہیں بلکہ شوق اور ذوق کی گرمی سے اپنی روح و دماغ میں جذب کرتے ہیں بعینہٖ اُس طرح جس طرح معدہ کی گرمی سے غذا انسانی جسم کا جزو بنتی ہی۔ دل و دماغ علم کو جذب کر کے منور اور زندہ ہو جاتے ہیں۔ اُن میں یہ قدرت وقوت پیدا ہو جاتی ہی کہ جو سیکھا ہے اُس پر مضبوطی سے عمل کریں اور بنی نوع انسان کو اُس سے فائدہ پہنچائیں۔

آپ نے میرے اوپر کے بیان سے سمجھا ہو گا کہ کامل تعلیم وہی ہی جس کا نتیجہ علم سکھانا اور چھپے ہوئے صفاتِ انسانی کی تربیت کرنا ہی۔ تربیت کے معنی ہیں رفتہ رفتہ بڑھانا، پرورش کرنا، ترقی دینا اور اس طرح بڑا اور قوی بنا دینا۔

دیکھو مالی زمین کو سینچ کر، کھود کر اُس کے اندر کے بیج کو نازک پودے کی شکل میں زمین کے

اوپر لاکر اُس کی خدمت کرتا ہے۔ برابر سینچتا ہے۔ کھود لگاتا ہے۔ گھاس کوڑے سے اُس کی کیاری کو صاف کرتا ہے اور رفتہ رفتہ اُس نازک پودے کو جو گھاس کے مثل کمزور تھا ایک تناور درخت بنا دیتا ہے۔

درختوں کے مالی کی طرح انسانی صفات کا باغبان جو استاد معلم کہلاتا ہے اسی طرح اپنے شاگرد کی باطنی زمین کے اندر اُس کے اچھے صفات کے بیجوں کو اپنے فیض تعلیم سے نمایاں کرتا ہے۔ اپنی شفقت کے اثر سے سینچتا ہے۔ بری عادتوں اور بد صفتوں کے زہریلے خس و خاشاک اور کانٹوں سے صاف اور اُس کے دل و دماغ اور روح کو پاک کر کے صفاتِ انسانی کے درخت کو قوی اور تناور بنا دیتا ہے۔

دیکھو اگر پودے کو پانی نہ دیا جائے اور اُس کی کیاری خس و خاشاک سے صاف نہ کی جائے تو اچھے اچھے پودے مرجھا کر سوکھ جاتے ہیں۔ جل کر خاک ہو جاتے ہیں۔ اس طرح اگر انسانی صفتوں کی غور و پرداخت استاد شفقت سے نہ کرے، بد عادتوں اور بُری صفتوں کی اصلاح کر کے روح اور دل کو اُن سے صاف نہ کرے تو اعلیٰ اور اشرف صفاتِ انسان مثلاً راست بازی، غیرت، شجاعت، ہمدردی مُرجھا کر فنا ہو جائیں گے۔ اور انسان لکھ پڑھ کر عیّار، خود غرض، نفسانی خواہشوں سے مغلوب۔ اور خودداری اور عزتِ نفس سے کورا رہ جائے گا۔ ظاہر ہے کہ ایسا انسان کیا عزت پا سکتا ہے اور اصلی کامیابی کب حاصل کر سکتا ہے۔ پس جو تعلیم و تربیت کا حقیقی اہتمام نہ کرے اُس کے نتائج ایسے ہی نکلیں گے۔

ایک بات اور سن لینی چاہیے۔ استاد کی تعلیم و تربیت پوری طرح فائدہ نہیں بخش سکتی جب تک کہ شاگرد کے ماں باپ اور خود شاگرد استاد کی مدد نہ کریں۔ اگر ماں باپ کی تربیت خراب ہے اور وہ بچّہ کی عادت اور زندگی کی نگرانی صحیح قاعدہ کے موافق نہ کریں اور بچہ کی عادت اور طبیعت خراب ہو جائے تو ظاہر ہے کہ استاد کی محنت بہت کچھ ضائع ہو جائے گی۔ اسی طرح اگر شاگرد اپنے بننے میں اور اپنی تعلیم و تربیت میں استاد کی مدد نہ کرے تو استاد کی ساری کوشش بیکار رہے گی۔ اس پر تعجب نہ کرو کتنے طالب علم ہیں جو برسوں پڑھتے ہیں۔ استاد اُن پر محنت کرتے ہیں مگر وہ جاہل رہتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ وہ دل نہیں لگاتے۔ محنت نہیں کرتے۔ استاد کی تعلیم کو دل نشین

کرکے اُس پر عمل کی کوشش نہیں کرتے۔ طالب علم کے لئے لازم ہے کہ استاد کی تعلیم کو غور سے سُن کر اُس کو مُسلسل غور کی قوت سے دل پر نقش کرے۔ اور اُس کے بعد اُس پر عمل کی پوری کوشش کرے۔ بُری خصلتوں کے چھوڑنے اور اچھی خصلتوں کے اختیار کرنے کی پوری سعی کرے۔ اور اس طرح اپنا خود استاد اور مربّی بنے۔

جو قوت عمل اور اعلیٰ خصلت اور کیرکٹر کی قدرت نے انسان میں رکھی ہے اُس کو حرکت میں لانے والے اور قوت بخشنے کے سرچشمے تین ہو سکتے ہیں۔ مذہب، بزرگوں کی مثالیں، ملک و وطن کی محبت۔ ہم کو کوشش کرنی چاہئے کہ مذہب کے احکام کی صداقت کے عقیدت کے ساتھ پابند رہیں۔ اُس کی تعلیم کو اپنی روحانی اور اخلاقی پاکیزگی کا ذریعہ بنائیں۔ مذہب کو دوسرے سے لڑنے کا آلہ نہ قرار دیں۔ بلکہ اُس کو خود اپنی بُری صفتوں سے اور عیبوں سے جنگ کرنے کا ہتھیار بنائیں۔ خدا کے بندوں سے (خواہ وہ کسی مذہب کے پیرو ہوں) رحم ہمدردی اور انصاف کا برتاؤ کریں۔ صحیح تاریخ کے مطالعہ سے اکابر کے حالات کو دل پر نقش کریں اور اُن کو اپنے واسطے مثال اور نمونہ بنائیں۔ اور ان کی پیروی کی کوشش کریں خواہ کتنی ہی تکلیف برداشت کرنی پڑے۔ اپنے وطن اور ملک کی خدمت اور بہبودی کو نصب العین قرار دیں۔ اس کے لئے بڑی سے بڑی قربانی کے لئے تیار رہیں اور ذاتی نفع یا آرام کے لئے کبھی ملک کو دغا نہ دیں۔

اگر ہم اوپر کے بیان کئے ہوئے تینوں سرچشموں کے فیض سے اپنے دلوں کو سیراب کریں گے تو بالضرور ہماری تعلیم و تربیت کامل ہو کر ہم کو دنیا کا کارآمد انسان اور بنی نوع انسان کا کارآمد خادم بنا دے گی۔ اور ہمارے اُستاد اور ہماری مادر درسگاہ ہمارے وجود پر فخر کریں گے۔ اور یہ ایک انسان کی بہترین سعادت اور عزت ہے۔

زلزلہ

مدت العمر میں اول مرتبہ جنبش زمین کا مجھ کو اُس روز ۴ جنوری ۱۸۹۲ء کو مشاہدہ ہوا۔ قریب مغرب میں باغ میں لبِ حوض کرسی پر بیٹھا ہوا تھا کہ دفعتہً مجھ کو کرسی متحرک محسوس ہوئی۔ میں سمجھا کہ کوئی شخص پشت پر کھڑا کرسی کو حرکت دیتا ہی میں نے پھر کر دیکھا تو کوئی نہ تھا حرکت اب بھی معلوم ہوتی تھی۔ اب مجھ کو یہ توہم ہوا کہ شاید میرا بدن ہلتا ہے میں

اسی تفکر میں تھا کہ جناب قبلہ گاہی صاحب نے (جو وہیں رونق افروز تھے) فرمایا کہ میری کرسی ہلی شاید زلزلہ آیا۔ وہیں میرزا وحیدالدین حیدر بیٹھے تھے انہوں نے بھی اس کی تصدیق کی اتنی باتیں جتنے عرصے میں ہوئیں اُتنے زمانہ تک حرکت محسوس ہوتی رہی۔ حرکت بہت خفیف لیکن خوب محسوس تھی اور تھم تھم کر ہوتی تھی اُس کی سمت شمال سے جنوب کو معلوم ہوتی تھی۔ بعد دریافت منکشف ہوا کہ گڑھی کے اندر اور حویلی میں بھی اس جنبش کی حس لوگوں کو ہوئی۔ اخباروں کے ذریعے سے واضح ہوا کہ اُسی شام کوالہ آباد لکھنؤ رانی کھیت وغیرہ میں بھی یہ حرکت محسوس ہوئی تھی لیکن سب مقاموں پر بے ضرر۔

(۹ جنوری ۱۸۹۴ء) (غیر شائع شدہ)

صحیح مسلم کا ایک قلمی نسخا

مُدت سے معارف کے صفحات کتاب خانہ حبیب گنج کی کارگزاری کے بیان سے خالی ہیں۔ عدم کارگزاری باعث نہیں ہے، عدم بیان ہے۔ تھوڑی سی تلافی مافات کی جاتی ہے۔

بلگرام دارالکرام کے اعیان میں ایک نامور صاحب السیف والقلم روح الامین خان تھے۔ مآثر الکرام میں میرآزاد مرحوم نے حسب ذیل اُن کا حال لکھا ہے:۔

"روح الامین خاں۔ شیخ عثمانی باشندہ محلہ قاضی پورہ تھے۔ فنونِ عربی، فارسی، ہندی میں یکتا حسنِ خلق میں ممتاز۔ ظریف طبع، خوش بیان، لطیفہ سنج۔ حافظہ بہت قوی تھا۔ مذکورہ بالا تینوں زبانوں کے اشعار قصائد اور مثنویاں طولانی ازبر تھیں۔ اسی طرح مسائل علمی اور حکایات جس علم کا سوال کوئی کرتا جواب حاضر۔۔۔۔ سید العارفین سید لطف اللہ قدس سرہ سے بیعت تھی۔ معنوی صفات کے ساتھ حُسن ظاہری میں بھی بلند پایہ رکھتے تھے۔ سخاوت و شجاعت کا شہرہ تھا امیرانہ شان سے زندگی بسر کی۔ کچھ دن پنجاب کے بائیس محال کے ضمن میں سیالکوٹ اور جالندھر

بھی شامل تھے) حاکم رہے۔ اودھ کے نائب صوبہ دار رہے۔ بالآخر برہان الملک سعادت خان کی رفاقت اختیار کی۔ باوجود ان تمام مشاغل کے کتاب کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹی۔ آخر عمر میں (کہ ستر برس سے زیادہ سن ہو چکا تھا) صحیح بخاری اور صحیح مسلم[1] اپنے ہاتھ سے لکھیں اور محشی کیں۔ عجیب استغراق حدیث شریف کی خدمت کا نصیب ہو گیا تھا۔ انجام کار ۱۱۵۱ھ میں پانی پت کے معرکۂ نادری میں مردانہ لڑ کر سرخرو ہوئے۔ "سالِ ہجرت یک ہزار و یک صد و پنجاہ و یک"

صوری و معنوی تاریخ ہے۔

حسنِ اتفاق۔ نصیب حبیب۔ مذکورہ بالا دو پاک نسخوں میں سے ایک یعنی صحیح مسلم میرے کتاب خانہ کا شرف افزا ہوا۔ یہ نسخہ ۱۴ انچہ طویل اور ۱۰ انچہ عریض ہے۔ تعداد اوراق ۲۰۰۔ سطریں فی صفحہ ۳۷ ہیں۔ اوّل سے آخر تک سراپا محشّٰی ہے۔ حواشی میں رجال، حلِ لغات، تحقیق مطالب، سب ہی کچھ ہے۔ نسخ و شفیعہ دونو خط پاکیزہ و پختہ ہیں، نیز جلی۔ ابتدا میں حسبِ معمول متعدد اوراق پر متعدد فوائد لکھے ہیں۔

نقل کی کیفیت خود کاتب روح الامین خان کے قلم کی زبانی سنو۔ خاتمہ میں لکھتے ہیں۔ (خلاصۃً)

"اس نسخہ کی نقل ۱۴۔ رجب۔ روز پنجشنبہ کو شروع کی۔ ذیقعدہ کی ۱۹ کو ختم ہوا ۱۱۴۵ھ تھا اس طرح چار ماہ پانچ دن میں کتاب ختم ہوئی۔ "کاتبہ بندہ روح الامین بلگرامی" سے سنہ کتابت نکلتے ہیں۔

"جب میں حضرت صحیح بخاری کے لکھنے سے فارغ ہوا تو حضرت صحیح مسلم کی تلاش میں بہت دن تک شب و روز مشغول رہا۔ دو سال کی جستجو کے بعد شاہجہان آباد میں ایک نسخہ ملا۔ مگر صحت اطمینان کے قابل نہ تھی۔ اس لئے نہ خریدا۔ اتفاقاً ۱۱۴۵ ہجری میں الہ آباد جانا ہوا۔ وہاں بھی تمام مدارس میں تلاش کیا۔ بالآخر سیدی و سندی محمد فاخر کے مدرسہ میں ایک نسخہ ملا۔ کیسا نسخہ۔ خالص عربی نژاد عجمی اُس کے پڑھنے سے عاجز۔

نقطہ اور اعراب کا نام نہ تھا۔ دو سطریں بھی پڑھنا خونِ جگر کھانا تھا۔ ایک صفحے میں سطریں ۵۵ سے بھی زیادہ تھیں۔ پڑھتے پڑھتے نظر سے غائب ہو ہو جاتی تھیں۔ تاہم میں نے ہمت کی۔ بارگاہ نبوی سے

---

[1] آخر عمر میں (جب کہ سن ستر برس سے زائد ہو چکا تھا) صحیح مسلم ۱۱۴۳ھ میں لکھی۔ اس کے لکھنے کے سات برس بعد ۱۱۵۱ھ میں وفات پائی اس طرح اندازاً اسی برس کی عمر ہوئی۔ اور اس سن میں شمشیر بکف میدان جنگ میں معرکہ آرا ہو کر سرخرو ہوئے۔ حبیب الرحمٰن۔ ۹ ربیع الاول ۱۳۶۲ھ

اعانت چاہی۔ اول کتاب کو من اولہ الی آخرہ پڑھا۔ اب وہ اتنی آسان ہوگئی کہ گویا خود میں نے لکھی تھی۔ اس کے بعد نقل کی جرأت کی بفضلِ خدائے تعالیٰ چار مہینے میں ختم ہوگئی۔ اس عمر میں کتابیں میں نے بہت لکھی ہیں۔ مگر اُن میں سے زادِ آخرت چار ہو سکتی ہیں۔ دو تفسیریں۔ تفسیر حسینی اور معالم التنزیل اور حدیث میں صحیحین۔ منقول عنہ نسخہ" مدینہ شریف میں مسجد نبوی کے باب السلام میں لکھا گیا تھا۔ ہندوستان میں ایسا صحیح نسخہ کم آیا ہے۔ یہ نسخہ ۹۶۳ھ کا لکھا ہوا بقلم یوسف بن محمد الوارث حنفی ہے"۔

بیان بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس عہد کے دنیا دار بھی کیسے بالغ نظر صاحب کمالات ہوتے تھے اہم واقعہ یہ ہے کہ اُس عہد میں کتبِ حدیث کی نایابی کا کیا حال تھا۔ صحیح مسلم کا صحیح نسخہ دو برس کی تلاش میں بھی شاہجہاں آباد میں نہ مل سکا۔

آج حدیث کی کتابوں سے ہندوستان کے کتاب خانے معمور و پُر نور ہیں۔ اللہ تعالے حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ اور اُن کے خاندان کی قبروں کو منور اور روشن فرمائے کہ یہ انھیں کی مساعی حسنہ کا نتیجہ ہے۔

(رسالہ معارف اعظم گڑھ بابتہ ماہ فروری ۱۹۲۹ء)

کلام خواجہ سنائی غزنوی

ستمبر سنہ حال کے معارف میں یہ مژدہ نظر سے گزرا کہ افغانستان کے ادیب فاضل سردار خاں گویا نے حکیم سنائی کے کلام کا ایک نہایت نادر و قدیم مجموعہ دریافت کیا ہے۔ اگرچہ معارف کے فاضل مدیر نے اس انکشاف پر خوش ہونے کا "حق فضلائے ہندوستان" کے لئے مخصوص فرمادیا ہے تاہم سرخوش نادانی شروانی بھی بیحد خوش ہوا۔ دو وجہ سے۔ اول ایک بیش بہا علمی سرمایہ کی دریافت پر۔ دوم اپنے وطن کے اس فخر پر کہ وہاں وہ گوہر شاہوار تاباں ہوا جس سے ایران کا دامن خالی نکلا ہر چند شروانی کے بزرگوں کو نواح قندھار سے آئے ہوئے پانسو برس ہو چکے تاہم للہ الحمد حبِّ وطن کی چنگاری ہنوز سینے میں زیر خاکستر دوری دبی ہوئی ہے۔ فرط فخر میں جب بے مایہ شروانی نے اپنی گدڑی کو ٹٹولا تو الحمد للہ چند لعل بے بہا اس میں سے بھی نکلے۔ معارف پرور قلوب کی ضیافت کے لئے اُن کے جوہر ذیل میں نمایاں کرتا ہوں۔ یہ ضیافت مدیر معارف کی صحت یابی کی نذر تصور فرمائی جائے۔

حبیب گنج کے کتاب خانے میں چھ نسخے کلام سنائی کے ہیں۔ ۲ مطبوعہ۔ ۴ قلمی۔

مطبوعہ میں: ۱۔ پہلا نسخہ مثنوی حدیقہ سنائی کا ہے جو سنہ ۱۸۸۵ء میں مطبع نولکشور میں چھپا تھا۔ اس میں خاص بات وہ دیباچہ نثر ہے جو خود سنائی نے حدیقہ پر لکھا تھا۔ مطبع نے اس کو شارحِ حدیقہ و مثنوی معنوی خواجہ عبداللطیف عباسی کی شرح سے نقل کرکے فیض عام کر دیا ہے۔ دوسری خاص بات یہ ہے کہ خواجہ موصوف کی شرح حدیقہ مسمّیٰ بہ لطائف الحدائق حاشیہ پر چڑھا دی ہے۔ شارح عباسی نے شرح کے مقدمے میں نسخہ حدیقہ کے اہتمام تصحیح کی تشریح کرتے ہوئے اس نسخے کا ذکر کیا ہے جو دور اکبری کے امیر عزیز خاں کوکلتاش نے حکیم سنائی کے مزار سے حاصل کیا تھا اور جو عہد مصنف سے قریب ہی زمانہ میں لکھا گیا تھا۔ مطبوعہ نسخہ جلی قلم خوشخط ہے۔

۲۔ دوسرا نسخہ مطبوعہ وہ ہے جو نواب علاؤ الدین خاں علائی والی لوہارو نے اپنے مطبع فخر المطابع واقع لوہارو میں چھپوایا تھا۔ خود تصحیح کی تھی۔ خود شرح بھی لکھی تھی جس کا نام طریقہ بر حدیقہ ہے اور جو حاشیے پر چڑھی ہوئی ہے۔ یہ سنہ ۱۲۹۰ھ مطابق سنہ ۱۸۷۳ء میں لکھی گئی۔ ایک خاص لطف اس نسخہ کا یہ ہے کہ علائی مرحوم کی طرف سے قاضی حسام الدین احمد سکندرآبادی کو ہدیۃً بھیجا گیا تھا۔ یہ نسخہ صرف مقصد اول تک چھپا ہے۔

قلمی نسخوں میں: ۳۔ ایک نسخہ مثنوی حدیقہ کا ہے۔ یہ نسخہ سنہ ۱۰۲۷ھ کا لکھا ہوا ہے۔ مقابلہ شدہ ہے۔

۴۔ دوسرا قلمی مجموعہ قصائد وغیرہ کا ہے جو بلحاظ خط و کاغذ نوادر میں سے ہے۔ سنہ ۱۰۰۵ھ میں امام علی کرمانی نے لکھا تھا۔ پورے ساڑھے تین سو برس گزر جانے پر بھی کاغذ کی آب و تاب اور مضبوطی قابل دید ہے۔ اس میں پانسو چوبیس صفحے ہیں۔ ان میں سے ۴۰۰ صفحوں پر قصائد و غزلیات ہیں۔ ۱۶ صفحے ہجویات کے ہیں۔ ہجو کے بعد مرثیے ہیں۔ مرثیوں کے بعد مقطعات۔ مقطعات کے بعد رباعیات۔ رباعی میں یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ ردیف و قافیہ چاروں مصرعوں میں یکساں ہے۔ رباعیات پر نسخہ ختم ہو جاتا ہے۔

۵۔ تیسرا قلمی مجموعہ جس کا حجم چھ سو چھ صفحات کا ہے سنہ ۱۰۱۲ ہجری میں بمقام آگرہ لکھا گیا۔ کاتب کا نام نہیں۔ اس مجموعہ میں اول قصائد ہیں جو حمد، نعت، الزہد والحکمۃ اور مدح میں ہیں۔ قصائد کے بعد غزلیات ہیں (جو ردیف وار ترتیب نہیں) غزلیات کے بعد معمیات، ہجویات، قطعات و رباعیات ہیں۔ اس حصہ کا نام الحدائق فی الخلائق ہے۔ دوسرا حصہ جو مستقل رسالے کی شکل میں ہے المسمّیٰ بہ "کارنامۂ بلخ بہ غزنین فرستادہ"۔ تیسرا حصہ مثنوی مسمّیٰ بہ سنائی آباد و حدیقۃ الحدیقہ۔ چوتھا حصہ کنوز الرموز۔ اس مثنوی سے پہلے ایک قصیدہ شیخ الاسلام محمد بن منصور کی مدح میں ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس مجموعہ کے بعض حصے اول و آخر سے کم ہیں۔ اس لئے کہ اس کی ابتدا اگرچہ بسم اللہ سے ہے تاہم شروع

کا عنوان ہی "قسم دوم در توحید رب العالمین جل جلالہ" آخری حصہ کا عنوان ہی، قسم دہم مثنویات۔ اول کنوز الرموز۔ سیر العباد الی المعاد۔ و مراتب حالِ انسانی"۔ آخری دو مثنویاں مجموعۂ ہذا میں نہیں ہیں۔ صرف کنوز الرموز ہی۔

۶۔ چوتھا قلمی نسخہ مکاتیب سنائی کا ہی۔ تقطیع چھوٹی۔ خوشخط نسخ۔ ۱۲ خط ہیں۔ ایک خواجہ احمد بن مسعود کے نام جن کی فرمایش سے حکیم سنائی نے اپنا دیوان مرتب کیا تھا۔ ایک خط خواجہ قوام الدین وزیر عراق کے نام ہی۔ ایک حکیم عمر خیام کے نام باقی علیٰ ہذا القیاس۔ حکیم عمر خیام کے القاب میں "فرید الزمانی فریع الدہر" لکھا ہی۔ درمیان خط میں ایک جگہ "پیشوائے حکیماں" کے لفظ سے خطاب کیا ہی۔ مکاتیب کی تحریر کا سنہ اور کاتب کا نام درج نہیں۔ خط اور کاغذ کے انداز سے نسخہ قدیم معلوم ہوتا ہی۔

(رسالہ معارف اعظم گڑھ ماہ دسمبر ۱۹۳۶ء)

المبین

(ریویو)

تقریباً چالیس برس کا زمانہ گزرتا ہی علامہ شبلی مرحوم کی تحریک سے میں نے جرجی زیدان کا رسالہ الہلال خریدنا اور پڑھنا شروع کیا تھا۔ ایسا خیال ہوتا ہی کہ ایک آدھ مرتبہ مراسلت بھی ہوئی۔ اُس زمانہ میں اعتدال اور وسعتِ مشرب کے لحاظ سے الہلال کے مضامین قابل پسند ہوتے تھے۔ علامہ مرحوم نے بھی اُس کی تعریف ایک بار سے زیادہ فرمائی تھی۔ رفتہ رفتہ طبیعت کا اصلی رنگ نمایاں ہوتا گیا۔ اور یہ صاف نظر آنے لگا کہ "مدیر الہلال" کو عربوں سے نفرت نہیں، تو کاوشِ ضرور ہی۔ اسی لئے بنی امیہ کی خلافت کی تنقیص اور خلافتِ عباسیہ کی توصیف اُس کا شعار تھا۔ علیٰ ہذا القیاس اُسی عرصہ میں ایک سے زیادہ ناول اُس کے شائع ہوئے۔ اُن میں بھی متمدن پیرایہ میں عرب و اسلام کی تنقیص پیش نظر رہتی تھی۔ لیکن یہ تدلیس اس قدر دل فریب ہوتی تھی کہ خود مسلمان اُس کے احساس سے عاری رہتے تھے۔ چنانچہ ان میں سے ایک سے زیادہ کا ترجمہ خود مسلمانوں نے کیا۔ اور ہاتھوں ہاتھ بکا۔ بالآخر علامہ مرحوم نے اس کو ضروری سمجھا کہ مسلمانوں کو خصوصاً اور اہلِ علم کو عموماً جرجی زیدان کی تدلیس سے بچائیں۔ عربی زبان میں ایک رسالہ لکھا اور محققانہ انداز میں جرجی زیدان کی غلط بیانیوں اور تدلیسات کو واضح کیا۔ یہ رسالہ مصر میں طبع ہو کر شائع ہوا تو شیخ رشید رضا (مدیر المنار) نے بہت

ملنے کا پتہ: مطبع شروانی، علی گڑھ۔

گرم جوشی سے اُس کا خیر مقدم کیا اور لکھا کہ "خود وہ اس ضرورت کو محسوس کر رہے تھے لیکن جرجی زیدان کی تدلیسات اور فریب کا دائرہ اس قدر وسیع تھا کہ اس کو قابو میں لاکر تردید کرنا ممکن نہ ہوسکا۔ مولانا شبلی کی قوتِ دماغی قابلِ داد ہے کہ انھوں نے قابو پاکر یہ علمی خدمت ادا کی۔ اور اہلِ علم کو دھوکا کھانے سے بچالیا" یہ تو پارینہ داستان تھی۔ المبین کے پڑھنے سے معلوم ہوا کہ جہاں الہلال کے ذریعہ سے عربی تمدن، تاریخ اور دین کی بیخ کنی کی جاتی تھی وہاں فلسفۃ اللغۃ العربیہ عربی زبان کی عظمت کو مٹانے کی کوشش ہے۔ بہرحال عربوں سے وحشت کا یہ بھی ایک انداز ہے۔ مباحث کا جو خلاصہ المبین میں ہے اُس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آج تمدن کے مقبول و محبوب انداز و طرز استدلال سے فلسفۃ اللغۃ العربیہ کے مؤلف نے بھی فیض پایا ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ "ضرورت کے وقت جزئی کو کلی کر دینا۔ خاص کو عام بنا دینا۔ اپنے قیاس کو واقعہ کا جزو یا واقعات کی کڑی قرار دیکر حقائق کو اُن کی اصلیت سے پھیرنا۔ اُن سے اپنے موافق نتیجہ نکال لینا" محولۂ بالا جو خدمتِ علمی پہلے مولانا شبلی مرحوم نے ادا فرمائی تھی اُس کی تکمیل گویا المبین کے مؤلف مولانا سید سلیمان اشرف صاحب کے قلم سے ہوئی اور ممدوح نے خصوصاً اہلِ لغت پر احسان فرمایا ہے کہ اُن کو ایک سخت مہلک مغالطہ سے بچالیا ہے۔ المبین میں صرف یہی نہیں ہے کہ جرجی زیدان کی لغزشوں اور غلط کاریوں کی تصحیح و تسدید فرمائی گئی ہے بلکہ عربی زبان کی خصوصیات اس کاوش اور تحقیق سے قلمبند فرمائی ہیں کہ بے مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک ایسا نیا فن مدوّن فرمادیا ہے جس کے دھندلے سے متفرق آثار اگلوں کی تصانیف میں نظر آجاتے تھے۔

المبین کے سات باب ہیں۔ اُن میں حروف کی بحث سے لیکر کمالِ گویائی تک تمام مدارج اور منازل میں عربی زبان کی فضیلت، و عظمت اس خوبی سے بیان فرمائی ہے کہ پڑھنے والا محوِ حیرت رہ جاتا ہے۔ یہ نہ خیال فرمایا جائے کہ فضائل کا قصیدہ پڑھا گیا ہے یا خطبہ دیا گیا ہے۔ نہیں۔ علم اصولِ لغت فلسفہ اور منطق، تعمق نظر اور قوتِ بحث سے حقائق کو واضح اور منکشف فرمایا ہے۔ درس نظامی کی استعداد آفرینی علمی حلقوں میں مسلّم ہے۔ مگر المبین کو پڑھ کر واضح ہوا کہ درس مذکور نہ صرف استعداد آفریں تھا بلکہ مجتہدانہ قوت بھی پیدا کر سکتا تھا۔ المبین میں مؤلف محقق کے قلم نے اُن دشوار گزار میدانوں کو فاتحانہ طے کیا ہے

جن کا نشان بھی اگلی کتابوں میں نہیں - اور اگر ہو تو جیسا میں نے اوپر عرض کیا مجمل اور مبہم سا۔ لفظ "قطن" کی بابت (جہاں جرجی زیدان نے قلم رکھ دیا تھا) تو ایسا دقیق نکتہ زیب قلم ہوا ہے کہ جس کو پڑھ کر قلب پر وہی کیفیت طاری رہی جو برجستہ شعر کے سُننے سے طاری ہوتی ہے۔ عربی زبان سے نگر ہی تھوڑا بہت تعلق نصف صدی سے ہے - مگر جو مضامین المبین میں پڑھے کبھی اس کا واہمہ بھی نہ ہوا تھا کہ زبان عربی ان حقائق و معارف سے مالا مال ہے۔ بیان اتنا مدلل اور صاف ہے کہ ذہن بے تکلف اُس کو قبول کرتا ہے۔ ہاں عناد اور ضد کا علاج نہیں۔ دقیق علمی مضامین کو اس قدر واضح بیان کر دینا مؤلف المبین کا حصہ تھا۔

مصنف علام نے المبین کو سات بابوں پر تقسیم کیا ہے۔ بے مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک زبان کی حقیقت واضح کرنے کے واسطے جتنے پہلوؤں سے بحث کی جا سکتی ہے وہ تمام پہلو ان ابواب میں زیر بحث آ گئے ہیں۔ حرف سے لیکر معانی کے فلسفہ تک کلام کے تمام مراتب پر بحث کی گئی ہے۔ بحث میں ایک حکیم کی دقت نظر، ایک ادیب کے ذوق، ایک لغوی کی ہمہ گیری سے کام لیا گیا ہے۔ اور جو دعویٰ کیا گیا ہے اُس کے ثابت کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ کتاب پڑھنے والوں کے واسطے بلند مرتبہ حکیمانہ مطالب کا ذخیرہ مہیا کیا گیا ہے۔ جن کو کشادہ دلی سے پڑھ کر انسان زبان عربی کے کمالات کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا اور اُس کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ عربوں کا دوسرے ملک کے باشندوں کو عجمی کہنا بیجا نہ تھا۔ اور یہی مصنف کا مقصد ہے۔ اب ہم ساتوں بابوں کے مباحث کی مختصر کیفیت پیش کرتے ہیں تا کہ اہل نظر "نمونے" سے اندازہ فرما سکیں کہ خروارئیں کیا ہے۔

باب اول میں عربی زبان کے مخصوص فضائل ہیں۔ اُس میں سب سے اول وضع لغت کے معرکۃ الآرا مسئلے سے بحث کی ہے اور اس بارے میں جو مختلف اقوال ہیں اُن کو مفصل بیان کیا ہے۔ اُن کا خلاصہ چار قول ہیں۔ اول الہامی یعنی انسان اپنی گوناں گوں قابلیتوں کے ساتھ گویائی کی قابلیت بھی اپنے اندر لے کر اس عالم میں آیا۔ دوسرا قول۔ خارجی آوازوں سے متاثر ہو کر اُن سے الفاظ بنا لئے۔ خارجی آوازیں اور جانوروں کی تھیں۔ یہاں ایک دلچسپ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ یہ کس تاریخ سے ثابت ہے کہ اس خاکدان میں اول چرند و پرند آئے، اُس کے بعد انسان۔ اس سے بھی زیادہ دقیق سوال یہ

ہوسکتا ہے کہ انسان الفاظ کے وضع کرنے میں فضائے عالم اور جانوروں کی آوازوں سے سبق حاصل کرنے کا محتاج تھا۔ اُن سے یہ سبق پڑھا۔ لیکن دوسرے گوناگوں کمالاتِ عالیہ کا خزانہ انسان کے دل و دماغ میں بھرا ہوا ہے۔ مثلاً فکر اور فکر کے بعد ترتیب مقدمات۔ اور ترتیب مقدمات کے بعد اخذ نتائج اور اخذ نتائج کے بعد اُن پر عمل۔ یہ تمام سبق انسان نے کس سے حاصل کئے۔ ظاہر ہے کہ اس کے سکھانے سے تو تمام ماحول عاجز و ساکت ہے۔ اس صورت میں ضرور یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ جہاں تمام کمالات کے خزانے فطرتِ انسانی میں ودیعت تھے وہاں کلام کا بھی کمال تھا۔

اسی ضمن میں ایک قول یہ بھی ہے کہ خود اپنی فطری آوازوں سے وضع الفاظ کا سبق سیکھا۔ مثلاً شدت کرب میں "چیخ" درد میں "ہائے" "وائے"۔ خوشی میں "واہ"۔

تیسرا قول۔ عالم میں جو آواز بھی کہیں پیدا ہو وہ مختلف چیزوں کے باہم ٹکرانے سے پیدا ہوتی ہے۔ انسان کی ادراک کرنے والی قوتوں نے جن مختلف خیالات سے ٹکریں کھائیں تو اُن ٹکروں سے باطنی آوازیں دماغ میں پیدا ہوئیں۔ آوازیں زبانوں تک آکر لفظ بن گئیں۔

عربی زبان کی خصوصیات کے تحت میں اول مخارج سے بحث کی ہے جو کلام کی سب سے پہلی منزل یا سیڑھی ہے۔ بدیہی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ قدرت نے جس قدر مخرج انسان کے اندر حروف کے رکھے تھے اُن سے پورا پورا کام صرف عربوں نے لیا۔ غیر عرب ان میں سے اکثر کو غیر مستعمل چھوڑ کر ہاتھ سے کھو چکے۔ ایک واقعہ یاد آ گیا۔ ایک یوروپین عالم کو (جو عربی زبان کے امتحانوں میں کامیاب تھے) دعویٰ تھا کہ وہ عین اُس کے مخرج سے ادا کر سکتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ ایک ہاتھ کے انگوٹھے سے حلق کی جڑ کو دباتے تھے اُس کے بعد زور کر کے اُس مقام سے آواز نکالنے کی سخت کوشش کرتے تھے۔ چہرہ سُرخ ہو جاتا تھا آنکھیں نکل آتی تھیں۔ مگر عین کی پوری آواز نہ نکلتی تھی۔ کچھ ضرور ادا ہو جاتی تھی۔ مخارج کے بعد حروف کے صفات بیان کئے ہیں۔ اس خصوصیت میں بھی عربی زبان صاف ممتاز ہو جاتی ہے۔

یہ نہ سمجھنا کہ مصنف نے یہ خصوصیات خود تراش لی ہیں جیسے اُن کے مقابل حریفوں کا عمل ہے۔ بلکہ ان قوانین پر بحث کی بنیاد رکھی ہے جو صدیوں کی تحقیق کے بعد ثابت اور مدوّن ہو چکے ہیں۔ اس بحث کے

مختلف پہلو پڑھنے اور پڑھ کر لطف اٹھانے کے قابل ہیں۔

دوسرے باب میں مخارج وصفات کی بحث کو اور زیادہ وسیع کیا ہی۔ جس سے گویا وہ جدید بحث بن گئی ہی۔ اسی کے ساتھ اعراب سے بھی بحث کی ہی۔ اس باب میں دکھایا ہی کہ الفاظ میں حروف کی کمی بیشی یا حرکات کی خفّت و شدّت سے کس طرح اُن کے معانی میں مختلف مراتب خفّت و شدّت کے پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور اس سے ثابت کیا ہی کہ عربی میں الفاظ کے اعراب اور حرکات کی وضع بھی ضابطہ و قانون سے خارج نہیں۔ بلکہ واضع نے اُن کو معانی کے تغیر و تبدل کا اسی طرح آلہ بنایا جس طرح اُن کی صورت کے تغیر و تبدل کا۔ جس طرح یہ بات بلحاظ اپنے مطالب کے پہلے باب سے زیادہ بلند اور دقیق ہی اسی طرح اُس کی بحث اور اُس کا استدلال بھی زیادہ بلند پایہ ہی۔ اور یہ مؤلف علّامہ کی تحریر کی خصوصیت ہی کہ جس قدر آیندہ ابواب میں دعوے بلند پر ہوتے گئے ہیں اُسی قدر اُن کی دلیل بلند و مضبوط ہوتی گئی ہے۔ اور مطالب کی دقّت، بیان کی صفائی کی بدولت۔ فہم کے لئے مشکل نہیں بن جاتی بلکہ آسان اور سریع الفہم رہتی ہے۔

اول اور دوسرے باب میں مفرداتِ حروف کی بحث سے فارغ ہو کر تیسرے باب میں ترکیب حروف سے بحث کی ہی۔ اور یہاں بھی محض قیاسات سے نہیں دلائل سے ثابت کیا ہی کہ مختلف حروف کس طرح باہم مل کر اپنی مخصوص ترکیب سے اپنے معانی کا نشان دیتے ہیں۔ اور جس طرح علم کیمیا کا ایک ماہر ثابت کرتا ہی کہ کن صفات کی دو مختلف چیزیں باہم مل کر ایک خاص تیسری چیز پیدا کریں گی اسی طرح اس فن کا ماہر بتادے گا کہ عربی میں جب فلاں صفات کے حروف سے لفظ بنے گا اُس میں فلاں معنی ہوں گے اگرچہ اُس نے لغت میں اُس لفظ کے معنی نہ دیکھے ہوں۔ اس بحث میں اول حروف کے صفات بتلائے ہیں جو علم تجوید میں ثابت ہیں۔ اُس کے بعد دکھایا ہی کہ کس طرح اُن کے اجتماع سے اُن صفات کے مناسب معنی پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً حرف "جیم" اور "میم" اپنے صفاتِ مقررہ کے لحاظ سے جس لفظ میں مل جائیں گے اُس میں فراہمی اور اجتماع کے معنی پائے جائیں گے۔ جیسے "جم" بہت "جماد" گروہ "جمہرہ" تودۂ ریگ۔ اس طرح بہت سے حروف کی صفات مقررہ بتاکر اُن کی کثیر مثالوں سے ثابت کیا ہی کہ حروف

کی صفات کا اثر معانی پر بطور قاعدۂ کلیہ پڑتا ہے جن کو تھوڑی سی مناسبت زبانِ عربی سے ہو اُن کو ان مباحث میں وہی لطف آئے گا جو اقلیدس کی شکلیں حل کرنے میں حاصل ہوتا ہے۔

چوتھا باب جرجی زیدان کے اُس مغالطہ کا مُدلل جواب دیتا ہے کہ زبانِ عربی کے الفاظ کا مادہ صرف دو حرف ہیں یعنی عربی کے تمام الفاظ ''ثنائی'' ہیں۔ تین یا چار حرف سے نہیں بنتے یعنی ''ثلاثی'' یا ''رباعی'' کوئی لفظ عربی میں نہیں۔ اگرچہ یہ دعویٰ بلا دلیل تھا مگر مصنفِ المبین نے اس کی تردید بھی حکیمانہ پیرایہ میں کی ہے اور فلسفیانہ بحث سے ثابت کیا ہے کہ کیوں عربی لفظ کے مادّے کی تکمیل محض دُو حرفوں سے نہیں ہوتی بلکہ ایک تیسرے اصلی حرف کے ملانے کی ضرورت ہے۔ اور تیسرے حرف کے ملنے کا معنی پر کیا اثر ہوتا ہے۔ اس سلسلۂ بیان میں جرجی زیدان کی ہمہ دانی جس طرح بے نقاب ہو جاتی ہے ارباب فہم کے لئے عبرت افزا ہے۔ جرجی زیدان کا لفظ ''قط'' کو ''ثنائی'' بتانا اُس کے علّامۂ لغت ہونے کی ایسی روشن دلیل ہے جس کے خلاف دم مارنے کی مجال نہیں ہو سکتی۔ اس بحث میں ''قطن'' کے لفظ کی جس کے سامنے جرجی زیدان نے ہتھیار ڈال دئے تحقیق ایسی لطیف و نادر ہے کہ بہت سے برجستہ اشعار اُس پر قربان کئے جا سکتے ہیں ''نون'' کا اپنی صفت (غُنّہ) کے ساتھ ''قاف'' اور ''طا'' سے مل کر ''قطن'' کی صورت پیدا کرنا اور اس مجموعہ کا اثر معنی میں یہ ظاہر کرنا کہ ''روئی'' نشو و نما کے بعد اندر سے اپنے گولڑ کو پھاڑ کر باہر آتی ہے۔ ایسی دقیق بحث ہے جس کی داد کا دینا بہت مشکل ہے۔

پانچواں باب۔ اس میں ارتقائے لسان سے بحث فرمائی گئی ہے۔ اول مستشرقین کے مقرر کردہ اصولِ ارتقا تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ اُس کے بعد ارتقا کو انسانی ارتقا سے عمرانیات کی مثال دے کر واضح کیا ہے۔ پھر یہ بیان کیا ہے کہ مستشرقین مذکور کے یہ اصول جدید نہیں بلکہ وہی ہیں جو صدہا برس پہلے ابو ہاشم معتزلی نے بیان کئے تھے۔ اس کے بعد بہت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ مسلکِ بالا پر بحث فرمائی ہے اور ثابت کیا ہے کہ مستشرقین کی یہ رائیں ایسے قیاسات ہیں جن کا ساتھ واقعات اور حقائق نہیں دیتے ان مباحث کے پڑھنے سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ مؤلف کے دماغ کی بلند پروازیِ تحقیق اُس فضا تک جا پہنچی ہے جہاں مستشرقین کے قیاسات پست ہو کر رہ جاتے ہیں اور یہ امر قابلِ فخر ہے کہ جو مباحث دلائل

جدید تعلیم یافتہ طبع کو ساکت و مبہوت بنا دیتے ہیں ایک قدیم درس گاہ کا فیض یافتہ عالم نہ صرف یہ کہ اُن سے مرعوب نہیں ہوتا بلکہ قوتِ استدلال سے اُن کی کمزوریاں ظاہر فرما کر طالبانِ علم کو صحیح راستہ تحقیق کا دکھا دیتا ہے۔

چھٹا باب۔ فلسفہ اشتقاق پر ہے اور گویا جانِ سخن ہے۔ اس میں اشتقاق صغیر و کبیر کی تعریف کے بعد صغیر و کبیر کا فرق دکھایا ہے۔ اُس کے بعد اشتقاقِ کبیر سے مفصل بحث کی ہے۔ اشتقاقِ کبیر زبان عربی کی ایسی خصوصیاتِ عالیہ میں سے ہے جس کے سامنے تمام زبانیں سپر ڈال دیتی ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ یہ صفت ایک زبان میں کیسے پیدا ہوئی۔ مؤلف علّام کا یہ کمال ہے کہ اس مسئلے میں جو تفصیل آج تک نہ ہوئی تھی وہ المبین کے ذریعہ سے ہماری آنکھوں کے سامنے آگئی۔ اور پہلے لغت کے امام جس قاعدہ کو وضع کر کے اُس کی چند ہی مثالیں لکھ گئے تھے۔ مولانا نے اُس کی صدہا مثالیں لکھ دی ہیں۔ درس نظامی کی یہ بھی حیرت انگیز استعداد آفرینی ہے کہ اُس کے فیض یافتہ ہر مشکل پر غالب آجاتے ہیں۔ صدہا مثالوں کے ذریعہ سے یہ امر بایۂ ثبوت کو پہنچا دیا ہے کہ یہ عربی زبان کی خصوصی شان ہے کہ اُس کے الفاظ کی ترکیب کو چاہے جس طرح الٹو پلٹو نہ صرف یہ کہ وہ مہمل نہ ہوں گے بلکہ یہ کہ اپنے مخصوص معنی کو برابر قائم رکھیں گے مثلاً ق م ر کی ترکیب سے جو لفظ بنے گا بامعنی ہوگا اور اُس میں بلحاظ ان حروف کی شخصی و ترکیبی صفات کے اُس کے معنی میں "بتدریج ظاہر ہونا" پایا جائے گا۔ مختلف ترکیبیں ملاحظہ ہوں "قمر" چاند۔ (آہستہ آہستہ گھٹتا بڑھتا ہے) "رقم" لکھنا (ایک حرف کے بعد دوسرا اور ایک لفظ کے بعد دوسرا درجہ بدرجہ لکھا جاتا ہے) "مرق" شوربہ (آہستہ آہستہ تیار ہوتا ہے) "قرم" سردار قوم (مرتبہ سرداری تک انسان بتدریج پہنچتا ہے) "رمق" تھوڑی سی جان جو باقی ہو (ایسی حالت میں سانس اور نبض دونوں آہستہ آہستہ چلنے لگتے ہیں) "مقر" زہر قاتل (زہر کا اثر بتدریج ہوتا ہے) اس سے بڑھ کر لطافت "عسل" شہد۔ اس کا الٹا "لسع" ڈنک۔ شہد کی مکھی میں ایک طرف شہد ہے تو دوسری طرف ڈنک۔

اسی سلسلہ میں بعض الفاظ عربی جو عجمی الاصل خیال کر لئے گئے تھے مثلاً "سراج" چراغ اور "لجام" لگام اُن کا عربی الاصل ہونا قوتِ استدلال سے ثابت کیا ہے کہ بے اختیار تحسین زبان سے نکلتی ہے اسی سلسلہ

میں یورپ کے مستشرقین کی رایوں کی کمزوریاں متعدد پیرایوں میں ظاہر فرمائی ہیں۔

ساتواں باب آخری باب ہے۔ اور اُس میں عربی زبان کا حیرت انگیز کمال گویائی دکھایا ہی اس باب میں یہ بحث ہی کہ عربی زبان کے الفاظ کا صرف یہی کمال نہیں کہ وہ اپنے معنی کے ساتھ ایک نظم و تناسب رکھتا ہی۔ نہیں، بلکہ اُس کے معنی کو جب دقّت و تعمق کی نظر سے دیکھا جائے تو اُس شئے کی ایسی حقیقت سامنے آجاتی ہی جس کے اظہار کے لیے عجمیوں کو صدیاں درکار ہوئیں اور پھر بھی اس کا بیان ایک لفظ سے نہ کر سکے۔ اور اس تعجب خیز دعوی کو متعدد مثالوں سے ثابت فرمایا ہی۔ ایک دوسرا پہلو وضع الفاظ کے کمال کا یہ دکھایا ہی کہ عرب اگر کسی مہمل آواز کی بھی نقل کرتے تھے تو وہ با معنی ہو جاتا تھا۔ اور ایسا با معنی جو اپنی اصل کے ساتھ پوری پوری مناسبت رکھتا تھا مثلاً کوے کے بولنے گھوڑے کی ٹاپ اور ہانڈی کے جوش کھانے کی آواز کی جب عربوں نے محاکات کی تو اس کی نقل کے لئے جو الفاظ وضع کئے اُن کے معنی اصل کے ساتھ مناسبتِ تام ملحوظ رکھی۔ مثلاً کوّے کی آواز کی نقل عربی زبان میں "غاق غاق" ہے۔ چونکہ یہ نقل ایک سیاہ جانور کی آواز کی تھی اس لیے اس مادہ سے جو الفاظ لیجئے اُن کے معنی میں سیاہی کا مفہوم موجود ہی۔ دیکھو "تغیق بصرہ" (اس کی بینائی تاریک ہوگئی) "غیق فی رایہ" اس کو تیرہ رائے کر دیا۔ علی ہذا القیاس۔

خاتمۃ الباب میں "بے مثل مطالعہ صحیفۂ کائنات" کی بحث ہی۔ عربوں نے دفترِ کائنات کا مطالعہ جس عمیق نظر سے کرکے ہر ہر پہلو اور تعیین مدارج کو جدا جدا الفاظ کے ذریعہ سے بتایا اور دکھایا وہ انھیں کا حصہ تھا۔ عرب لکھنے پڑھنے سے عام طور پر بے بہرہ تھے تاہم لکھنے پڑھنے کے سامان کی مختلف حیثیتوں کے لئے جس قدر الفاظ عربی زبان میں ہیں شاید ہی کسی اور زبان میں ہوں۔ دیکھو جس "نے" سے قلم بنایا جاتا ہے جب تک اصلی حالت میں ہی "انبوبہ" ہے۔ اب قلم تراشنا شروع ہوا جو ریزے کٹ کر گرتے گئے اُن کا نام "براء" یا "برایہ"۔ قلم کے شگاف کو جس سے وسیع کرتے ہیں اُس کے لئے لفظ "لیطہ"۔ نوک کاٹنے کو "قط"۔ جس پر قط لگایا جائے وہ "مقط"۔ جب بن کر درست ہوگیا تو اُس کا نام "قلم" ہوا۔ طرف قط کو "رشن" کہتے ہیں۔ قلم کی تعریف ہی "قلم رشاش" (محرف قلم) جب قلم چلا تو اُس کی آواز کا نام "صریر" ہے۔

اسی طرح دوات اور روشنائی اور کتاب کے واسطے الفاظ ہیں۔ اس دقت نظر اور باریک بینی کو مولانا نے بہت سی مثالیں دے کر واضح اور مدلل فرما دیا ہے۔ یہ بحث جس قدر نازک ہے اسی قدر پر لطف اور خرد افروز ہے اسی پر کتاب کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

بیان بالا سے آپ کو واضح ہوا ہو گا کہ "المبین" نے عربی الفاظ کی پیدائش (مخارج) سے لے کر کمالِ عمر (کمالِ وضعِ الفاظ) تک کی ہر منزل سے بحث فرمائی ہے، اور میرا یقین ہے کہ مدلل بحث فرمائی ہے۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ علم دوست احباب و اصحاب اس کے مطالعہ سے لطف و بصیرت حاصل فرمائیں۔ طلبا کو اس کے مطالعہ کا موقع دیا جائے تاکہ وہ بھی تحقیق (اور آزادانہ تحقیقات) کے انداز سیکھیں، اس کے خوگر ہوں۔ علما اس کو مطالعہ فرما کر تحقیقات کا قدم اور آگے بڑھائیں۔ کاش اس رسالے کا ترجمہ عربی اور کسی یورپین زبان میں ہوتا تاکہ دوسرے ممالک کے اہلِ کمال بھی مؤلف علّام کی محنت و تحقیق کی داد دے سکتے۔ فقط [1]

[1] خود مولانا مرحوم نے اس کا عربی ترجمہ ایک صاحب معروف بہ "شامی صاحب" سے کرایا تھا جو "المبین" کی تالیف و اشاعت کے زمانہ میں مسلم یونیورسٹی میں عربی کے معلم تھے، اور اس خدمت کے معاوضہ میں شامی صاحب کی کتاب "تعلیم العربیہ" باہتمام بندہ اپنے صرف سے چھپوا دی تھی اور ان کا ارادہ یہ ترجمہ بھی چھپوانے کا تھا مگر حالات نے مساعدت نہ کی اور مسودہ غالباً ان کے متروکہ سامان کے ساتھ ان کے ورثا کے قبضہ میں گیا۔ محمد مقتدیٰ خاں شروانی

(رسالہ معارف اعظم گڑھ بابتہ ماہ اگست ۱۹۳۰ء)

صحیح بخاری کا ایک عتیق نسخہ

(کتاب خانہ حبیب گنج میں)

شہر ربیع الاول سنہ حال (۱۳۴۹) کے معارف میں کتاب خانہ ریاست رام پور کے صحیح مسلم کے نسخۂ عتیق کا ذکر ہے۔ "الشئی بالشئی یذکر" میرے کتاب خانہ میں ایک نسخہ صحیح بخاری کا عتیق ہے جلد اول۔ یہ نسخہ بخط عرب سمرقندی کاغذ پر لکھا ہوا ہے۔ سطر فی صفحہ ۳۱۔ لوح پر شمسہ طلائی و لاجوردی ہے۔ اس میں یہ عبارت بخط نسخ شنجرفی جلی خوشخط درج ہے "جلد اول صحیح بخاری۔ بخط نسخ عرب در آخر کتاب خط حضرت شیخ المحدثین عفیف الدین گازرونی است جلد سیاہ و ترنج سرخ و جدول طلائو بستہ بابتہ فتح شہر محمد آباد المعروف

بہ بیدہ جمع کتاب خانہ معمورہ عالم پناہ ابراہیم عادل شاہ خلد ملکہ شدہ ۹ رشعبان ۱۰۰۰؁ ہجری"۔ آخر کتاب میں لکھا ہے "بلغ مقابلۃ فی رجب ۸۷۰؁ھ ثمانین وسبعمائۃ" شیخ عفیف الدین گازرونی شارحین صحیح بخاری میں ہیں۔

صاحب کشف الظنون نے شروح صحیح کے ضمن میں شیخ ممدوح کا ذکر کیا ہے۔ عبارت یہ ہے "وشرح الامام عفیف الدین سعید بن مسعود الکازرونی الذی فرغ منہ فی شہر ربیع الاول ۷۶۱؁ھ" شیخ کی عبارت مذکورہ بالا ۷۶۱؁ھ ربیع الاول کی لکھی ہوئی ہے۔ اُس کے نیچے اُن کے پوتے عبدالکریم بن عبداللطیف کے ہاتھ کی عبارت اجازت ہے مورخہ ربیع الآخر ۸۴۴؁ھ خود کتاب کا سنہ کتابت نہیں۔ بہر حال ۸۴۴؁ھ سے پہلے کی لکھی ہوئی ہے۔ یہ نسخہ محشی و محفوظ ہے ۲۲۰ ورق ہیں۔

اِن نسخوں کا شاہی کتاب خانوں میں ہونا مسلّم۔ سوال یہ ہے کہ مثل مشارق الانوار وہ کہیں نظر افروز بھی ہوتے تھے؟ علما میں متداول تھے؟ داخل درس تھے؟ ان سوالوں کا جواب بظاہر نفی میں ہے۔ اگر نفی میں ہے تو نسخہائے عتیقہ کی برکت شاہی کتب خانوں تک محدود و منتہی ہو گی۔ فقط

(رسالہ معارف اعظم گڑھ بابتہ ماہ ستمبر ۱۹۳۰؁ء)

مُلّا سعد ٹھٹوی

ملا صاحب کی تین تصنیفیں ترتیب فہرست کتاب خانہ کی ضمن میں نظر سے گزریں تینوں مثنوی مولانا روم کے متعلق ہیں۔

(۱) باغ گلشن۔ تاریخی نام ۱۱۰۵؁ھ کی تصنیف۔ مثنوی شریف کا انتخاب "مشتمل بر داستان چند" یہ نسخہ ۱۱۰۶؁ھ کا لکھا ہوا ہے۔ شاہی کتاب خانہ اودھ میں رہ چکا ہے۔ نصیر الدین حیدر، سلیمان جاہ اور امجد علی شاہ کی مہریں ہیں۔

(۲) ہر شش دفتر مثنوی کے خطبات کا فارسی ترجمہ ۱۱۱۰؁ھ کا لکھا ہوا۔

(۲) شرح مختصر و فرہنگ لغاتِ مثنوی ۱۳۶ ورق مورخہ ۱۱۱۷ھ ہجری کاتب و مالک میر عبد القادر ابن میر محمد مراد ابن سید نور محمد الحسینی الرضوی الگرویزی الوری۔

فرزندانِ بہار میں سے کوئی صاحب مُلّا صاحب کے حالات پر روشنی ڈالیں تو چشم ما روشن دلِ ما شاد۔ فقط

(رسالہ معارف اعظم گڑھ بابتہ ماہ اکتوبر ۱۹۳۰ء)

عرب و ہند کے تعلّقات

"جناب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی جو حضرت استاذِ مرحوم کے حلقۂ احباب میں میرے واجب التعظیم مخدوم ہیں، اُنھوں نے میری حقیر تازہ تالیف "عرب و ہند" پر تبصرہ لکھ کر ذرہ نوازی فرمائی، یہ حضرت استاذ مرحوم کے ساتھ موصوف کی یہ سُنّتِ قدیم رہی ہے کہ اُن کی تصانیف پر وہ اکثر اور سب سے پیشتر تبصرے لکھا کرتے تھے، جو بجائے خود ادب و انشا کے جواہر ہوتے تھے۔ موصوف نے "عرب و ہند" پر تبصرہ لکھ کر غالباً اُسی سنت کو قایم رکھا ہے اور اپنی بزرگانہ پاس وضع کا یہ ایک نیا ثبوت پیش کیا ہے۔ مصرع "بلبل ہمیں کہ قافیۂ گل بود بس است

سلیمان"

قدرت نے عرب و ہند کا رشتۂ تعلق سمندر کے ذریعہ سے قایم فرمایا ہے۔ رہروانِ شوق ساحلِ ہند کو چھوڑ کر بے واسطۂ زمین سرزمین عرب میں داخل ہو جاتے ہیں۔ یہ ایما و اشارہ تھا کہ ہند و عرب کے تعلقات میں بھی وہی صفائی اور دلکشائی رہی ہوگی جو سمندر کا خاصّہ ہے۔

اغراض نے اور نظر کی کوتاہیوں نے سرچشمۂ صفا و وفا کو خس و خاشاک سے پاٹ دیا۔ وسعتِ مشرب کے سمندر کو چھوڑ کر تنگ اور تاریک خلیجیں پسند کرلی گئیں جن کا پانی رکاوٹ اور بندش سے مُتعفن ہو کر دل و دماغ کے لئے سمِ قاتل بن چکا تھا۔ جب عرب و ہند کے تعلقات کا تصور کیا جاتا تھا خبر

کے سر بفلک پہاڑ سنگ افشاں نظر آتے جن سے کبھی سر چکنا چور ہوتے کبھی ہاتھ پانوں پاش پاش۔ ضرورت تھی کہ گہری نگاہیں گوہر مقصود کا پتہ لگائیں، خس و خاشاک کو دور کر کے اصلیت کی تہ تک پہنچیں اور آج جب کہ دل مل جانے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے، دکھائیں کہ کبھی اس سرزمین پر محبت و ہمدردی کا ابر رحمت بھی برساتھا۔ اس کے لئے تصنع کی حاجت نہ تھی۔ واقعات کو بگاڑنے، و رنبانے کی ضرورت نہ تھی۔ صرف چہرۂ حقیقت کو بے نقاب کر دینا کافی تھا۔ مگر شاہد مقصود تک باریابی ہر ایک کی قسمت میں نہیں آئی ہے۔ کارکنانِ قضا و قدر نے یہ فتحیابی "سلیمانِ وقت" کے لئے محفوظ و مخصوص فرما دی تھی۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

ہندوستانی ایکاڈیمی مبارکباد کے قابل ہے کہ اُس نے انتخاب بجا اور بہت بجا کیا۔ مجلس مذکور نے مولوی سید سلیمان صاحب ندوی کو مدعو کیا کہ عرب و ہند کے تعلقات پر الہ آباد آکر لکچر[ئە] دیں۔ شاید الہ آباد گنگا جمنا کا سنگم ہونے کی وجہ سے اس کے لئے سب سے زیادہ موزوں مقام تھا۔ ان خطبات کی کامیابی کا اصلی راز وہ بنیاد ہے جن پر اُن کی عمارت تیار ہوئی ہے۔

اگر ایرانی اور ہندوستانی مورخوں کی طرف ہمارا فاضل دوست رخ کرتا تو یقیناً قبلۂ مقصود کج ہو جاتا۔ دقیقہ سنجی اور بلند نظری اُس میدانِ دلکشا میں اُن کو لے پہنچی جہاں عرب کی پاک و صاف ہوائیں رُشح پرورہ تھیں۔ تعصبات کی گندگی نے جہاں رسائی حاصل نہ کی تھی۔

سُلیمانِ زماں نے دیو و پری کی داستانوں کا سُنانا باعثِ عار سمجھا اور اُن نکتہ سنج حقیقت نگار مصنفین اور سیاحوں کو اپنا رفیقِ طریق بنایا جن کی فکر اور نظر میں اسلامی وسعت اور صدق پسندی تھی۔

سلیمان تاجر، ابن خردازبہ، ابودلف، مسعودی، ابن حوقل، بشاری، ابنِ بطوطہ اور ایسے بہت سے محقق سیاح، جغرافیہ نویس، تاریخ نگار ہیں جن کی کتابوں میں اسلامی تعلیم کے اثر سے مذکورۂ بالا صفات پوری طرح جلوہ فرما ہیں، فاضل خطیب نے انھیں کتابوں سے کام لیا ہے۔ نہ خیال کرنا کہ یہ کتابیں کہیں خس و خاشاک کے انبار میں اُن کے ہاتھ آگئی ہیں۔ نہیں۔ قریباً سب کی سب یورپ کی شائع کردہ اور پسندیدہ

ئە یہ لکچر مجموعہ کی شکل میں ایکاڈیمی کی طرف سے ٹائپ میں چھپے ہیں۔ اور دفتر ایکاڈیمی الہ آباد سے ملیں گے۔ ضخامت ۴۰۰ صفحے قیمت مجلد للعہ

ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ ان سے یہ کام اب تک نہ لیا گیا۔ ورنہ تعلقات کی یہ برباد کُن صورت نہ ہوتی۔ ان لکچروں کی وسعت چار سو ٹائپ کے چھپے ہوئے صفحات سے زیادہ ہے۔ تاہم یہ بیان مبالغہ سے خالی ہے کہ وہ خیالی مضامین یا عبارت آرائی سے بالکل پاک صاف ہیں۔ واقعات پر مورخانہ اور فلسفیانہ بحث کی ہے اور بحث کے صحیح نتائج سامعین و ناظرین کو سنائے اور دکھائے ہیں جو اہم اور نتیجہ خیز مطالب اس کتاب میں ہیں اُن کی فہرست ۲۵ صفحوں سے زیادہ پر ہے۔ اور خود اُن کی تعداد کم و بیش ۲۰۰ ہے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکیں گے کہ کس قدر غور و فکر اور وسیع اور عمیق مطالعہ کے بعد یہ لکچر تیار ہوئے ہوں گے۔

اس کتاب میں پانچ باب ہیں۔ پہلے باب کا عنوان "تعلقات کا آغاز اور ہندوستان کے عرب سیاح" ہے۔ اس باب میں جن مطالب سے بحث ہے اُن کا نمونہ ان عنوانوں سے معلوم ہو سکے گا۔ "ہندوستان مسلمانوں کا پدری وطن"۔ "ہندوستان کا بہشتی دریا"۔ "نورِ محمدی کا ظہور ہندوستان میں"۔ "سادات نیم ہندوستانی ہیں"۔ "لفظ ہند"۔ "ٹھاکر عربی زبان میں"۔ "جاٹ صحابہ کے زمانہ میں"۔ علیٰ ہذا القیاس۔ اسی سلسلہ میں ہندوستان کے عرب سیاحوں کا ذکر آتا ہے اور ابن خرداذبہ، سلیمان تاجر، ابوزید سیرافی، ابو دلف، بزرگ بن شہریار ملاح، مسعودی، ابن حوقل، بشاری، البیرونی، ابن بطوطہ۔ اور ان کے سوا اور مورخین اور جغرافیہ نویسوں سے اس باب میں تعارف ہو جاتا ہے۔

اپنے مشاہدوں میں جو حالات اور واقعات ان حقیقت نگار مصنفوں نے دیکھے اور لکھے ہیں اُن سے بحث کی ہے۔ مثلاً یہ اہم سوال کہ سندھ میں مسلمانوں کا مقابلہ کس سے ہوا۔ عام طور پر متعصب ہندو مانے جاتے ہیں۔ مگر دراصل وہ بدھ تھے۔ سندھ کا نقشہ جو ابن حوقل نے تیار کیا (جس کی نقل شامل کتاب ہے)، ہندوستان کی بولیاں، ایلیٹ کی تاریخ کی تکمیل کی بابت کارآمد مشورہ، یورپین مورخوں کے یونانی بیانات کو ہندوستان کی قدیم تاریخ کا واحد ماخذ ماننے پر بجا گرفت۔

دوسرے باب میں تجارتی تعلقات سے بحث ہے۔ اس باب میں اُن تعلقات کا دروازہ کھول دیا گیا ہے جو قدرتاً ملنساری اور خوشگوار پُرامن راہ و رسم کے متقاضی ہیں۔ یعنی تجارتی تعلقات دگر شاید آج یہ کلیۃً ٹوٹ چکا ہے) اس باب کی شانِ تحریر بالکل تاجرانہ نقطۂ نظر سے ہے۔ بحری راستے، بندرگاہیں،

منزلیں اور مسافتیں۔ ہندوستانی پیداوار (جن میں یادش بخیر آم اور پان بھی ہیں) اور بیوپار، مصنوعات، بحرِ ہند کے جہازات، ایک عرب ہندوستانی کا وطنی گیت۔ غرض وہ سب کچھ اس باب میں موجود ہے جو بحری تجارت کا لوازمہ ہے۔ اور جن سے بحث تاجرانہ ذوق کی متقاضی ہے۔ اس باب میں بعض اور دلچسپ واقعات بھی آجاتے ہیں۔ مثلاً قرآن کریم میں تین ہندی نام، بنیا عرب جہازوں میں، ہندوستان کے قدیم رُوسی تاجر۔

تیسرا باب دوسرے باب سے بھی زیادہ بلند پایہ ہے۔ اس لئے کہ اُس میں علمی تعلقات سے بحث ہے۔ اس باب میں بھی دقیق اور سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اس کے مطالعہ میں ہم جاحظ بصری، یعقوبی، ابن ندیم بغدادی ابوریحاں بیرونی، قاضی صاعد اُندلسی وغیرہم عالی مرتبہ علماء سے فیض یاب ہوتے ہیں۔

اس باب کی جانِ سخن "برامکہ" کے لفظ کی بے نظیر تحقیق ہے جس پر میں اپنے عزیز کو دلی مبارکباد دیتا ہوں۔ اور کہتا ہوں کہ تحقیق کا یہ نقش، ایک "بہاری قلم" کے انتظار میں پس پردۂ تقدیر تھا۔

آخر آمد زپس پردۂ تقدیر پدید

شروع سے دیکھئے۔ قدیم مورخوں کی نظر تو لفظ تک محدود رہی۔ برمک کو قدرۃً فارسی لفظ سمجھ کر زہر کا قصہ بیان کر دیا۔ جس نے ساری عمارت ڈھا دی۔ برامکہ کا دورِ حاضر کا محقق مُورخ پیرِ مُغاں کے ساغر سے سرشار ہو کر رہ گیا۔ معزز خطیب کی بحث کو بغور پڑھئے تو آپ پر واضح ہو گا کہ کس تحقیق سے یہ ثابت فرمایا گیا ہے کہ بلخ کا "نوبہار" جس کے پجاری برامکہ تھے آتشکدہ نہ تھا۔ بلکہ بدھوں کی خانقاہ تھی۔ عربوں نے اُس کا نقشہ اُس کے رسُوم، اُس کے لوازم سب ہی تو بیان کر دئے ہیں۔ اس مصالح کی بنیاد پر ثابت کیا گیا ہے کہ نوبہار۔ نَو وِہار تھا۔ فارسی لہجہ میں "نوبہار" بن گیا۔ جس طرح ہندی "دیہار" بھی "بہار" ہو گیا۔

برامکہ بُودھ تھے اور برمک دراصل سنسکرت کا لفظ پرمک تھا جس کے معنی برتر اور بڑے مرتبہ والے کے ہیں۔

چوتھا باب مذہبی تعلقات کے متعلق ہے۔ اس باب کی بحث کی بنیاد خصوصاً "کتاب البدء والتاریخ" ابوالعباس ایرانشہری، عبدالکریم شہرستانی، عبدالقاہر بغدادی اور مرتضیٰ زیدی کی تصانیف ہیں۔ بابِ ہذا

کی بیت الغزل وہ بحث ہے جس میں عرب اور ترک۔ مغل فاتحوں کا فرق بتایا ہے۔ پوری بحث کتاب میں غور اور کشادہ دماغ سے پڑھو اور تحقیق پر آفریں کہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ غوری، غزنوی اور خلجی وغیرہ قبائل نومسلم تازہ اسلام تھے اُن کی رگ و پے میں اسلام نے ایسی سرایت نہ کی تھی جو اُن کی کایا پلٹ کرکے افغانی وحشت اور ترکانی سفّاکی کو یکسر اسلامی اخوت و ہمدردی سے بدل دیتا۔ میں اس بحث کو لکھتا تو خلاصۃً یہ کہدیتا کہ اُن کو قرونِ خیر کا فیض نہ پہنچا تھا اور وہ اُستاد نہ ملے تھے جن کا تصرف انسانی دل و دماغ کو توحید کے نشہ سے سرشار کرکے مخلوق سے اُخوت و مساوات اور ہمدردی کا سبق یاد کرا دیتا تھا۔

ہمارا ملک قیامت تک ماتم میں رہے گا کہ یہاں صحابۂ کرام کا فیضِ تعلیم و تربیت نہ پھیلا۔ ورنہ آج ہندوستان کی ترقی میں کثرت و قلت، چھوت اور اچھوت کے روڑے نہ اٹکائے جا سکتے۔

واقعاتِ بابری دیکھو۔ خود بابر کہتا ہے کہ تورۂ چنگیز خانی اُس کے زمانہ تک سلاطینِ مغل کا دستور العمل تھا جس کے مقابلہ میں اسلامی احکام موثر نہ تھے۔ حالانکہ مغلوں کو مسلمان ہوئے صدیاں گزر چکی تھیں۔ شکر ہے کہ خود بابر اس تورے سے بیزار تھا اور مذہبی احکام کے مقابلہ میں اُن کو توڑ دیتا تھا۔ خلاصہ۔ افغانوں اور ترکوں کے "اُدخلوا فی السلمِ کافۃ" کا مصداق نہ ہونے کی وجہ سے اُن کی پالیسی اور زندگی میں اسلامی تعلیم کی وہ وسعت اور رواداری پیدا نہیں ہوئی جو عربوں میں تھی۔ ایک حال کا واقعہ سن لیجئے سرحدی حصہ میں ایک پٹھان نے اپنے دشمن کو پکڑ پایا۔ مہینہ رمضان کا تھا۔ فیصلہ کیا کہ روزے میں مسلمان کا قتل درست نہیں۔ روزہ کھول کر گولی کا نشانہ بنانا چاہیے۔ چنانچہ ہاتھ پاؤں باندھ کر ایک طرف ڈال دیا۔ شام کو کھانے پینے کی فکر ہوئی۔ لکڑی لینے جنگل میں نکل گیا۔ اسیر جفا نے کوشش کرکے ہاتھ کی رسّی ڈھیلی کی۔ ہاتھ نکل آیا تو سب رسیاں کھول ڈالیں۔ رفل جو وہیں رکھا تھا ہاتھ میں لے لیا۔ جوں ہی اُس کا مہربان نمودار ہوا ایک فیر میں کام تمام تھا۔ رفل اور کپڑے لے کر قیدی نے گھر کا راستہ لیا۔

آمدم بر سر مطلب!۔ نومسلم ترک و افغان کے مقابلہ میں عرب قدیم الاسلام تھے۔ سرچشمۂ اسلام سے ایسے سیراب کہ خود چشمۂ توحید اُن کے دلوں سے بہہ رہا تھا۔

اِن دونوں بیانوں کے بعد دکھایا ہے کہ عرب فاتحوں کا عمل کیا تھا اور اُس عمل کا اثر ملک کی ترقی پر کیا ہوا (خواہ وہ ترقی اخلاقی تھی یا معاشرتی، تمدنی تھی یا ملکی) سندھ کی وہ تاریخ جو عربی دورِ حکومت میں بنی، اُس تاریخ سے بدرجہا اعلیٰ اور اشرف ہے جس کو افغان، تُرک اور مغل بنا سکے۔

اِسی سلسلہ میں یہ بیان آجاتا ہے کہ عرب ہندوؤں کو کیا سمجھتے تھے۔ ثابت کیا ہے کہ اہلِ کتاب تو نہ سمجھتے تھے البتہ مُشابہ اہل کتاب مانتے تھے۔ اور یہی فیصلہ بنیاد اُس تمام برتاؤ کا تھا جو اُن کا ہندوؤں کے ساتھ تھا۔ یہ بیان فاضل مؤلف کی قوتِ اجتہاد کا شاہدِ عادل ہے۔ اس بحث کو پڑھ کر میرے دماغ نے یہ محسوس کیا کہ تاریخ کے منطقۂ حارّہ سے (جس کو ہمارے مہربانوں نے دِل سوز بھٹی بنا دیا ہے) نکل کر جان بخش اور روح پرور آب و ہوا میں آگیا۔ اس باب کو پڑھو اور واقعات کی شہادت پر مان لو کہ مسلمانوں کی حقیقی خالص سلطنت ہندوستان میں اُس سے بہت بہتر تھی جس کا بیان غزنوی دور کے آغاز سے مغلوں کے خاتمہ تک تاریخ میں ملتا ہے۔

پانچواں باب۔ "ہندوستان میں مسلمان، فتوحات سے پہلے" پر بحث کرتا ہے۔ اس باب میں بہت سے دلچسپ اور ضروری حالات اور مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ غور کے قابل یہ مسالہ ہے کہ علاوہ فاتح و مفتوح کے تعلقات کے دوسری قسم کے تعلقات ہندو مسلمانوں کے کیسے اور کیا تھے۔ واقعات شہادت دیتے ہیں کہ یہ تعلقات ہر لحاظ سے ہمدردی اور کشادہ دلی کا نمونہ تھے۔ ہندوؤں کی حکومت میں مسلمان ہر حیثیت سے (خواہ وہ جنگی ہو یا مُلکی، مذہبی ہو یا علمی، تاجرانہ ہو یا حاکمانہ) عزت اور اثر کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے۔ اسلامی فتوحات سے بہت پہلے ملتان، منصورہ، دیبل، مسلمان عُلما کے برکات سے مُشرّف ہو چکے تھے۔ منجملہ اُن کے ایک ابو المعشر نجیح سندھی اس پایہ کے امام تھے کہ خود اولوالعزم عباسی خلیفہ مہدی نے اُن کے جنازہ کی نماز پڑھائی۔ اسی عہد میں ابو عطا شاعر بھی تھا۔

اس باب میں دلچسپ بیان اُن اسلامی فرقوں کا بھی ہے جو اُس زمانہ میں سندھ میں تھے۔ اس سے اُن فرقوں کی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے جو آج بھی صوبہ بمبئی میں موجود ہیں۔

آج تبلیغ کی گرمیٔ ہنگامہ کے سلسلہ میں بابِ ہذا کا وہ بیان پڑھنے کے قابل ہے جس میں شیخ الاسلام

حضرت زکریا ملتانی، حضرت سید جلال بخاری قدس سرہما کے فیوضِ تبلیغی کا ذکر ہے۔ کاش آج کوئی شیخ الاسلام پیدا ہو جائے تو رنگ ہی دوسرا ہو جاتا ہے۔ سومریوں کے متعلق بحث پڑھنے کے قابل ہے۔

عالم خطیب نے ایک دوسرے میدانِ قلم میں بھی اپنی محققانہ رائے کا ثبوت دیا ہے۔ ایک سے زاید مقام پر یورپین علما کی غلطیوں پر گرفت کی ہے اور اُن کو صحیح راستہ دکھایا ہے۔

اس سلسلہ میں یہ کہنا ہم ضروری خیال کرتے ہیں کہ جہاں ایک حق شناس مؤلف یا خطیب کا فرض ہے کہ غلطیوں کی اصلاح کرے، بے راہی پر ٹوکے وہاں یہ بھی اخلاقی فرض ہے کہ پیرایۂ اعتراض ایسا ہو جس میں سختی یا خود شناسی کا واہمہ پیدا نہ ہو۔ مثلاً کسی کی رائے کی بابت کہنا کہ "قطعاً غلط ہے"۔ افسوس ہے کہ ایسا پیرایہ علامہ شبلی مرحوم کی تحریروں میں بھی ہے۔ جس رائے یا خیال کو غلط سمجھتے ہیں اُس پر شاہین کی طرح گرتے ہیں۔ میرا گمان ہے کہ یہ سر سید مرحوم کی صحبت کا اثر تھا۔ تفسیر احمدی میں مفسرین اور دیگر اکابر کو جن الفاظ سے یاد کیا ہے وہ اس کا بیّن ثبوت ہے۔

آخر میں ہم پھر ہندوستانی اکیڈیمی، خصوصاً اپنے مہربان سر تیج بہادر سپرو کو مبارکباد دیتے ہیں کہ اُن کی سعی سے ملکی ادب میں ایسی نادر کتاب کا اضافہ ہوا جیسی "عرب و ہند کے تعلقات" ہے۔ فقط

(رسالہ معارف اعظم گڑھ بابتہ ماہ نومبر ۱۹۳۰ء)

قاری عبدالرحمن صاحب محدث پانی پت

حیدرآباد سے واپسی کے بعد مولانا اپنی قلمی کتابوں کی فہرست بنانے میں منہمک رہے۔ چنانچہ ۲۳ رمضان ۱۳۲۹ھ کو نو مہینے آٹھ دن کے بعد اس اہم کام سے فراغت پائی۔ اوسطاً ساڑھے تین گھنٹے روزانہ کام کرتے رہے، اس اختتام کی خوشی میں آج سے اڑتیس ۳۸ برس قبل کی ایک یادداشت کی نقل معارف کے لئے عنایت فرماتے ہیں۔ یادداشت کے سادہ لفظوں میں جس پُر کیف ملاقات کا حال درج ہوا ہے اُس کی مستی آج بھی آنکھوں کی راہ دل میں سماجاتی ہے۔ معارف

۹ رجب ۱۳۱۱ھ ہجری کو زیارت جناب قاری صاحب کے قصد سے دلی سے روانہ ہوا۔ پانی پت پہنچ کر بعد نماز عصر مسجد محلۂ انصاریں قاری صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ برادرم مولوی محمد یونس خاں صاحب رئیس دتاولی بھی ہم سفر تھے۔ بعد سلام و پرسش مزاج بجواب سوال قاری صاحب میں نے کہا بھیکن پور رہتا ہوں اور محمد خاں زماں خاں مرحوم کا پوتا ہوں جنھوں نے مسائل اربعین کے جواب لکھوائے تھے۔ خوش ہوکر فرمایا جس زمانہ میں مولوی امین الدین جواب لکھوا رہے تھے میں طالب علم کی حیثیت سے حاضر مدرسہ ہوا کرتا تھا۔ بعد مکالمہ کے میں نے شاہ ولی اللہ صاحب کی اربعین پڑھی (جو میں ساتھ لے گیا تھا) میں قاری تھا، برادر موصوف سامع۔ رسالۂ مذکور قاری صاحب کے بیان کردہ مطالب حاشیہ پر لکھ کر میں نے داخل کتاب خانۂ حبیب گنج کردیا ہے۔ اس کے ختم ہونے پر برادر موصوف نے صحیح بخاری کی حدیث اول پڑھی۔ وہ قاری تھے اور میں سامع۔ قاری صاحب کی تقریر اربعین کے مطالب کے بیان میں بہت جچی تلی تھی۔ الفاظ بے تکلف ایک ایک ہوکر علیحدہ علیحدہ زبان پر آتے تھے۔ بیان صاف تھا، الفاظ بقدر معانی محتاط نہ۔ احتیاط کلام سے ہویدا تھی۔ پہلی حدیث کا مطلب بیان فرما کر پوچھا "میں نے کیا کہا؟" چونکہ سرسری تقریر سنی تھی میں نے تامل سے الفاظ یاد کرکے بیان کیے۔ بے تکلف فرمایا "میں نے یہ نہیں کہا"۔ مکرر سابق تقریر کا بجنسہ اعادہ فرمایا اور سوال مکرر۔ اب الفاظ بمقابلہ پہلے کے میں نے زیادہ مطابق تقریر ادا کیے۔ پھر فرمایا "میں نے یہ نہیں کہا"۔ تیسری مرتبہ تقریر کی۔ اب میں نے بجنسہ نقل الفاظ کردی۔ اسی طرح ہر حدیث کے مطلب کا بجنسہ اعادہ کرایا۔ ایک دو حدیث کے بعد توجہ تام ہوگئی تھی۔ اس سلئے میں پہلی ہی تقریر کے بعد اعادہ کردیتا تھا۔ مثلاً حدیث توبہ کے بیان میں یہ الفاظ فرمائے تھے: "توبہ کے تین رکن ہیں۔ ترکِ معصیت نقد الوقت۔ ایسا پچھتانا کہ بھری مجلس میں رسوائی ہوگئی۔ آیندہ معصیت مذکور نہ کرنے کا عہد۔"

اثنائے گفتگو میں شاہ عبدالعزیز صاحب کا ذکر فرمایا کہ شباب میں بینائی بالکل جاتی رہی تھی۔ اکثر تصانیف حالت نابینائی کی ہیں۔ میں نے شاہ صاحب کے کتاب خانہ کا حال پوچھا تو فرمایا کہ جو بہت پسندیدہ کتابیں تھیں وہ شاہ اسحٰق مرحوم بوقتِ ہجرت اپنے ساتھ لے گئے تھے اور وہ وزن میں نو من تھیں۔ باقی

کتابیں اُن کے ایما سے میں نے اور نواب قطب الدین خاں نے ہرّاج (نیلام) کر دی تھیں۔ اپنے سند کے متعلق فرمایا کہ میں نے صحاح ستہ شاہ اسحٰق صاحب سے پڑھیں اور پھر سالہا سال تک مدرسہ میں صبح سے عشا تک حاضر رہا۔ اس حاضری میں بہت سی کتابیں سماع میں آئیں۔ کلام مجید کی تفسیر تمام وکمال جناب میاں صاحب موصوف کی زبان سے وعظ میں سُنی۔ مولوی عالم علی صاحب مرادآبادی، مولوی علیم الدین صاحب کاندھلہ کے باشندے اور دو ایک اور صاحب میرے ہمدرس وہم سبق تھے۔ مولوی احمد علی صاحب سہارن پوری کی نسبت فرمایا کہ انھوں نے ہندوستان میں حدیث میاں صاحب سے نہیں پڑھی، مکۂ مکرمہ میں پڑھی تھی۔ جامع ترمذی اور تیسیر الوصول پوری تنقید سے پڑھیں۔ صحیح مسلم جب میں نے وہاں جا کر پڑھی تو وہ سامع تھے۔ فرمایا صحیح مسلم میں نے تین بار میاں صاحب سے پڑھی۔ ایک مرتبہ تمام وکمال۔ دوسری مرتبہ اول کا حصہ اور تیسری بار آخر کا۔ ایک دفعہ میاں صاحب بواسیر کے سخت دورے میں مبتلا ہو گئے تھے۔ چھ مہینے تک ایک عالم یاس رہا۔ اس عرصہ میں قاری صاحب اور اُن کے ساتھی حدیث مولوی حسن علی صاحب لکھنوی سے پڑھتے رہے۔ قاری صاحب کی ایک اجازت مولوی صاحب موصوف سے بھی ہے۔ مولوی حسن علی صاحب مولوی الٰہی بخش صاحب کے شاگرد تھے، مولوی الٰہی بخش صاحب شاہ عبدالعزیز صاحب کے۔ قاری صاحب کو اجازتِ حدیث بعض مشائخِ عرب سے بھی تھی، جن میں سے بعض کی سند کا سلسلہ شیخ ابراہیم کردی سے تھا، بعض کا شیخ ابو طاہر سے۔

فنِ تجوید قاری صاحب نے امروہہ جا کر قاری امام الدین صاحب سے حاصل کیا تھا۔ مخرج ضاد کی بابت (بجواب سوال مولوی یونس خاں) فرمایا کہ زبان کا پہلوئے چپ اوپر کی بائیں ڈاڑھوں کی جڑوں سے رگڑ کر نکلے تو یہ حرف ادا ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص عمداً بجائے اُس کے ظ کی آواز نکالے تو نماز باطل ہے۔ مجبوراً کرے تو وہ جاہل ہے۔ اُس کی نماز خود تو درست ہو گی، قابلِ امامت نہیں۔

برادر موصوف نے مولود شریف میں قیام کی بابت سوال کیا تو فرمایا۔ میں کیا کہوں۔ قرآن و حدیث وفقہ میں اس کا ذکر نہیں۔ جب متقدمین کی تصانیف عالمِ وجود میں آئیں اُس وقت تک اس کا

وجود نہ تھا۔ متاخرین نے یہ طریقہ ایجاد کیا اور ان کا ذکر اپنی تصانیف میں کیا ہی۔ ان کو ہم نہیں مانتے۔ ایک طرف یہ ہی کہ اس مجلس خاص میں تو قیام کرنا عین ایمان ہوا اور ویسے آپ کا ذکر بارہا ہو میلاد کا بھی ذکر آئے، اور احوالِ مبارک بھی بیان ہوں، اُس میں کوئی کھڑا نہ ہو۔ یہ عجیب بات ہی۔ دوسری طرف یہ شدت ہی کہ کفر و شرک بتاتے ہیں۔ آخر رسول اللہ کی تعظیم تو ہی۔ (دوسری طرف.... الخ یہ عبارت پوری یاد نہیں اس وقت لکھی ہی) اس لئے میں کچھ نہیں کہتا۔"

برادرِ موصوف نے مولوی نذیر حسین صاحب دہلوی کے تلمذ کی بابت دریافت کیا تو فرمایا کہ جس روز میاں صاحب ہجرت کر کے روانہ ہوئے اُس روز یہ اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور چند کتابوں کی اوائل کی ایک ایک حدیث پڑھی اور پڑھ کر کل کتابوں کی اجازت حاصل کی۔ میاں صاحب نے ایک چھوٹے کاغذ پر یہی واقعہ لکھ کر دے دیا۔ اس سے پہلے مدرسہ میں پڑھنے کو کبھی نہیں آئے۔ کوئی مسائل پوچھنا ہوتا تھا تو دوسرے تیسرے مہینے آ جاتے تھے۔ میاں صاحب کا مدرسہ بیرم خاں کے تراہے پر تھا۔ شاہ عبدالعزیز صاحب نے اپنی زندگی میں اُن کے واسطے یہ مدرسہ بنوا دیا تھا۔

میں نے قاری صاحب کے سن کی بابت دریافت کیا۔ فرمایا ٹھیک یاد نہیں۔ شاہ عبدالعزیز صاحب کے وعظ میں اپنے والد کے ساتھ جایا کرتا تھا۔ اور کلام اللہ حفظ کر چکا تھا۔ (اس حساب سے ملاقات کے وقت قاری صاحب کا سن کم و بیش نوے برس کا تھا) قاری صاحب کا بدن لاغر، قد لانبا، رنگ گندمی، آنکھ اور ناک بڑی، آواز بھاری تھی۔ مزاج میں تیزی معلوم ہوتی تھی۔ رائے کے اظہار میں قطعاً بے دھڑک تھے۔ کبرسن کے آثار صحت پر غالب آ چکے تھے۔ ڈاڑھی گھنی تھی، قدرتاً چھوٹی، مہندی لگی ہوئی۔ سر پر بال پورے۔ لباس، انگرکھا دوں کرتے کے۔ سر پر عمامہ سپید۔ پاجامہ غالباً تنگ (میں نے قاری صاحب کو بیٹھا دیکھا تھا اس لئے ٹھیک اندازہ نہ کر سکا)۔

قصبہ میں کچھ املاک ہی اُس سے بفراغت بسر ہوتی ہی (یہ یادداشت ملاقات کے تیسرے روز ۱۱ رجب المرجب روز جمعہ ۱۳۳۱ھ ہجری کو کتاب پر قلمبند کی گئی)۔

اب افسوس ہوتا ہی کہ شاہ عبدالعزیز صاحب اور شاہ اسحٰق صاحب کا حلیہ قاری صاحب سے نہ پوچھا۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔ فقط

(رسالہ معارف اعظم گڑھ بابتہ ماہ اپریل ۱۹۲۱ء)

حبیب گنج کا کتاب خانہ کس طرح جمع ہوا

یہ تو یاد نہیں کہ میری عمر اُس وقت کیا تھی مگر یہ کہہ سکتا ہوں کہ محض بچّہ تھا جب یہ دیکھا تھا کہ والد مرحوم کو کتابوں کا اور کتاب دیکھنے کا شوق تھا۔ شب کو ایک مُعیّن وقت پر کھانے سے پہلے کتاب دیکھتے تھے۔ زیادہ تر فارسی کی تاریخیں مثلاً تاریخ فرشتہ، سیر المتاخرین یا ادب اُردو مثلاً بوستانِ خیال۔ گفتگو میں اکثر بادشاہوں کے تاریخی واقعات بیان فرماتے۔ دوپہر کو لیٹ کر سونے سے قبل بھی کتاب دیکھتے۔ جب میں اُردو پڑھنے لگا تو مرزا غالب کی اُردوئے معلّٰی کا نسخہ مجھ کو عنایت ہوا تھا۔ میں اس کو دیکھتا۔ کچھ سمجھتا بہت کچھ نہ سمجھتا۔ تاہم دیکھے جاتا۔ اور اتنا دیکھا کہ والد مرحوم تنگ آجاتے۔ منع فرماتے۔ ذوقِ ادب کی یہ بُنیاد تھی۔

ایک کتاب فروش تھے عبدالرحیم نامی۔ اپنی گٹھری لے کر مکتب میں درسی کتابیں بیچنے آتے۔ درسی کتابوں کے سوا چھوٹی چھوٹی نظم کی کتابیں دکھا کر شوق دلاتے کہ بچے خریدیں۔ مثلاً نور نامہ۔ حضرتِ بلالؓ کا قصہ۔ جملہ معترضہ۔ ہم کتابیں دیکھتے تو استاد کہتے جاتے "لڑکو۔ مصطفائی یا نظامی مطبع کی کتاب لینا، نولکشوری نہ لینا"۔ یہ صحیح کتاب کا اہتمام تھا۔ درسی کتابوں کی قیمت تو بزرگوں کی سرکار سے ملتی۔ غیر درسی کی خود دینی ہوتی۔ اتوار کے دن ہمارے یہاں بازار لگتا تھا۔ اُس میں پیسے ملتے تھے۔ انھیں میں سے اس کام میں صرف ہوتے۔ خوب یاد ہے کہ ایک بار کتاب فروش کے ایک روپیہ چھ آنے میرے ذمہ واجب ہوگئے۔ میرے پاس صرف چھ پیسے تھے۔ تقاضا کے بعد دھمکی دی کہ "خاں صاحب سے کہوں گا"۔ یہ بڑی دھمکی تھی۔ قرض کی چیز لینا سخت جُرم تھا۔ اُس رات جو فکر رہی وہ آج تک یاد ہے۔ دوسرے روز کچھ کتابیں واپس دیں۔ کچھ بدلے میں دیں۔ پاس کے پیسے دئے جب تقاضا ہلکا ہوا۔ بچپن کے اسی شوق کا یہ اثر تھا کہ رات کو زنانہ میں یہ کھیل ہوتا کہ کوئی چادر بچھا دی جائے نماز مل جاتی تو لپیٹ کر گٹھری بنائی جاتی اور کتابیں بیچی جاتیں۔ بیبیاں دیکھ کر تعجب کرتیں۔

بہرحال یہ شوق کتابیں دیکھنے کا عبدالرحیم موصوف نے لگایا تھا غفرلہٗ۔ استعداد کے ساتھ کتابوں کا معیار بھی بڑھتا گیا۔ اب نورنامہ وغیرہ تو موجود نہیں۔ البتہ اُن سے خریدی ہوئی شیخ سنہ نثر ظہوری وغیرہ کتابیں موجود ہیں۔ اُن میں سے بعض پر ۱۳۰۰ھ ہجری میرے قلم سے درج ہے۔ انھیں کتابوں کی خریداری کے ساتھ اُردو دواوین کا شوق ہوا۔ ایک واقعہ کی مدد سے یاد آتا ہے کہ ۱۸۸۳ء تک سو سوا سو کتابیں جمع ہو چکی تھیں۔ ایک صندوق پلنگ کے پاس رہتا تھا۔ اس میں یہ کتابیں اور لکھنے پڑھنے کا سامان رہتا۔ اسی طرح کتابیں بڑھتی رہیں۔ جب علٰحدہ کمرہ رہنے کو ملا تو والد مرحوم نے اُس میں ایک الماری کتابوں کے واسطے بنوا دی۔ یہ الماری جب تک بھری نہ تھی۔ یہ اُس وقت کا ذکر ہے کہ قطبی وغیرہ کتابیں پڑھتا تھا۔ ۱۸۸۵ء میں انگریزی پڑھنے کے لیے آگرہ گیا۔ وہاں قلمی کتابیں دیکھنے اور خریدنے کا موقع ملا۔ یاد آتا ہے کہ سب سے پہلے قاضی ابوزید مروسی کا رسالہ مساحت خریدا۔ واقعاتِ بابری کا ایک نادر قلمی نسخہ آگرہ کالج کی لائبریری میں تھا جو ندرت کی وجہ سے سیف میں رکھا جاتا تھا عمِ محترم مرحوم کی اجازت سے اُس کی نقل ۱۸۸۸ء میں کرائی۔ اسی زمانہ میں علامہ شبلی مرحوم سے ملاقات ہوئی۔ اُن کے فیض صحبت سے وسعتِ نظر پیدا ہوئی۔ پٹنہ، رام پور وغیرہ کے کتاب خانوں کے حالات سُنے۔

یہی زمانہ تھا کہ والدہ مرحومہ کے معالجے کے سلسلہ میں دلی جانا اور رہنا ہوا۔ خریداریِ کتب کا شوق ساتھ تھا۔ مولوی سلیم الدین خاں صاحب مرحوم بہت وسیع پیمانہ پر قلمی کتابوں کی فروخت کا کاروبار کرتے تھے قیمت پوری لیتے تھے۔ اُن سے بلا بعض کتابیں خریدیں مثلاً دیوان طالب آملی کا قلمی نسخہ ایک کباڑی کے یہاں سے کشف الحجاب فی علم الاصطرلاب کا عمدہ نسخہ خریدا۔ اُسی کی معرفت بعض اور کتابیں اور خوشخط قطعات خریدے۔ قطعات کا یہ پہلا شوق اور خریداری تھی۔ جملہ معترضہ "زر زر کشد" کا تجربہ ہوا۔ حکیم سعدالدین احمد صاحب ہمارے یہاں لکھنؤ کے ایک طبیب تھے۔ حکیم یعقوب صاحب مرحوم کے شاگرد۔ اُس عہد کی تہذیب کے موافق خوشخط تھے۔ خطاطی کی باقاعدہ مشق کی تھی۔ میں نے دلی کے قطعات کا سرمایہ اُن کو دکھایا تو میرا شوق دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ جو قطعے اُستادوں کی نشانی اُن کے پاس تھے وہ مجھ کو عنایت کر دیے۔ اب تک اُن کی یادگار کی تصریح کے ساتھ کتاب خانہ میں محفوظ ہیں۔

آدم بر سر مطلب۔ جو قلمی چیز خریدی جاتی علامہ مرحوم کو دکھائی جاتی۔ جرح کرتے اور کوشش فرماتے کہ نگاہ بلند ہو۔ انھیں کے ذریعہ سے لکھنؤ کے قلمی کتاب فروشوں سے سابقہ ہوا۔ جن کو مولانا "غارتگر" کہتے تھے۔ وہ کتاب ایسی دکھاتے تھے کہ نہ لینا ممکن نہ ہوتا۔ قیمت ایسی طلب کرتے کہ دیوالیہ کر دیتے۔ اب بھی اُن کی قیمت دیکھتا ہوں تو گرانباری محسوس ہوتی ہے۔ لکھنؤ کی مدد سے قلمی کتابوں کا سرمایہ بڑھتا رہا۔ دوسرے مقامات سے بھی کتابیں ملتی ہیں۔ اب اتنا سرمایہ ہو گیا تھا کہ رہنے کے کمرہ میں چاروں طرف چھوٹی بڑی الماریاں کتابوں سے معمور پیش نظر رہتی تھیں۔ حفاظت سے رکھتا۔ تھوڑی بہت فہرست، یہ سب اپنے ہی ہاتھ سے کرتا۔

ایک بار استاذ العلما مولانا لطف اللہ صاحب مرحوم کی ایک صاحبزادی کی شادی مولانا کے وطن علی گڑھ میں ہوئی۔ میں بھی حاضر ہوا۔ عجیب عالم تھا۔ تلامذہ کا کثیر مجمع تھا جن میں نامور علما بھی شامل تھے۔ مثلاً مولانا سید محمد علی صاحب مولانا احمد حسن صاحب۔ مولانا عبد الغنی خاں صاحب۔ مولانا عبد الجمیل صاحب۔ لطف یہ تھا کہ مہمانوں کے سامان پہنچانے پر ہر طرف مولوی ہی مولوی نظر آتے تھے۔ پلنگ، پانی، برتن، غرض جملہ اشیا اہل علم ہی کے ہاتھ سے پہنچ رہی تھیں۔ میرے یہاں جب سامان لانے لگے تو میں نے معذرت کی کہ آپ نہ لائیں۔ ایک صاحب نے جو واقف تھے ہنس کر کہا کہ "یہاں مولویوں کے سوا اور ہے کون، جو تمہارے لئے سامان لائے گا"۔ غرض ان حضرات میں سے بعض کو میں نے تکلیف دی کہ شادی کے بعد حبیب گنج تشریف لائیں۔ کرم فرمایا۔ کتاب خانہ دیکھا۔ متعارف فنون کا اتنا سرمایہ جمع ہو چکا تھا کہ قابلِ تحسین ٹھہرا۔

مولانا سید محمد علی صاحب اور علامہ شبلی کی تشویق سے بیرونی ممالک کی کتابوں کے خریدنے کا شوق ہوا۔ ندوۃ العلما کے جلسوں کے سلسلہ میں کانپور جانا ہوتا تو مولوی نور الدین مرحوم اور مولوی سلیمان صاحب تاجر کتب مصریہ کی فہرستیں دیکھ کر کتابیں خریدی جاتیں۔

قدم آگے بڑھا تو بمبئی، مصر، شام اور یورپ سے کتابیں آنے لگیں۔ متفرق طور سے بھی کتابیں

لے مولوی سید ظہور الاسلام صاحب فتحپوری غفرلہٗ ۱۲

(اور نادر کتابیں) ہاتھ آتی رہیں- یہ ارزاں مل جاتیں- مثلاً مباحث مشرقیہ امام رازی کا نسخہ ایک بیوہ شریف زادی کے یہاں سے تین روپیہ کو ملا- الٰہ آباد سے ایک صاحب نے ایک بیوہ کا مال گلستان کا نادر مصور نسخہ بے طلب بھیجدیا جب دس[1] روپیہ قیمت بھیجی تو دعا اور شکریہ بھی ملا- جو نادر کتاب ہاتھ آتی علامہ شبلی مرحوم کو مطلع کرتا وہاں سے تحسین آتی- یاقوت مستعصمی کا لکھا ہوا کلام مجید کا نسخہ ہاتھ آیا تو نیاز نامہ کے جواب میں فرمایا "کانوں میں بیٹھے ہوئے بغداد تک چھاپے مارتے ہو" اس کلام مجید کے دستیاب ہونے کا واقعہ بھی شنیدنی ہے-

ایک علمی اور درویشی خاندان کے صاحبزادہ نے روش خاندانی بدل کر باپ کی موجودگی میں سرمایہ علمی پر دست درازی شروع کردی- ایک بار ایک نادر نسخہ معمولی داموں پر یہاں فروخت کر گئے- چلتے وقت کتاب دار سے کہا کہ یہ تو معمولی چیز تھی- ہمت ہو تو ایک چیز لاؤں- کہا گیا "ضرور" دوبارہ آئے تو یاقوت مستعصمی کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن شریف کا وہ نادر روزگار نسخہ لائے کہ آنکھیں کھل گئیں- ظفر خاں شاہ جہانی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ عبارت اس پر تھی "بقلم یاقوت مستعصمی کہ بہتر ازیں نوشتہ اند"- ہدیہ چالیس[للعہ] روپیہ لے گئے- چند روز بعد اہل خاندان کو خبر ہوئی- وہ اس کے ذریعہ سے زیادہ نفع کے امیدوار تھے- بعد مشورہ چالیس[للعہ] روپیہ دے کر صاحبزادے کے والد کو میرے پاس بھیجا میں ایک جگہ عزیزداری میں گیا ہوا تھا وہاں ملے- تخلیہ کی فرمائش کی- کھٹک گیا- تنہائی میں لڑکے کی نالائقی کا شکوہ فرما کر دریافت کیا کہ آیا کلام مجید کا نسخہ حبیب گنج پہنچنے کی خبر صحیح ہے- مشکل کا سامنا ہوا- آپ خیال کر سکتے ہیں کہ شوق کا تقاضا کیا ہوا ہوگا- دل نے کہا کہ خطاب کرنے والے سید ہیں معاملہ کلام مجید کا- جھوٹ بولنا روا نہیں- صاف واقعہ کہہ دیا اور واپسی کا وعدہ کیا- سید صاحب یہاں تشریف لائے تو نسخہ واپس کر دیا- چلتے وقت فرمایا "وقف ہے- حفاظت نہ ہو سکی تو تمہارے پاس امانتاً رکھوا دوں گا" آگے سنئے- صاحبزادے چالیس[للعہ] روپیہ میں ہدیہ کر گئے تھے خود بزرگوار نے بارہ[عہ] روپیہ میں گروی رکھ دیا- مجھ کو کسی

---

[1] اس نسخے پر سلاطین اودھ کی مہریں ہیں- بیوہ سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اُن کے نانا غازی الدین حیدر بادشاہ کو کتاب سنایا کرتے تھے-

ذریعہ سے معلوم ہوا تو زرِ رہن بھیج کر نسخہ اپنے پاس منگوا لیا۔ سید صاحب نے پھر کرم فرمایا۔ نسخہ پھر حوالے کر دیا گیا۔ اس مرتبہ اُن کے زرِ طلب عزیز ایک ریاست میں لے گئے اور ساڑھے گیارہ سو روپیہ میں ہمیشہ کے لئے اپنے آپ سے اس عزیز کو جدا کر دیا۔ میں نے اس واقعہ کا پہلا حصہ علامہ شبلی سے بیان کیا تو فرمایا "تمہاری شرافت تمہارے شوق پر غالب آئی۔"

جب حیدرآباد میں تعلق ہوا تو وہاں بھی عمدہ موقعے کتابوں کے حاصل کرنے کے ملے۔ خود اپنے بزرگوں کے کتاب خانوں کے سرمایہ سے بھی اضافہ ہوا ہے۔ منجملہ اُن کے بعض نادر نسخے ہیں مثلاً تفسیر جلالین کا ایک نسخہ عہد قطب شاہی کا نفیس لکھا ہوا۔ تاناشاہ کے بعض حاشیے اس پر درج ہیں۔

داستانِ بالا سے معلوم ہوا ہوگا کہ یہ میرا مختصر کتاب خانہ نصف صدی سے زیادہ کی تلاش کا سرمایہ ہے۔ الحمدللہ کہ اس میں ایک نسخہ بھی سرقہ یا ناجائز ذریعہ کا حاصل کیا ہوا نہیں ہے۔ بلکہ ایسا ہوا ہے کہ فروشندہ نے ناواقفیت سے کم قیمت مانگی میں نے زیادہ دام دئے۔ بہت سی کتابیں نقل کے ذریعہ سے بھی حاصل ہوئی ہیں۔ سفرِ حج میں حرمین شریفین میں بھی کتابیں ہاتھ آئیں۔ احباب اور اعزہ کے ہدایا نے بھی سرمایہ بڑھایا۔ تحفۂ اثنا عشری کا نسخہ منشی احتشام علی صاحب کا عطیہ ہے۔ جو خود شاہ صاحب نے صحیح کرا دیا تھا۔ بعض دفعہ حماقتیں ہوئیں جن پر اب تک افسوس ہے۔ ایک حماقت سُن لیجئے۔ بوستان سعدی کا ایک نسخہ آیا۔ مشہور خطاط (غالباً اسحٰق) کے ہاتھ کا لکھا ہوا بفرمائش شاہی۔ کئی مغل بادشاہوں کی مُہریں اور دستی عبارتیں لکھی ہوئیں، جن میں جہانگیر اور شاہ جہاں شامل تھے۔ اُس کی آراستگی قابلِ دید تھی۔ تین سو روپیہ قیمت تھی۔ ایک دوست نے بھیجا۔ چند روز رکھا رہا نہ معلوم دماغ اُن ایام میں صحت کے کس درجہ میں تھا کہ نہ لیا۔ واپس کر دیا۔ خود اُن دوست نے خرید لیا۔ اب میں ہوں اور وہ دوست۔ طرح طرح سے پھسلاتا ہوں مگر اُن کا دل نہیں پسیجتا۔ اگر معارف کے قارئین میں سے کوئی صاحب میری مدد فرمائیں تو اُن کا نام بھی بتا دوں۔

کتابوں کے جمع کرنے میں زیادہ اہتمام قلمی نسخوں کا رہا ہے۔ مطبوعہ علمی اور فنی کتابیں جمع کی ہیں۔ معمولی کتابوں سے تعداد بڑھانا کبھی پیشِ نظر نہیں رہا۔

اس تمام تجزیہ سے قدیم زمانہ کے علمی و کتابی شوق کا جو اندازہ ہوا ہے اُس کے مقابلہ میں عہد حاضر کی بے ذوقی بلکہ بد ذوقی دیکھ کر دل دُکھتا ہے۔

اس وقت کتاب خانہ میں کُل جلدیں ۴۱۷۳ ہیں۔ ان میں سے ۳۱۱۱ مطبوعہ ہیں۔ اور ۱۰۶۲ قلمی اب ایک وسیع عمارت بھی اُس سرمایہ کے لئے تنگی کر رہی ہے جو اوسط پیمانہ کے صندوق سے شروع ہوا تھا۔

ترتیب فن وار ہے۔ کتابیں عربی، فارسی، اُردو۔ تینوں زبانوں کی ہیں۔ انگریزی کی بھی ۱۰۷ ہیں۔ جو فہرستِ بالا سے خارج ہیں۔ فہرستیں ایک سے زیادہ مُرتب ہو چکی ہیں اور بعض ہنوز زیرِ ترتیب ہیں۔ سرمایہ الحمد للہ برابر ترقی پذیر ہے۔ حال میں دِلّی کے ایک کباڑی کے یہاں سے قدیم مطبوعات کے بہت سے نسخے ملے ہیں ؎

ہنوز آں ابرِ رحمت دُرفشانست

خم و خمخانہ با مُہر و نشانست

(رسالہ معارف اعظم گڑھ بابتہ ماہ اکتوبر ۱۹۳۱ء)

آج یہ مقالہ ارتجالاً پڑھا۔ اب کتابوں کی تعداد اس کتاب خانے میں ۶۰۹۰ مندرجۂ فہرست ہے۔ تعداد مندرجۂ مقالہ سے ۱۹۱۷ زائد۔ یعنی ڈیوڑھی تعداد ہو گئی۔ فالحمد للہ تعالیٰ علیٰ ذٰلک۔ اور یہ بارہ سال میں ہوئی ہے۔ اس طرح فی سال ڈیڑھ سَو ۱۵۰ سے زائد کتابوں کا اضافہ ہوا۔ علاوہ فہرست بھی کتابیں ہیں جو ہنوز درج فہرست نہیں ہوئی ہیں۔

حبیب الرحمٰن۔ ۹ جمادی الاول ۱۳۶۳ھ

(۳ مئی ۱۹۴۴ء)

مے و مے خانہ

کتب خانۂ حبیب گنج کی فہرست کا گوشوارہ

سابق میں اپنے کتاب خانہ کے قلمی سرمایہ کی فہرست مرتب کرنے کی اطلاع معارف کے ذریعہ سے اہل علم کو کی تھی۔ اس کے بعد ایک مرحلہ اور طے ہوا۔ اپنے ذوق کے مطابق ایک گوشوارہ تیار کیا ہے۔ اس کے عنوان بھی خود ہی تجویز کئے ہیں۔ قارئین معارف کی خدمت میں اصلاح و اطلاع کے لئے پیش کرتا ہوں۔ ممکن ہے دوسرے کتاب خانے ان میں سے کسی عنوان کو اپنے لئے پسند فرمائیں اس گوشوارے کا خیال یوں بھی ہوا کہ ایک امریکن[1] خاتون یہاں صرف مطلا و مذہب کتابیں دیکھنے آئی تھیں دکھائی گئیں۔ مگر فہرست جداگانہ نہ ہونے سے ملاحظہ تام نہ ہو سکا۔ گوشوارہ کے عنوان حسب ذیل ہیں:۔ (عنوان چونکہ جدید ہیں اس لئے شاید نامانوس ہوں یا ناموزوں۔ عدم موزونیت کی اصلاح کا ارباب ذوق سے آرزومند رہوں گا)۔

(۱) **المذہبیات**۔ اس عنوان کے تحت صرف وہ کتابیں ہیں جو طلائی کام کے لحاظ سے امتیاز رکھتی ہیں۔ ان کتابوں کی مدد سے مختلف عہدوں اور ملکوں کے انداز اور ذوق کا پتہ لگ سکتا ہے۔ ماوراء النہر ایران، عرب، ترکی، کشمیر، ہندوستان وغیرہ ممالک کا ہنر سامنے آجاتا ہے۔ مختلف ادوار کی ترقی و تنزل مذاق کا پتہ لگ سکتا ہے۔

(۲) **الخطاطیات**۔ اس عنوان کے تحت میں مسلّم خطاطوں کے قلم کی کتابیں درج ہیں۔ مثلاً میر عماد، میر علی کاتب وغیرہ۔

(۳) **الخطیات**۔ یہ وہ کتابیں ہیں جو اعیانِ ملک کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں یا ان کے خط سے مزین ہیں۔ مثلاً ابو الحسن آصف خاں شاہ جہانی، حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی۔

(۴) **المجلدات**۔ قدیم جلد سازی کے نمونے۔

۱؎ لیڈی کرامبرنی

(۵) **السلطانیات** - جن کتابوں کا سلاطین سے خاص تعلق ہے، وہ اس عنوان میں لکھی گئی ہیں۔ مثلاً ابراہیم عادل شاہ کے کتاب خانہ کی صحیح بخاری حصنِ حصین کا نسخہ پیشکش شاہزادہ عالی جاہ اعظم شاہ بحضرت عالمگیر بادشاہ در سنہ جلوس۔

(۶) **الفتوحیات** - وہ کتابیں جو سلاطین کے کتاب خانوں میں فتح کے مالِ غنیمت میں سے داخل ہوئیں مثلاً مثنوی گوے چوگان ملا عارفی نوشتہ میر علی کاتب جو عالمگیر بادشاہ کے کتاب خانہ میں گولکنڈہ کی فتح کے مالِ غنیمت میں سے داخل ہوئی۔

(۷) **المقامیات** - وہ کتابیں جن پر مقام تحریر وغیرہ درج ہے۔ مثلاً قسطنطنیہ، مدینہ منورہ، مکہ مکرمہ، بلخ، بخارا، وغیرہ دارالسلطنتوں سے لے کر دیہات تک سب درجوں کے نام اس فہرست میں ہیں۔ کبھی ہمارے علمی فیض سے ایک عالم منور تھا۔ اب یاد ہے اور حسرت۔ ایک مقام قوچون ہے۔ معجم البلدان میں اس کا پتا نہیں۔ شاید اہل معارف پتا بتا سکیں۔

(۸) **الختمیات** - جن کتابوں پر مہریں ہیں۔ اس فہرست سے ذوقِ ادب کے سوا مہروں کی تاریخ عیاں ہو جاتی ہے بعض مہریں کس قدر دلگیر ہیں۔ "نظام الدین بیچارہ نہ ایں نہ آں" "ایں نیز بگزرد"۔ اس مہر کو بار بار پڑھا۔ کتاب کو دیکھا۔ دل نے کہا "آخر گزر ہی گیا" جب سے اب تک خدا معلوم کیا کیا اور کون کون گزر گیا۔ ایک مہر عجیب ہے دو تو بڑی امرا شاہی کی شان کی۔ نہایت خوشخط واضح الحروف ہے۔ الفاظ بجنسہ نقل کیے جاتے ہیں۔ شاید کسی طرف سے روشنی پڑے کہ یہ کون امیر تھے، کس نسل یا ملک کے تھے۔ نقل (دوینگ ڈیل دیریانوں فدوی محمد شاہ بادشاہ غازی ۱۱۵۰) یہ مہر جس کتاب پر ہے وہ زبور کا ترجمہ ہے۔

؎ دارالسلطنۃ دہلی میں ایک پرتگالی خاندان تھا جس کو دربار بہادر شاہ اول سے بارہ گانوں کی جاگیر کا پروانہ عطا ہوا تھا۔ یہ جاگیر انگریزی عملداری میں بھی جاری رہی۔ اس خاندان کا ایک فرد جرنل مانول دیریانوں ۱۸۲۹ء میں بمقام دہلی فوت ہوا جس کی قبر کشن گنج کے قبرستان عیسوی دفن میں ہے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب مہر اسی خاندان سے عہد محمد شاہی میں تھا۔ مہر کے الفاظ کو یوں پڑھنا چاہیے:

"دوینگ ڈیل دیریانوں فدوی محمد شاہ بادشاہ غازی ۱۱۵۰" اصل پرتگالی نام کا املا بخط انگریزی

نون غنہ کی دہری آواز پرتگالی (Dominic mal Durmao) زبان میں دیتا ہی۔ (اقتباس از خطاب ڈاکٹر عبد اللہ یوسف علی سابق سولین صوبہ متحدہ بحوالہ پنجاب یونیورسٹی ہسٹاریکل سوسائٹی جرنل بابتہ دسمبر سنہ ۱۹۳۲ء صفحہ ۱۵۵ تا ۱۶۰)

(۹) الاقاربیّات - یہ وہ کتابیں ہیں جن کا میرے رشتہ داروں سے تعلق ہی - ان کی تالیف ہیں - حواشی سے مزین ہیں - فرمائش سے لکھی گئی ہیں - یا اُن کے کتاب خانوں سے ملیں - وغیرذالک -

(۱۰) الاُستاذیّات - اس عنوان میں وہ کتابیں رکھی گئی ہیں جو میرے اُستادوں کے سلسلہ میں سے کسی بزرگ کی لکھی ہوئی ہیں - یا محشّی بقلم خاص ہیں - یا اُن کے خط سے کسی دوسرے عنوان سے مزین ہیں - وغیرذالک -

(۱۱) الحسنیّات - ان میں وہ کتابیں ہیں جو بلحاظ خط نادر ہیں - (غیر خطاطیات)

(۱۲) القرطاسیّات - اس میں کاغذوں کے اقسام دکھائے گئے ہیں - مثلاً گجراتی، سمرقندی، وغیرہ

(۱۳) العتیقات - نویں صدی ہجری یا اُس سے قبل کی کتابیں - سب سے قدیم نسخہ پانچویں صدی کا ہی -

(۱۴) الخطوط - اس میں مختلف خطوں کی تشریح ہی - مثلاً خط نسخ عربی، بغدادی، ایرانی، کشمیری، ہندی بہاری وغیرہ -

(۱۵) المصنفیات - بخط مصنف - یا نسخہ مصنف سے منقول - یا مقابلہ شدہ وغیرہ مثلاً الاجوبہ والاسولہ للامام القشیریؒ خود امام کے ہاتھ کی لکھی ہوئی - ارتیاح الاکباد یا ریاح فقد الاولاد للحافظ شمس الدین سخاویؒ اُن کے ہاتھ کی لکھی ہوئی - (بعض حصے) فقط

مثنویاتِ سرورؔ

(ریویو)

نواب اعظم الدولہ محمد میر خاں معظم جنگ بہادر خلفِ نواب اعظم الدولہ مظفر جنگ دہلوی بسید رضوی اور دلی کے نامی گرامی امرا میں سے تھے۔ بادشاہی سلسلۂ حیات کے ظہور مختار و معتمد شاہ جی کے پوتے تھے۔ دربارِ شاہی میں معزز۔ فارسی میں مرزا جان بیگ صباحی کے شاگرد۔ شاعری میں ابتدا میر فرزند علی موزوں سے تلمذ تھا۔ پھر اپنے والد کے شاگرد ہوئے۔ جن کا تخلص صباحی تھا۔ سید محمد زکریا خاں زکی شاگرد مرزا غالب سرور کے پوتے تھے۔ غالب نے جو سند زکی کو لکھ کر دی تھی اس میں سرور کی والا دودمانی اور امارت کی تصدیق کی ہے۔ اس سرٹیفکٹ کی نقل دیوانِ زکی مطبوعہ مطبع رضوی دہلی ۱۳۱۲ھ کے دیباچہ میں شامل ہے۔

موزوں سامانہ کے رہنے والے تھے۔ دلی میں رہے۔ وہاں سے لکھنؤ چلے گئے۔ میر شمس الدین فقیر کے شاگرد تھے۔ فارسی اور اردو دونوں میں شعر کہتے تھے۔ سرور بھی اردو فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ اردو شعراء کا تذکرہ بہت عمدہ لکھا تھا۔ تذکرۂ شعرائے ہند میں لکھا ہے کہ تذکرۂ مذکور دہلی میں بہت مشہور تھا۔ نیز یہ کہ شیفتہ وغیرہ نے اسی تذکرہ سے فائدہ اٹھایا۔

شوال ۱۲۵ھ ہجری میں سرور نے وفات پائی۔ تذکرۂ مذکور میں اُن کی عادت کی بابت لکھا ہے ”نہایت خوش طبع، کشادہ پیشانی، ہنستی صورت، نیک اختلاط، پاکیزہ زندگی“۔ صاحبِ دیوان تھے۔

غزل کا نمونہ

کوچۂ یار میں خوابیدہ اس آرام سے ہوں
شورِ محشر کو بھی ہووے گا جگانا مشکل

ولہ

دیدۂ تر سے لگا خط کو نہ اُس کے سرور
یار کے ہاتھ کا لکھا ہے۔ مبادا مٹ جائے

ولہ

غیر لایا ہے اُسے بہرِ تماشا۔ دمِ نزع
دوستوں سے نہ ہوا وہ جو ہوا دشمن سے

ولہ

مرگ بہتر ہی - گر نہ ہو تو پاس ۔۔۔ بے مزہ تجھ سے زندگانی کا

ولہ

اُس کو شاید کہی پیماں شکنی اب منظور ۔۔۔ اور کے چاہنے کا مجھ پہ جو بہتان رکھا

مثنویاتِ سرورؔ - تذکرہ نویسوں نے سرور کے تذکرہ اور دیوان کا تو ذکر کیا ہی مگر مثنویوں کا ذکر پیش نظر تذکروں میں سے کسی تذکرے میں نظر سے نہیں گزرا - البتہ زکی دہلوی اپنے تذکرہ بالا دیوان کے فارسی دیباچہ میں لکھتے ہیں۔ "حضرت سرور را دیوانے و مثنویات سبعہ سیارہ و تذکرہ شعرائے اُردو بود" - یہ بھی لکھا ہی کہ یہ سارا سرمایہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں برباد ہو گیا۔

میں جس نسخہ کو اس مقالے کے ذریعہ سے روشناس کرنا چاہتا ہوں وہ $\frac{5\frac{1}{2}}{8\frac{1}{2}}$ چھوٹی تقطیع پر نہایت خوشخط جلی قلم سے کسی خطاط کا لکھا ہوا ہی - طرز خط میر پنجہ کش کے انداز سے ملتی ہوئی ہی - کاغذ دبز دفتی نما ہی - تعداد صفحات ۱۱۶ - فی صفحہ ۸ سطر (درمیان میں جابجا اوراق غائب ہیں) جدول طلائی عریض سُرخ و سپید - عنوان ہر مثنوی کا طلائی کار - رنگ آمیز طرز جدا - صفحہ اول طلاکار زرافشاں -

اس نسخہ میں تین مثنویاں ہیں - اول یوسف زلیخا، دوسری لیلیٰ مجنوں تیسری وامق و عذرا - آخرالذکر ناقص ہی - اس لئے سنہ کتابت، نام کاتب و مؤلف مفقود ہی - تخلص سرور البتہ جابجا موجود ہی - تذکروں میں پُرانے شعرا کے ذکر میں سرور تخلص صرف نواب اعظم الدولہ کا مذکور ہی - نسخۂ ہذا کم سے کم ساٹھ ستر برس اُدھر کا لکھا ہوا ہی۔

مناجاتِ یوسف زلیخا میں سرور لکھتے ہیں :-

کروں دیوانگی میں شور و غوغا ۔۔۔ پڑھوں جب قصۂ یوسفؑ زلیخا
کہے عذرا و وامق کی حقیقت ۔۔۔ کروں ابیات میں موزوں بحسرت
کبھو کر یاد حالِ قیس و لیلیٰ ۔۔۔ کروں میں وقفِ لب صد وائے ویلا
کبھو فرہاد و شیریں کا فسانہ ۔۔۔ سُناؤں دل کو اپنے بیخودانہ

حکایت شمع و پروانے کی گاہے — سناؤں گر دلِ دیوانہ چاہے
نظر میں گر گل و بلبل کا عالم — نواسنجی میں ہوں مصروف ہر دم

ان اشعار میں چھ مثنویوں کے نام آگئے۔ یوسف زلیخا، وامق و عذرا، لیلیٰ مجنوں، فرہاد و شیریں، شمع و پروانہ، گل و بلبل۔ اس لئے میں یہ تصور کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ مذکورۂ بالا مثنویاں نواب اعظم الدولہ سرور کی ہیں۔

نمونۂ کلام یوسف زلیخا

الٰہی۔ کر عنایت دل میں وہ سوز — کہ ہووے نالہ میرا شعلہ افروز
رہے افروختہ سینہ میں آتش — بنے تن۔ داغِ سوزاں سے منقش
چمک دیکھے یہ۔ آہِ شعلہ افشاں — جسے ہو برقِ سوزاں دیکھ حیراں
رہے آنکھوں سے بہتے اشک جاری — بنیں مژگاں۔ رگِ ابرِ بہاری
رہوں بیہوش میں آشفتگی سے — نہ رکھوں کام نیکی اور بدی سے
اٹھاؤں ہر گھڑی شورِ قیامت — بنوں میں ساکنِ کوئے ملامت
جنوں سے روز و شب ہمخانہ ہوں میں — ہمیشہ عقل سے بیگانہ ہوں میں
مرا وحشت میں ٹھہرے دشت مسکن — گریباں چاک رہوے تا بہ دامن
طفیلِ ساقیِ کوثر۔ پلا۔ اب — شرابِ عشق سے جامِ لبالب
کہ بن عشق۔ آدمی کی کچھ نہیں شان — جو اس سے آشنا ہو وہ ہی انسان
دلِ فارغ ز دردِ عشق دل نیست — تنِ بیدرد دل جز آب و گِل نیست
عجب ہے عشق کی نیرنگ سازی — نئی ہر جا ہے اس کی ترک تازی
جدھر دیکھو ادھر ہے جلوہ گر عشق — لئے پھرتا ہے سب کو دربدر عشق
فلک سرگشتہ از سودائے عشقت — جہاں پر فتنہ از غوغائے عشقت
اگر حاصل ہو عمرِ جاودانی — نہیں بن عشق لطفِ زندگانی
اسی کا جلوہ ہی دونوں جہاں میں — سمایا ہے مکان و لامکاں میں

مزا ہو عشق کا جس کو نہ مرغوب　　نہیں وہ زمرۂ احیا میں محسوب
سناؤں فاضل نامی کی یہ بیت　　سند ہے حضرت جامی کی یہ بیت
"غم عشق از دلِ کس کم مبادا　　دلِ بے عشق در عالم مبادا"
اگرچہ عشق میں آفت ہے یکسر　　نہیں پر شغل کوئی اس سے بہتر
بظاہر کر بلائے ناگہاں ہے　　دلِ غمگیں کا پر راحت رساں ہے
یہ ہے شمعِ شبِ ہجرانِ عاشق　　منور جس سے ہے ایوانِ عاشق
یہ ہے آرامِ جانِ بیقراراں　　تسلیِ دلِ اُلفت شعاراں
یہی ہے کلبۂ احزاں کی رونق　　گلِ بُستانِ عاشق ہے یہ الحق
یہ ہے مرہم برائے سینہ چاکاں　　یہ ہے درمانِ دردِ دردناکاں
یہی ہے مُونسِ و غمخوارِ عاشق　　یہی ہے گرمیِ بازارِ عاشق
لکھوں وصفِ جنابِ عشق کیونکر　　زبانِ خامہ ہے یاں گنگ یکسر

اسی سلسلہ میں اس شعر میں تخلص آتا ہے :-

مجھے کہتا ہے میرا دل کہ سرور　　عجب یہ قصہ دلکش ہے یکسر

نمونہ مثنوی لیلیٰ مجنوں (حمد)

اے مالکِ لاشریکِ مُطلق　　صانعِ اشیا کا تو ہے الحق
اے ربِ وُدود تو ہے معبود　　ہے حکم سے تیرے بُودِ نابود
ستّارِ عیوب بے مثالی　　غفّارِ ذنوب - لایزالی
تجھ سے ہے سبھوں کو استعانت　　ہے امر کی فرض تیری طاعت
ہے ذات تری کریم لاشک　　وابستہ ہے تجھ سے کار ہر یک
اے رازقِ واہب العطایا　　وے خالقِ غافر الخطایا
اے قادرِ و کارسازِ عالم　　محتاج سبھی ہیں تیرے ہر دم
اے عالمِ سِرّ و آشکارا　　ہرگز نہیں ہے یہ مجھ میں یارا

نعت

از بہر نبی رسولِ مقبول   دنیا کی تلاش جاؤں میں بھول
وہ خاتمِ انبیا ہے برحق   اسلام نے پائی جس سے رونق
وہ باعثِ اختراعِ کونین   ہے شان میں جس کی قاب قوسین
ہے سب کو اطاعت اُس کی نافع   ہوگا وہی روزِ حشر شافع
لے حامیِ شرع و دینِ اسلام   دے ماحیِ کفر عہدِ اصنام
نازل صلواتِ حق ہو تجھ پہ   تیرا ہے غلام دل سے سرور

منقبت

جتنے تیرے ہیں آل و اصحاب   باہم ہیں وہ دوست و احباب
پہنچے اُن پر درود دائم   جیری بخشش کو ہیں وہ کافی

مناجات

اس شیشۂ دل کو بھرے یارب   کر بادۂ عشق سے لبالب
مجھ کو رہے عشق سے سروکار   اس نشّہ کا دل سے ہوں طلبگار
ساقی یہاں آ فداک روحی   بھر جام میں تو مئے صبوحی
دے مجھ کو کہ پی کے اُس کو دو ہاتھ   اشعار سناؤں اُلفت آئیں
یعنی کہ لکھوں فسانۂ عشق   کہتے ہیں جسے ترانۂ عشق
رکھتا ہے زبسکہ رتبہ عالی   ہے عشق جناب لاؤبالی
پنہاں ہے وہی - وہی ہے پیدا   ق   گو اُس کے سبب سے کتنے شیدا
وحشت زدہ ہو کے مر گئے ہیں   آخر جی سے گزر گئے ہیں
ہے اُس سے ہی ذکرِ قیس مجبور   لیلیٰ کو کیا اسی نے مشہور
ماہیتِ عشق کون پا دے   دوں جان بھی گر یہ ہاتھ آوے
ہے عشق سے آبروئے عاشق   ہے اس سے ہی ہائے ہوئے عاشق

اندوہ میں اُس کے راحتیں ہیں
مرغوب اُس کی اذیتیں ہیں

نمونہ وامق و عذرا
(حمد)

اے خدائے دو جہاں بندہ نواز
کوئی تیرا نہیں اصلاً انباز

مالکِ الملک ہے تو اے قادر
راز پوشیدہ ہیں تجھ پر ظاہر

تو نے پیدا ہیں کئے کون و مکان
تیرے مخلوق ہیں سب اہلِ جہاں

تیری محتاج ہے خلقت ہر دم
بہرہ ور تجھ سے ہیں اہلِ عالم

تو ہی معبود ہے سب کا بے شک
تیری قدرت کا مُقِر ہے ہر یک

(نعت)

اے خداوند مرے عزّ و جل
ہے جو تیرا وہ نبیِ مرسل

واضعِ شرع جنابِ اطہر
فخرِ کونین و شفیعِ محشر

نام نامی ہے محمد جس کا
سب پہ احسان ہے بے حد جس کا

شان میں اس کی ہے نازل لٰسین
شق اشارے سے کیا ماہِ مُبیں

منبعِ لطف ہے وہ کانِ کرم
وہ ہی ہے مرجعِ اربابِ ہمم

ساقیِ کوثر و تسنیم ہے وہ
حق یہ ہے لائقِ تعظیم ہے وہ

تجھ پر اے تابعِ امرِ معبود
پہنچے ہر دم صلوات اور درود

(منقبت)

آل و اصحاب ترے پاک سیر
میرے ہیں حشر میں حامی یکسر

پہنچے ہر لحظہ انھوں پر بھی سلام
اُن سے اسلام کو رونق ہے تمام

تخلص کا ایک شعر ؎

بسکہ عاجز ہے بہت اے داور
عرض کرتا ہے یہ تجھ سے منور

تعریفِ عشق ؎

دلِ ناکام کو ہے عشق سے کام
گرچہ اُس میں ہیں بہت سے آلام

عشق ہوتا نہیں عاشق سے جدا
جھوٹ اس میں نہیں شاہد ہے خدا

کیوں نہ سمجھوں میں اُسے جزوِ بدن
عشق نے دل میں بنایا مسکن

عشق ہی عشق نظر میں آیا
جلوہ گر ارض و سما میں پایا

ممکنات اُس سے نہیں ہیں خالی
عشق کی ہے وہ جنابِ عالی

ہر دو عالم میں کیا عشق نے ہے | دفترِ نیستی و ہستی بٹے

کلام عاشق در عذر بیہوشی

سُن کے وامق نے یہ عذرا کا کلام | ہوش میں آ کے کہا دل کو تھام
اے گُلِ تازۂ باغِ خوبی | وے نہالِ چمنِ محبوبی
مرہمِ زخم نہانِ عاشق | تجھ پہ قربان ہے جانِ عاشق
مجھ سے آزردہ نہ ہو اے مغرور | اپنے دل سے تو مجھے پھینک نہ دور
عذرِ بے تابیِ دل کر تو معاف | ہوں میں ناچار نہیں لاف و گزاف
حکم سے تیرے نہیں کچھ انکار | ہوں ترا بندۂ فرمانبردار
ہو کے آزردہ نہ دے مجھ کو عذاب | دیکھ کر تجھ کو ہوا میں بیتاب
جلوہ افروز ہو معشوق جہاں | کیونکہ عاشق میں رہے تاب و تواں

ہجر میں حالِ زارِ وامق

گاہ و بیگاہ و شب شورش و شین | دم نہ لیتا تھا زبس تھا بے چین
ہوتے اُس سے نہ جدا اک ساعت | قلق و یاس و فراق و حسرت
بے قرار انہ سحر سے تا شام | تھا اُسے گریہ و زاری سے کام
دشنۂ غم جو لگا تھا کاری | خونِ دل چشم سے رہتا جاری
کھینچتا نالۂ جانکاہ ہرگشہ | مارتا دل پہ اٹھا کر پتھر
شعلۂ ہجر سے جلتا تھا وہ | ہاتھ افسوس سے ملتا تھا وہ
آستیں دیدۂ نم سے ہر دم | موج و دریا کی نمط تھے باہم
دامن و جیب کیا تھا صد چاک | کس قدر دستِ جنوں تھا چالاک
ہو کے حیرت زدگی سے ناچار | تھا کبھو جیسے کہ نقشِ دیوار
تپشِ دل سے کبھو تھا بیتاب | مضطرب حال بسانِ سیماب

عذرا کا حال مہجوری میں

حالِ وامق تو یہ تھا فرقت میں | دلِ عذرا بھی بہا زحمت میں
روز و شب وہ بُتِ غارتگرِ ہوش | آہ و نالہ سے نہ رہتی خاموش

ہر گھڑی اُس کو غشی طاری تھی — فرقتِ یار کی بیماری تھی
کارگر ہجر کا آزار ہوا — زرد وہ چہرۂ گلنار ہوا
ہر بہانہ سے وہ رہتی گریاں — مطلق اُس میں نہ رہا تاب و تواں
ناتوانی کی اذیت جو سہی — طاقتِ جنبشِ مژگاں نہ رہی
رشکِ شمشاد قد اُس کا یکبار — جھک گیا جیسے کہ شاخِ خمدار
دُوریِ یار سے گھبرائی وہ — ایسے جینے سے بہ تنگ آئی وہ

(رسالہ ہندوستانی بابتہ ماہ اپریل ۱۹۳۲ء)

مثنوی کراماتِ پیرانِ پیر جہاں

(ریویو)

حکیم ابوالقاسم قدرت اللہ خاں، قاسم تخلص کا نام دنیائے ادب میں اُن کے تذکرۂ شعرا موسوم بہ "مجموعۂ نغز" کی وجہ سے مشہور ہے۔ دہلوی تھے۔ اُن کا خاندان علم اور فقر میں مشہور تھا۔ حضرت مولانا فخرالدین کے قادریہ سلسلے میں مُرید تھے۔ عربی علوم کی تحصیل خواجہ احمد جان سے کی تھی۔ طب میں حکیم محمد شریف خاں صاحب کے شاگرد تھے۔ شاعری میں ہدایت اللہ خاں ہدایت سے تلمذ تھا۔ مطب کا شغل تھا۔ سنہ ۱۲۴۶ ہجری میں بڑی عمر پاکر وفات پائی۔ مثنوی مذکورۂ بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ آٹھ برس کی عمر میں یتیم ہوگئے تھے۔ گیارہ برس کی عمر میں میر فتح علی خاں (اُن کے والد کے دوست) نے حضرت ممدوح الصدر کی خدمت میں پہنچا دیا اور حضرت کے مدرسہ میں پڑھنے لگے۔ مولوی سید احمد صاحب کے سپرد تعلیم تھی۔ بڑی محنت سے پڑھتے تھے۔ چنانچہ لکھا ہے:-

میں تھا گرمِ تحصیل جب اے خلیل — سدا تھی مجھے علم سے قال و قیل

مجھے جز کشی تھی بایں آب و تاب | کہ تھا بس میں لے یار و جزو کتاب
نہ چھٹتی تھی مجھ سے کتاب ایک پل | کہ کرتا تھا مشکل مسائل کا حل
غرض شام سے صبح تک میں بہ کد | مطالعہ کناں تھا۔ جو اہلِ خرد
لے اک ساتھ آٹے کا پیڑا میں خام | علی الصبح پڑھنے کو جاتا مدام
پکا اُس کو تندور سے اور کھا | میں تا شام رہتا تھا پڑھتا سدا
مجھے بسکہ مقصد میاں علم تھا | میں تھا پیچھے باندھا اُس کے آٹا پڑا
کبھو بھی میں ناغہ نہ کرتا سبق | بلا ناغہ پڑھتا ورق دو ورق

تذکرہ شعرائے ہند میں لکھا ہے "ریختہ کہنے کا بہت شوق تھا۔ ایک مثنوی بھی ان کی کہی ہوئی ہے اور ایک دیوان موجود ہے اور ایک تذکرہ شعرائے ہند کا۔ حکیم ثناء اللہ خاں فراق طب میں اُن کے شاگرد تھے"۔ تذکرہ گل رعنا میں لکھا ہے "دیوان دیکھنے میں نہیں آیا"۔

نمونہ کلام

(۱) قاسم کے ساتھ بادہ خوری تھی تمام شب | اور نام سے ہے اُس کے تجاہل علی الصباح
(۲) سر بسر قول ترا اے بُت خود کام غلط | دن غلط۔ رات غلط۔ صبح غلط۔ شام غلط
(۳) دشنام دے مناتے ہو رُوٹھے کو آن میں | کیا جانے کیا فسوں ہے تمھاری زبان میں
(۴) مسلماں تو اُسے پروا ہو کیا اغیار عاشق کی | وہ نصرانی بچہ عیسیٰ نفس تو ہے۔ یہ کافر ہے
(۵) جان جاوے یا رہے قاسم۔ یہ دیکھیں گے اُسے | ہے ارادہ یہ مصمم دیکھئے کیسے بنے

تذکرہ قاسم کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے دیوان میں سات ہزار شعر تھے۔ دیوان کے علاوہ دو مثنویاں تھیں۔ ایک مولانا روم کی مثنوی کی بحر میں بیانِ معراج میں۔ دوسری مثنوی بوستان کی بحر میں حضرت غوثِ اعظم کی کرامات کے ذکر میں۔ تیسری مثنوی غزوۂ بدر کے حال میں لکھنے کا ارادہ مصمم تھا۔

میرے اس مقالے کا موضوع قاسم کی وہ مثنوی ہے جس کا تاریخی نام "کراماتِ پیرانِ پیر جہاں"

ہی اُس سے ۱۱۹۶ھ ہجری برآمد ہوتے ہیں۔ یہ ایک ضخیم مثنوی ہے۔ ۲۲/۱۹ تقطیع۔ خط صاف جلی۔ مشجر فی آمیز سطر فی صفحہ ۱۲ صفحات ۴۰۴۔ نسخہ کامل ہے۔ ۱۱۹۶ھ ہجری میں تالیف شروع کی۔ چنانچہ دیباچہ میں لکھا ہے:۔

کہوں کیا یہ آغاز کے بعد پر — رہا سالہا طاق نسیان پر
برآیا پس از سال اکیس کے — فرامشگری کے یہ جزدان سے
بتائید و توفیقِ رب الانام — اُسی برس اس کو ہوا اختتام
رقم ہو چکا جب بتمام و کمال — ہزار و دو صد اور ہفدہ تھا سال ۱۲۱۷
یہ مصرع ہے تاریخ کا دلپذیر — رموز کمالاتِ پیرانِ پیر (۱۲۱۷ھ)

بوستان کی بحر ہے۔ معہ دیباچہ ایک سو پانچ عنوان ہیں۔ ہر عنوان کے آخر میں فارسی کا ایک شعر شیخ سعدی وغیرہ شعرا کا لکھا ہے۔ کل اشعار کی تعداد پانچ ہزار ایک سو ساٹھ (۵۱۶۰) ہے۔ ہر ایک عنوان بھی منظوم ہے جس کی بحر اصل مثنوی سے جدا ہے۔ اس مثنوی میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ کے حالاتِ مبارک ہیں۔ اور نسب و پیدائش سے لے کر آخر تک گیارہ باب باندھے ہیں۔ دیباچہ میں حمد، نعت، منقبت آل و اصحاب، منقبت پیران پیر رضی اللہ عنہ و منقبت حضرت مولانا فخرالدین ہے۔ مدح شاہ عالم بادشاہ اور سببِ تالیف و تاریخ و فہرست کتاب ہے۔ آخر میں مناجات، مدح میر فتح علی خاں صاحب مدظلہ۔ مدح حضرت مولانا فخرالدین، مدح حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، مدح نواب نجیب الدولہ بہادر، مناجات مکرر، تاریخ از حکیم ثناء اللہ خاں فراق و عبدالصمد فدا۔ ان دونوں کی تاریخوں کی تقریب خود مؤلفِ مثنوی نے کی ہے۔

یہ نسخہ امیر الدین ولد میر علیم نے ۳۰ رمضان ۱۲۹۲ھ میں لکھا ہے۔ کاتب کے قلم سے ۱۱۹۲ھ نکل گیا ہے جو ظاہر ہے کہ صحیح نہیں ہو سکتا اس لیے کہ آغازِ تالیف کتاب ۱۱۹۶ھ میں ہوا تھا۔

نمونہ کلام (حمد)

ہے یہ توحیدِ خدا میں داستاں — گوشِ دل سے تم سنیئے دوستاں
کرے کیا کوئی حق کی مدح و ثنا — سراسر وہ ہے نورِ ارض و سما
جہاں اُس کے جلوہ سے معمور ہے — ہر اک پہ نمایاں وہی نور ہے

بچھایا خلایق یہ فرشِ وجود　　گیا آپ کو اُن سے یعنی نمود

حقیقت میں دیکھو تو ہے ایک نور　　کیا ہی یہ سو سو طرح سے ظہور

کہیں ہے وہ لیلائے محمل نشیں　　بنا ہے عزیز و وہ مجنوں کہیں

کہیں ہے وہ شیرین شیریں سخن　　کہیں ہے وہ تیشہ کہیں کوہکن

کہیں بن کے موسیٰ کیا ہی ظہور　　کہیں ہے تجلی کہیں کوہِ طور

کہیں ہے وہ بندہ کہیں ہے خدا　　کہیں ہے سفینہ کہیں ناخدا

وہی جسمِ آدم وہی روح تھا　　یہ طوفاں وہی تھا وہی نوح تھا

سکندر نہ تھا نے فریدون تھا　　نہ بقراط تھا نے فلاطون تھا

نعت

محمدؐ کو سردارِ عالم کیا　　اُسے سیّد ولدِ آدمؑ کیا

یہ مقدور رکھتا ہے کوئی بشر　　کرے نعت اُس کی جو وہ سربسر

وہ احمدؐ نبی خاتم المرسلین　　کہ بندہ ہے جس در کا روح الامیں

سرشت اُس کی ہوتی نہ گر دوستاں　　نہ مخلوق ہوتے زمین و زماں

زباں کیوں نہ ہو وصف میں اُن کے لال　　کسی کا یہ ہے حوصلہ۔ کیا مجال

منقبت غوث اعظم

محمدؐ کے من بعد اے دوستاں　　ہزاروں ہوئے قطب و غوثِ زماں

ہر اک کو دیا حق نے عالی مقام　　ہیں مقبول ذاتِ مقدس تمام

ولے مرتبہ ہے ہر اک کا جدا　　کوئی اُن میں چھوٹا ہے کوئی بڑا

سرے سب سے دیکھو گر انصاف گر　　کدورت کو سینہ سے ہاں صاف کر

نہ پاؤ گے جز غوثِ اعظم کوئی　　کہ سردفترِ اولیا ہو۔ وہی

ہے دنیا میں نایاب اُس کا عدیل　　وہ یکتائے عالم ہیں بے قال و قیل

وہ ہیں بلبلِ گلشنِ مصطفےٰ　　وہ ہیں سروِ بستانِ آلِ عبا

وہ ہیں نورِ چشمِ حسن دوستاں　　حسین ابنِ حیدر کے آرامِ جاں

گدا اُن کے کوچہ کا ہے ہر ولی — کہ ہیں وہ شہنشاہ۔ ابنِ علی
توسّل بن اُن کے کوئی ذی کمال — جو چاہے ہو واصل بحق۔ کیا مجال
سعادت سمجھ سب نے ان کا قدم — رکھا اپنی گردن پہ مل کر بہم
مگر ایک۔ شیخ صفاہان نے — کہ دی تھی دغا اُس کو شیطان نے
سو حق نے کیا اُس کا منصب تغیر — محقّر ہوا نزدِ برنا و پیر
رہا اُس کے چہرے پہ مطلق نہ نور — ہر ایک اُس کو کہنے لگا "دُور دُور"
عزیزے کہ از درگہش سر بتافت — بہر در کہ شد ہیچ عزت نیافت

(مدح مولانا فخرالدین) پس از مدح سلطانِ کون و مکان — شہنشاہِ جیلاں و قطبِ زماں
تو اے قاسمِ قادری باصفا — دل و جاں سے کر اُس ولی کی ثنا
کہ تھا یار وہ قبلۂ راستیں — بلا شبہ و شک فخرِ دنیا و دیں

(مدح شاہ عالم) عجب ہی بہ امن و اماں ہی یہ عہد — تمامی خلایق ہے آسودہ عہد
نہ ہو کیوں یہ ہے ہند کا بادشاہ — وہ گردوں وقار و وہ انجم سپاہ
کہ ہے آسماں جاہ و کوہِ شکوہ — فتوّت وثار و مروّت پژوہ
ہیں معدنِ جُود و کانِ سخا — ہیں منبع فیض و بذل و عطا
طرازندۂ تختِ ظلِ الٰہی — فرازندۂ تاجِ شاہنشہی
عَلم کہکشاں۔ تخت نیلی فلک — سدا کُوہ زر بخش بے شبہ و شک
گہہ بذل ہی سعد و نحس اُس کو ایک — کہ ہے وہ شہنشاہ خود سعد و نیک
مربع نشیں و مثلث نشاں — بہ تربیع و تثلیث گوہر فشاں
مربیِ شرع و ہوا خواہِ دین — مددگار ارکانِ دینِ متیں
دلِ اہل درد و سرِ اہلِ شوق — جگر بند معنی بصد شوق و ذوق
خدیوِ جواں بخت و فرخندہ رائے — شہنشاہِ گیتی و گیہاں خدائے

خدا ترس و ہشیار و والا نژاد | خوش آئین و خوش دین و خوش اعتقاد
موحّد بہ جاں - احمدی - حیدری | حنیفی بدل - اشعری - قادری
حلیم و گنہ بخش و مخلص نواز | دلیر و عدو مال و دشمن گداز
سر ربع مسکون و صاحب خبر | شہ عالم و شاہ عالی گہر
جہانبانِ دوران و عالی جناب | بہ چرخِ شہی رشکِ مہ آفتاب
نجوم سعادت سے باہم ملے | یہ خورشید رخشندہ یارب رہے
چھٹے کفر کا اُس سے جلدی کسوف | بحقِ نبی - اے رحیم و رؤف
رہے اُس کے سائے کے نیچے سدا | خوشی خورم آسودہ خلقِ خدا
روا کر سدا اُس کی حاجات تو | رہے تیری رحمت سے یہ خندہ رُو
برومند دارش درخت امید | سرش سبز - و رویش برحمت سپید

اس مقالہ کا ماخذ حسبِ ذیل کتابیں ہیں :-

تذکرۂ شعرائے ہند مولفۂ منشی عبدالکریم دہلوی - تذکرۂ گلشنِ بیخار نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ - تذکرۂ میر حسن دہلوی - تذکرۂ آبحیات محمد حسین آزاد دہلوی - تذکرۂ گلِ رعنا مولوی سید عبدالحی صاحب -

تذکرۂ قاسم کی عبارت کے لئے میں پروفیسر شیرانی لاہوری اور اُن کے شاگرد مولوی عبداللطیف صاحب تپش کی عنایت کا ممنون ہوں - تذکرۂ خمخانہ جاوید لالہ سری رام ایم اے دہلوی، دیباچۂ دیوان حافظ زکریا خاں زکی دہلوی -

(رسالہ ہندوستانی بابتہ ماہ جولائی ۱۹۳۲ء)

مثنوی فتوح الحرمین۔ محی لاری

(ریویو)

اس مثنوی کا ایک نفیس قلمی نسخہ حیدرآباد سے حال ہی میں آکر داخل کتاب خانہ حبیب گنج ہوا ہے۔ خط بخلاف عام قلمی کتابوں کے خطاطی کی شان لئے ہوئے ہے۔ باقاعدہ ہی۔ جہاں تک پڑھا صحیح ہے۔ جدول طلائی و لاجوردی۔ کاغذ سمرقندی آب رسیدہ۔ قدرے کرم خوردہ۔ نقشے رنگین و طلاکار۔ عنوان طلاکار لاجوردی۔ نام کاتب و سنہ کتابت مفقود۔ قراین کی شہادت سے باطمینان کہا جا سکتا ہے کہ کم و بیش تین سو برس کا پرانا نسخہ ہے۔

محی لاری کا ذکر اکثر تذکروں میں ہے۔ کشف الظنون نے بھی فتوح الحرمین کے تحت میں لکھا ہے۔ ریاض الشعرا داغستانی میں ہے کہ محی لاری سلطان یعقوب کے عہد میں تھا۔ شاہ طہماسپ کے زمانہ تک رہا۔ کمال فضیلت سے ممتاز تھا۔ قصیدۂ تائیہ ابن فارض کی شرح لکھی ہے۔ حج سے واپس آکر سلطان مظفر بن محمود شاہ کے نام پر مثنوی فتوح الحرمین لکھی۔ ایک لاکھ سکۂ سکندری انعام پایا۔ خزانۂ عامرہ میں بھی یہی ذکر ہے۔ اتنا اضافہ ہے کہ محی لاری محقق دوانی کا شاگرد تھا۔ ہفت اقلیم اور مخزن الغرائب میں ذکر ہے۔ آخرالذکر نے بابا فغانی کا معاصر لکھا ہے۔ فہرست کتاب خانہ بانکی پور میں سنہ وفات ۹۳۳ھ درج ہے۔ (اس اطلاع کے لئے پروفیسر نظام الدین استاذ جامعۂ عثمانیہ کا سپاس گزار ہوں) کلام صاف۔ زبان شیریں ہے۔ حقیقت و اثر کا رنگ لئے ہوتے ہے۔ مکہ مکرمہ کی تعریف ملاحظہ ہو:

مکہ کہ شد قبلۂ اہلِ نجات — حرسہا اللہ عن الحادثات

طعنہ بر اکسیر زند خاکِ او — گُل خجل است از خس و خاشاکِ او

ریگِ زمینش چو نجوم سماست — گم شدگاں را بہ یقین رہنماست

جنتِ معلیٰ کہ بلے زرع و کشت — جمع در و گشتہ نعیم بہشت

گل نہ و بادِ سحرش مشکبوے | ے نہ و میخانہ پر از ہاے وہوے
زرع نہ و خرمنِ او دانہ بخش | غرس نہ و طوبئ او سایہ بخش
باغ نہ و میوۂ او ظاہر است | راغ نہ و سبزۂ او ظاہر است
لالہ بنفروختہ در وے چراغ | بر دلش از حسرتِ آں ماہ داغ

تمام مناسکِ حج شوق کی تڑپ اور پاس ادب کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ حج کے بعد زیارت مدینہ طیبہ کی تفصیل شانِ بالا کے ساتھ ہے۔ ایک باب کا عنوان ہے "من نتائج انفاسِ مولانا نور الدین عبد الرحمٰن جامی"۔ عنوان ہذا سے پہلے یہ شعر ہے ؎

گر ہُدَت از سخنِ من ملال | گوش کن از عارفِ جام ایں مقال

اس عنوان کے تحت چار صفحے مولانا جامی کے کلام کے ہیں۔ اخیر شعر یہ ہے ؎

یارب از آنجا کہ کرم آنِ تست | چشم ہمہ بر درِ احسانِ تست
جامی اگرچند نہ صاحب دلیست | از تو بامید چنیں حاصلیست

نسخہ ہٰذا کے ہاتھ آنے پر میں نے اپنے کتاب خانہ کا جائزہ لیا۔ تو دو نسخے نکلے۔ ایک قلمی، دوسرا مطبوعہ۔ بہر دست مطبوعہ نسخہ سے بحث کرنی ہے کہ ایک فاش غلطی کی اصلاح ہو۔ یہ نسخہ مطبع نول کشور میں دوبارہ ۱۸۷۸ء میں بمقام لکھنؤ طبع ہوا ہے۔ کاغذ سپید ہے۔ خوشخط، جلی قلم، کاتب فدا حسین خوشنویس مطبع۔ آخر میں ۱۹ صفحے تقریظوں اور تاریخوں کے ہیں۔ جو تقریظ مالکِ مطبع کی طرف سے شامل کتاب ہے اس میں لکھا ہے "یہ نسخہ صحیحہ فتوح الحرمین مصنفہ جناب تقدس قباب ...... محی الدین عبد القادر جیلانی ......"

اس کے آگے لکھا ہے کہ "اس مثنوی کا ایک نسخہ مرقوم بخوشترین خط نستعلیق ولایتی مولوی اشرف علی لکھنوی کے توسط سے ملا۔ اس کو دیکھتے ہی طبع کا شوق ہوا۔ دوسرا نسخہ باوجود تلاش نہ ملا۔ منشی محمد مرزا جان تصحیح پر مامور ہوئے (جن کے مذاق شعر و سخن کی مہارتِ تام کی تعریف بھی درج ہے)۔

ہم یہ مان لیتے ہیں کہ جو نسخہ مطبع کو ملا اس میں انتساب تصنیف حضرت غوثِ اعظم رضی اللہ عنہ کی جانب ہوگا۔ لیکن مطبع کی ذمہ داری اس پر ہی ختم نہیں ہو جاتی۔ حضرت کے حالات کی تحقیق کرنی تھی

کہ آپ نے فارسی میں کوئی مثنوی لکھی ہے۔ ظاہر ہے کہ مغالطہ "محی" کے لفظ سے کھایا ہے۔ لہٰذا شعرا کے تذکرہ میں "محی" کا ذکر دیکھنا لازم تھا۔ انتہائی بے پروائی یہ تھی کہ تذکرہ خزانۂ عامرہ اس مثنوی سے برسوں پہلے اسی مطبع میں طبع ہوچکا تھا۔ اس کو بھی دیکھنے کی تکلیف گوارا نہ کی۔

جو عنوان ہم نے مولانا جامی کے کلام کا قلمی مثنوی سے اوپر نقل کیا ہے، اگرچہ وہ مطبوعہ میں نہیں ہے تاہم مولانا جامی کے نعت کے دو مشہور بند درج مثنوی مطبوعہ ہیں (دیکھو صفحہ ۱۰۲ و ۱۰۳) مولانا کا کلیات بھی مطبع نول کشور میں ۱۳۰۸ھ میں چھپا تھا۔ اس میں یہ بند بھی ہیں (ملاحظہ طلب صفحہ ۱۹ کلیات نولکشوری) کاش ان کو ہی اہلِ مطبع دیکھ لیتے۔ ان بندوں میں ایک شعر یہ ہے ؎

کش عنانِ دل زکف حرص و ہوا بربودہ اند   کز گدائے بینوا جامی عنایت وا مگیر

مثنوی مطبوعہ میں بجائے "جامی" کے "جام" ہے۔ اور مصرع اس طرح: "کز گدائے بینوا جامِ عنایت وامگیر"۔

بڑی زبردست شہادت اس مثنوی کی زبان اور طرزِ بیان ہے۔ حیف ہے کہ آج سے نصف صدی پہلے اہلِ مطبع میں ذوقِ فارسی اس قدر مفقود تھا کہ وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ مثنوی کی زبان نویں دسویں صدی ہجری کی ہے۔ جو فیضی اور جامی وغیرہ کی مثنویوں میں بے تکلف ملائی جاسکتی ہے۔ پانچویں یا چھٹی صدی ہجری کی زبان یا طرزِ سخن نہیں جو حضرت کی طرف منسوب ہوسکتی ہے۔ کاش شیخ عطار و حکیم سنائی کی مثنویوں سے ملا لیتے۔

ضمیمہ۔ مضمونِ بالا کی کتابت کے بعد صاحبِ مضمون کا حسبِ ذیل ضمیمہ موصول ہوا۔   معارف

عجب اتفاق ہے۔ پرانے خطوط ایک ضرورت سے دیکھے جارہے تھے کہ علامہ شبلی مرحوم کی ایک تحریر مورخہ ۸ر فروری ۱۹۱۱ء ہاتھ آئی لکھتے ہیں:۔

"فتوح الحرمین" حالاتِ حرمین میں ایک مثنوی ہے۔ مصنف کا نام محی ہے۔ لیکن کشف الظنون کے سوا کسی تذکرے میں پتہ نہیں لگتا۔ آپ اپنے دفتر میں تو دیکھئے"۔

عین اس وقت جبکہ میرا مضمون معارف میں چھپ رہا ہے اس تحریر کا بائیس برس بعد ہاتھ میں

آنا کیسا عجیب ہے۔ یہ تو یاد نہیں کہ اس وقت جواب کیا دیا تھا لیکن اس سے ایک خاص لطف قلب محسوس کرتا ہے کہ ایک محترم فرمائش کی تعمیل ہو رہی ہے۔ معلوم نہیں مولوی صاحب نے کون سے تذکرے دیکھے جو محی کے ذکر سے خالی تھے۔ ورنہ خزانۂ عامرہ، ریاض الشعرا وغیرہ تذکروں میں تو اس کا ذکر موجود ہے۔

(رسالہ معارف اعظم گڑھ بابتہ ماہ نومبر ۱۹۳۲ء)

ایک علوی منظر

(ایک تماشائی عالم کی نظر سے)

کل شام اپنے مختصر سے پائیں باغ میں تھا۔ گہرا ابر چھایا ہوا تھا جو کئی دن دل کھول کر برس چکا تھا۔ فضا شفاف تھی۔ ہوا خنک اور صاف۔ پتوں کی سبزی پھولوں کی سرخی نگاہ افروز تھی، دلنواز تھی۔ دفعتہً مغرب میں بادل پھٹا۔ آفتاب لب بام کے نور سے بلند بالا درخت روشن ہو گئے۔ قوس قزح نے آسمانی فضا کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اب عالم یہ ہے کہ باغ کا بالائی حصہ تابناک ہے۔ پائیں تاریک اس دلکش منظر نے نگاہ شوق کو مائل کیا۔ رفتہ رفتہ شوق میں ذوق کی، ذوق میں محویت کی کیفیت پیدا ہوئی۔ محسوس ہونے لگا کہ قوس قزح کے محرابی دروازے میں سے دوسرا عالم نظر آرہا ہے۔ آفتاب اور نیچا ہوا۔ نور نے مزید بلندی اختیار کی۔ اب بلند درختوں کی صرف چوٹیاں منور تھیں۔ کیف دوبالا ہوا، محویت بیخودی سے بدل گئی۔ ایک اونچے درخت کی بالائی شاخ پر قمری کا جوڑا نظر آیا۔ محبت کی تصویر، وفا کا پتلا، راحت کا مجسمہ۔ بسیرے کی آمد سے سراپا سرور۔ سورج کی کرنیں اس پر نور افشاں

یہ سماں دیکھ کر سفلی دل میں رشک کی لہر آئی۔ معاً باصرہ کے ساتھ سامعہ کی لذت اندوزی کا بھی سامان ہوا۔ ایک غیبی آواز:۔

اے بھولے بھالے پرندوں پر رشک کرنے والے!

بکشا بال و صفیر از شجر طوبیٰ زن   حیف باشد چو تو مرغے کہ اسیرِ قفسی!!

پُر اثر آواز نے چونکا دیا۔ بے اختیار زبان سے نکلا۔ "شجر طوبیٰ یہاں کہاں! عالمِ سفلی اور جنت کا درخت!"۔

"تجھی میں شجر طوبیٰ ہے۔ تجھی میں خار و خس۔ عالمِ علوی بھی ہے خاکدانِ سفلی بھی۔ محبت کی بلند شاخوں کو نشیمن بنا۔ بلند ہمتی اور صلح پسندی کو مقصدِ زندگی قرار دے۔ آج تجھ کو پرندوں پر رشک ہے کل ان صفات کی بدولت فرشتے تجھ پر رشک کریں گے۔ سرمدی نور کی بارش ہوگی۔ یہ بھی سُن لے کہ عظمت کی بلندی چھوڑ کر ہنگامہ پستی میں مبتلا ہونے والے حسد، کینہ اور طمع کی تاریکی میں جا پھنستے ہیں۔ شیاطین اُن سے پناہ مانگتے ہیں۔ دیکھ وہ گلاب کا درخت تیرے سامنے ہے۔ تجھ کو پھول محبوب نہیں، مرغوب نہیں۔ کانٹے پسند ہیں۔ ان ہی میں پھنستا ہے۔ اُن ہی سے اُلجھتا ہے۔ اب اگر اعضا خونا خون اور کپڑے پارہ پارہ ہیں تو کس کا قصور۔ حب بغض و حسد اور حرص و طمع کے کانٹے دل و دماغ کو مجروح اور پاش پاش کر ڈالتے ہیں تو تو چلاتا ہے کہ دنیا دار المحن ہے، مصیبت کا گھر ہے۔ دُنیا کو بُرا کہتا ہے۔ اپنے آپ کو ملامت نہیں کرتا۔ جو روحیں ساٹھ اور ستر برس سے اس خاکدان میں رہ نورد ہیں مگر باوجود گوناگوں تعلقات کے طمع سے پاک، حسد سے دور، کینہ سے مبرا۔ نہ کسی سے کاوش، نہ کسی سے خواہش۔ وہ اس قمری سے زیادہ مطمئن اور مسرور ہیں جس پر تجھ کو رشک آیا۔ قمری بسیرے کی آمد کا سرور محسوس کرتی ہے، تو وہ ابدی راحت کی امید میں سراپا راحت ہیں۔ اُن کے لئے دنیا بھی دارِ سرور ہے اور آخرت بھی۔"

بیخودی کے اس تلاطم میں آفتاب غروب ہوگیا۔ تاریکی کی چادر میں دنیا جا چھپی۔ نہ قوسِ قزح رہا۔ نہ نورانی منظر۔ نہ قمری کا جوڑا۔ نہ بلند بالا درخت۔ محویت کافور ہوئی۔ ہوش و حواس بجا ہوگئے۔ بے اختیار زبان سے نکلا ؂

"خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا"

(اخبار سچ لکھنؤ مورخہ ، اکتوبر ۱۹۳۲ء)

تاریخ الاسلام للذہبی

یکم اگست اور ۱۶ راگست سنہ حال کے کانفرنس گزٹ میں تاریخ الاسلام للذہبی پر ایک مضمون چھپا ہے جو ڈاکٹر سموڈگی کے مضمون کا ترجمہ ہے۔

مترجم لکھتے ہیں کہ وہ اصل مضمون پڑھ کر ڈاکٹر سموڈگی مضمون نگار کے گرویدہ ہو گئے۔ کاش وہ الذہبی اور عربی علوم کے بھی گرویدہ ہوئے ہوتے۔ نقل کو چھوڑ کر اصل کو لیتے۔

سخت ضرورت ہے کہ ہمارا انگریزی داں طبقہ اپنے اصلی علوم میں ماہر ہو کر یورپ کے مستشرقین کو فیض پہنچائے۔ اور بجائے کاسہ لیسی کے اُن کی میزبانی کا شرف حاصل کرے۔

یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ مستشرقین جو غلطیاں کرتے ہیں (اور اکثر کرتے ہیں) اُن کی اصلاح ہو۔ اُن غلطیوں کا منشا اکثر تو نقطۂ نگاہ کا تفاوت ہے جو ایشیا اور یورپ کی نظر میں ہے۔ اور ایک بار سے زیادہ تنگ نظری اور تعصب سدِّ راہ ہو جاتا ہے۔ ہمت کا اقتضا یہ ہے کہ ہم خود اپنے مال کے محافظ ہوں۔ اُس سے دوسروں کو فیض پہنچائیں نہ یہ کہ غیروں کو نگہبان بنا کر اُن کی مدح وثنا کو اپنے لئے کافی خیال کریں

نفسِ مضمون اتنا طویل ہے کہ ایک رسالہ ہی کے لئے زیادہ موزوں تھا۔ کانفرنس گزٹ کے لئے مناسب خلاصہ بہتر ہوتا۔

آپ کا یہ خیال صحیح ہے کہ عربی الفاظ کی ہیئت ترجمہ در ترجمہ نے بہت کچھ متغیر کر دی ہے۔ دل اُن کے پڑھنے سے الجھتا ہے۔ مثلاً۔ الیونینی کو "الیونانی" لکھا ہے۔ مدعا کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ (دیکھو محولہ مضمون کے حصۂ ثانی کی ابتدا)۔

عیون الانباء فی طبقات الاطباء کے مؤلف کا لقب ابن ابی اُصیبعہ ہے۔ مضمون میں تالیف و مؤلف دونوں کا نام بدل گیا ہے۔ الذہبی کو الذہابی لکھ دیا ہے۔ اسی سلسلے میں ایک ترجمہ دیکھئے۔ قاضی ابن الشہبہ کا قول حاجی خلیفہ نے نقل کیا ہے۔ اصل عبارت عربی یہ ہے "قال ابن الشہبہ والعجب انہ وقف

فی تاریخ الاسلام علیٰ سبعمائۃ ۷۰۰ھ۔ ولم یوصله الیٰ سنة اربعین ۷۴۰ھ کما فعل فی العبرفان بین یدیه ذیل الیونینی الیٰ حین وفاته وذیل الجزری"۔ انتھیٰ۔

صحیح ترجمہ۔ ابن الشہبہ نے کہا ہے کہ تعجب ہے کہ وہ (ذہبی) تاریخ الاسلام میں ۷۰۰ھ پر ٹھہر گئے اور اُس کو چالیس ۷۴۰ھ تک نہ پہنچایا (یعنی ۷۴۰ ہجری تک) جیساکہ العبر میں کیا ہے۔ تعجب اس لئے ہے کہ ان کے سامنے الیونینی کا ذیل جو انھوں نے اپنی وفات تک لکھا ہے اور ذیل الجزری موجود تھے"۔

اس ترجمہ کو مضمون کی عبارت سے ملا کر پڑھئے اور حیرت کیجئے۔ الفاظ "بین یدیہ" کا ترجمہ کیا سے کیا کر دیا ہے۔ سنئے۔ "جیسے وہ العبر کو اپنی حیات میں "الیونانی" اور "الجزاری" سے لکھاتے رہے"۔ ڈاکٹر سمودگی نے الذہبی کی مطبوعہ کتابیں صرف دو لکھی ہیں (۱) المشتبہ فی اسماء الرجال (۲) میزان الاعتدال۔ واضح ہو کہ میزان الاعتدال "مشکوک یا غیر معتبر" روایتوں پر نہیں لکھی گئی ہے بلکہ اس میں رجال روایت ہیں ثقہ بھی اور ضعیف بھی۔

الذہبی کی دو معرکۃ الآرا کتابیں عرصہ ہوا حیدرآباد کے دائرۃ المعارف میں چھپ چکی ہیں۔ ایک تذکرۃ الحفاظ (۴ جلد) جو چالیس برس پہلے چھپ چکا ہے۔ دوسری تاریخ دول الاسلام۔ معہ ذیل مطبوعہ ۱۳۳۷ھ (دو جلد) دول الاسلام میں حالات ۷۴۴ھ ہجری تک ہیں۔ اس طرح ایک حد تک ابن الشہبہ کی شکایت دور ہو جاتی ہے۔

دول الاسلام معہ ذیل کا ایک نسخہ قلمی یہاں بھی ہے۔ جو امام ذہبی کے خط کی نقل ہے۔ اس میں ۷۴۰ ہجری تک کے حالات ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چار سال کے حالات اس کے بعد امام ذہبی نے بڑھائے۔

جو فہرست غیر مطبوعہ کتابوں کی ڈاکٹر سمودگی نے لکھی ہے اُن میں سے الکاشف کا مکمل نسخہ یہاں ہے۔

(کانفرنس گزٹ علی گڑھ مورخہ ۱۶ اکتوبر ۱۹۲۳ء)

تصانیف شیخ جمالی دہلوی

مئی سنہ ۱۹۳۲ء کے اورنٹیل کالج میگزین میں "سکندر لودھی اور اُس کے عہد کے بعض فارسی مصنفین کے" عنوان سے ایک محققانہ اور دلنشین مضمون چھپا ہی اُس میں شیخ جمالی کا بھی تذکرہ ہی۔ شیخ کی تصانیف کے سلسلہ میں تین کتابوں کے نام آئے ہیں: سیر العارفین[1]۔ اس پر تبصرہ کیا ہی۔ مثنوی مہر و ماہ[2] اور دیوان[3]۔ ان دونوں کو نایاب لکھا ہی جو امر واقع ہے۔

میرے یہاں علاوہ سیر العارفین کے دو اور کتابیں شیخ جمالی کی ہیں۔ ایک مثنوی مرآۃ المعانی دوم دیوان (ناقص الاول والآخر)۔

الف۔ مرآۃ المعانی تصوف میں ہی۔ اس میں سات سو شعر ہیں۔ مسائل تصوف کے بیان کئے ہیں چنانچہ سبب تالیف میں لکھا ہے ؎

ہر چہ بود اند آشکارا و نہاں	اصطلاحِ عارفاں کردم بیاں
نامہ راچوں روشنائی بر فزود	گشت مرآتے کہ روئے حق نمود
چوں معانی کرد حق الہام اُو	گشت مرآۃ المعانی نام او

اولاً سراپا کے مختلف اعضا پر عارفانہ کلام کیا ہی اور اُن سے معرفت کے نکتے پیدا کئے ہیں بعض عنوان ملاحظہ ہوں:

در بیان "روئے" کہ عبارت از وجہ حقیقی باشد

در بیان "دہان" گوید کہ اشارت از سر خفی ست

در بیان زلف گوید کہ اشارت از جذبہ حقیقی ست کہ طالب را از خودی برد۔ علی ہذا القیاس۔

سراپا کے بعد مسائل تصوف پر صراحتہً بحث ہے مثالاً۔ در بیان ضمیر گوید۔ در بیان تسلیم و رضا گوید علی ہذا۔ آغاز مثنوی حمد سے ہے۔ نعت کے بعد پیر کی مدح ہی۔ اُس کے بعد سبب تالیف۔ کلام پختہ۔ صاف

صوفیانہ ہے حشو و زواید سے پاک۔

نمونۂ کلام (حمد) نامہ آغازم بنامِ ذوالجلال | آنکہ۔ بیروں ذاتش از وہم و خیال
جانِ عالم پرتوِ انوارِ اوست | عرشِ اعظم نقطۂ پرکارِ اوست
صانعِ ہفت و نہ و پنج و چہار | خالقِ ماہ و خور و لیل و نہار
عالمِ اعیاں کہ آیاتِ ویست | حرفہائے مصحفِ ذاتِ ویست
(نعت) احمدِ مرسل کہ محبوبِ خداست | در صفِ اول امامِ انبیاست
گوہرِ بحرِ صفات و ذاتِ اوست | بیگماں مقصودِ موجوداتِ اوست
گر نبودے ذاتِ آں عالی صفات | در عدم ماندے وجودِ کائنات
کائنات از نورِ او پیدا شدہ | عقلِ کل از عشقِ او شیدا شدہ
(مدحِ پیر) از پسِ توحید و نعتِ مصطفیٰ۔ | برکشایم مدحِ پیرِ باصفا
بلکہ۔ اول واجب آمد بر مرید | تا بسازد نامِ پیرِ خود پدید
چوں کلیدِ نامِ پیر آمد بدست | برکشاید قفلِ ہر گنجے کہ ہست
ہر کہ اول ذاتِ پیرِ خود شناخت | با خدا آخر تواند عشق باخت
از جمالش شد جمالی آفتاب | زاں جمالی را جمالی شد خطاب
(خاتمہ) منتِ ایزد کہ در بحرِ عظیم | آشنا گشتم پئے دُرِّ یتیم
اندراں دریائے پُر خوفے درنگ | خویش را انداختم مثلِ نہنگ
غوطہ خوردم ہمچو غواصاں درو | مشکلِ خود ساختم آساں درو
عینِ معنی چوں صدف بشگافتم | گوہرِ اسرارِ حق دریافتم
اے جمالی جملہ دریا نوش باش | چوں صدف۔ پُر دُر شو۔ و خاموش باش

نسخہ خوش خط۔ صحیح بے عیب ہے۔ چھوٹی تقطیع کے ۱۱ صفحات ہیں۔ ہر صفحہ میں ۵ اسطر۔ کاغذ کرم خوردہ ہے تاریخ تحریر درج نہیں۔ بظاہر دو سو برس یا اس سے زیادہ زمانہ کا لکھا ہوا ہے۔ آخر کتاب پر خوشخط مہر مربع

میں نیر محمد شاکر کندہ ہے۔

(ب) دیوان۔ ناقص الاول والآخر۔ بخط پختہ صاف۔ جلی قلم۔ جدول طلائی شنگرفی ولاجوردی۔ کاغذ حنائی رنگ گجراتی۔ کم کرم خوردہ۔ نسخہ دو سو برس اُدھر کا معلوم ہوتا ہے۔ تقطیع اوسط۔ تعداد صفحات ۱۴۶۔ فی صفحہ ۱۵ سطر جملہ اشعار ۲۱۹۰۔ عنوان وغیرہ کی جگہ خارج کرنے پر تعداد اشعار کم وبیش ۶۰ کم ہو جائے گی۔ بہرحال ۲۱۰۰ سے زیادہ اشعار ہیں معلوم نہیں کہ اول و آخر سے کس قدر کلام کم ہے۔ ابتدا میں زیادہ کم معلوم نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ حمد کے تین قصیدے موجود ہیں۔ نعتیہ قصائد پانچ ہیں۔ اگر حمد کے قصائد بھی اسی قدر یا کچھ زائد ہوں گے تو ہمارا قیاس صحیح ہے کہ ابتدا میں زیادہ کمی نہیں۔ آخر کا اندازہ مشکل ہے۔ خصوصاً اگر غزلیات بھی اُس میں شامل تھیں۔

جیسا کہ اوپر بیان ہوا حمد کے قصیدے تین ہیں ۵ نعتیہ، بارہ مدح پیر میں، سات سکندر لودھی کی مدح میں اور چھ بابر اور ہمایوں کی مدح میں جملہ قصائد ۳۹ ہیں۔ ترجیع بند۔ نعتیہ ایک۔ عارفانہ ایک جملہ دو۔ ترکیب بند (مراثی) مرثیہ سلطان سکندر ایک۔ مرثیہ پیر خود ایک۔ مرثیہ فرزند پیر دو۔ مرثیہ فرزند خود مسمی یہ حسن ایک۔ جملہ پانچ۔ آخر میں ایک ترکیب بند عارفانہ ہے۔ جو ناقص ہے اور اسی پر ناتمام نسخہ تمام ہو جاتا ہے۔

قصائد کے لوازم۔ شوکتِ الفاظ۔ بلندی خیال اور بندش کی پختگی کی پوری پابندی معلوم ہوتی ہے۔ مضامین میں تازگی بھی ہے۔ محض قافیہ پیمائی یا رہ نوردی نہیں۔ گریز بھی خوبی رکھتی ہے۔ بعض بدیع ہیں۔ تشبیب مناسب و با موقع ہے۔ نمونہ قصائد ملاحظہ ہو۔

حمد۔ بر طرح مشہور

اے رُخے خود زپردہ نمودار ساختہ	خود را بحُسنِ خویش طلبگار ساختہ
تابِ رُخت بچہرۂ اعیانِ ثابتہ	بخشیدہ نور مظہرِ آثار ساختہ
چوں رُو کشودہ ذات تو از پردۂ صفات	عالم عیاں زپرتوِ رخسار ساختہ
عکسے زدہ در آئینہ حسنِ جمالِ تو	آئینہ را بحُسن گرفتار ساختہ
شاخ و درخت و باغچہ و کائنات را	فیضِ تو پُر زبرگ و گُل و خار ساختہ

یک دانه ز خرمنِ لطفت بباغِ خلد　　اشجار را پُر از گل و اثمار ساخته
یک رشحه ز فیضِ جلالت ز روئے لطف　　حور و قصور و جنت و گلزار ساخته
یک نفحهٔ وزید ز زلفت بسوئے چین　　پُر مشک نافِ آہوئے تاتار ساخته
یک موجئے از محیطِ ہویت برون ده　　صد بحر و جوئے و جدول انہار ساخته
یک پرتو تجلی حسنت ہزار دل　　در صد بلا کشیده و افگار ساخته
یک نورِ پاک را بہ سپاہِ تجلیات　　ذاتِ تو برگزیده و سردار ساخته
نامش نہاده احمد و محمود۔ المصطفی　　در انبیا خلاصهٔ ابرار ساخته
از بہرِ پیشوائیِ انس و ملک ورا　　در راہِ عشق قافله سالار ساخته
مستانِ جامِ بادهٔ عشقِ ترا اگر　　آواز کُن کشیده و ہشیار ساخته
چشمِ تو غمزه زده بر ترکشِ بتان　　خونخوار و دلفریب و ستمگار ساخته
آنرا که کرده دردِ غمت آشنائے خویش　　از خویش و آشنا ہمه بیزار ساخته
آنرا که چشمِ قہرِ تو انداخت از نظر　　در مردمان سرشکِ صفت خوار ساخته
وانرا که داده لطفِ تو انوارِ مردمی　　منظورِ دیدهٔ اُولو الابصار ساخته

نعت از ترجیع بند

دوشش در ملکِ ملک گلبانگ لانغیا زدیم　　اندران وادی دم از مہر رخ اطلہ زدیم
از بساطِ قدسیان در بزم لاہوتی شدیم　　پس در آن بزم از ید الله ساغر صہبا زدیم
در ہوائے سایهٔ بالِ ہمائے ہمتش　　در فضائے لامکان پرواز با زآسا زدیم
بر سریرِ عرشِ اعظم نوبتِ شاہِ عرب　　ہر نفس در ملک سبحٰن الذی اسریٰ زدیم
تا شدیم از جان غلام چار یار از یک دلی　　چار طاقِ خسروی بر گنبدِ مینا زدیم
در ہوائے گلشنِ رویش بر آوردیم آه　　شعلهٔ آتش بباغِ جنت الماوا زدیم
چون مسیحا از کفِ عالم کشیدیم آستین　　دست در دامانِ آن خورشیدِ بے ہمتا زدیم

آنکہ چشمِ قدسیاں را سرمہ خاکِ پائے اوست
نورِ مازاغ البصر در دیدۂ بینائے اوست

مدحِ پیر و مرشد - تشبیبِ قصیدہ

شاہ را چترِ سیہ گرداں نہ گرد افسر ست
دودِ سرگردانیِ سودائے دنیا بر سر ست

عاشقِ عریاں تن ار لشکر ندارد بادشاست
دودِ آہش چترِ مشکیں اشکِ رنگیں لشکر ست

سرورِ دنیاست گو پوشد قبائے ہفت تنگ
چوں گدا یک رنگ باشد در دو عالم سرور ست

ہر کرا در معرفت نورِ بصر سنجیدہ گشت
پیشِ چشمِ روشنش ہر ذرہ مہرِ انور ست

روح را راحِ محبت دہ کہ آں جامِ جم ست
قلب را بخشا صفا کائینۂ اسکندر ست

دل ز حرص و کینہ خالی کن کہ تا مونس شوی
خوک و سگ بردن بہ بیت اللہ کارِ کافر ست

شو خلیل اللہ کہ تا آتش گلستانت بود
بت پرستِ نفس نزدِ حق خلیلِ آذر ست

پاسِ انفاس ار نداری باغِ عمرت را خزانست
ہر دمے کو را خدا ہمدم نباشد صرصر ست

ز آسماں گر تیغ بارد سر نخارد اہلِ دل
نیشِ سوزن بر دلِ نامرد زخمِ خنجر ست

مرد نتواں گفت او را کو تن آراید بہ زر
زینتِ مرداں ست آہن زر - زناں را زیور ست

مرد را کردار عالی قدر گرداند - نہ نام
ہر سگے را کو علی نام ست - نے چوں حیدر ست

از معانی افتخارِ سینۂ عالم بود
عزتِ معدن نہ از کوہ ست بل کز گوہر ست

سرخیِ روئے منافق لالہ را ماند - کہ او
اسود القلب ست اگرچہ رنگِ رویش احمر ست

نے کسے کاہل بیاباں شد - دمِ وحدت نہ زد
خون ہر آہوئے صحرائی نہ مشکِ اذفر ست

اصلِ ایماں در نیابی در فقیہِ بے اصول
کامتحانِ دین او را اختصارِ مختصر ست

مدحِ سلطان السلاطین سکندر بڑے جوش سے کرتے ہیں - ایک جگہ کہتے ہیں :-

میانہ من و تو دوستی بہرِ خداست
نہ از برائے متاعِ زمانۂ غدار

ولہ

قد و رخسار و زلف و لعل و خط آں دلبر
یکے عرعر یکے اختر یکے عنبر یکے شکر

چہ عرعر عرعرِ رعنا - چہ اختر اخترِ زیبا
چہ عنبر عنبرِ سارا چہ شکر شکرِ عسکر

رخ و دندان و خطّ و موے مشک افشانِ او باشد — یکے لالہ یکے ژالہ - یکے ہالہ یکے عنبر

چہ لالہ لالۂ رنگیں - چہ ژالہ ژالۂ سیمیں — چہ ہالہ ہالۂ مشکیں چہ عنبر عنبرِ ابتر

دل و آہ و سرشکِ سرخ و رگہاے وجودِ من — یکے منقل یکے مشعل یکے جدول یکے مسطر

چہ منقل منقلِ پرخوں چہ مشعل مشعلِ گردوں — چہ جدول جدولِ گلگوں چہ مسطر مسطرِ دفتر

شہے کش ہست دربان و غلام و چاکر و خادم — یکے نوذر یکے سنجر یکے قیصر یکے سرور

چہ نوذر نوذرِ اعظم - چہ سنجر سنجرِ اکرم — چہ قیصر قیصرِ منعم چہ سرور سرورِ اکبر

سکندر شاہ کز دست و دل و قدر و شرف دارد — یکے قدرت یکے شوکت یکے رفعت یکے لشکر

چہ قدرت قدرتِ بیچوں چہ شوکت شوکتِ افزوں — چہ رفعت رفعتِ گردوں چہ لشکر لشکرِ بے مر

زگرز و پال و تیر و ناوک و شمشیر تیزِ او — یکے مالک یکے سالک یکے ہالک یکے اژدر

چہ مالک مالکِ ہیجا چہ سالک سالکِ بے پا — چہ ہالک ہالکِ اعدا چہ اژدر اژدرِ اقہر

ز طبع و تیغ و جود و دستِ او از فرقِ سرشان زد — یکے ملّت یکے نصرت یکے دولت یکے افسر

چہ ملت ملّتِ احمد چہ نصرت نصرتِ بیحد — چہ دولت دولتِ سرمد چہ افسر افسرِ مفخر

ز فیض و لطف و جود و بذلِ او پیوستہ می کاہد — یکے مدفن یکے مخزن یکے معدن یکے گوہر

چہ مدفن مدفنِ کالا چہ مخزن مخزنِ دریا — چہ معدن معدنِ دُرہا چہ گوہر گوہرِ ازہر

مدح سلطان ظہیر الدین محمد بابر - بادشاہ رزم جنگ پانی پت

رزم | ز افغان فغاں برآمد آندم کہ شد حسامت — اشباح را مخرّب - ارواح را محصّل

از صدمۂ سمندت - ہر فیلِ کوہ پیکر — در خاک و خوں فرو شد ہمچوں حمار در گل

در حلقۂ سپاہت کامد عدو پُر از خوں — چوں نقطۂ ز سرخی در چشم گشتہ داخل

چوں وردِ دعا برآمد بسم اللہ از زبانت — از خنجرت ہمان دم خصمِ تو گشت بسمل

یک دم ز قلبِ افغاں تیغت نگشتہ یکسو — کے آب دُور گردد یا خوں چہ گشت واصل

مُردن گزید خصمت بر زندگی کہ اورا — مشکل نمود آساں۔ آساں نمود مشکل

بزم

در مکتبِ سعادت بہرِ قضاے گردوں — بر جبہیں را ضمیرت آموختہ مسائل

در بزمِ نکتہ دانی فکرِ تو بادہ مجلس — در مجمعِ معانی راے تو شمعِ محفل

لعل و زمرد آرد بہر جائے سبزہ و گل — بارانِ ابرِ دستت جائیکہ گشت نازل

از دستِ دُرفشانت دیوانہ گشت دریا — باشد گسستہ زاں رو پیوستہ در سلاسل[1]

ایضاً۔ اس قصیدے کی تشبیب بابر کے تیموری ذوق کی ہو بہو تصویر ہے اور شاعر کے کمال کی سند:۔

باد جاں پرور وزید اے ابرِ نوروزی ببار — شد چمن سر سبز بر فرقش لآلی کن نثار

چار باغِ[2] بادشہ دارد نشان ہشت خلد — آب جو آمد مثالِ سلسبیلش در کنار

شد کنارِ جویبار۔ از سبزہ۔ مینائی بساط — تا دہد سلطانِ گل اندر کنارِ جویبار

رشتہاے از ہوا چوں تارِ زر بیروں کشید — میکند ہر رشتہ پُر باراں بذرِ شاہوار

لالہ دارد جام یاقوتی پُر از مے از چہ بود — نرگس اندر عین مستی سرگراں گشت از خمار

تا کلیمِ عندلیب آید بہ دستاں در کلام — از براے او ہوا بر شاخِ گل افروخت نار

شاخسارِ سرو و اوراقِ شجر بنگر کہ ہست — در بہ ہر برگ طوطی۔ بر سرِ ہر شاخ۔ سار

ہمچو لعلِ جانفزایاں غنچہ را شیریں دہن — ہمچو روے دلکشایاں لالہ را رنگیں عذار

صوفیانِ سبز پوشِ باغ را وجد ست و حال — از سرودِ بلبل و از دستکِ برگِ چنار

اندریں موسم کہ در کشتی نشیند بادشاہ — آفتابے داں کہ اندر ماہِ نو گیرد قرار

در بہارِ مجلسش میخواند بلبل ایں غزل — بر مثالِ عاشقِ شوریدہ دل بر بوے یار

غزل

اے ز رشکِ عارضت پیوستہ گل در خارخار — در غمِ رویت چو من جاں دادہ در رہ صد ہزار

از چہ بُد سر بر ندارد لالہ در صحنِ چمن — گر نماند از عارضِ رنگینت اے گل شرمسار

سنبلِ پیچانِ تو از سرکشی۔ مشکیں کمند — نرگسِ فتانِ تو۔ از خونخوری مردم شکار

---

[1] اس شعر کی ندرت قابلِ داد ہے۔ (شروانی)

[2] در آگرہ حالا آرام باغ نام دارد ۱۲ شروانی

چشمِ تو با طاقِ ابرو ہندوئے محراب گیر
خالِ تو با زلفِ مشکیں کافرِ زنّار دار

میدوَد پیوستہ دل بر رشتۂ ہر موئے تو
بر مثالِ عنکبوتے[1] کو دوَد بر روئے تار[2]

جانِ سرگرداں۔ ز روزنہا۔ کہ دارد سینہ ام
سوئے خورشیدِ رخت رقصاں برآید ذرّہ وار

چشمِ تو در عینِ بیماری ز خونِ مردماں
باز می ناید۔ نمی ترسد ز عدلِ شہریار

شاہ جم سیرت ظہیر الدین محمد بابر۔ آنکہ
خاکِ درگاہش بود مسجودِ شاہانِ کبار

از خراساں چوں بہندستاں شدی آمد ترا
بخت و دولت در یمین و فتح و نصرت در یسار

دشمنت را زندگی شد خواب آسایش محال
خود خیال و خواب را چنداں نباشد اعتبار

۱ (خوبیِ تشبیہ ملاحظہ ہو)۔ ۲ اسی مضمون کو سیادت لاری نے باندھا ہے:۔

ہمیں نہ دل بقفایش رَوَد ز کوچہ آہ
چو عنکبوت دوَد دیدہ ہم بہ تارِ نگاہ

دونوں شعروں کا فرق ظاہر۔ سیادت کی تشبیہ زیادہ بلیغ ہے۔ پہلے مصرعہ میں کوچہ کی جگہ رشتہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ (حسرت شروانی)

در صفِ ہیجا شد از گرد و غبارِ موکبت
چہرۂ افلاک تیرہ و دیدۂ خورشید تار

صورِ اسرافیل گشتہ بانگِ سُرنائے و نفیر
فیلہا جنبیدہ ہر سو چوں بہ محشر کوہسار

خونِ بدخواہاں دمادم شد رواں مانند جوئے
نیزہا بنمود سرو ستاں کنارِ جوئبار

اندراں معرض ندا از ہاتفِ غیبی رسید
سوئے تو نصرٌ من اللہ۔ سوئے دشمن الفرار

از نہیبِ شوکتِ شیرافگنت در روزِ رزم
شد زمین در اضطراب و آسمان در اضطرار

از جلوست شد مشرّف تختِ دار الملکِ ہند
آسماں بر پایۂ تختِ تو شد کوکب نثار

ملکِ ہندستاں ز انصافت چناں رونق گرفت
رستۂ بازارِ اردو شد ز کابل تا بہار

ہراقی۔ مرثیے بہت دردناک کہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ خونِ جگر نوکِ قلم سے ترا وش کر رہا ہے۔ سب مرثیے بصورت ترکیب بند ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو:۔

مرثیۂ پیر و مرشد

اے دیدہ خوں بریز کہ دلدار غائب است
یعنی جمالِ آں مہ رخسار غائب است

اے ظلمتِ ستم رخِ آفاق را مپوش　　　کاں آفتابِ عالمِ انوار غائب ست

شیخے کہ سرّ حق ز لبش می شنود خلق　　　اکنون میانِ عالمِ اسرار غائب ست

در غارِ غم روید کہ آں یارِ غارِ دیں　　　ہمچوں نبی کنوں بدلِ غار غائب ست

زاں جاں ہمی کنیم کہ جاناں نہفت روئے　　　زاں غم ہمی خوریم کہ غمخوار غائب ست

انوارِ آں جمال۔ بمعنی محیطِ ماست　　　گر صورتش ز دیدۂ خونبار غائب ست

یارب چہ حالت ست کہ امروز در جہاں　　　صبر و قرار۔ از دلِ ابرار غائب ست

یعنی سمارِ دولتِ دیں زیرِ خاک شد۔

زیں غم ہزار جامۂ اسلام چاک شد

مرثیہ فرزند پیر و مرشد۔ موسوم بہ عبداللہ :۔

بند دوم　یعنی از روئے زمیں مطلعِ انوار برفت　　　قرۃ العین سمار الحق ازیں دار برفت

در بیابانِ بلا ما ہمہ سرگردانیم　　　پیشوائے دل و دیں قافلہ سالار برفت

دل برآریم ز جاں جاں بدر آریم ز تن　　　دل و جاں را چہ تواں کرد کہ دلدار برفت

جگرم پارہ شد و سینہ پر افگار بماند　　　سیلِ خوں دم بدم از دیدہ برخسار برفت

کوہ را طاقتِ آں نیست کہ ایں بار کشد　　　آنچہ بر جانِ منِ خستہ ازیں بار برفت

می خلد خارِ غم اندر جگر و سینہ از آنکہ　　　گلِ رعنائے من از عرصۂ گلزار برفت

باز جنبید نہ دانم ز کجا سیلِ فنا　　　کہ از و خانۂ دیندار ز دیوار برفت

غمِ دل با کہ تواں گفت کہ از روئے زمیں　　　بقضائے فلک آں محرمِ اسرار برفت

طالباں از غمِ او جامۂ جاں چاک زدند

خویش را سینہ در آتش زدہ بر خاک زدند

مرثیہ فرزند خود مسمی بہ حسن

روزگارِ بے وفا با من عجائب کار ساخت　　　سینہ ام افگار کرد و دیدہ ام خونبار ساخت

بختِ من بیدار بود و فتنہ محنت بخواب
بخت را در خواب کرد و فتنہ را بیدار ساخت

سوزِ غم را یا دل بے صبرِ من ہمدرد کرد
صبر را از سینۂ پُر دردِ من بیزار ساخت

اے عزیزاں یوسفم گم کرد ایں گرگِ کہن
دیدۂ یعقوب چوں اشکِ زلیخا خوار ساخت

صد ہزاراں داغِ محنت بر دلِ پُرخوں نہاد
مُردن آساں کرد بر من زندگی دشوار ساخت

دیدۂ ما ہر دم از عکسِ رخش گلزار بود
دَورِ گردوں آں ہمہ گلزار را پُر خار ساخت

آنکہ از روئیش در و دیوارِ ما پُر نور بود
روزگار - اندر میانِ ما - و - او - دیوار ساخت

دیدہ گریاں سینہ بریاں دل پریشاں جاں خراب
ہمچو مرغِ نیم بسمل می طپم در اضطراب

مرثیہ سلطان سکندر لودھی

خلق حیران و پریشانست شہنشاہ چہ شد
ہمہ بر سینہ زناں دست کہ اللہ چہ شد

مہر در آتشِ غم سوخت۔ شفق خوں بارید
انجم از چرخ فرو ریخت کہ آں ماہ چہ شد

ظلمت آباد شد آفاق ز شامِ غمِ او
یارب آں طلعتِ خورشیدِ سحرگاہ چہ شد

خوں گرہ شد بگلو زآہ۔ دمم شد مسدود
در غمِ آں کہ مرا ہمدم و ہمراہ چہ شد

ویک با آں فرحت و آں بہجت و آں حال چہ گشت
اوجِ آں دولت و آں مسند و آں گاہ چہ شد

تا بہ دنبالِ وے افسوس کناں می رفتم
ہیچ فردے نشد از رفتنش آگاہ چہ شد

نیک خواہان وے ایں لحظہ اجل خواہ شدند
کاں خدا دان و خدا بین و خداخواہ چہ شد

ہاتفم گفت میندار کہ او در خاکست
قدسش ہمچو پیمبر بسر افلاکست

اس کا آخیر شعر ہے:-

بادہ ہمچوں تو سزاوار سریر و دیہیم
مردمِ چشمِ تو۔ سلطانِ جہاں ابراہیم

ترجیع بند در معرفت

ای رخت در جمال تو پیدا   وی جمال تو بر رخت شیدا
عارضت نور دیدهٔ مردم   مردم از عارض تو نابینا
مانده تنها بعین تنهائی   کرده پیوند با همه تنها
همه نام تو بر زبان دارند   مومن و گبر و کافر و ترسا
گاه ناظر بدیدهٔ وامق   گاه منظور در رخ عذرا
رفته از ذات در سرای صفات   هشته بر او غشاوهٔ اسما
جمله اسم و صفات را ناگاه   دیده در ذات ظاهر و پیدا
گاه دریا بموج کرده ظهور   گاه شد موج عین آن دریا
یار با ما و ما همه بی او   مانده تنها چو او و بی ما
گر نهانست چیست چندین شور   ور عیانست چیست این غوغا
مطرب دل به پرده میگوید   تننا تن تنا - و - تن درنا

که هو عابد و هو معبود
لیس فی الدار غیره موجود

ترکیب بند معرفت

ماییم خلاصهٔ دو عالم   تفسیر حروف اسم اعظم
هم ذات خدا بذات مبیّن   هم نور صفت بما مسلّم
مشهور رخ صفات و اسما   مسجود فرشتهٔ معظّم
همواره بما کمال مضمر   پیوسته بما جمال مدغم
از بهر ظهور صورت دوست   آئینهٔ معنی است آدم
دریای محیط بیکرانه   این قطره که شد عیان ز شبنم
هر قطره که شد ز موج پیدا   هم موج فرو کشید و هم یم
آن کس که شود نهنگ این بحر   باشد به نشیب ورطه بی غم

نے تنگ ز کفر نہ خرم از خیر — نے خوش ز ثنا نہ ناخوش از ذم
بیزار ز قید کفر و اسلام — آزاد ز جنت و جہنم

اینست کمال رہرو دیں

ایں جا ازل و ابد یکے ہیں

یہ ترکیب بند ناتمام رہتا ہے اور ناتمام کتاب تمام ہو جاتی ہے۔ سارا ترکیب بند جوش اور زور کلام کا آئینہ ہے۔

غزل

ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ اس مجموعہ میں غزل نہیں۔ خوش قسمتی سے دو غزلیں قصیدوں کی ضمن میں آگئی ہیں۔ ایک لکھی جا چکی ہے۔ دوسری ملاحظہ ہو جو پیر و مرشد کے قصیدے میں لکھی ہے۔ شعر قصیدہ ۹۔

در ہوائے محفلش میخواند بلبل ایں غزل
زد گریباں تا بدامن چاک ازیں گفتار گل

اے قدت شمشاد و عارض لالہ و رخسار گل — لالہ ات ریحاں دمد شمشادت آرد بار گل
در گلستاں سنبل از نسریں برافگن کز حیا — باز گردد غنچہ و باشد نہاں رخسار گل
تا نہاں کردی رخ اے سرو روانم از نظر — می فشانم دمبدم از دیدۂ خونبار گل
گرچہ رنگین و لطیف و نازک آمد در چمن — پیش رخسارت ندارد قیمت و مقدار گل
بت پرست شد نشان زرد کفرش بر جبیں — ریسماں دارد بگردن بستہ چوں زنار گل
در فراقت نالۂ زار من آرد گریہ گوش — از نوائے نغمۂ بلبل بود بیزار گل
ناظر روئیت رقیب و من بفریاد و فغاں — بلبل اندر نالہ و در چشم بوتیمار گل
باشد از خار جفائے عارض رنگین تو — چوں دل بلبل ہمہ تن در چمن افگار گل
اندکے با روئے رنگینت نباشد نسبتش — گرچہ شوید ز آب شبنم روئے خود بسیار گل
بر گلستان رخت ہر تار زلفت حلقہ زد — می نماید روئے تو از حلقۂ ہر تار گل

تا خیالِ روئیت اے گل خانۂ چشم گرفت　　　در نظر می آیدم ہر سو در و دیوار گل

چشم من در انتظارت ہمچو نسریں شد سپید　　　تا بہ زلفینِ سیہ کردی نہاں اے یار گل

می سزد گر نایدت عارے ازیں تن اے ضعیف　　　زانکہ از خارے ندارد در گلستاں عار گل

پیش مخدوم جہاں نالم چو بلبل از غمت
زانکہ لطفش در اماں دارد زجور خار گل

(کلام پر رائے از حضرت شروانی)

جمالی را جمالِ شعر زیبا　　　فریب چشم ساقی ہاں مگر نیست

برائے شاعری آمادہ ہر چیز　　　"ورائے شاعری چیزے دگر نیست"

وہ جو آل تیمور کے شاعروں کے یہاں ہے۔

(رسالہ اورنٹیل کالج میگزین لاہور بابتہ ماہ نومبر ۱۹۳۳ء)

مقدمۂ کلیاتِ عزیز

لکھنؤ کے دورِ آخر کو جن اہل کمال پر ناز اور بجا ناز تھا اُن میں خواجہ عزیز الدین عزیز مرحوم ممتاز ہیں امتیاز کی وجہ یہ ہے کہ ادب فارسی میں کمال حاصل کیا اور ان میدانوں میں علم استادی بلند کیا جو متاخرین کی دسترس سے باہر تھے۔ یعنی مثنوی و قصیدہ۔ اصناف سخن میں سب سے زیادہ مختصر رباعی ہے جو سب سے زیادہ مشکل ہے۔ دیکھو صدیوں کے دوران میں صرف چار پانچ ہی استاد رباعی گزرے ہیں۔ حضرت ابو الخیر ابو سعید۔ شیخ الاسلام انصاری۔ عمر خیام۔ سحابی نجفی۔ دل چاہے تو سرمد کو بھی یاد کر لو اس نے بھی ایک لطف پیدا کیا ہے۔

رباعی کے بعد مثنوی ہے۔ اس میں اساتذہ کی تعداد بیس[۲۰] سے زیادہ نہ ہوگی۔ مثنوی کے بعد قصیدہ ہے اس کے استاد سنو کے اندر اندر رہیں گے۔ سب سے زیادہ آسان غزل ہے۔ استاد غزل بیسیوں مشاہیر غزل

سینکڑوں ہیں۔ کہنا یہ تھا کہ خواجہ عزیز صاحب اتیازیوں ہیں کہ انھوں نے مثنوی اور قصیدہ میں جوہر کمال دکھائے مذاق شعر کا پایہ بلند کیا۔ اس کا ثبوت آگے دیکھو۔

لکھنؤ کی سبزی منڈی میں خواجہ صاحب کی بارہ دری گویا خیابانِ شیراز تھی۔ انسان وہاں پہنچتا تو حافظ و سعدی کے کمال کی مہک یا تا رونق دوبالا ہوجاتی جب علامہ شبلی بھی وہاں ہوتے۔ اور یہ اکثر ہوتا۔ لکھنؤ کی حاضری میں خواجہ صاحب کی خدمت میں باریاب ہونا میرے لئے لازم تھا۔ جس وقت اطلاع پہنچتی محل سرائے سے اس شان سے برآمد ہوتے کہ لب پر تبسم ہوتا۔ ہاتھوں میں چار کا سامان۔ بالاتر قلبی محبت کا اثر تمام حرکات و سکنات میں عیاں نظر آتا۔ مراتب پذیرائی کے بعد میٹھی باتیں کرتے چار کی تیاری کا اہتمام جاری رہتا۔ ناممکن تھا کہ مہمان ہاتھ ہٹائے۔ چار میں زعفران ضرور پڑتی۔ شام سادہ صبح کو دودھ ناشتہ کے ساتھ۔ بازار کا دودھ جب چار کو بد رنگ کر دیتا تو خواجہ صاحب کا جز بز ہو جانا قابل دید ہوتا۔ کم سخن تھے اور سادہ بیان۔ خودستائی سے نفور کوسوں دور اس لئے گفتگو میں خوش بیانی نہ تھی۔ ع

"ورلئے شاعری چیزے دگر بود"

خواجہ صاحب کے اوصاف کی وہ تاثیر تھی کہ سیدھی سادہ مختصر باتوں پر خوش بیانی کا دفتر قربان تھا۔ بارہا حاضر ہوا مگر کلام سننے یا حاصل کرنے میں اتنا کم کامیاب ہوا کہ گویا نہ ہوا۔ ہاں دوسروں کا کلام سناتے ادبی نکتے بیان فرماتے علمی سوالوں کا جواب شافی ملتا۔ ناممکن ہے کہ ان صحبتوں کا ذکر ہو اور خواجہ نور الدین مرحوم کی نورانی صورت یاد نہ آئے۔ اُن کا ایک طرف خاکسارانہ بیٹھنا۔ کلام کے مزے لینا۔ نکتہ سنجی۔ لطیف کلام۔ ایک خاص لطف رکھتا تھا جو برسیں گزر جانے پر بھی آج تک نقشِ دل ہے۔

خواجہ صاحب کی وفات سے آج تک دل کو ہمیشہ یہ قلق رہا کہ مرحوم کا کلام مرتب و شائع نہ ہوا۔ جب یہ خیال آتا کہ کس مپرسی میں کہیں تلف نہ ہو جائے تو دل پر ایک چوٹ سی لگتی۔ مسرت نہیں حیرت ہوئی جب میں نے دیکھا کہ چھپا چھپایا مجلد "کلیات عزیز" میری آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔ قدرت نے یہ کام کس کے ہاتھوں سے لیا۔ اُس کے جس کو نہ شاعری سے لگاؤ ہے نہ شعر و سخن سے۔ خواجہ عزیز کے

فرزند عزیز خواجہ وصی الدین صاحب میں اور بہت سے جوہر ہیں مگر "موزونیت" تو اُن کی طبیعت سے بمراحل دور ہی باوجود اس کے اپنے باکمال والد کا کلام مرتب کرکے چھپوا دینا قابل صد ستایش اور دنیائے ادب پر عظیم احسان ہی۔ مقولہ ہی کہ نام آسمان سے اُترتے ہیں۔ ان کا نام شاید وصی الدین اسی لئے ہوا تھا کہ اشاعت کلام کی وصیت پوری کریں گے۔ انھوں نے اپنے نامور باپ کی روح کو شاد کیا۔ اللہ پاک ان کو دارین میں شاد بامراد رکھے۔

حالات خواجہ عزیز کے مورث خواجہ محمد مقیم آٹھویں صدی ہجری میں ترکستان سے حضرت سید شرف الدین بلال شاہ کے ساتھ کشمیر میں آکر مقیم ہوئے۔ یہ ہی حضرت بلبل شاہ ہیں جنہوں نے کشمیر کو اسلام پھیلا کر جنت نظیر بنایا۔ خواجہ مقیم تاجر تھے اور یہ پیشہ آخر تک اس خاندان میں رہا۔ خواجہ عزیز کے والد خواجہ امیر الدین نے تجارت کا دائرہ اتنا وسیع کیا کہ یورپ کو بھی پشمینہ پوش اور کشمیر کا حلقہ بگوش بنا دیا۔ فرانس خاص بازار تھا۔ یورپ کے تاجران کے یہاں آکر مہمان رہتے اور فرمایشیں تیار کراکے واپس جاتے۔ خواجہ امیر الدین نے کشمیر کی سکونت ترک کرکے لکھنؤ میں بود و باش اختیار کی۔ سبزی منڈی کی بارہ دری اُنھی کی بنا کردہ ہی۔ یہاں بھی شال کا کارخانہ وسیع پیمانہ پر قایم کیا۔ بالآخر تجارت کی کساد بازاری اور یورپ کی خودغرضی نے اس کارخانہ کو بھی سرد کر دیا۔ شکر ہی کہ خواجہ عزیز کی گرمیِ سخن نے اُس کو وہ نور بخشا کہ آج تک روشن و منور ہی۔

خواجہ عزیز ۱۸۲۱ء میں ملک کشمیر میں پیدا ہوئے۔ آٹھ برس کی عمر تھی کہ باپ کے ساتھ لکھنؤ پہنچے اور یہیں تحصیل علم کی۔ افسوس ہی کہ خواجہ کی تحصیل علم کے حالات پردۂ خفا میں ہیں۔ کیا پڑھا کس سے پڑھا۔ کچھ نہیں معلوم۔ فارسی پڑھی بلکہ اُس میں کمال حاصل کیا۔ اس میں کیا کلام ہو سکتا ہی۔ علوم عربیہ میں بھی صاحب استعداد تھے۔ خصوصاً ادب میں۔ حماسہ۔ متنبی۔ سبعہ معلقہ کا بارہ دری میں درس دیتے تھے۔ یہ بھی روایت ہی کہ ایک افغانی بزرگ کی صحبت میں (جو درگاہ حضرت شاہ مینا میں رہتے تھے) کلام فارسی میں ترقی کی۔ ان بزرگ کا نام عبداللہ تھا۔ ابتدائی شاعری کا نمونہ ؎

ما عاشقیم عشق بود کار ما عزیز   عاشق پسند ہست ہمانا کلام ما

خواجہ صاحب کی شادی داروغہ عاشق علی خاں کے یہاں ہوئی جو محمد علی شاہ بادشاہ کی سرکار میں توشہ خانہ کے داروغہ تھے اور حسین آباد کی تعمیر کے مہتمم۔ خواجہ صاحب کے اقربا بھی لکھنؤ اور کشمیر میں نامور رہے۔ نواب قمرالدولہ، ظہیرالدولہ اور شرف الدولہ کے نام شرف خاندانی کی روشن سند ہیں۔

۱۸۶۴ء میں خواجہ صاحب نے اپنے دوست شیخ واجد حسین صاحب تعلقدار کے اصرار پر کیننگ کالج میں فارسی کی پروفیسری قبول فرمائی اور نو سال تک اس فیض کو جاری رکھا۔ اس میں کون شبہ کرسکتا ہے کہ اس تعلق سے خود کیننگ کالج کا شرف بڑھا۔ ۱۹۰۹ء حیدرآباد دکن کے محکمۂ السنہ شرقیہ کے ممتحن مقرر ہوئے۔ خواجہ صاحب کی سوانح میں غالب دہلوی سے ملاقات کا واقعہ شان رکھتا ہے۔ ۱۲۸۰ھ میں اثنائے سفر کشمیر میں وارد دہلی ہوئے تو غالب کی زیارت کا شوق دل میں پیدا ہوا۔ مرزا کا یہ آخری زمانہ تھا۔ پلنگ پر لیٹے رہتے تھے۔ سماعت اس قدر کم ہوگئی تھی یا کم کر رکھی تھی کہ لوگ بجائے بات کرنے کے کاغذ پر مطلب کی بات لکھ کر پیش کرتے اور مرزا صاحب لیٹے لیٹے جواب لکھ دیتے یہی معاملہ خواجہ صاحب سے پیش آیا۔ تحریر سے ذوق شعر محسوس کرکے مرزا نے شعر کی فرمائش کی۔ خواجہ عزیز نے یہ شعر لکھ کر پیش کیا ؎

مہ مصر ست داغ از رشک مہتابے کہ من دیدم
زلیخا کور شد در حسرتِ خوابے کہ من دیدم

غالب کو "مہ مصر" کی ترکیب میں تامل ہوا کہا "ماہ کنعاں سنا ہے مہ مصر نئی ترکیب ہے"۔ خواجہ عزیز نے صائب کا شعر سند میں پیش کیا تو مرزا بہت خوش ہوئے۔ شعر بار بار پڑھا اور تحسین بلیغ کی۔ خواجہ عزیز کا ایک نعتیہ شعر بہت بلند پایہ ہے ؎

وہد حق عشق احمد بندگانِ چیدہ خود را
بخاصان شاہ بخشد مئی نوشیدۂ خود را

پٹنہ کے صاحب دل بزرگ مولانا محمد سعید حسرت تخلص نے یہ شعر سنا تو کیف وجد طاری ہوگیا کلکتہ کی ایک مجلس میں جب کہ ہفت بند عزیزی پڑھا گیا تو ایرانیوں پر بھی کیفیت ذوق طاری ہوئی۔ خواجہ

صاحب نے کشمیر کا کئی بار سفر کیا تھا منجملہ اُن کے ایک سفر کی یادگار مثنوی "ارمغانِ لاجواب" ہے۔ خواجہ صاحب نے ۵۰ برس کی عمر میں ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۵ء میں بمقام لکھنؤ رحلت کی۔ کٹرہ ابو تراب خاں میں دفن ہوئے غفرلہٗ۔ ذبیح فرخ آبادی نے تاریخ خوب کہی۔ ع عزیز مصر جناں خواجہ عزیز الدین۔ ایک عدد کا تعمیہ ہے۔

اخلاق خواجہ صاحب با اوقات عبادت گزار تھے۔ مذہب کی طہارت اور مشرب کی وسعت اُن کے جملہ حرکات و سکنات سے خود بخود عیاں ہوتی تھی "مشک آنست کہ خود ببوید" نہایت غیور اور سیر چشم تھے۔ کسی کا بار احسان نہ اُٹھا سکتے تھے۔ تحائف کا خوش اسلوبی سے فوراً عوض کرتے تھے۔ بعض دفعہ دستی پہنچنے کا موقع نہ ملا تو پارسل سے ڈاک میں یہاں پہنچا۔ باوجود وضع کی پابندی اور شان استغنا کے نہایت ملنسار اور متواضع تھے۔ آدمی جتنے دیر حاضر رہتا اخلاق کی پاکیزگی سے مسحور رہتا۔ حسن اخلاق مذہب اور فرقے کی قید سے بالاتر تھا۔ مسلمان۔ ہندو۔ عیسائی۔ سُنی۔ شیعہ۔ سب کے ساتھ یکساں اخلاق سے پیش آتے تھے۔ محض ظاہری اخلاق نہیں وہ اخلاق جس کا اثر دل پر پڑتا۔ عارف جامی کا مشہور شعر گویا اُن کی زندگی کا اصول تھا ؎

پس چناں زی کہ بعد مردنِ تو
ہمہ گریاں بوند تو خنداں

احباب کا دائرہ وسیع تھا۔ مخصوص احباب پر دل سے فدا تھے۔ علامہ شبلی کی وفات کے بعد پہلی ملاقات میں مرحوم کا ذکر مجھ سے فرمایا تو بایں ہمہ تمکین۔ آواز گلوگیر تھی اور آنکھوں سے آنسو جاری۔ کلیات کے ساتھ جو رقعات چھپے ہیں ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ معاصرین سے (جو ادب فارسی کے بقیۃ السیف تھے) خواجہ صاحب کے دوستانہ مراسم تھے۔ مثلاً منشی غلام غوث خاں بیخبر الہ آبادی۔ مولوی محمد سعید صاحب حسرت پٹنوی۔ علامہ شبلی۔ مولانا عبدالغنی خاں صاحب غنی۔ راجہ درگا پرشاد تعلقدار سندیلہ۔ منشی دلاور علی طرازی۔

اولاد خواجہ صاحب کے چار لڑکے تھے۔ خواجہ خلیل الدین۔ خواجہ رشید الدین۔ خواجہ وصی الدین۔

حافظ محمد امین الدین - والد کی حیات میں حافظ محمد امین الدین مرحوم مہمانوں کی خدمت ایسی خوبی اور بے تکلفی سے کرتے تھے کہ دیکھنے والوں کو تعجب ہوتا کہ خواجہ صاحب کے صاحبزادے اور یہ شوق خدمت۔ علامہ شبلی نے ایک بار تعجب سے پوچھا کہ حافظ امین الدین اس قدر بے تکلفانہ خدمت کس طرح کرتے ہیں تو فرمایا کہ ہمارے گھروں میں بچّے مہمانوں کی خدمت کے عادی بنائے جاتے ہیں۔ خواجہ وصی الدین صاحب گریجوایٹ ہیں۔ ڈپٹی کلکٹری کے عہدے کا وظیفہ پا رہے ہیں۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا اُن کا خاص کارنامہ یہ ہی کہ باوجود فارسی ادب سے مناسبت نہ ہونے کے مرحوم والد کی یادگار قایم رکھنے کو اُن کا کلیات مرتب اور شائع کیا۔ اہل سخن کو ممنون کرم بنایا جو دشواریاں اُن کو اس کام میں پیش آئیں اُن کا اندازہ آسان نہیں۔ اور ہاں نہ صرف کلیات عزیز کو شائع کیا بلکہ جس بارہ دری میں اس کی فکر ہوئی تھی اُس کو وسیع و دلآویز "عزیز منزل" بنا دیا۔ اسم با مسمیٰ ہوگئی۔

خواجہ صاحب کے پوتے خواجہ شریف الدین لکھنؤ کے مشہور ڈاکٹر ہیں۔

تلامذہ جن با ادب تلامذہ کے نام معلوم ہوسکے وہ حسب ذیل ہیں :۔

(۱) مرزا محمد ہادی صاحب رسوا۔ بی اے لکھنوی (۲) ریاض حسن خان صاحب دانش رئیس رسول پور (۳) قاضی محمد خلیل صاحب خلیل بریلوی (۴) مولوی شکر اللہ صاحب سہیل میر دبیر بھوپال۔ (۵) منشی میکو لال صاحب عشرت لکھنوی (۶) مولانا محمد نجیب اللہ صاحب نجیب فرنگی محلی۔

انداز اصلاح خواجہ صاحب کے شاگرد رشید سہیل کے الفاظ میں سنو۔ حضرت خواجہ صاحب کا حلیہ کے ساتھ خُلق پدرانہ شفقت وقار و حلم اور تشفی بخش طرز افہام و تفہیم تھی۔ حضرت خواجہ صاحب کا طرز اصلاح خصوصیت کے ساتھ یہ تھا کہ اپنے شاگردوں کی نظم کے الفاظ کو خفیف سی ترمیم کے ساتھ کچھ اس خوبی سے تبدیل فرما دیتے تھے کہ شعر میں ادب و زبان اور خیال و بندش کی بیشمار خوبیاں پیدا ہوجاتیں۔ احتیاط کا یہ حال تھا کہ کبھی ایسے محاورے کو جائز قرار نہیں دیتے تھے جس کی سند موجود نہ ہو۔ درس میں جب شاگردوں کو مضامین کے سمجھنے میں مشکلات پیش آتی تھیں۔ نہایت آسانی سے حل فرمادیا کرتے تھے۔ انتہی۔

یہ میرا تجربہ ہے کہ خواجہ صاحب کلام بہت غور اور دقّت نظر سے سنتے تھے۔ ایک موقع پر میں نے شفائی اصفہانی کا یہ مطلع پڑھا۔ ؎

آمد بہار و جلوۂ بستانم آرزوست
ہمبالگی بہ مرغ غزل خوانم آرزوست

میرے یہاں جو کلیّات شفائی کا قلمی نسخہ ہے اُس میں "ہمبالگی" ہی تھا۔ اس کو پڑھ کر میں نے اور اشعار پڑھے۔ مگر دیکھا کہ خواجہ صاحب متوجہ نہیں۔ آہستہ آہستہ شعر پڑھ کر اس کے الفاظ کو یوں دُہرانے لگے جیسے کسی کے نوالے میں کوئی ریزہ آجاتا ہے اور وہ اس کے نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ بعد تامل دوسرا مصرعہ اس طرح پڑھا۔ ع ہم نالگی بہ مرغ غزل خوانم آرزوست۔ پڑھ کر فرمایا "مجھ کو "ہمبالگی" میں تامل ہوا کہ بال سے بالگی کیونکر بنا صحیح ہمنالگی ہے۔ اب مصرع چست ہے۔

دوسروں کا کلام سن کر داد بہت فراغ دلی اور کشادہ پیشانی سے دیتے۔ اساتذۂ فارسی میں مولانا نظامی کو بہت مانتے تھے۔ ایک بار میں نے نظامی کی خصوصیت پوچھی تو فرمایا الفاظ کا انتخاب ترتیب اور بندش ان تینوں مراتب میں نظامی ممتاز ہیں۔ بعینہٖ جس طرح ایک باکمال جوہری جواہر آبدار بے داغ کا انتخاب کرے۔ ان کی ترتیب میں جوہر دکھائے اور جڑاؤ میں قوت مہارت ۱۳۱۲ھ میں قیصر باغ کے اجلاس ندوۃ العلماء میں ترکیب بند پڑھتے ہوئے میں نے سنا تھا پڑھنے کا انداز متین اور سادہ تھا۔ اثر آفرینی کا اہتمام نہ تھا۔

کلام خواجہ صاحب کا کلیات اگرچہ ضخیم نہیں اور اُس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کل کلام نہیں تاہم اصناف سخن سے مملو ہے۔ قصیدہ۔ مثنوی۔ غزل۔ ترکیب بند۔ قطعات۔ ہفت بند۔ رباعی۔ سب کچھ ہے۔ ہمہ نعمتیں موجود۔ اہل نظر ترتیب کلیات دیکھ کر مسرور نہ ہوں گے۔ مگر یہ ثبوت ہے خواجہ وصی الدین کی مشکلات کا اور اُس دشواری کا جو حصول کلام و ترتیب میں پیش آئی۔ عام انداز کلام۔ متانت۔ بندش کی چستی۔ حشو و زوائد سے پاکیزگی۔ مضامین کی بلندی ہے۔ مناسبت لفظی کا اہتمام بھی پیش نظر تھا۔ بالاتر یہ کہ فارسی ذوق ادب خود ساختہ نہ تھا۔ بلکہ وہ تھا جو استادوں کی پیروی کا پروردہ تھا۔ لہٰذا سندی تھا۔

نعت ومنقبت میں عقیدت کی گرمی وتاثیر صاف عیاں ہے۔ مثنویات چار ہیں۔ قیصر نامہ بطرز سکندر نامہ۔
اس میں جنگ روم و روس کی داستان ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

حمد

بنام خداوند کار آفریں	ہزار آفریں صد ہزار آفریں
ازل تا ابد بارگاہ ویست	کراں تا کراں در پناہ ویست
اگر از جلالش زند دم زباں	بلرزد سپہر و بجنبد جہاں
بہ یکتائیش ہر کہ دم می زند	نہ دم بل دو عالم بہم می زند
رخ غازیاں را بخوں غازہ ساز	بآب دم تیغِ جاں تازہ ساز
بحکمش ابابیل چوں پر زند	صف ژندہ پیلاں بہم بر زند

نعت

بہ معنی ز رحمت نخست آیتے	بظاہر ز دولت پسیں رایتے
زمیں تا فلک روشن از دینِ او	ز آئینہ روشن تر آئینِ او
ز مہر نبوت کہ بر پشت زد	بہ مہر سلیماں زد انگشت زد
بدیدار آں روضہ شاداں شوم	اگر خار باشم گلستاں شوم
بخاک درش کاش خاکم کنند	کز آلائش خاک پاکم کنند

تالیف کتاب

کہن آتش پارس پژمردہ بود	دل و جان گبراں ہم افسردہ بود
نہ آتش بجا و نہ آتشکدہ	در دیر را قفل محکم زدہ
من آوردم آں قفل را چوں کلید	در بستہ را شد کشادے پدید

مدح سلطان عبدالحمید خاں

بادرنگ شاہنشہی پائے اوست	ولے در دلِ عالمے جائے اوست
ہمین پاسبانِ کہیں خانقاہ	کہیں دیدبانِ ہمین خوابگاہ
ز پشتش قوی پشت اسلامیاں	بدورش بلند اختر شامیاں

لہ آج "بنام" کار و زسیاہ دیکھو ۱۲

درش مرجع هفت ملت بود — ولے مرکز پنج نوبت بود

روانگی لشکر روم و روس -

دو جمشید لشکر بر انگیختند — بخوں ریختن می زکف ریختند
دو اسکندر از راه ار زندگی — بخوں کرده بر چشمهٔ زندگی
دو شمع از دو رخ بر افروختند — نه پروانها جانها سوختند
دو لشکر بروں شد بمیدان کیں — بجنبش در آمد زمان و زمیں
در آمد بجنبش دو فوج گراں — دو کوه از دو سو گشته گوئی رواں

فوج پلونه عثمان پاشا

بر آشفت سلطان زیں دار و گیر — بفرمود بنوشت فرماں دبیر
که سالار عثمان جنگ آزمائے — زایوان بمیداں شود ره گرائے
برادر است اسپهبد صف شکن — قشونے ز ترکاں شمشیر زن
همه کارداں و قواعد شناس — چو ایمان خود جمله محکم اساس
همه تو جوانان ماهوت پوش — بخاکستری جامه آتش فروش
بفرهنگ و آهنگ و ناموس و ننگ — سبق برده در جنگ از اهل فرنگ
پیاده چو آب و سواره چو باد — با عدائے نوح و یا شرار عاد

عثمان پاشا

سپهدار عثمان جنگ آزمائے — خردمند دانا دل تیز رائے
محیطے و چوں کوه آتش بجوش — نهنگے یکے اژدهائے بدوش

جوانانِ ترک

ازیں سوئے ترکان طاعت گزار — بکار خداوند سرگرم کار
وضو کرده هر یک بخوناب خویش — بشوق سجودی سر افگنده پیش
نمازی بخوں جا بجا ساخته — دل از مهر و آزرم پرداخته
گہے در رکوع و گہے در سجود — گہے در قیام و گہے در قعود
یکے گرم سعی و یکے در طواف — یکے فدیه گردیده خود در مصاف

شمردند محراب شمشیر را | رسانند بر عرش تکبیر را
به پیکار کارے کہ تکبیر کرد | نہ شمشیر می کرد و نے تیر کرد
چناں سوے شمشیر عریاں شدند | کہ گوئی ہم آغوش حوراں شدند

عثمان پاشا کا گھوڑا میدان کارزار میں کام آتا ہے ؎

سمندش کہ می گشت در کوہ و دشت
زبس تیز رفت از جہاں در گذشت

(جہاز سے اتر کر) عثمان پاشا امیر المومنین کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں ؎

نخستیں بپابوس سلطاں رسید | بلے قطرہ آخر بعمان رسید
سزد مہر را داغ بر دل نہاد | کہ سلطان بہ پیشانیش بوسہ داد
مگر بوسہ تمغاے اخلاص بود | کہ تمغاے عثمانی خاص بود

خاتمہ جنگ و کلام

چو شمشیر ہا رفت اندر نیام
کشیدم زبان من ہم آخر بکام

یہ مثنوی ۱۲۹۶ء میں مطبع نظامی میں چھپ کر شائع ہوئی تھی۔ اس وقت مسلمانوں کے لئے یہ فردون کی زندہ داستان تھی۔ آج ہماری مردہ دلی سے مُردوں کی کہانی ہے۔ چند روز میں ہم کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔

مثنوی ید بیضا یہ مثنوی شیرازی کی مشہور مثنوی سحر حلال کا جواب ہے۔ اور خواجہ صاحب کی قوت فکر و سخن آفرینی کی روشن دلیل۔ ذو بحرین ذو قافیتین مع التجنیس ہے۔ مثنوی ید بیضا ۱۳۱۱ھ میں مطبع اصح المطابع لکھنؤ میں (جو اُس وقت تک مطبع نظامی کی شاخ تھا) خواجہ عزیز کے شاگرد عزیز شیخ اصغر علی اصغر تعلقدار گنڈارہ کی فرمائش اور اُسی مرحوم کے تحشئے سے طبع ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ ان تمام شرائط کی پابندی کے ساتھ کلام سادہ نہیں رہ سکتا۔ دقیق اور عسیر الفہم ہو جائے گا۔ ہم بطور نمونہ اُس کا مطلع لکھ دیتے ہیں ؎

اسے تو اندر سرمن شور ہا نام تو ہست افسر منشور ہا

تیسری مثنوی "ہدیۃ الثقلین" ہے اس میں ایک خواب کا جس میں دیدار حضرت رسالت پناہ سے مشرف ہوئے ذکر ہے۔

چوتھی مثنوی "ارمغان لاجواب" یہ مثنوی کشمیر ہی۔ کشمیر جنت نظیر کے مناظر اور مشہور مقامات کا ذکر ہی۔

قصائد قصائد متعدد ہیں۔ مدائح بھی شاندار ہیں۔ مثلاً سلطان عبدالحمید خان مرحوم۔ واجد علی شاہ بادشاہ اودھ۔ اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خان بہادر آصف جاہ شاہ دکن۔ قاآنی کے طرز کا قصائد میں خوب اتباع کیا ہی۔ نمونہ ملاحظہ ہو ۔

دو شم بگوش آمدہ کاے بندۂ خدا — از بند خود برآ ز در بندگی درآ
دستے فراز کن کہ نیازت شود قبول — صبحے نیاز کن کہ نمازت شود ادا
بردار سرز پیش و زجیب فلک برآر — بگذار پا بخویش و بعرش بریں برآ
کبر تو چیست چرا نشکنی ز ہم — نفس تو کافرست چرا نفگنی ز پا
طوفے بکوے عشق کہ ہم کعبہ ہم حرم — سعی ز روے صدق کہ ہم مروہ ہم صفا
رخش تو چرخ سیر چہ پوئی بہفت خواں — دست تو دیو گیر چہ پیچی بہ اژدہا

قطعات قطعات بہت ہیں۔ تہنیتی اور تعزیتی۔ ہر قسم کی تاریخیں عموماً صاف اور حشو و زوائد سے پاک ہیں۔ منشی اطہر علی صاحب مرحوم کی تاریخ وفات کیا خوب ہوئی ہی۔ ع نام اطہر و طبع اطہر و جا اطہر یافت۔ مولوی محمد اکرم فرزند مولانا محمد نعیم فرنگی محل کی جوانمرگی کی تاریخ ملاحظہ ہو۔ ع بود او گلبنے ز باغ نعیم[1]

غزلیات غزلیات کا انداز اشعار ذیل سے عیاں ہوگا۔

بیا ساقی سرت گردم رواں کن کشتی می را — باسم اللہ مجریہا باذن اللہ مرسٰہا
بود سرجوش ایں صہبا سراسر ہوش ہشیاری — دل دانا شود بینا مغز دانہ پنبہ بینا
عزیزا از گفتہ ات سرمست و سرخوش نشانیں ہستی — حماک اللہ فی الدنیا سقاک اللہ فی العقبیٰ

---

[1] باغ نعیم کا لطف ملاحظہ طلب ہے۔

دهد حق عشق احمد بندگان چیدهٔ خود را — بخاصان شادی بخشد مئی نوشیدهٔ خود را

دو عالم را شب معراج بود و لیلة القدری — گشادی چون دو گیسوئے بہم پیچیدهٔ خود را

بود پیمانہا لبریز و جانہا بر لب از حسرت — کہ کج دارد مریز آموختست یار بیچ نگاہان را

چو منعمے کہ برد مفلساں حسد برند — بدل ز درد تو رشک است جملہ اعضا را

عزیز بندگی خواجهٔ عنبرم کرد — کہ هست بندهٔ یکتا خدائے یکتا را

ز داغ سینہ رسد فیض جملہ اعضا را — یک آفتاب بود بس تمام دنیا را

بجرم عشق نیازم کہ جائے فرد عمل — بدست دامن یوسف بود زلیخا را

بود نور خدا مشاطہ حسن بے حجابش را — ید الله شانہ باشد گیسوی پرپیچ و تابش را

ندانم تا بجیب دامن عاشق چہ خواہد کرد — کہ ذوق جلوهٔ خود می درد از هم نقابش را

خم می پردار جلوهٔ می هست اے غافل — چه دانی چیست زیر خرقهٔ مستان خرابش را

فریب جلوه صیدے می خورم هر دم بصحرائے — کہ انداز رم آهوست هر موج سرابش را

بشوق خلد در کام سقر انداختم خود را — حریف ستم و نه شناسم از لطفش عتابش را

مرا خود کشتہ و افگنده در حیرت جہانے را — ببی تیغ از هر کسے پرسد کہ کشت این خستہ جانے را

ز عرض حال دل مکتوب قاصد بر نمی آید — گراند نورد نامہ می پیچم زبانے را

در گلشن برویم باغبان بیهوده می بندد — کہ چون طاؤس من باخویش دارم گلستانے را

مهر ز لعل او بلب نطق سخن سرائے را — عقدهٔ ز زلف او بکار عقل گره کشائے را

بخون خفته شاید کار ها باقیست گردون را — کہ بر خاک شہیدان آورد آن جامہ گلگون را

بینک دل چون برون آید کسے از عهدهٔ نازش — خداوندا ولی کن در تنم هر قطره خون را

بزم باده خواران جسم نمی ارزد — اگر صد اربعین هم بگذرد در خم فلاطون را

نگه از ضبط خون گردید و شد وقف چکیدنہا — نقاب افگندن از رخسار و آنگه منع دیدنہا

ترنج و کف چه باشد چون نقاب از رخ تو برداری — چه سرها کان او دهر سو بتاراج بریدنہا

زدن شستیم داغ کلفت بیم و امید اینجا | دو عالم یک سرشکی بود کز مژگان چکید اینجا

بدعوی گاه عشق از خون بها بگذر غنیمت دان | که قاتل دست مزد خویش نخواهد از شهید اینجا

خوشم کای بی وفا نا خوانده کردی چاک مکتوبم | بعنوانی که حرف مدعا فهمیدهٔ گویا

پیمانه ما پر شد و ما مست خماریم | یارب که بساقی برساند خبر ما

چاک کن جامهٔ هستی که شود او پیدا | تا گریبان ندرد گل نکند بو پیدا

هر بن مویم از و چشم ضیائی دارد | روزنی هست درین خانه ز هر سو پیدا

من جدا چشم براهش دل بیدار جدا | در جدا دیده جدا رخنهٔ دیوار جدا

بساده لوحی من کس مباد در عالم | که کرده اند بوصلش اُمیدوار مرا

خدا سیاه کند روی مرگ کز گیتی | بیک دو گز کفنی کرد شرمسار مرا

عزیز مصر نیم بل عزیز ناچیزم | شوم عزیز جهانی عزیز دار مرا

گر نبوی نبود از چه مستی را چه بعید | در عجم تازه مشام آنکه کند سلمان را

چون کتان صد پارهٔ دل را حیرت نظاره کرد | صورت مه پارهٔ تصویر بر هر پاره کرد

غیرتش بازیچهٔ مشق طبیبانم نخواست | آنکه دردم داده بود او عاقبت چاره کرد

شیخ عهد خویش بودم می کجا و من کجا | ذوق صحبتهای میخواران مرا میخواره کرد

دیدمش صد بار و تسکین دلم حاصل نشد | دیدن هر باره ام مشتاق دیگر باره کرد

در پریشان خاطری بخشیده خوش دمیجه | آنکه دل را پارهٔ و هر پاره را صد پاره کرد

ترک چشم روز مستی می زند شبخون بدل | کثرت میخواری او را عاقبت میخواره کرد

داغِ حسرت را بجز دل هیچ یک قابل نشد | گرچه مه در نیم مه کامل شد اما دل نشد

ابر نیسان دیگر و فیض محبت دیگر است | قطره بگذشت از خود و گوهر شد اما دل نشد

حسرتِ دیدار را میرم که بعد از کشتنم | جان نه رفت از تن برون تا از نظر قاتل نشد

نگه تیر و مژه خنجر بسر از طره اش افسر | سپاه ناز و خیل غمزه را شاه این چنین باشد

شب ہمہ شب جائے تو اے مہ بسترم ہمہ خاک بود — چشم انجم سوئے من چشم سوئے افلاک بود

پیش برناشستہ روئے جلوہ فرمودن روا نیست — آں جمال پاک را در خورد نگاہ پاک بود

دلم بہ غفلت شبجاں بار یا لرزد — کہ ایں غزال شکاراں بخواب خرگوشند

آنانکہ سعی در طلبش چار سو کنند — اے کاش در حریم دلش جستجو کنند

کاریکہ در شباب نشد کن بہ پیریش — شب آنچہ گم شود سحرش جستجو کنند

پردہ زاں جہاں سوز افگنیم — داغ شمع را شمع محفل می کنیم

قرب او خواہیم دور از وے نیم — سعی در تحصیل حاصل می کنیم

ضعفم از جنت بشارت می دہد — تکیہ بر شمشیر قاتل می کنیم

از خدا نہ بودہ ایم آگہ عزیز — فرق چوں در حق و باطل می کنیم

(از ہفت بند) از لب جاں بخشت آگہ چشمہ حیواں چو گشت — از خجالت آب شد حتی توارت بالحجاب

گرچہ با یاد تو در خلدم ولی دل می کشد — اشتیاق منزلے کاں مسکن ما وای تست

افسر جم را شمارد کمتر از جام سفال — ہر کرا از دولت فقرت توانگر ساختند

قبلۂ کوے تو ہست امید گاہے عالمے — یک نگہ کن سوئیم اے سویت نگاہ عالمے

رقعات کلیات کا ضمیمہ مکتوبات ہیں۔ نثر میں بھی خواجہ صاحب کی طبیعت کی بلندی، متانت و شکل پسندی، اطناب سے احتراز، مناسب الفاظ کا اہتمام قایم ہے۔

مقدمۂ دیوان درد (اردو)

کوئی درد آشنا کہہ گیا ہے؎

اگرچہ شاعرانِ نغز گفتار ز یک جا مند در بزمِ سخن مست
ولے با بادۂ بعضِ حریفاں خمارِ چشم ساقی نیز پیوست
مشو منکر کہ در اشعارِ ایں قوم ورائے شاعری چیزے دگر ہست

خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ کے دم قدم سے "ورائے شاعری" مضامین سے اردو ادب فیض یاب ہوا ؎

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدّعی کے واسطے دار و رسن کہاں!

عموماً اردو شاعری کا سرمایۂ ناز حسن ظاہری کے انداز ہیں جن میں حسن بیان نے چار چاند لگا دیئے ہیں۔ خواجہ صاحب کی چشمِ حق بیں جمالِ حقیقی کے جلووں سے منور تھی۔ وہی نور اُن کے کلام میں تاباں ہے۔ میر تقی میر لکھتے ہیں: "گلچیں خیال، اور اگلِ معنی دامن دامن"۔ یہی وجہ ہے کہ خواجہ صاحب کے کلام کا پایہ عام شاعری سے بالاتر ہے۔

ادب اردو سید راس مسعود صاحب کے خاندان کی سرپرستی کا برسوں سے منت پزیر ہے۔ سر سید نے اردو نثر کو "بیانِ مطالب" کی قوت بخشی۔ نکتہ شناس "پوتے" نے نظم اردو کی خدمت کی۔ "انتخاب زرین" کی اشاعت سے اردو نظم کا نام روشن کیا۔ سونے میں سہاگہ ڈالا۔ اساتذہ اردو کے دواوین خوش اسلوبی سے شائع کرنے کا اہتمام کیا۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی "دیوان درد" بھی ہے۔ شروانی دہقانی مقدمہ نگاری پر مامور ہے۔ عین سعادت کہ خواجہ صاحب کی بزم ادب میں باریابی کا ذریعہ ہاتھ آیا۔ ع

آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

خواجہ صاحب کے حالات

نام خواجہ میر۔ درد تخلص[1] صحیح النسب حسینی سید ہیں۔ آبائی سلسلہ بارہویں پشت میں خواجہ بزرگ بہاؤالدین نقشبندی قدس سرہٗ سے اور چھبیسویں پشت میں حضرت امام عسکری رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ مادری سلسلۂ نسب حضرت غوث اعظم رضی اللہ عنہ تک منتہی ہوتا ہے۔ خواجہ صاحب کی دادی بھی حضرت غوث اعظم رضی اللہ عنہ کی اولاد میں تھیں۔ والد کا نام خواجہ ناصر، عندلیب تخلص نانا میر سید محمد حسنی تھے۔ جو بیٹے تھے نواب میر احمد خان شہید کے نواب صاحب پانی پت کے معرکہ میں نادر شاہ کے مقابلہ میں شہید ہوئے۔ جہاں کشائے نادری میں اُن کا ذکر ہے۔ میرزا رفیع سودا کے ممدوح تھے۔ خواجہ صاحب کے نسب کے بیان میں تذکرہ نویسوں نے فاحش غلطیاں کی ہیں۔ ہمارا بیان خواجہ صاحب کی علم الکتاب سے ماخوذ ہے۔ مسکن پرانی دلّی میں تھا۔ اسی محلہ میں شاہ ولی اللہ صاحب کی بھی سکونت تھی۔ "اجڑے دیار" کی آبادی و مردم خیزی۔ اللہ اکبر!

خواجہ ناصر صاحب کے والد بخارا سے تحصیل علم کے بعد عہد عالمگیری میں وارد ہندوستان ہوئے تھے۔ خواجہ محمد ناصر صاحب ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ ابتداءً شاہی منصبداروں میں شامل تھے۔ آخر منصب ترک کرکے یادِ الٰہی میں مصروف ہو گئے۔ حضرت قبلۂ عالم خواجہ محمد زبیر سے بیعت ہیں حضرت شاہ گلشن پیر صحبت ہیں۔ شاہ گلشن کی نسبت خواجہ صاحب ایک موقع پر فرماتے ہیں "کہ اُن کے فارسی کلیات میں دو لاکھ کے قریب شعر تھے۔ فن موسیقی میں کامل مہارت تھی۔ حج سے مشرف ہوئے تھے۔ اُن کی مدح میں فرماتے ہیں ؎

---

[1] اس تخلص میں ایک خاص لطف ہے۔ حضرت شاہ گلشن حضرت شاہ محمد وحدت گل کے مرید تھے۔
اب شجرہ تخلص ملاحظہ ہو۔

شاہ محمد وحدت	گل
حضرت شاہ سعد اللہ	گلشن
خواجہ محمد ناصر صاحب	عندلیب
خواجہ میر صاحب	درد
خواجہ محمد میر صاحب	اثر

دیکھو گُل کی جلوہ نمائی سے "گلشن" ہوا۔ گلشن نے نالۂ "عندلیب" پیدا کیا۔ نالۂ عندلیب سے "درد" جلوہ افروز ہوا۔ درد سے "اثر" ؎ ایں سلسلہ از طلائے ناب ست ٭ ایں خانہ تمام آفتاب ست

چوں مرغِ صد بہار از فقرِ من گل می کند
در فقیری بہرہ مند از فیض شاہِ گلشنیم

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی روح پر فتوح سے طریقۂ محمدیہ حاصل کیا۔ اُن کی تصنیف "نالۂ عندلیب" کا حجم اٹھارہ سَو صفحے کا ہے۔ جس کو آزاد نے "ایک رسالہ" لکھا ہے۔ زبان فارسی ہے۔ قصے کے پیرایہ میں معارف بلند اور مطالب عالیہ بیان فرمائے ہیں۔ موقع موقع پر کثرت سے اشعار درج کئے ہیں۔ وجہ تصنیف خود یہ بیان فرمائی ہے کہ "اکثر آدمی مجھ سے مختلف مطالب اور مسائل دریافت کیا کرتے تھے۔ صوفی طریقت کے جویا تھے۔ مُلّا احکام شرعیہ پوچھتے تھے۔ مثلاً جبر و اختیار کا مسالہ بعض جوان مذہب شیعہ وسنی کی تحقیق چاہتے تھے۔ بعض اخلاق ستودہ کے متلاشی تھے۔ کسی کو عشق بازی کی حکایتوں کا شوق تھا۔ اہل عقل کو عقلی پیرایہ کی جستجو تھی۔ اسی عرصہ میں حضرت قبلۂ عالم نے رحلت فرمائی۔ ادائے تعزیت کے لئے اعزہ اور احباب کا مجمع میرے مکان پر ہوا۔ اسی موقع پر افسانہ کے پیرایہ میں "بزبان ہندی" مطالب بالا کے جوابات خواجہ صاحب نے بیان کئے۔ تین شب و روز یہ صحبت رہی۔ اپنے اپنے مطالب کے جواب پاکر سامعین پر عجب عالم طاری ہوا۔ سامعین مصر ہوئے کہ اس افسانہ کو قلمبند کردوں۔ عرصہ تک ٹالا۔ آخر اشارۂ غیبی پاکر فارسی زبان میں لکھ دیا۔ طریقۂ تالیف یہ تھا کہ عشا کے بعد مخصوص احباب کے روبرو زبانی بیان کرتا۔ میر درد لکھتے جاتے۔ احیاناً وہ نہ ہوتے تو بعد از میرے مرید قلمبند کرتے کبھی وہ بھی نہ ہوتے تو خود میں ہی لکھتا جاتا۔ اس طرح ۱۱۵۳ھ میں یہ کتاب ختم ہوئی۔ "نالۂ عندلیب" نام پایا میر درد صاحب نے تاریخ لکھی۔ ع "نالۂ عندلیب گلشن ماست"۔

کتاب کو پڑھو اور کمال اور بیان کی قوت کا اندازہ لگاؤ۔ خواجہ عندلیب صاحب نے ۶۶ برس کے سن میں شعبان ۱۱۷۲ھ میں رحلت فرمائی۔ رضی اللہ عنہ

حضرت خواجہ میر درد ۱۱۳۳ھ میں پیدا ہوئے۔ تحصیل علم اپنے والد ماجد سے کی۔ تفصیل تحصیل نظر سے نہیں گزری۔ لیکن تصانیف شاہد ہیں کہ نقلی اور عقلی علوم میں کامل تھے۔ خصوصاً علم الکتاب کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ تفسیر حدیث فقہ تصوف اور معقولات میں پوری مہارت حاصل تھی۔ ابتدائے شباب میں

دنیاداری رہی۔ جاگیر اور معاش کے اہتمام میں پوری تگ ودو کی امرائے شاہی اور مقربان بارگاہ کے ناز اٹھائے۔ ۲۸ برس کی عمر میں جذبۂ حق نے اپنی طرف کھینچا۔ سب کو چھوڑ کر ادھر جھکے۔ لباس درویشی پہن کر آستانہ جاناں پر سر جھکا دیا۔ ۳۹ برس کی عمر میں خواجہ عندلیب صاحب کی رحلت کے بعد مسند نشین ارشاد ہوئے اور آخر دم تک قدم نہ ہٹا۔ مصیبتوں کے دریا چڑھے اور اترے۔ یہاں پائے استقامت کو جنبش بھی نہ ہوئی۔ انہی مصائب میں "حملۂ نادری" بھی تھا۔ خواجہ صاحب بارہویں [12] صدی ہجری کے اولیاء کبار سے ہیں۔

تصانیف کا شوق ابتدائے عمر سے تھا اور آخر تک رہا۔ پندرہ برس کی عمر میں بحالت اعتکاف "رسالہ اسرار الصلوٰۃ" لکھا۔ ۲۹ برس کی عمر میں رسالہ "واردات" لکھا۔ رسالہ مذکور ۱۱۷۲ھ میں ختم ہوا۔ اس کے بعد ایک مدت تک اس کی شرح "علم الکتاب" لکھی۔ علم الکتاب کے بعد "نالۂ درد" لکھا۔ جو ۱۱۹۰ھ میں پورا ہوا۔ میر اثر نے تاریخ کہی۔ ع نالۂ عندلیب درد من ست۔ نالۂ درد کے بعد ۱۱۹۲ھ میں رسالہ "آہ سرد" ختم ہوا۔ تاریخ از میر اثر ع "آہ سرد ما نماید گرئی رفتار ما"۔ آہ سرد کے بعد "درد دل" کی نوبت آئی۔ اسی کے ساتھ ساتھ "رسالہ شمع محفل" لکھا گیا۔ دونوں کو ساتھ لکھنے کی وجہ یہ تحریر فرمائی ہے کہ "نالۂ درد اور آہ سرد" کی تالیف کے بعد جب رسالہ "درد دل" لکھنا شروع کیا تو خیال آیا کہ اس کے بعد ایک رسالہ "شمع محفل" کے نام سے لکھوں گا۔ مگر چونکہ سن باسٹھ [62] برس کا ہو چکا تھا۔ فرصت مفقود۔ لہذا دونوں کو ساتھ ساتھ لکھنا شروع کر دیا۔ صفر ۱۱۹۹ھ میں دونوں رسالے ختم ہوئے۔

فن موسیقی میں خواجہ صاحب کو پورا دخل تھا۔ میاں فیروز خاں گویوں کا استاد حاضر ہو کر فن کے نکتے حل کرتا۔ دوسری اور چوبیسویں [24] تاریخ کو ہر مہینے میں ایک مجلس سماع مکان پر ہوتی۔ اس طرح کہ قوال بلا طلب حاضر ہو جاتے اور جب تک ان کا دل چاہتا سناتے اور چلے جاتے۔ نہ بلائے جاتے نہ روکے جاتے۔ سماع کی نسبت خواجہ صاحب فرماتے ہیں "سماع من من جانب اللہ است وحق بریں امر ہمہ وقت گواہ کہ خود بخود گویندگان می آیند و بادام کہ می خواہند می سرایند۔ نہ آنکہ فقیر ایشاں را می طلبد۔ و شنیدن سرود را چون دیگراں عبادت می فہمد بلکہ ہماں معاملہ نہ انکار می کنم نہ ایں کار

می کنم در پیش است و عقیدۂ من ہمان ست کہ عقیدۂ بزرگاں من ست" (نالۂ درد ۳۷) ۲۴ صفر ۱۱۹۹ھ

ہجری کو انتقال فرمایا۔ اور اپنے والد ماجد کے پہلو میں دفن ہوئے تاریخ وفات از بیدار ؎

آفتاب امت دین محمد خواجہ میر	مظہر علم علی و وارث اثنا عشر
حضرت درد آنکہ از درد فراق عندلیب	نالۂ با ناصر ششی می کرد برد لہا اثر
حیف کز دنیا بعمر شصت و ہشتم سالگی	جانب اعلا علیین او کردہ سفر
بندۂ بیدار کاں ہست از غلامانش یکے	جست از وقت وصال و روز ماہش چوں خبر
یک پہر شب ماندہ ہاتف کرد واویلا و گفت	ہائے بود آدینہ و بست و چہارم از صفر

اس تاریخ میں خواجہ صاحب کی عمر ارسٹھ برس کی لکھی ہے۔ حالانکہ خود خواجہ صاحب کے بیان سے چھیاسٹھ برس معلوم ہوتے ہیں، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔ مزار شہر پناہ کے باہر شاہ جی کے تالاب کے متصل ہے۔ میں بھی فاتحہ خوانی سے مشرف ہوا ہوں۔ والحمد للہ علیٰ ذالک۔ نزع میں یہ مصرع خواجہ صاحب کی زبان پر تھا۔ ع "درد ہم جاتے ہیں پر چھوڑے اثر جاتے ہیں۔ میر اثر خواجہ صاحب کے بعد سجادہ نشیں ہوئے۔ یہ سلسلہ خواجہ محمد نصیر متخلص بہ "رنج" تک جاری رہا۔ جو خواجہ صاحب کے نواسے تھے۔ خواجہ صاحب کے صاحبزادے ضیاء الناصر تھے۔ تخلص "الم" تھا۔

تصانیف

بیان بالا سے خواجہ صاحب کی تصانیف کے یہ نام معلوم ہوئے۔ اسرار الصلوٰۃ۔ رسالہ واردات۔ علم الکتاب۔ نالۂ درد۔ درد دل۔ آہ سرد۔ شمع محفل۔ ان کے علاوہ دیوان فارسی۔ دیوان اردو۔ جملہ تصانیف بالاستثنائے ہو چکی ہیں۔ اسرار الصلوٰۃ۔ چھوٹا سا رسالہ ہے جس میں نماز کے ارکان ہفتگانہ کے اسرار "سر سر" کرکے بیان فرمائے ہیں۔ واردات یہ ایک سو گیارہ واردات کا مجموعہ ہے۔ ہر وارد کا نام جداگانہ ہے۔ مثلاً وارد اول "فاتح الواردات"۔ وارد ثانی "نور من نور اللہ" علیٰ ہٰذا القیاس۔ وجہ تالیف "واردات" کی یہ ارشاد فرمائی ہے کہ اکثر اوقات غلبۂ حالات میں (جو عبارت ہے شدت مشاہدہ کی حالت سے اور استیلاء تاثر سے) جو معانی دل پر منکشف ہوتے تھے وہ رباعیوں کی صورت میں منظوم ہو جاتے تھے۔ جب یہ رسالہ تمام ہو گیا تو ۱۱۷۲ھ میں خواجہ عندلیب

صاحب کی خدمت میں پیش ہوا اور پسند فرمایا گیا۔ رسالہ واردات میں معرفت و حقیقت کے مطالب عالیہ بیان فرمائے گئے ہیں۔ ہر وارد کا ایک دیباچہ ہے۔ اول و آخر رباعی ہے۔ درمیان میں شارحانہ نثر۔ نمونہ وارد اوّل سے

رباعی اوّل

در خلوت ماکہ رشک صد انجمن است — باخویشتن زباں چو شمع گرم سخن ست
عالم آئینہ خانہ است و ما را — ہر سو کہ اشارت ست باخویشتن ست

رباعی آخری

از فیض تو ہر خرابہ معمور آمد — وز لطف تو ہر غمزدہ مسرور آمد
بخت سیہش رخت ز عالم بربست — ہر سایہ کہ زیر سایۂ نور آمد

وارد دوم - رباعی آخری سے

ہستی و عدم خرابِ میخانۂ اوست — امکان و وجوب مستِ پیمانۂ اوست
چشم دل تو اگر حقیقت بین ست — ہر ذرۂ خلق روزنِ خانۂ اوست

"علم الکتاب" رسالۂ بالا کی شرح ہے۔ جو میر اثر کی فرمائش سے لکھی گئی۔ باریک خط کے بڑے بڑے صفحے ۸۴۴ ہیں۔ خواجہ صاحب کے علم الٰہی کا تبحر اور کمالات معرفت کی حقیقت اس تصنیف سے واضح ہوتی ہے۔ جا بجا عربی طویل عبارتیں بے تکلف غایت بلاغت کے ساتھ مثل چشمہ رواں ہیں۔ مطالب حقہ کا ہجوم ہے۔ آیات اور احادیث اس روانی اور آسانی سے ہر موقع پر درج ہوتی ہیں کہ پڑھنے والے کا قلب اُن کے انوار سے پُر نور و معمور ہو جاتا ہے۔ سلوک کے مسائل کو آیات و احادیث سے مجتہدانہ اور عارفانہ قوت کے ساتھ ثابت و مدلّل فرمایا ہے۔ "نالۂ درد" میں فرماتے ہیں کہ "نالۂ درد" اور "علم الکتاب" طریقۂ محمدیہ کے سلوک کے لئے کافی ہیں۔ یہ کتاب متانت و قوتِ تحریر میں شاہ ولی اللہ صاحب کی بہترین تصانیف کے ہم پایہ ہے۔

"نالۂ درد" "علم الکتاب" کے بعد لکھا گیا۔ دیباچہ میں فرماتے ہیں۔ "علم الکتاب" کے ختم ہونے پر جو

مطالب "قلب حیران" پر تراوش کرتے تھے اُن کو میر اثر جمع کرتے گئے۔ جب مجموعہ تیار ہو گیا "نالۂ درد" نام رکھا۔ اس میں لفظ ناصر کے ہم عدد ۳۴۱ نالے ہیں۔ یہ رسالہ سوز و گداز اور ولولۂ شوق سے معمور ہے چنانچہ خود فرماتے ہیں ؎

دردمی بارد از رسالۂ درد　　　شمعِ دردِ دل ست نالۂ درد

"آہ سرد" اس میں بھی ۳۴۱ سرد آہیں ہیں۔ "نالۂ درد" و "آہ سرد" دونوں مل کر گویا ایک کتاب ہیں۔ "درد دل"۔ "نالۂ درد"۔ "آہ سرد"۔ دونوں ختم ہو گئے مگر درد دل بدستور تھا۔ ناچار "دردِ دل" لکھا۔ اس میں ۳۴۱ درد ہیں۔ ہر درد میں مطالب عرفان کی شرح ہے۔

"شمع محفل" اس میں ۳۴۱ نور ہیں۔ اور ہر نور معارف بلند سے معمور۔ رسالہ کا آغاز خواجہ صاحب کی عمر کے باسٹھویں سال میں ہوا تھا۔ چھیاسٹھ برس کی عمر تک درد دل کے ساتھ اس کی تحریر جاری رہی۔ اس رسالہ کا خاتمہ حیرت خیز اور واقعہ عبرت انگیز ہے۔ خاتمہ میں فرماتے ہیں۔ "اب میری عمر کا چھیاسٹھواں سال ہے اور یہ رسالہ ختم ہو رہا ہے۔ مبارک اسم اللہ ۶۶ ہیں۔ صحیفہ واردات ۱۱۷۲ھ میں ختم ہوا تھا۔ اسی سال والد عالی مرتبہ نے چھیاسٹھ برس کی عمر میں رحلت فرمائی تھی۔ حسن اتفاق کہ اس رسالہ کا خاتمہ مسال ہوا جو میرا سال ارتحال ہے۔ یہ رسالہ۔ رسالہ شمع محفل کے ساتھ ۱۱۹۵ھ میں شروع ہوا تھا۔ ۱۱۹۹ھ میں ختم ہو رہا ہے۔ ظاہرا یہ خاتمہ تو اس سکوتِ خاتمہ بالخیر راقم رسالہ سے۔" خواجہ صاحب کے کلام کا خلاصہ ختم ہوا۔ دیکھو اسی صفر کی ۲۴ تاریخ کو خواجہ صاحب نے رحلت فرمائی۔ یہ کیا تھا۔ سائنس کے رمز شناس سوچیں۔ "شمع محفل" کا نور (۲۲۹) اس راز پر روشنی ڈالتا ہے۔ جہاں فرماتے ہیں کہ مجھ سے وعدہ فرمایا گیا ہے کہ سال ارتحال و حال انتقال تجھ کو پیشتر سے بتلا دیا جائے گا۔ برید اجل ناگہاں نہیں پہنچے گا۔ چاروں مذکورہ بالا رسالوں میں یہ التزام ہے کہ سوائے اپنے اشعار فارسی کے کسی اور شاعر کا کلام درج نہیں کیا۔

"دیوان فارسی" دیوان فارسی مختصر ہے ۱۳۰۹ھ میں مطبع انصاری دہلی سے شائع ہوا ہے۔ غزلیں ہیں رباعیاں ہیں۔ مخمس وغیرہ بھی ہیں۔ زبان کا وہی انداز ہے جو فارسی شعراء ہند خان آرزو وغیرہ کا ہے۔

معرفت کی قوت کے لحاظ سے بہت بلند پایہ ہے ایک شعر سن لیجئے ؎

شد منشأ ظہور دو عالم وجود ما
جوشید نشأتین ز جوش شراب ما

اس شعر سے زور کلام اور قوت نسبت کا اندازہ کیجئے۔ اگر "نالۂ درد" وغیرہ کے اشعار بھی شامل دیوان ہو جائیں تو ایک ضخیم مجموعہ مرتب ہو جائے۔

نمونۂ غزل فارسی

جوش زد بادۂ توحید بہ میخانۂ ما — بحر دارد بہ گرہ قطرۂ پیمانۂ ما
بیخودی پردہ کشائے حرم دل باشد — بستہ احرام رہش لغزش مستانۂ ما
دیدہ آئینہ باشد بامیدے کہ کند — جلوۂ یار قدم رنجہ بکاشانۂ ما
زینت و زیب نیاں باد مبارک زہاد — ساز دنیا نہ کند ہمت مردانۂ ما
منت طبع رسا درد بمنت نہ کشیم — آشنا کردہ بما معنیٔ بیگانۂ ما

(دیگر)

آئینہ ایم فرما تا در حضور آئیم — ہر جلوہ کہ داری در خود ترا نمائیم
عرفان تیز بیں را حیرت گرفت آخر — اکنوں بنور ایماں چشم یقیں کشائیم
از آشنائی ما بیگانگی ست او را — بیگانہ وار ہستیم از بسکہ آشنائیم
ما چشم نقش پائیم دید قصور داریم — گو در رہش فتادیم اما رہ نمائیم
او دلبر و دل آزار ما دل بدست دادہ — یا رب چہ پیشش آید آمادۂ بلائیم
ما از وفا نہ ہستیم تو از جفا نگوئی — تا چند آزمائی تا چند آزمائیم
یاران ز مہربانی دانند ہر چہ دانند — ما خوب می شناسیم اے درد آنچہ مائیم

متفرق

درد سلطان بحر و بر گشتم — کہ لب خشک و چشم تر دارم
صبح روز فراق شام بود — اے شب وصل شام تو سحر ست
فروغ ماہ در شبہا تواں دید — بہ ہندستاں نماید نور ایماں

در دست چراغے کہ درین راہ بگیرم ۔۔۔ آئینہ بہ کف از دل آگاہ بگیرم

"دیوان اردو" اس کا بیان آگے آتا ہے۔

ادبِ اُردو

خواجہ صاحب اردو شعراء کے تیسرے دور میں ہیں۔ میر و مرزا معاصر تھے۔ دور سوم کے شعراء کی نسبت آزاد "آبِ حیات میں لکھتے ہیں"۔ "زبان اردو ابتدا میں کچا سونا تھی۔ ان بزرگوں نے اُسے کدورتوں سے پاک صاف کیا۔ اور ایسا بنا دیا ہے کہ جس سے ہزاروں ضروری کام اور آرائشوں کے سامان حسینوں کے زیور بلکہ بادشاہوں کے تاج و افسر تیار ہوتے ہیں۔۔۔۔۔۔ یہ اپنی صنعت میں کچھ کچھ تکلف بھی کریں گے مگر ایسا جیسے گلاب کے پھول پر شبنم یا تصویر پر آئینہ۔ ان کا تکلف بھی اصل لطافت پر کچھ لطف زیادہ کرے گا۔ اس کی خوبی پر پردہ نہ ہوگا۔ تم میر صاحب اور خواجہ میر درد کو دیکھو گے کہ اثر میں ڈوبے ہوں گے"۔ آگے چل کر لکھتے ہیں"۔ اپنے استادوں اور بزرگوں سے یہی سنا کہ مرزا جان جاناں۔ سودا۔ میر۔ خواجہ میر درد۔ یہ چار شخص تھے کہ جنھوں نے اُردو کو خراط پر اُتارا ہے"۔

کلام بالا سے خواجہ صاحب کے ادبی صفات یہ واضح ہوئے۔ زبان کو پاک اور کلام کو آراستہ کیا۔ خراط اُتارا۔ اس سے بھی بڑھ کر شہادت میر تقی میر اور میر حسن کی ہے۔ میر صاحب جب اکبر آباد سے دلی آئے تو خواجہ صاحب کی خدمت میں شرف اندوز ہوتے رہے۔ اُن کے مشاعرہ میں شریک ہو کر دارالخلافہ کے مذاق سے آشنا ہوئے۔ اور اہلِ زبان کی صحبت سے فیض حاصل کرنے کا موقع اُن کو ملا۔ میر صاحب کی ترقی دیکھ کر خواجہ صاحب فرماتے ہیں "میر تقی تو میر مجلس خواہی شد"۔ جب وہ مشاعرہ خواجہ صاحب کے یہاں بند ہو گیا۔ تو میر صاحب نے اُن کی فرمائش سے اپنے یہاں مقرر کیا۔ اپنے مشاعرہ کی نسبت کہتے ہیں۔ "واللہ کہ بذاتِ ہیں بزرگ ست"۔ میر صاحب کو صاف اقرار ہے کہ اُن کا کمال خواجہ صاحب کے پاک انفاس کا ممنونِ کرم ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔ "الحمد للہ والمنۃ کہ حرفِ آں سر سلسلۂ خدا پرستان مؤثر افتاد۔ باطن آں خضر قافلۂ اہل عرفان کہ از ظاہرش ظاہر پرست زود کار کرد (دیکھو تذکرہ میر تقی حالات خواجہ صاحب) میر حسن نے بھی ابتدائے ذوق شاعری کی پختگی خواجہ صاحب کی

صحبت میں حاصل کی۔ کریم الدین لکھتے ہیں۔ "بچپن سے میر حسن کو شوق نظم کا تھا۔ جب اس شوق کی ترقی چاہی خواجہ میر درد کی صحبت میں رہے۔ اسی فیض صحبت سے وہ اپنے ارادہ پر مضبوط اور قایم رہے" (ترجمہ گارساں دی تاسی) خود میر صاحب اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ "میرے استاد میر ضیا ہیں مگر مجھ سے اُن کے طرز کا کما حقہ نباہ نہ ہو سکا۔ اس لئے میں نے دوسرے بزرگوں کی (مثل خواجہ میر درد۔ میرزا رفیع سودا۔ اور میر تقی میر) پیروی کی"۔ خواجہ صاحب کی خصوصیت خاص یہ ہے کہ اردو شاعری کے قالب میں حقیقت و معرفت کی روح پھونکی۔ مردہ جسم کو زندہ کیا۔ نمایاں وصف یہ ہے کہ اردو ادب میں مذاق صحیح پیدا کیا۔ میر تقی میر اور میر حسن اُن کے صحبت یافتہ ہیں۔ اثر اور قایم ان کے شاگرد ہیں۔ نیز فراق۔ بھکاری داس۔ عزیز نثار۔ الم۔ صاحبزادے ہیں۔ ایک قریبی رشتہ دار شاعر تخلص ہیں۔

میر اثر کی مثنوی "خواب و خیال" افسوس ہے کہ اب تک دستیاب نہیں ہوئی مگر جو اشعار اس کے محفوظ ہیں اُن سے اور خواجہ حالی کی شہادت سے عیاں ہے کہ مثنوی مذکور ایک نمونہ تھی حسن ادب کا۔ آب حیات میں آزاد نے تصریح کی ہے کہ میر حسن جو انداز بیان دلّی سے لائے تھے وہ اُن کے خاندان نے آخر تک قایم رکھا۔ چنانچہ میر انیس کہہ دیتے تھے کہ "یہ میرے گھر کی زبان ہے۔ حضرات لکھنؤ اس طرح نہیں فرماتے"۔ نہ صرف یہ بلکہ انداز گفتگو۔ طرز معاشرت میں بھی آخر تک امتیاز قایم رہا۔ جن صاحبوں نے میر نفیس اور میرزا اوج کو دیکھا ہے وہ میرے بیان کی تصدیق کریں گے۔ اب یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ مثنوی خواب و خیال۔ مثنوی بدر منیر۔ اور مراثی انیس سے جو فخر و شرف ادبیات اردو کو حاصل ہوا وہ خواجہ صاحب کی فیض تربیت کا ممنون ہے۔

خواجہ صاحب شاعری کی نسبت ایک موقعہ پر فرماتے ہیں (اس سے اندازہ کرو کہ کیسی شاعری کا مفہوم خواجہ صاحب کے ذہن میں تھا) "شاعری ایسا کمال نہیں جس کو مرد آدمی اپنا پیشہ بنالے۔ اور اُس پر ناز کرے۔ البتہ انسانی ہنروں میں سے ایک ہنر ہے بشرطیکہ صلہ حاصل کرنے اور دربدر پھرنے کا آلہ نہ بنے۔ اور مدح اور ہجو دنیا کمانے کے لئے نہ کہے۔ ورنہ گداگری کی ایک صورت ہے اور طماعی اور بدنفسی کی دلیل"۔ (نالۂ درد۔ ۲۸) ایک اور موقع پر فرماتے ہیں۔ "اس سے پہلے بہت ہی کم آدمی ایسے نظر آسکے تھے

جو سلسلۂ جنبانِ سخن" ہوں آپ کہیں دوسروں سے سنیں۔ دل بے اختیار چاہتا تھا کہ دل پر جو معارف تازہ وارد ہوتے تھے اُن کو سخن فہم نکتہ سنجوں کے سامنے بیان کروں اور اُن سے ہم کلام ہوں۔ یہ نتیجۂ انسانیت ہے اور نشانِ آدمیت۔ کلام مربوط عجیب لذت رکھتا ہے اور دل کو شگفتہ کردیتا ہے۔ عَلَّمَہُ البیان کا یہی خلعت ہے جو خلیفۃ اللہ کو پہنایا گیا ہے۔ پاک فرشتوں کی مسجودیہ مشتِ خاک اسی نعمت کی بدولت ہوئی ہے اب معنی فہم انسانوں سے زمانہ بالکل خالی ہو چکا ہے بعض جہلا توحید اس انداز سے بیان کرتے ہیں جو عین الحاد ہے۔ بعض جنگ جو مذہب و ملت کی باتیں اس طرح کرتے ہیں جو منشاءِ فساد ہو جاتی ہیں۔ کچھ خام طبع باہم مل کر جوشِ اخلاق کا اظہار کرتے ہیں اور بیہودہ گوئی کے معرکے گرم کرتے ہیں۔ عقل و فہم کہاں۔ خدا ایسی صحبتوں کے شر سے محفوظ رکھے۔"

خود اپنی شاعری کی نسبت فرماتے ہیں۔ "فقیر کے اشعار باوجود رتبۂ شعری کی رعایت کے پیشۂ شاعری اور اندیشۂ ظاہری کے نتائج نہیں۔ بندہ نے کبھی شعر بدون آمد کے، اہتمام آورد سے موزوں نہیں کیا۔ اور بہ تکلف کبھی شعر و سخن میں مستغرق نہیں ہوا۔ کبھی کسی کی مدح یا ہجو نہیں لکھی۔ کبھی فرمائش یا آزمائش سے متاثر ہو کر شعر نہیں کہا" (علم الکتاب صفحہ ۹۱) عشق مجازی کا مفہوم خواجہ صاحب کے یہاں معمولی سطح سے بلند تر ہے۔ فرماتے ہیں۔ "بوالہوسی عشق مجازی نہیں ہے۔ اور اس مجاز کو حقیقت کی راہ نہیں کہہ سکتے۔ پیر کی محبت وہ عشق مجازی ہے جو مطلوب حقیقی تک پہنچا دیتی ہے۔"

دردِ من میخواستم دردِ دلے   دردِ سر افزود از عشقِ بتاں

ایک اور موقع پر فرماتے ہیں۔ "میں کبھی رسمی عشق بازی میں گرفتار نہیں ہوا۔ لیکن دل عاشقانہ صادقانہ" پایا ہے محبوبوں سے تو کبھی سابقہ نہیں رہا البتہ دوستوں کی صحبت بے تکلفانہ میں وقت گذارا ہے۔ دوستان ہمدم جب جمع ہوں اور "محفل زندہ دلی" گرم فرمائیں اس "مردہ دل افسردہ خاطر" کو بھی یاد کرلیں اور فاتحہ خیر سے شاد۔"

مضامین بالا سے واضح ہوا ہوگا کہ خواجہ صاحب کی شاعری کی نوعیت اور تخیلِ شعری کی حقیقت کیا تھی۔ خواجہ صاحب کا "دیوان اردو" مختصر ہے۔ عام طور پر جو مطبوعہ نسخے ملتے ہیں بہت غلط ہیں۔ اسی

لئے جناب سید راس مسعود صاحب کو صحیح نسخے کا خیال پیدا ہوا۔ اور ہمت صحیح پیدا ہوا۔ حیدرآباد میں ایک سے زائد قلمی دیوان درد کے نسخے میرے ہاتھ آئے۔ سید صاحب کی فرمایش سے میں نے سید معین الدین صاحب شاہ جہاں پوری (مترجم نپولین اعظم وغیرہ) کو تصحیح و مقابلے کی تکلیف دی۔ اہل ادب کو ممنون ہونا چاہیے کہ نہایت محنت و دیدہ ریزی سے انھوں نے ایک صحیح نسخہ مرتب فرمایا اُسی نسخہ سے یہ دیوان طبع ہوا ہی۔ طبع کے بعد جب میں حیدرآباد سے حبیب گنج آیا تو کتاب خانہ میں ایک قدیم مطبوعہ نسخہ موجود ملا جو دہلی کے مطبع مصطفائی میں ۱۲۶۸ء میں اہتمام سے طبع ہوا تھا۔ یہ نسخہ بہت صحیح ہی۔ او رمتعدد صحیح نسخوں کے مقابلے سے چھاپا گیا تھا۔ میں نے اس نسخے سے بھی مقابلہ کرنے کی خواہش سید معین الدین صاحب سے کی اور انھوں نے مہربانی سے محنت کرکے مقابلہ کیا۔ یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ حالیہ مطبوعہ نسخہ قدیم سے بالکل مطابق نکلا۔ صحت میں بھی اور مقدار کلام میں بھی۔

خواجہ صاحب کے کلام میں بعض ایسے الفاظ ضرور ہیں جو اب متروک ہو چکے ہیں۔ اللہ بہتر جانتا ہی کہ جو زبان آج فصیح سمجھی جاتی ہی کل اُس کے کتنے الفاظ غیر فصیح اور نامانوس مانے جائیں گے۔ لیکن اسی کے ساتھ معرفت اور حقیقت کا رنگ، کلام کی پاکیزگی، تخیل کی بلندی، درد کی چاشنی سوز و گداز کا کندن ہر جگہ عیاں ہی تاباں ہی۔ اشعار ذیل اس دعوے کے شاہد ہیں ؎

مقدور ہمیں کب ترے وصفوں کی رقم کا — حقا کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا

جس مسند عزت پہ کہ تو جلوہ نما ہے — کیا تاب گزر ہووے تعقل کے قدم کا

بستے ہیں ترے سایہ میں سب شیخ و برہمن — آباد ہی تجھ سے ہی تو گھر دیر و حرم کا

ہی خوف اگرجی میں تو ہی تیرے غضب کا — اور دل میں بھروسا ہی تو تیرے ہی کرم کا

مانند حباب آنکھ تو اے درد کھلی تھی
کھینچا نہ پہ اس بحر میں عرصہ کوئی دم کا

مژگان تر ہوں یا رگ تاک بریدہ ہوں — جو کچھ کہ ہوں سو ہوں غرض آفت رسیدہ ہوں

کھینچے ہے دور آپ کو میری فروتنی — افتادہ ہوں پہ سایۂ قد کشیدہ ہوں

ہر شام مثلِ شام ہوں میں تیرہ روزگار
ہر صبح مثلِ صبح گریباں دریدہ ہوں

کرتی ہے بوئے گل تو مرے ساتھ اختلاط
پر آہ میں تو موجِ نسیمِ وزیدہ ہوں

چاہے ہے یہ مری تپشِ دل کہ بعدِ مرگ
کنجِ مزار میں بھی نہ میں آرمیدہ ہوں

اے دردؔ جا چکا ہے مرا کام ضبط سے
میں غمزدہ تو قطرۂ اشکِ چکیدہ ہوں

ہر طرح زمانے کے ہاتھوں سے ستم دیدہ
گر دل ہوں تو آزردہ خاطر ہوں تو رنجیدہ

ہم گلشنِ دوراں میں اے خفتگیِ طالع
سرسبز تو ہیں لیکن جوں سبزۂ خوابیدہ

اے شورِ قیامت رہ اودھر ہی میں کہتا ہوں
چونکے ہے ابھی یاں سے کوئی دلِ شوریدہ

اوروں سے تو ہنستے ہو نظروں سے ملا نظریں
ایدھر کو نظر کوئی پھینکی بھی تو دزدیدہ

مجھ پر تو یہ عقدہ ہی تو کھول صبا بارے
زلفوں نے کسے بھیجا یہ نامۂ پیچیدہ

بدخواہ سبھی عالم گو ہووے تو ہو لیکن
یارب نہ کسی کے ہوں دشمن یہ دل و دیدہ

کرتا ہے جگہ دل میں جوں ابروِ پیوستہ
اے دردؔ یہ تیرا تو ہر مصرعہ پیچیدہ

کاش تا شمع نہ ہوتا گزرِ پروانہ
تم نے کیا قہر کیا بال و پرِ پروانہ

شمع کے صدقے تو ہوتے ابھی دیکھا تھا اسے
پھر جو دیکھا تو نہ پایا اثرِ پروانہ

کیوں اسے آتشِ سوزاں میں لیے جاتی ہے
سوجھتا بھی ہے تجھے کچھ نظرِ پروانہ

ایک ہی جست میں لی منزلِ مقصود اس نے
راہرو رشک کی جا ہے نظرِ پروانہ

شمع تو جل بجھی اور صبح نمودار ہوئی
پوچھوں اے دردؔ میں کس سے خبرِ پروانہ

اُس کی بہارِ حسن کا دل میں ہمارے جوش ہے
فصلِ بہار جس کے ہاں ایک یہ گل فروش ہے

خلوتِ دل نے کر دیا اپنے حواس میں خلل
حُسن بلائے چشم ہے نغمہ وبالِ گوش ہے

ہووے تو درمیاں سے اپنے تئیں اٹھائیے — یار نہیں ہے اور کچھ۔ سر ہی وبالِ دوش ہے
نالہ و آہ کیجیے خونِ جگر ہی پیجیے — عہدِ شباب کہتے ہیں موسمِ ناؤ نوش ہے
خیر تجھے تو چاہیے بدرقۂ جنوں نہ چھوڑ — ہم نے جہاں کی سیر کی۔ رہزنِ خلق ہوش ہے
غیرِ ملال زاہدا۔ کیا ہے طریق زہد میں — دل ہو شگفتہ جس جگہ۔ کوچۂ میفروش ہے

اپنے تئیں تو کام کچھ خرقہ و جامہ سے نہیں
درد اگر لباس ہے دیدۂ عیب پوش ہے

آفتِ جان و دل تو یاں وہ بتِ خود فروش ہے — پہلے ہی جس کے پیشکش۔ صبر و قرار و ہوش ہے
دل کو سیاہ مست کر۔ کچھ بھی تجھے جو ہوش ہے — کہتے ہیں کعبہ اس کو۔ اور کعبہ سیاہ پوش ہے
کس کی یہ ہوتی ہے صبا۔ گفت و شنید باغ میں — غنچے سبھی دہان ہیں۔ گل بھی تمام گوش ہے
آتشِ گل جنوں مرا گرم کرے سو یہ نہیں — سینہ ہمیشہ آگ ہے۔ دل میں سدا ہی جوش ہے
حادثۂ زمانہ کیا تیری جفا سو کیا بلا — ہم کو سپہر مت ڈرا۔ نیش بھی یاں تو نوش ہے
ہم نے تو ایک معصیت چاہی چھپے نہ چھپ سکی — اپنے گناہ کو ترا عفو ہی پردہ پوش ہے
آہ کہیں یہ ناتواں حال کرے سو کیا بیاں — منہ پہ ہے مہرِ خامشی دل میں بھرا خروش ہے
دور نہیں ہوا ہمیں رنجِ شعور ساقیا — اک دو سہ جام اور بھی باقی ابھی تو ہوش ہے

محنت و رنج و غم سے یاں درد نہ جی چھپائیے
بار سبھی اٹھائیے جب تئیں سر ہے دوش ہے

آخر میں یہ لکھ دینا ضروری ہے کہ جو حالات اس مقدمے میں لکھے گئے ہیں اُن کا ماخذ خود خواجہ صاحب کی تصانیف ہیں۔ بعض حالات یا مضامین ایسے بھی درج ہوئے جو دوسری کتابوں سے ماخوذ ہیں۔ اُن کا حوالہ موقع پر دے دیا گیا ہے۔

میں ممنون ہوں کہ سید ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی سے قیمتی مدد ملی ہے۔ ناشکری ہو گی اگر میں نہ لکھوں کہ خواجہ صاحب کی نادر اور نایاب تصانیف (علم الکتاب و نالۂ درد وغیرہ) اور خواجہ عندلیب

صاحب کی نالۂ عندلیب کی اشاعت کی سعادت نواب سید نور الحسن خاں مرحوم بھوپالی کو نصیب ہوئی۔ یہ دین و علم کی ایسی بیش بہا خدمت تھی جو ہمیشہ اہل دل کو اُن کا ممنون رکھے گی۔ جزاکا اللہ خیراً۔

اللہ بس - باقی ہوس

۱۵ محرم الحرام ۱۳۴۲ھ
۲۹ اگست ۱۹۲۳ء
یوم چہارشنبہ

قصائدِ مظہرؒ

معلوم ہوتا ہے کہ خود ظہور و خفا بھی کسی مخفی قانون کے تابع ہے۔ حضرت شیخ دہلوی نے تذکرۃ المصنفین میں دیوان مظہر کو کمیاب بلکہ نایاب لکھا ہے۔ (اورنٹیل کالج میگزین۔ مئی ۱۹۳۵ء) یہ آج سے تین سو برس پہلے کا واقعہ ہے۔ صدیوں تک گوشۂ گمنامی میں آسودہ رہ کر مظہر کا کلام اب ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اور اس قیت کے ساتھ کہ اسی صوبے کے دو شہروں میں بہ یک وقت اُس کے ظہور کا سامان ہوا۔

لکھنؤ میں پروفیسر وحید مرزا صاحب نے حکیم آشفتہ صاحب کے نسخے پر تبصرہ کرکے حق تحقیق ادا کیا۔ اسی زمانہ میں مولوی ابوبکر شیث صاحب ناظم دینیات نے مسلم یونیورسٹی میں ازراہِ معارف پروری اُن قلمی نسخوں کی فہرست نویسی شروع کی جو ہنوز تشنۂ توجہ تھے۔ اسی سلسلہ میں ایک قصائد فارسی کا نسخہ سامنے آیا جس کے مؤلف کا نام پردۂ خفا میں تھا لوح نام سے خالی تھی۔ اندرونِ کتاب بھی تفتیش کی حاجت تھی۔ براہ کرم ناظم صاحب نے مجھ پر اعتماد کرکے نسخہ تحقیقِ مؤلف کے لئے عنایت کیا۔ کسی قدر کاوش کے بعد مظہر تخلص ملا۔ مصرع (مظہر بندۂ کمتر کہ میراث پدر دارد) قصیدہ ۵۱۔ دو جگہ اور یہ تخلص نظر سے گزرا۔ ترکیب بند ۱۴۔

مظہر در ثنا خوانی چو دُر افشانست دریابیت ۔۔۔ کنونت از سر اخلاص دست اندر دعا کردہ

قصیدہ نمبر ۲۴-

از زبانِ مطہرِ مسکیں

شاہ را ایں دعا مبارکباد

ایک جگہ کاتب نے تخلص صاف مظفر لکھ دیا ہی (دیکھو قصیدہ ۴۴) ظاہر ہی کہ یہ قلم کی لغزش ہی-

شوق مزید تفتیش کا متقاضی ہوا- اپنے یہاں کے محدود وسائل سے کام لینا شروع کیا- یہ کاوش جاری تھی کہ ماہ مئی ۱۹۳۵ء کا اورنٹیل کالج میگزین پہنچا- اس میں پروفیسر وحید مرزا صاحب کا مضمون مع فاضل مُدیر کے ضمیمے کے دیدہ افروز و سبق آموز ہوا- جو کچھ میں مزید مواد جمع کرسکا ہیش کرتا ہوں- اس موقع پر مشہور مصرع بدلتا ہوگا- ع نقاش نقشِ اول بہتر کشید از من[1]

قصائد مطہرؒ کا نسخہ تقطیع اوسط ۹×۶- شعر فی صفحہ ۱۷ صفحات ۳۲۸- اشعار کم و بیش ۵۳۷۶ اول و آخر ناقص- خط جلی- خطاطی کی شان لئے ہوئے- دوسرا صفحہ پورا مُطلّا و مذہّب باقی پر جدول طلائی لاجوردی کاغذ سمرقندی- اول سے ایک ورق نہیں- آخر سے معلوم نہیں کس قدر ناقص ہی- ظاہر ہی کہ اس حالت میں سنہ تحریر کس طرح نظر افروز ہوتا- نسخے کی مجموعی حالت پر نظر کرکے یہ کہنا نادرست نہ ہوگا کہ یہ نسخہ نویں صدی ہجری کا لکھا ہوا ہی- صحت کے اعتبار سے عام سطح سے بلند ہی- اشعار پورے ہیں- کہیں کہیں بیاض ہی- نسخے پر نظر ثانی احتیاط سے ہوئی ہی جس کی وجہ سے بہت سے اشعار کا اضافہ ہوا ہی- مثلاً قصیدہ نمبر ۴۲ کے صرف سات شعر متن میں تھے- نظر ثانی میں حاشیہ پر سولہ[16] شعر کا اضافہ ہوا ہی- اضافہ شدہ اشعار کا خط دو قلمہ ہی- اس سے معلوم ہوتا ہی کہ ایک بار سے زیادہ نظر ثانی ہوئی ہی- بعض جگہ تصحیح بھی ہی- کلام ردیف وار مرتب ہی- نسخہ محفوظ ہی- کرم خوردہ یا آب رسیدہ نہیں

اول قصائد ہیں- جن کی تعداد ساٹھ[60] ہی- لکھنوی نسخے میں اٹھائیس ہیں- پہلا قصیدہ وہی ہی جو لکھنوی نسخے میں اول ہی- قصائد کے بعد ترکیب بند ہیں جن کی تعداد اکیس[21] ہی- ترکیب بندوں کے درمیان میں متعدد مسمّطات ہیں- غالباً صحّاف کی بے احتیاطی سے مخلوط ہوئے ہیں- اکیسویں ترکیب بند کے ختم ہونے سے پہلے ناتمام نسخہ تمام ہو جاتا ہی-

---

[1] اصل نقاش نقش آخر بہتر کشد ز اول-

ایک عجیب واقعہ ہے۔ ایک جگہ سے زیادہ ایسا ہوا ہے کہ دو ورق باہم ملا کر ٹھراگر دیئے ہیں۔ دبازت اس کی شہادت ہے۔ روشنی میں دیکھنے سے اندر کی تحریر کی جھلک بھی محسوس ہوتی ہے۔ اس سے سلسلۂ کلام بھی درہم برہم ہو جاتا ہے۔ مثلاً قصیدہ ۳۸ کے آخر صفحۂ وصل پر یہ شعر ہے۔

بر رُخِ شاہد گلرنگ شرابِ گلگوں　　　می کشیدند زساقیِ سمن بر بسر در

وُرق اُلٹنے پر یہ شعر سر صفحہ ہے۔

ندامت آرد اگر باوجہ حکمت و شرع　　　زمامِ نفس بدست ہلاک بسپاریم

معلوم نہیں یہ ورق کس مصلحت سے چپیاں کر دئے گئے۔

حالاتِ مظہر حالات جس قدر پروفیسر وحید مرزا صاحب اور فاضل مدیر نے دیدہ ریزی کے بعد فراہم کر دئے ہیں اُن پر اضافہ دشوار ہے۔ تاہم جو حالات اور معلوم ہو سکے درج ذیل ہیں۔

افسوس ہے کہ جہاں تک میں دیکھ سکا سراجِ عفیف اور ضیاء برنی دونوں نے اپنی تاریخ میں مظہر کا ذکر نہیں کیا۔ دو مزید تذکروں میں ذکر ملا۔ ایک ریاض الشعراء واغستانی ہیں۔ دوسرے مجمع الفصحا پھر میں دونوں میں مظہر کے تحت حال لکھا ہے چونکہ کلام مظہر کا انتخاب کیا ہے اس لئے بے تامل کہہ سکتے ہیں کہ تصحیف ہے خود تذکرہ نگاروں کی۔ ریاض الشعراء میں ہے۔

"مولانا مظہر از ایران آمدہ در گجرات توطن نمود۔ طبع در نہایت قدرت و روانی داشتہ"

مجمع الفصحا میں دو جگہ ذکر ہے۔ اوّل

"مظہر گجراتی از سخن گویانِ شیریں زبان و فاضلانِ نیکو بیان ست و اصلش از ایران ست" ہشت ہزار بیت صاحبِ دیوان ست" دوم

"مظہر ہندی قاضی اگرہ بیست و مرسے آگہہ۔ مداح فیروز شاہ بود۔ و مدح عین الملک نیز نمودہ بعضے ورا مظہر مذکور خوانند و بعضے جدا دانند علی ای حال بنام اُو می باشد"

انتخاب کلام میں دونوں جگہ مظہر کا کلام نقل کیا ہے۔ لہذا مظہر گجراتی اور مظہر ہندی دونوں ایک ہیں۔ میرے بیاں کے نسخہ تذکرۂ مجمع الغرائب میں فہرست میں مظہر ہے۔ اصل کتاب میں مظہر میرے مخدوم

سید صمدانی لکھتے ہیں کہ تذکرۂ یدبیضا میں میر غلام علی آزاد نے مُطہر کو کڑہ کا باشندہ لکھا ہے۔ نیز یہ کہ فیروز شاہ کے یہاں قُرب حاصل تھا۔ (ید بیضا میرے سامنے نہیں[۱]) تعجب ہے کہ اس حال میں میر آزاد کا تذکرہ خزانۂ عامرہ مُطہر کے ذکر سے کیوں فیض یاب نہ ہوا۔ تذکرۂ مذکورہ کا موضوع فیض یافتہ شعراء کا ذکر ہے۔ مُطہر فیوض سے مالا مال تھا۔

حضرت شیخ دہلوی نے اخبار الاخیار میں مُطہر کو حضرت چراغ دہلوی کا مُرید خاص لکھا ہے۔ منقبت شیخ میں اُس کا ایک قصیدہ نقل کیا ہے۔ نیز ایک مرثیہ شیخ کی وفات پر۔

حضرت شیخ نے کلامِ مُطہر کو کمیاب بلکہ نایاب لکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ دیوانِ مطہر پیش نظر نہ ہوگا۔ دوسری جگہ سے کلام بالا نقل کیا ہوگا۔ اس وقت جو دو نسخے قصائد کے ظہور پذیر ہوئے ہیں (لکھنؤ و مسلم یونیورسٹی میں) دونوں اس قصیدے اور مرثئیے سے خالی ہیں۔ مسلم یونیورسٹی کے نسخے میں ایک قصیدہ بطور منظوم شجرۂ خواجگان چشت ہے۔ اس میں مُطہر نے حضرتِ سرورِ عالم سے لے کر حضرت نظام المشائخ تک شجرہ کی ترتیب کے ساتھ نام لکھے ہیں۔ اگر مطہر کو حضرت خواجہ نصیر الدین دہلوی سے بیعت تھی تو سلطان المشائخ کے بعد اُن کا نام نامی آتا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ بلکہ دوسرے نام کا اشارہ ہے۔ ملاحظہ ہو ؂

نظامِ دل و دیں کہ اخلاقِ احمد	درو تعبیہ شد چو در شیر شکر
دِگر گشتۂ عشق رکنِ حقیقت	کہ چوں خواجہ منصور در ناز ادفر

بظاہر رکن کا اشارہ رکن الدین کی طرف ہے۔ اب اشکال یہ ہوتا ہے کہ (سیر الاولیا، خزینۃ الاصفیا اور اخبار الاخیار کی شہادت کے بموجب) حضرت سلطان جی یا حضرت چراغ دہلوی کے خلفاء میں کوئی رکن الدین نہیں۔ بلکہ دوسرے سلسلوں میں بھی صرف ایک رکن الدین کا ذکر ان کتابوں میں

---

[۱] معارف۔ یدبیضا کی وہ عبارت یہ ہے۔ "قاضی مُطہر از اہالی شہر کڑہ است۔ عالم و فاضل و شاعر کامل بودہ و در سلک مریدان خاص شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی انتظام داشتہ و در خدمت فیروز شاہ باعلیٰ مراتب قربت و منزلت محترم زیستہ۔ ناظم تبریزی گوید کہ شاعر شیریں زبانے نمکیں بیانے بودہ مسودۂ اشعار او بخط قدیم در گجرات بدست مولانا محمد صوفی زندانی بود۔ وے اورا در سلک ترتیب و ترمیم کشیدہ منتشر ساخت۔ فقط

آتا ہے اور وہ حضرت رکن الدین ملتانی ہیں جو سلسلۂ سہروردی کے شیخ ہیں۔ نہ کہ چشتیہ کے۔ پھر ان کا نام یہاں کیوں آیا۔ اگر مظہر کو ان سے بیعت تھی تو سلسلۂ چشتیہ میں اُن کا نام کیوں آیا۔ ایک احتمال یہ ہوتا ہے کہ ان دونوں شعروں کے درمیان میں کوئی شعر چھوٹ گیا ہو جس میں حضرت چراغ دہلوی کا نام ہو لیکن یہ احتمال یوں قائم نہیں رہتا کہ خواجہ بختیار کاکی کے ذکر کے بعد حضرت گنج شکر کے نام کا شعر کاتب سے چھوٹ گیا تھا مقابلے میں حاشیہ پر اُس کا اضافہ کر دیا گیا۔ اگر یہاں بھی شعر چھوٹ گیا ہوتا تو اُس کا اضافہ کر دیا جاتا۔ بہر حال یہ اشکال حالتِ موجودہ میں ہے جس کو شروانی کی نادانی حل نہ کر سکی۔

علاوہ تذکروں کے خود کلام مظہر کے مطالعہ سے حسب ذیل حالات معلوم ہوتے ہیں :۔

مظہر کا باپ بھی شاعر تھا۔ ہندوستان میں تھا اور شاہی خدمت میں۔ چنانچہ قصیدہ نمبر ۱۵ میں ہے (واضح ہو کہ نمبر اصل کتاب میں میں نے خود قائم کئے ہیں)۔

مظہر بندۂ کمتر کہ میراثِ پدر دارد
دریں درگہ دعا گوئی دریں حضرت ثنا خوانی

مظہر کے قبضے میں شاہی جاگیر تھی جہاں پانی کے اندر ایک بلند ٹیلے پر مکان تعمیر کیا تھا۔

زجودِ شاہ دہے داشتم برائے معاش ۔۔۔ کہ در دعاش نشستم بکنج تنہائی
میانِ آب یکے خانۂ بنا کردم ۔۔۔ بہ پشتۂ ز بلندی چو چرخ مینائی
چو در عمارتِ آن خانہ و زراعتِ دیہ ۔۔۔ برفت آنچہ کہ بُد نقد جنس دنیائی

خاندان اور خدم و حشم کی تعداد کثیر تھی۔

ترا خویش و فرزند و خیل و تبار ۔۔۔ فزوں از ہزار اند گر بشمری

قصیدہ نمبر ۲۳ میں ایک اور گانوں کا ذکر ہے۔ معلوم نہیں یہی تھا یا دوسرا۔

آں قدر مرحمت و تربیت ارزانی داشت ۔۔۔ کہ یکے را نتواں کرد بعمرے مامور
خانۂ و دیہ دگر زانچہ بباید اسباب ۔۔۔ ہمہ فرمود بداں لطف و بشاشت فرمود (دہ مذکور)

خاتمہ میں کہتا ہے ؎

استمالت کنم ایں دیہ پریشاں شدہ را
باشد آئندہ دہد جبر بہ نقصان وکسور

قصیدہ نمبر ۲۷ میں اپنی جاگیر کا ذکر زیادہ تفصیل سے کیا ہے۔ مطلع ہے ؎

حبذا باغِ ارم بقعۂ اسلام آباد — کہ بر اسلام بنا کردنِ او میموں باد

حسنِ مطلع ؎ خاصہ بر ذاتِ خداوند ملک عین الملک — کہ بیاراست جہاں از دو نفس دانش و داد

آگے چل کر لکھتا ہے ؎

اندر آں روز کہ من بر دریا وکردم عزم — ویں حکایت بدلِ شاہ جہاں دادم یاد
مرحمت کرد و مرا داد دریں جا دیہے — واختیارم زپئے قرب ہمیں قریہ نہاد
ہمہ گفتند کہ دیہیست نکو اما خوط — سخت متاکلہ و جملہ اقارب بیداد
من چو واثق بدم از نصرتم و تائید ملک — التفاتے نہ نمودم بدل از اہل عناد
واں مقدم چو ز دیوانِ قدرہ فرصت یافت — شکل دیگر شد و صد تعبیہ بنیاد نہاد
وانچہ واصل بدے از دیہ مرا کردے خط — وانچہ میکرد خط آں نیز نیارستے داد
طرفہ تر آنکہ در آں حوض کہ او ساختے سر — رہ نمی داد کہ سازند وضو اہلِ رشاد
چہ گلے داشت دراں حوض کہ می پروردا او — ہمچو والد کہ کند تربیت مر اولاد
چہ گلے تیرہ و دریافتہ چوں الفاظاں — کہ بصد حیلہ درو راہ نمی کردے باد
ہر یکے شاخ چو یک سلسلۂ از آہن — ہر یکے خار چو یک نیشترے از پولاد
غیرتے داشت بر آں بستہ ز چشم مردم — کہ چناں رشک نہ بردہ ز عروسے داماد
پائے ببریدے اگر خار بریدے نجار — دست بشکستے اگر شاخ شکستے جلاد
آں نہ لبس بود کہ میکرد چنیں سو پنہاں — سر برآورد بجائے کہ ز کفر و الحاد
مسجدے را کہ برآورد فلاں کرد خراب — واں صنم خانہ کہ بشکست شہ آں کرد آباد
من چو آں خواری دیہ دیدم وآں عزتِ کفر — طاقتم طاق شد و صبر درآمد بہ نفاد

گفتم آدرخ که پسندیده بود نزدیکی شهر — در دهی بر دو گروهی که بُد از حکم سواد
این چنین کفر بود غالب و اسلام ضعیف — چون فلک سنگ نمی بارد ازین استبداد
خاصه آن ده که دِه پدرِ شاه پدا نشم هی — تا کند علم در و درس و عبادت بنیاد
همه شب بودم ازاں غصه در اندوه و قلق — بامداداں که سر گشت سپیدی ز سواد
آمدم بر دَرِ دیوان و دَرِ اصحابِ ملک — کردم از فتنهٔ آں کافر بے دیں فریاد
راستی اہلِ دو داد دین و امینانِ ملک — چوں نمودند دریں کار رہی را امداد
بستم آں خوط بصد سلسله در پا و به — همچو حمدونه که بند دست و نه آزاد
بستدم انچه برد بود ز محصولِ خطی — بگرفتم که دریں ده بنود استشهاد
هم برین شرط ضمانے شدم پا برچلے — وانگهی کردم ازاں شدت و بندش آزاد
پس بتوفیق خداوند و باقبالِ ملک — هم به تنها که بختم ز کسے استمداد

× × × × × × × ×

وانچه تخییل و تعیش بود برده ل کردم نیز — تا شود منقطع از قریه یمن بیخ فساد
کردم آں بقعه همه صاف ز بالا و نشیب — کردم آں بت کده تا چیز ز بیخ و بنیاد
مسجد آراستم و محرابے و مسلمانی چند — کردم آباد که باشند به ذکر و اوراد
مالکُ المشرق بدولت چو در آمد در شهر — دیں حکایت بتواتر بشنید از آحاد
آفریں گفت بریں خسته و از راهِ کرم — گنجِ الفاظ گهربار به تحسین به گشاد
تا چه دارا نه سیکے عزم سواری فرمود — سوے آں ده بصد کوکبهٔ استعداد
سایباںها و سراپرده براں حوض کشید — که بپوشید به دیباے یمن سبع شداد
بزمے آراسته که در حشمه فردوسِ برین — خوبتر زاں نتواں یافت مقام عباد
داد دریں بزم بسے مایده کرد افراز — که فزوں آمده الوانِ نعم از اعداد
عام در داد و صلاے بهمه بحواشی و خدم — چوں عجم در مه نوروز و عرب در اعیاد

الغرض چونکہ ازاں نوش و نعم فارغ شد — گاہ بے کرد طلب حاذق و دانشمند استاد
گفت تا بر سرِ آں حوض مقامے سازند — رونق و روح فزا چو ارم ذاتِ عماد
باغ از جانبِ شرقیش نگارند شرف — برگ زارے ز جنوبیش نگارند بنیاد
تا نشینند دریں جا نگہ اصحابِ علوم — بدعا گوئی سلطانِ جہاں خرم و شاد

قصیدۂ بالا سے حالاتِ ذیل معلوم ہوتے ہیں :-

جاگیر اسلام آباد کے سواد میں تھی - مظہر کا شمار علماء میں بھی تھا - صاحبِ درس تھا - اس کی تائید قصیدہ نمبر ۳۲ سے بھی ہوتی ہے یعنی اپنی حاضری دربار کے دو ذریعے بیان کرتا ہے ؎

سالہا آرزوئے بود کہ در حضرتِ شاہ
بطفیلِ علماء یا شعراء یابی بار

جاگیر کے گاؤں میں مدرسہ اور باغ عین الملک کے حکم سے تعمیر ہوا - قصیدہ نمبر ۴۲ میں ایک جگہ ۷۷۰ھ کا ذکر کرتا ہے ؎

ترا بہفتصد و ہفتاد ہجر مدتِ عمر
چو عمر نوح نبی باد ہفتصد و پنجاہ[1]

[1] صحیح نہصد و پنجاہ -

مختلف قصائد میں شعرائے ذیل کے نام لئے ہیں :-

سعدی - نزاری - کمال اصفہانی - جمال اصفہانی - بدیع الہمدانی - رضی نیشاپوری - معزی - عنصری - فردوسی - انوری - خاقانی - فرید - عسجدی - عمعق - سنائی - ہمام - ظہیر

سعدی کی شیریں کلامی - اور خاقانی کی بلند پروازی مسلّم ہے - چنانچہ قصیدہ نمبر ۵۳ میں ہے ؎

ہم الفاظ خاقانیم در بلندی — ہم آواز سعدی بہ شیریں کلامی

امیر خسرو یا حسن دہلوی کا ذکر نظر سے نہیں گزرا - لیکن وقائع نگاری کا انداز کہتا ہے کہ امیر خسرو کا کلام پیش نظر تھا -

ایک قصیدے میں ذیل کی طبی کتابوں کے نام لکھے ہیں :-

نحو اور معانی۔	مقالید و فتح ۔
صرف و لغت ۔	کامل اور ازہری
اخبار و آثار ۔	ہر دو صحاح ۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)
تفسیر ۔	کشاف زمخشری
فقہ ۔	مبسوط
منطق ۔	مطالع
علم کلام ۔	مواقف ۔ و مقاصد
حکمت ۔	ابہری
وعظ و نصائح ۔	کتاب سری
اخلاق و تہذیب ۔	ناصری ۔ ع ۔ زطب و زتار یجہاد اقدی ۔ کیا و اقدی کی طب ہیں ۔ بھی کوئی کتاب تھی ۔
تقلیل ۔	مجموعہ یرغزی

مقاماتِ ذیل قصائد میں نظر آئے :۔

دہلی ۔ فیروز آباد ۔ ٹھٹھ ۔ جاجنگر ۔ اسلام آباد ۔ نگرکوٹ ۔ غازی پور ۔ قصیدہ نمبر ۳۳ ۔ دیکھو ۔

لیک چوں مدتے حرمانست ہنوزم باقی　　　بود والاملک الشرق سوے غازی پور

من چو آنجا ز علائق نتوانستم رفت　　　رفع کردم ز دعا گوئیِ خود چند سطور

ایک جگہ عبور گنگ کا ذکر ہے ۔ ع چناں کن کہ چوں عبرہ کردی زگنگ ۔ گجرات کے کسی مقام کا نام نظر سے نہیں گزرا ۔ اس سے بھی مظہر کا گجراتی ہونا مشتبہ ہو جاتا ہے ۔

کلام پر تبصرہ

قصائد مظہر کا انکشاف اس پہلو سے بھی قابلِ قدر ہے کہ تیموری دور سے پہلے کے عہد کا کلام ہی جواب کمیاب نایابی کی حد تک ہے ۔ میرے یہاں علاوہ امیر خسرو اور خواجہ حسن دہلوی کے کلام کے عہد مذکور کے حسب ذیل شعرا کے دواوین ہیں ۔

عاشق دہلوی (تلمیذ امیر خسروؒ) خواجہ مسعود بک۔ جمالی۔ بدر چاچی (مطبع نول کشوری) علاوہ اس تاریخی قدر و قیمت کے باعتبار خوبی کلام بھی قصائد مطہر فارسی ادب میں بیش بہا اضافہ ہی۔ مطہر کے کلام میں سیرابی و تازگی ہی۔ قوت مشاہدہ ہی۔ اور حقیقی شاعری۔ محض قافیہ پیمائی اور الفاظ نوردی نہیں ہی۔ مطہر کے کلام کی وقعت بہت بڑھ جاتی ہی جب ہم اُس کے پیش رَو بدر چاچی کے قصائد دیکھتے ہیں۔ اُس کی اُستادی مسلّم۔ لیکن کلام میں سوائے اغلاق، اشکال اور مقررہ اصطلاحوں اور مضامین کے اعادہ کی جدت و جودت (جو سرور آفریں اور دل کشا ہو) بہت ہی کم ہی۔ مطہر کے یہاں یہ جنس گرانمایہ بکثرت ہی۔ اور اُس کی یہ خصوصیت مسلّم ہی۔ والہ داغستانی نے لکھا ہی "طبع در نہایت قدرت و روانی داشتہ" سپہر نے مجمع الفصحا میں یہ راے ظاہر کی ہی "از سخن گویان شیریں زبان و فاضلان نیکو بیان ست"۔ حضرت شیخ دہلوی اخبار الاخیار میں فرماتے ہیں "در فضیلت و بلاغت و فصاحت از منفردانِ روزگار بود"۔ بت خانہ میں ہی "جزالتِ کلامش، بمذاق سخن سنجی آں سر دفتر سخن شناسان خوش افتاد.... شعرش بے تکلفانہ و سہل ممتنع است"۔

ان شہادتوں کے مقابلے میں مُلّا عبد القادر بدایونی کی یہ راے کیا وزن رکھتی ہی "چوں مُلّائی بر شاعری غالب است نقد شعرش چنداں در بازار فضل رواج ندارد"۔ شاید اس لئے میں ملّا صاحب کی مُلّائیت کا شاعری پر غلبہ رہا!

بڑی شہادت خود اُس کا کلام ہی۔ روانیِ کلام، بلندیِ خیال، متانت و شوکت کلام میں اُس کے قصائد مسلم الثبوت اساتذہ کے کلام سے دوش بدوش ہیں۔ شیریں بیانی، سحر آفرینی اور خوش بیانی میں بہت سے شہسواروں سے آگے ہے۔ ہم ذیل میں اُس کے کلام کا تین تاجدارانِ قصیدہ کے کلام سے مقابلہ کرتے ہیں۔ یعنی انوری خاوری ظہیر فاریابی و سلمان ساوجی۔ انوری کا کمال روز روشن کی طرح تاباں ہی۔ ظہیر و سلمان کی بابت یہ دو قول یاد کر لو۔

دیوانِ ظہیر فاریابی در کعبہ (کعبہ) بدزد اگر بیابی

"شعر سلمان و انار سمنان ہر جائی باشد"۔ ان کمالوں کو پیش نظر رکھ کر مقابلہ کرو۔

حسنِ مطلع ؎

صوفی از صومعہ گو خیمہ بزن در گلزار
وقت آں نیست کہ در خانہ نشینی بیکار

اسی زمین میں سعدی کا مطلع :- اور حسنِ مطلع ؎

بامداداں کہ تفاوت نہ کند لیل و نہار
خوش بود دامنِ صحرا و تماشاے بہار

لیکن مُظہر کا مطلع، واہ! رنگِ غزل میں ڈوبا ہوا ہی۔ کیا کہتے ہیں! ؎

انوری خاوری

دوش چوں چشمۂ خورشیدِ سپہرِ دوّار — گشت از چشم نہاں در پسِ ایں پردۂ تار
روے بنمود بہ سالِ نو از چرخ چنانک — پارۂ زرّیں از روے صحیفہ زنگار
جرم او گاہ پذیرندہ از انجم آرام — سیر او گاہ نمایندہ زارکاں آثار
گاہے از دوری خورشید ہمی شد فربہ — گہ ز نزدیکی او باز ہمی گشت نزار
پر از و بود سبک روح زبیری کہ فلک — معنی اندر ورق روح ہمی کرد نگار
مضمر اندر سخنش ہر چہ قضا را مقدور — مدغم اندر قلمش ہر چہ قدر را اسرار
بود بر تختۂ او از ہمہ نوعے آیات — بود در دفتر او از ہمہ وزنے اشعار
باز بر طارم دیگر صنمے سیم اندام — بکفے بربطِ سعدی بدگر جامِ عقار
از تبسم لبِ شیرینش ہمی شد ختہ — وز اشارت رخِ زیباش ہمی گشت فگار
سخنش از وتد و واسطۂ موسیقی — خللش از وتہ زمزمۂ و موسیقار
حضرتے بود پر از طارمِ او سخت رفیع — سقف او را نہ ستوں بود نہ دیوار بکار
ملکے ہمچو خرد عادل و بیدار درو — نیک منتظر وز و یافتہ خاک استظہار
گہ تہی کرد ہمی دامنِ ابر از گوہر — گاہ پُر کرد ہمی کیسۂ کاں از دینار
صحن و دہلیز و سرا پردۂ او اوج و حضیض — اشہب داد ہم گردِ آخرِ او لیل و نہار

بادرا دخل نمی داد بوجہے زدخان — آب را خرج نمی کرد بوجہے زبخار

مطہر

بامداداں کہ بیفگند ہوا پردۂ قار — شاہد صبح بیندود بسرخی رخسار

آسمان نامۂ اعمالِ زمیں کرد سپید — شب توگوئی کہ گنہ بود، سحر استغفار

سادہ شد چوں دلِ مومن زہمہ ظلمت و زنگ — روئے مشرق کہ سیہ بود چو خالِ کفار

باد مشکیں زسر زلفِ عروسانِ بہشت — می رسانید دمِ نافۂ آہوئے تتار

من کہ در خواب خوش از فتح گرفتم فالے — شدم از غایتِ شادیش چو دولت بیدار

منتظر بودہ ام از غیب کہ دیدم ناگہ — گشت طالع صنمے ہمچو سہے زیر غبار

قاصدے نزدِ من آمد زسوئے شہر دوال — چوں نسیمے کہ وزد صبحدماں از گلزار

نامہ در کفِ او مہر بعنوانِ رہی — کاتبِ نامہ امیرے ز امیرانِ کبار

مہر آں نامہ چو بکشادم و خواندم مضمون — دیدم از غالیہ بر گل رقمے کردہ نگار

ریختہ مشکِ سیہ بر سر کافور سپید — راست چوں خطِ دلآویز بتاں گردِ عذار

لفظ چوں آبِ حیاتش زسیاہی بمثل — چوں گہر داشتہ با نور سحر در شبِ تار

. . . .

شہر آراستہ دیدیم چو فردوسِ بریں — کوثرے در تہِ او موج زناں دریا زار

مرغ داغ و بط و سرخاب در آں صحن کبود — فوج در فوج رواں گشتہ چو صفہائے سوار

راست چوں لشکرِ ترکان میانِ لبِ رود — ساحلِ آب گرفتہ سپہ بوتیمار

صحنِ او روح فزا ساحتِ او جاں پرور — خاکِ او مشک فشاں نکہتِ او عنبر سار

ظہیر فاریابی

وزیر مشرق و مغرب نصیرِ دولت و دیں — کہ با درایتِ عالیش تا ابد منصور

نشست در دل و چشم ملوک ہیبتِ او — چنانکہ صولتِ مے در طبیعتِ مخمور

نہ در حدیقۂ فکرش وزید باد غلط نہ بر صحیفۂ عزمش نشستہ گرد فتور

ز طول و عرض جلالت کمال و صدرہ مہندسان فلک معترف شدہ بقصور

زہی دقائق لطفت خفی چو جرم سہا ولیک گشتہ چو خورشید در جہاں مشہور

صریر کلک تو در کشف مشکلات جہاں چنانکہ نغمۂ داؤد را ادائے زبور

بزیر دامن افلاک خلقتاں مجمر کہ کردہ طیب افق را پر از بخار و بخور

بگرد حفظ اسلام حفظت آں خندق کہ شیر شرزہ نیابد درو مجال عبور

سوے حریم خلافت ترا ہماں آتش نمود راہ کہ اول کلیم را سوے طور

تو روے علمے کردہ کہ رایت صبح بزیر رایت او گم شود بوقت ظہور گم

ترا بحبل متین اعتصام پس چو پاک اگر گسستہ شود رشتۂ سنین و شہور

چراغ بخت تو زاں شمع بر فروختہ اند کہ آفتاب بہ پروانہ خواہد از وے نور

نہال جاہ تو زاں حوض یافتہ ست نما کہ از ترشح آں حاصل آمدہ ست بحور

فراست تو چو انگندہ نور در عالم نماند در تتق غیب ہیچ سر مستور

ہمائے ہمت تو کرگسان گردوں را بعجز و ضعف چو تیہو شمردہ بل عصفور

قطعہ

خدائگان شرق فلک قدر ملک عین الملک کہ منیر ست بدو دیدۂ اجرام و دہور

آنکہ دارد بسخا مشرب ایام بہار وانکہ دارد بہ وغا ہیبت ہنگام نشور

آنکہ از خاک درش رشک برد باغ ارم وانکہ از فیض کفش طیرہ بود موج بحور

آنکہ دارد حسبے تازہ تر از سرو چمن وانکہ دارد نسبے پاک تر از ماء طہور

آنکہ از مادر ایام نزاد دست چنو صفدرے تیغ زن نامورے جلد جسور

آنکہ از ہیبت شمشیر جہاں آشوبش لرزہ در روم کند قیصر و در چین فغفور

آنکہ از صاعقۂ گرز بلا انگیزش سنگ میداں چو سپنداں شود و کرہ دور

آنکه در چنگلِ شاهینِ شکوه سیرش
چرم عنقا بود از عجز و عنا چون عصفور

آنکه دارد ز ندبیران ازل دولت تو
تا ابد بر سر اقطاع دو عالم منشور

آنکه در فضل و خرد بیش ز ارکانِ دول
هیچ فرقانست ز تورات و ز انجیل و زبور

آن جوانبخت که در عهدِ جوانمردیِ او
قفل بر زر ننهد دست بوقتی گنجور

شهسواری که کفش در شبِ تاریک شهد
نوکِ ناوک بجهد قره در پلک دیدهٔ مور

سرفرازی که بهنگام وغا پیکانش
آتش از آب برون آرد و آهن ز صخور

گر نسیم کرمش در دهنِ مار وزد
زهر او شهد شود همچو لعابِ زنبور

کشور از سایهٔ احسانش چنانست ایمن
که بروی نوزد هیچ گهی باد حرور

من باقبال تو امروز درین کشور هند
ق
چه در ابداع قوافی چه در انشای بحور

چه کمالم به سپاهان چه عالم بهری
چون بدیع از همدان چون رضی از نیشاپور

سلمان ساوجی

شود خسرو همه با مایهٔ اقبال تو خسر
زود رستم همه با قوتِ بازوی تو زور

ای نهاده دوت قافِ شقاوت را جرم
وی سوادِ قلمت عینِ سعادت را نور

لشکری سست به لشکر تو همه زرد و شفات
کام یابند ز دوران تو همه سال ثغور

باشد از نسبتِ رایت شرفِ شمس و قمر
میرود با دلِ دستت گهر کان و بحور

نه چنان راست نهادی تو بپاهای براق
که کس از زیرِ بنان ناله کند چون طنبور

یافت ترجیح بصد مرتبه بر آبِ حیات
خاک نعل سُمِ اسپت که شرابیست طهور

رشحاتِ کفِ دستِ تو اگر بیند ابر
در سر ابر فتد پس از این بادِ غرور

هر که در دهر کشد سر ز تو چون شاخ رزان
پایمال ستمِ عصر شود چون انگور

قلبِ دین شاه فلک مرتبه محمود که اوست
بهمان سیرتِ محمود محامد مذکور

ملکی که در سایهٔ انصاف لوایت چون کبک
خنده بر بازخش میزند اکنون عصفور

رای پیرت تتق سر خدا المحرم — دل پاکت نظر لطف خدا را منظور
پایهٔ سلطنت از سایهٔ قدرت عالی — رایتِ مملکت از رایتِ رایت منصور
بوئے اخلاق تو دمساز شمالست و صبا — صیت احسانِ تو انباز جنوبست و دبور
بحر را روز عطایت نتوان گفت کریم — کوه را پیش وقارت نتوان خواند صبور
عهد اقبال ترا ملک و ملائک داعی — خط فرمان ترا چرخ و کواکب مامور
ناف مشک از اثر خلق تو یابد آهو — نیش و نوش از غضب و لطف تو دارد زنبور
(نمونهٔ تشبیب) فصل دے ماه است پیش از صبح خوان باید کشید — مے بجام و میوه ها در نقل دان باید کشید
خرگه چون مهر و ماه از دیبه باید کرد راست — خوابگاهے چون سپهر از پرنیان باید کشید
مجلس چون خلد باید ساخت در ساقی و جان — حور در بازو و کوثر در میان باید کشید
زان لب شیرین و جام تلخ و یاقوتِ روان — نوش باید کرد و یاقوتِ روان باید کشید
مطربِ خوشگوئے هم زانوئے دل باید نشاند — شاهدے چون نوش در آغوش جان باید کشید
شب نکوتر آید از قرابهٔ مے کردن بجان — زانکه مے گنج است و گنج زر نهان باید کشید
گنج زرداری زیاده گنج گم کن کز جهان — هر که گنجش هست رنج بس گران باید کشید
هر سبک روحے که دارد دل گران از روزگار — گر سبک خواهد دلش رطل گران باید کشید
وانکه در پیرانه سر دارد جوانی آرزو — بادهٔ پیرش ز ساقیِ جوان باید کشید
چرخِ ظالم پیشه خونِ عالمے بر خاک ریخت — تا کے این جور و جفایش هر زمان باید کشید
خونِ فرزندان رز را کاسمان داده ست سیر — نوش باید کرد و این کز آسمان باید کشید
در چنین مجلس که ما داریم گر آن شهسوار — خود بیاید هم بصد زاری عنان باید کشید
موے در شے او ست هندستان و طاوس از قیاس — گر تو آن خواهی ضرورت جور آن باید کشید
آن مثل نشنیده آنرا که طاوس آرزوست — ناگزیرش زحمتِ هندوستان باید کشید
پیش آن غنچه لب شیرین زبان کز شوق او — ق — ده زبان بیرون ز سوسن از دهان باید کشید

گر کشاید گل دهن گل را دهن باید شکست — ور کشد سوسن زبان او را زبان باید کشید
دل اگر بر دند خوبان جان بر سم خدمتے — در جناب صاحب صاحب قران باید کشید

نمونهٔ تغزل

آن دلبری که نوبر باغ روان توئی — نوروز روزگار ربیع زمان توئی
کوثر توئی بهشت توئی بوستان توئی — از جان چه بهتر است در آفاق آن توئی
دانم که میر مجلس شاه جهان توئی — کز جام لعل تست جهان مست و جان خراب
اے دلبری که کوے تو فردوس زهر است — خط تو باغ خلد سخن آب کوثر است
سرو سهی ست قامت تو یا صنوبر است — مهر سماست روے تو یا ماه انور است
مشک است طیب زلف تو یا عود و عنبر است — شهد ست جام لعل تو یا شیره شکر است
درج است در بیش تو یا سلک گوهر است — ماء معین است آب دهان تو یا گلاب
آنی که بر سمن به شبه مشک سوده — وز ماه عارضت خط شبگون نموده
فریاد من اگرچه که شبها شنوده — روزے به پرسش من مسکین نبوده
در حسن اگرچه صبح علم بر کشوده — بارے چو آفتاب یکے بر سرم متاب

ترکیب بند

صبح چون بنمود رخ شادی زسر باید گرفت — مجلس نو دیگر و بزمے دگر باید گرفت
ساغرے از حوض کوثر صاف تر باید کشید — دلبرے از حور عین پاکیزه تر باید گرفت
از لب شیرین شاهد نقل تر باید چشید — وز کف سیمین ساقی جام زر باید گرفت
عرصهٔ بزم صبوح از صبحدم تا چاشتگاه — گر زیادت نیست بارے این قدر باید گرفت
بلبلے کز صبح مستان را بشارت میدهد — هم برین شادی دهانش در شکر باید گرفت
ساعد ساقی اگر تیغے کشد چون آفتاب — همچو جام از جام مے مه را سپر باید گرفت
قطرهٔ کز جام مے بر خاک مجلس می چکد — نے بدست آستین کز دیده بر باید گرفت
جرم مستان را بهشیاری بدر باید شمرد — عیب یاران را ز دلداری هنر باید گرفت

اندوہ دنیا چو پایانے ندارد از قیاس — کارہا کوتاہ و غمہا مختصر باید گرفت
گر گلے بے خار میخواہی و خمرے بے خمار — بادہ بر یاد امیرے نامور باید گرفت

صفدر آفاق عین الملک کز اقبال شاہ
ہست سنجر رزم و اسکندر ظفر جمشید جاہ

ساقیا مے دہ کہ ہے ذوقے دگر دارد ہمی — بے خبر باشد زمے آں کو خبر دارد ہمی
زاں مے مشکیں کہ گوئی جام جان افزائے او — لون و لذت از گل و شہد و شکر دارد ہمی
در چنیں موسم کہ باد صبح و بستان بہار — آستیں پر مشک و دامن پر گہر دارد ہمی
خرم آں مستے کہ مے در دست و نائے در کنار — مطربے در پیش و باغے در نظر دارد ہمی
مرغ اندر تابہ زن کردست و نانے در تنور — میوہ اندر نقلداں از خشک و تر دارد ہمی
چشم بر دیدار یار و سبزہ و آب رواں — گوش بر نائے و نے و صوت و سمر دارد ہمی
بامداداں چوں برآرد بانگ زنبور از گلو — طائرے کو تاج یاقوتیں بسر دارد ہمی
مے طلب کن از نگارے کو بر زرّیں قبا — جعد او مشکیں کمندے تا کمر دارد ہمی
سرو بالا ماہ رخسارے کہ زلف عنبرش — در دل بستانے بہر موئے ہنر دارد ہمی
آنکہ چشم شوخ او گوئی بدست غمزہا — خنجر خونریز شاہ بحر و بر دارد ہمی

پشتوان دین و دولت پادشاہ شرق و غرب
آفتاب مملکت فرماں روائے شرق و غرب

(نمونۂ معارف) مجرد شو از دین و دنیا قلندر — کہ راہ حقیقی ست زیں ہر دو بہتر
جہاں چیست دانی بہ نزدیک مرداں — طلسمات ابلیس پر شور و پر شر
بظاہر عمارت بہ باطن خرابی — قبائے جہاں را نیابی تو استر
بہ خوابے است زندہ بہ آبے است قائم — چہ بر باد تکیہ! چہ بر آب پیکر
زنے بے وفائیست مکارہ گیتی — بیندیش تا چند کشتہ است شوہر

چہ سازی تو با اُو کہ باکس نہ سازد — طلاقش بانداز و بگذار و بگذر
بقاے جہاں راست آخر فنائے — پس آنگہ چہ گیرد منی اے برادر

. . . .

جمالیست پوشیدہ در پردۂ جاں — کہ محجوب از انست این دیدہ ابتر
اگر نیست گردی ز خود رُخ نماید — کہ چوں شب سر آید کند مہر سر بر
پسِ نیستی بنگری ہستیِ او — کہ ظلش گرفتست ہم بحر وہم بر
بسوداے فقر آفتابیست پنہاں — کہ سرگشتہ اوست نہ چرخ اخضر
دریں بحر فقر است دُرہاے معنی — بزن غوطہ بر آر از قعر جوہر
ہر آنکس کہ بگزید فقر اختیاری — توانگار اورا بہ معنی توانگر
گذشتند آناں کہ زیں مُلکِ فانی — جہانِ بقا شد بر ایشاں مقرر

. . . .

شرابِ طہورا چہ آشاماد آنکس — کہ خوردہ ستے از لبِ لعل دلبر
کسے کز دو عالم گدا کرد اورا — چہ دیر و چہ گنبد چہ دار و چہ منبر
عجب طائفہ در خراباتِ عشق است — نہ ملحد نہ ترسا نہ مومن نہ کافر
بہ سازند دو نرخ ز سوز دل ایشاں — در آرند شان التجا بریں گر
نخواہند حور و نخواہند غلماں — نخواہند تخت و نخواہند افسر
یکے داں یکے خواں یکے گو یکے جے — قلندر۔ قلندر۔ قلندر۔ قلندر

واقعہ نگاری۔ فکرِ تعمیر مکان کا نقشہ اور تغزل

درچنیں وقت خوش و ساعتِ میموں کہ درو ست — ہمہ آثار سعادت ہمہ انوار و سرور
من کہ دارم نفس از حسرت و ناکامی سرد — من کہ دارم جگر از آتشِ محنت محرور
خاطرے داشتم از بہر مطر سخت خراب — کہ چگونہ کنم این کلبۂ احزاں معمور

خشت نایاب و خشب نادر و احجار بعید کار تعجیل و کفم بے زر و بازو بے زور
چوں برم محنت سقار و جفائے نجّار چوں کشم زحمت رازان و بلائے مزدور
خود گرفتم نبود بابت ارباب صلاح جائگاہے کہ کند نسبت رفعت بقصور
کم ازانم کہ بود یک دو مقامے محفوظ کم ازانم کہ بود چند جدارے منظور
ہم دریں فکر بدم غرق کہ ناگاہانی اندر آمد ز در آں فتنۂ ایام و شہور
جام مے خوردہ و خوے کردہ و خواب آلودہ سر زلفینش پریشاں بر و دامن مجرور
دل ستانے کہ اگر وصف کنم خوبی او نہ عجب دارم اگر نعرہ زنند اہل قبور
دیدۂ سرو بر و ماہ چناں بودش روے دیدۂ لالہ در و مشک چناں داشت شعور
ساق و ساعد ز سمن سینہ بہ سیماب ز سیم لب و دندانش گہر بد بر و بازوش بلور
سرو بالاش سہی سنبل گیسویش تر لالہ روے طرب نرگس چشمش مخمور
شکل و شیوہ و بالا و خرام و خندہ ہمہ شیریں و ازو خاستہ در عالم شور
دو کلہ دوختہ از دیبۂ و زربفت بر آں استرے ساختہ قاقم بحواشی معمور
جعد زلفینش معنبر ز فرا میرو ز مشک جیب و دامانش معطّر ز ریاحین و بخور

قند مکرر مقالۂ ہذا کا اوّل حصہ ختم ہونے کے بعد شوق نے کلام مطہرؔ مکرر پڑھنے کا تقاضا کیا۔ اوّل سے آخر تک پڑھا۔ جو نئی باتیں ملیں حاضر ہیں۔

مزید حالات مطہرؔ صاحب اولاد تھا۔ شاہی جاگیر آخر عمر تک اُس کے قبضہ میں رہی۔ ۷۰ برس کی عمر کے بعد اُس نے درخواست کی تھی کہ جاگیر اُس کے بچّوں کے نام کر دی جائے۔ جیسا کہ قصیدہ نمبر ۲۸ سے ثابت ہوتا ہے۔ یہ قصیدہ سلطان ابوالفتح ناصر الدین محمد شاہ تغلق کی مدح میں ہے۔ جو بیٹا تھا سلطان فیروز شاہ کا (جیسا کہ اورنٹیل کالج میگزین کے فاضل مدیر کا بھی خیال ہے) اس بادشاہ کا پہلا جلوس ۷۹۰ھ میں ہوا۔ اور دوسرا ۷۹۱ھ میں۔ اس کی مدح میں صرف یہی ایک قصیدہ پیش نظر نسخے میں ہے۔ ظاہر ہے کہ درباری تعلق کے لحاظ سے تخت نشینی کے وقت قصیدہ پیش ہوا ہوگا۔ اسی وقت موقع تھا کہ جاگیر

کی بحالی اور اولاد کے نام منتقلی کی درخواست کی جائے۔ چنانچہ شاعر نے موقع سے نفع اٹھایا اور درخواست کی۔ جب یہ قرین قیاس ہے کہ یہ قصیدہ جلوس کے وقت پیش ہوا تو مظہر کے سال پیدائش کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جو تقریباً ۷۱۶ھ ہجری ہے۔ قصائد میں صرف ایک قصیدے کا جانشین فیروز شاہ کی مدح میں ہونا اس خیال کو بھی قرین قیاس کر دیتا ہے کہ مظہر تخت نشینی کے بعد زیادہ زندہ نہیں رہا ورنہ آئینِ شاہی کے مطابق اُس کو دوسرے مواقع پر بھی قصیدے پیش کرنے چاہیئے تھے۔ چنانچہ اپنے دوسرے ممدوحوں کی شان میں مختلف تقریبوں پر قصیدے لکھتا رہا ہے۔ علاوہ درمیانی بادشاہ غیاث الدین تغلق ثانی اور ابو بکر شاہ کی مدح میں قصیدہ کا نہ ہونا اس پر دلالت کرتا ہے کہ ان بادشاہوں کے مختصر عہد میں شاعر زندہ نہ تھا ورنہ قصیدہ پیش کرتا۔ ان قراین سے شاعر کا زمانہ تخمینی طور پر ۷۱۶ھ ہجری سے ۷۹۱ھ ہجری تک معین ہو جاتا ہے۔ حافظ شیرازی کی وفات ۷۹۱ھ ہجری میں ہے۔ ثابت ہوا کہ مظہر بلبل شیراز کا ہم سفر و ہم صفیر تھا۔ جس قصیدے میں مظہر نے ۷۷۰ھ ہجری لکھا ہے وہ تقریباً پچاس برس کی عمر میں لکھا ہوگا۔ ۱۹ سنہ جلوس فیروز شاہی میں جو اس عہد کے شباب کا وقت تھا۔ اس قصیدے میں ایک شعر یہ بھی ہے ؎

ابنار و اقربا و تبار و تبع ہنوز
میخواہدم بہ رنج و تعب مبتلا کند

اس سے صاف ظاہر ہے کہ علاوہ اولاد کے مظہر کا پورا کنبہ ہندوستان میں موجود تھا۔ اس صورت میں یہ کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے کہ "مظہر ایران سے آیا تھا"۔

پہلے حصہ مقالہ میں ایک شعر لکھا جا چکا ہے جس میں اُس نے اپنے والد کے متعلق لکھا ہے کہ وہ بھی دربار شاہی کا مداح اور دعا گو تھا۔ ایک اور شعر لکھا جا چکا ہے جس میں اُس نے اپنے خویش و اقارب و متعلقین کا شمار ایک ہزار لکھا ہے یہ مزید ثبوت مُظہر کے ہندوستانی ہونے کا ہے۔

اب قصیدے کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

من ہم چو دیدم اینکہ چو ہفتاد و سہ گذشت
عمر و فلک بد نیست کہ پشتم دوتا کند

ابناء و اقربا و تبار د تبع ہنوز — میخواہدم برنج و تعب مبتلا کند

در خواستم ز شاہ چو دیہے کہ شہ مرا — داد ایں عطا بمرحمت اولاد را کند

تا ہر کسے بحصۂ خود زستتے برد — و ز وجہ ایں معاشِ خود و اقربا کند

وین خستہ با فراغ نشیند بگوشۂ — حمد خدا ے گوید و شہ را دعا کند

سلطانِ شرق و غرب محمد شہ آنکہ او — جہد و جہاد بر صفتِ مصطفیٰ کند

بو الفتح شاہ ناصر دنیا و دین کہ او — تائید ملک و ملت و دین و دنا کند

اس قصیدے کی تشبیب میں حوائج زندگی کی تفصیل کرتا ہی جس سے آج سے سات سو برس پہلے کے تمدن پر روشنی پڑتی ہی۔ آخر عمر میں درویشانہ زندگی کے تین درجے قائم کرکے اور دو اعلیٰ اور ادسط مرتبوں کا ذکر کرنے کے بعد لکھتا ہی:- مطلع قصیدہ ہی ؎

ہر دم چو پیر شد خرد ایں اقتضا کند
کارِ فضول ترک و رعونت رہا کند

. . . .

ادناش آں بود کہ بآئین صالحاں — در کنج عافیت بہ قناعت بقا کند

دارد بگردِ خود درمے چند از حلال — تا حاجتش بقدرِ کفایت قضا کند

وز بہر آں کہ رنج و ریاضت ستودہ نیست — پیرِ ضعیف را کہ خلل در قوا کند

ناچار بر طریقتِ حکمت بقدرِ وسع — اصلاحِ حالِ خانہ لباس و غذا کند

محفوظ خانہ ایش بباید ز خشت و سنگ — کایمن ز باد و آتش و باراں را کند

وز درد امتی دہد و گربہ و سگے — نتواند از پرندش کہ قصدِ سرا کند

یک حجرہ و صفہ و یک جا میزرش[۲] — یک مطبخے کہ منقسمش چار جا کند

یک گوشہ لند[۱] ویش و یکے گوشہ ہیزمش — یک گوشہ دیگداں و یکے آسیا کند

---

[۱] خم کلاں از گِل کہ در آں غلہ نہند ۱۲ [۲] میزر تہبند، چادر، شلوار وغیرہ مراد از جملہ سامانِ لباس ۱۲

واینچ از متاعِ خانہ و اسباب حائلش — خرد و لطیف و مختصر و دیر پا کند
طشتے و آفتابہ و شمعے و کرسیش — زیلوچۂ[1] و حصیر دیے پلنگیہا کند
یک صحن و یک سکورہ یکے کاسہ یک قدح — یا یک طبقچۂ[2] ز شفاف خطا کند
یک تابہ و دیگ سنگی کہ اندرو — گہہ رشتہ گہہ برنج و گہے شوربا کند
فرتود تختہ و طغارے و کفچہ — یا تنگ[3] بیز و چمچہ کزو اعتنا کند
دستاک خرد و ہاون و سنگ و صلایہ — حمنے و حجلہ کہ ازو استقا کند
صندوقے از برائے کتب طب[4] بہر ثوب — واینچ اقتضاء جنس ادام انا کند
وانگہ چو فرد خانۂ حکمت تمام شد — بر صورتے کہ جملہ حوائج روا کند
اصلاحِ حال قوت و غذائے کہ در خور است — بر راہ و رسم مطبخ دار[4] الشفا کند
ہرچہ از غذا بہ وزن قلیل و قوی کثیر — از وے تنا و لے بگہہِ اشتہا کند
در چاشتگاہ قلیہ برنجے و روغنے — با ترشئے کہ معتدل آید غذا کند
در شامگاہ نانے و آشے ز آب گوشت — پاکیزہ و لطیف غذا در عشا کند
تا در دل و دماغ و جگر قوتے دہد — وندر تنش بدایت و نشو و نما کند
و ز سیخ و سغد[5] و سریاں کباب و کشک[6] — با دیخن و پنیر و قدید[8] احتما کند
در گوئی از لباس چہ حاجت بود و را — کال البعید و جبہ و جمع اکتسا کند
یک جبہ و یکے فرجے و یکے دو تائے — کز صوف وار کی و شامی عبا کند
با شملۂ حجازی و مصری عمامۂ — قرنے بس است عمرِ عزیز ار وفا کند

ممدوح حسام الملک کی جاگیر شاہی کی آمدنی چھ لاکھ اشرفی ہے

بود شش خراج سال ز دیوان بادشاہ — شش صد ہزار تنکۂ سرخ از زرِ عیار

---

۱ زیلو - گلیم ۱۲ ۲ نوعے از حلوہ ۱۲ ۳ نوعے از غربال ۱۲ ۴ دارالشفا کی غذاؤں کی تفصیل خصوصاً سبق آموز ہے ۱۲ ۵ سغد و چرب زدہ ۱۲ ۶ کشک قسمے از ہریسہ کہ از گندم یا جو و شیر گوسپند راست کنند ۱۲ ۷ مراد از ظرفے برائے آب ۱۲ ۸ خشک گوشت ۱۲

ایک اور موقع سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کا اصل مشغلہ علم کی خدمت تھی اور درباداری و شاعری ضرورۃً تھی چنانچہ قصیدہ نمبر ۲۳ میں کہتا ہے ؎

عشقِ من کنج و کتابے بد و تحفہ و مال را — میل بر مدح و ندیمی و ملاقات حضور
گر مراعات کنم علم و عمل راست خلل — ور رعایت نہ کنم دیدہ و درم راست فتور

قصیدہ نمبر ۳ مولٰنا جلال الدین رومی کی مدح میں ہے۔ اُس کا ایک شعر ہے ؎

مصابیح و مشارق را چناں مستحضر الباب ست
کہ گوئی از زبانِ مصطفٰے کردہ است اصغا را

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس عہد میں کمال حدیث مصابیح و مشارق کا استحضار تھا۔
ٹھٹھ کی فتح کے سلسلے میں وہاں کے دو راجاؤں کا ذکر کرتا ہے۔ ایک راؤ تماچی دوسرا راؤ جام۔ خود ٹھٹھ کو جزیرہ کہتا ہے ؎

ٹھٹھ کہ آں جزیرہ بلائیست پر کہت
دریاش یک طرف و پنج آب یک طرف

تخلص :- علاوہ مذکورالسابق اشعار کے مطہر کا تخلص متعدد جگہ اور ملتا ہے۔ ملاحظہ ہو قصیدہ نمبر ۱۷ "اے مطہر سخن دراز مکن"۔ قصیدہ نمبر ۲۴ "و ز زبان مطہر مسکیں"۔
ترکیب بند نمبر ۱۰ ؎ بندۂ کمتر مطہر را بمدح آستانت
فیض خاقانی و ذہن انوری پیوستہ باد
قصیدہ نمبر ۱۴ ؎ مطہر در ثنا خوانی چو دُر افشاندست درپایت۔
ان تمام اشعار میں مطہر صاف لکھا ہوا ہے۔ مطہر کے ایک قصیدے کے دو شعر ہیں ؎

بہ ہندستاں سفر بسیار کردم ہر سوئے لیکن — ہوس دارم کہ یک چندے بہ بینم ملک بالا را
در آیم از حجاز اندر یمن زانجا سوئے مکہ — بہ بینم مر صفا و مروہ و عرفات و بطحا را

ان اشعار سے اُس کے ایرانی ہونے اور مشتاق ایران ہونے کا استدلال معلوم نہیں کس طرح

ہو سکتا ہی۔ قصیدے میں ایران یا خراسان کا مطلق ذکر نہیں ہی جس سے طرفِ بالا کا اشارہ ہو۔ یہاں بالا کا لفظ بلحاظ شہرت استعمال ہونا قرین قیاس ہی جس کی تشریح دوسرے شعر میں ہی۔ ایک بات اور قابل لحاظ ہی۔ کیا مطہر کو معلوم نہ تھا کہ مکہ حجاز میں ہی۔ اگر علم تھا تو پھر حجاز سے یمن جانے اور وہاں سے مکہ جانے کی تمنا کس بنیاد پر تھی۔ "حجاز" "جہاز" کی جگہ تو نہیں لکھا گیا ہی۔

کلام کے مختلف اسالیب | (۱) ملاقات احباب کا اشتیاق ؎

نبود عجب از بہرِ ملاقاتِ عزیزاں — گر موے شود بر تنِ مشتاق چو پرہا

مُوئے بدن سے زبان کا تو کام لیا گیا تھا ع۔ "اگر ہر موے من گردد زبانے"۔ لیکن پر کا کام غالباً مطہر ہی نے لیا ہی اور بمقابلہ زبان کے زیادہ موزوں ہی۔ دیکھو پر کو بال و پر بھی کہتے ہیں۔

(۲) مبالغہ کس قدر لطیف ہے ؎

(۱) قلم کہ خطِ غبار آں چناں نبشتی است — کہ سطر در تو موے ہی بود اخفا

(۲) چشم روشن کہ پاے مور بدیدے — بشب تیرہ در چہ ظلمانی

ایں زماں اشترے بہ بارنہ بیند — بر بلندی اگر (تو؟) بروانی

(۳) **تشبیہ دہن و زلف**

اے پر ورقِ گل زشکر ساختہ میمے — وز مشک برآوردہ بکافور دو جیمے

(۴) تعریف اسپ | از اسپ بے قرار قرار ست ملک را — نبود قرار ملک چو گیرد قرار اسپ

شعر بالا اس عہد کی زندگی کی سچی تصویر ہے۔

؎ اول زپائگاہ ہزار اسپ بادپاے — ہر یک زتازیانِ براق اصل برق سار

مہ روے خُرد موے و سیہ چشم و تیز جسم — خوش گام و خوش لگام و سُبک سیر و راہوار

اسی سلسلے میں ترکستان اور ہندوستان کا فرق ؎

در ترک اسپ بے حد و در ہند آدمی — زیں جا فرست بردہ[۱] وز آنجا بیار اسپ

؎۱ تقدیر ہی میں غلامی ہے ۱۲

طلب اسپ | دارم امید آنکه رکابی خویش را — بخشی ز راہ لطف یکے راہوار اسپ

تعریفِ اسپ میں دوسری جگہ کہتا ہے ؎

پرندہ ہمچو دُخاں و روندہ ہمچوں سیل — جہندہ ہمچو درخش و دوندہ ہمچو سحاب

سپید روے و سیہ چشم و برافراختہ پیش — بلند بارگہ و نرم پوست و سخت اعصاب

بخاک بادیہ پروردہ۔ آتش آہنگے — کز آب و کاہ کفایت کند بباد و سراب

ہماں بدست کہ بر پشتِ او نشستم راست — بہ جست تند چنانک از کمان جہد نشاب

ہمی دوید بہ ہاموں ہمی گزشت بہ کوہ — ہمی نوشت بیاباں ہمیں بُرید خصاب

گہے بگام چو شیر و گہے بپویہ چو گُرگ — گہے بہ تگ چو غزالے کہ بگزرد بہ غاب

(۵) محبت مطلوب

تو مرا باش کہ تا ہر دو جہانم باشد — بے توام گنج دُر و تودۂ زر حاجت نیست

(۶) تشبیہ طلوع صبح کاذب

نگر کہ صبح نخستیں نمود رایت خویش — بسانِ نیمۂ خنجر کہ برکشی ز قراب

(۷) تعریف خنجر

ونگہ ہزارہ خنجر خونریز مشرقی — ہر یک بسان صارم و صمصام و ذوالفقار

سوزندہ تر ز عشق و فروزندہ تر ز عقل — تابندہ تر ز نور و شتابندہ تر ز نار

ہم پشت او چو ماہی و ہم رخے او چو ماہ — ہم گوہرش چو مور و چہ ہم پیکرش چو مار

(۸) تشبیہ ساغر

بر سر دستہا چہ باز سپید
ساغر بادہ را سوار کنید

(۹) تشبیہ طلوع صبح

دیدم نشان صبح ز گردون تیرہ رنگ — چوں بر حصارِ سنگ سیہ برج مرمرے

یا تودۂ سپید ز کافور ساختہ — بر ساختے سیاہ ز یاکیزہ عنبرے

بابِ هفتم ۱۲

نظم و نثر ۱۲

یا بر قیاس آنکہ کشاید کسے نگاہ — سیمیں دریچۂ ز سر تیرہ منظرے
گفتم مگر کہ بانگِ نماز مؤذناں — بکشاد از براے دعا از آسماں درے
یا در میانِ جنتِ فردوس جانفزاے — افگندہ جبرئیلؑ شعاعے ز شہپرے
ہردم میان صبح و شب از تیغ آفتاب — می رفتہ نیزہ جنگی و خونریز خنجرے
گفتی مگر کہ بر سرِ صحراے نیلگوں — زد بر سپاہِ زنگ ز سقلاب لشکرے
یا خود سوادِ ملکت ہندوستاں تمام — بگرفت از مواکب اسلام محشرے

(۱۰) فلسفۂ محنت | خاطر آسودہ کن کہ یک شادی — بے غمِ بے شمار نتواں یافت
ہیچ مُل بے خمار نتواں خورد — ہیچ گل بے زخار نتواں یافت
بے زخوناب دیدہ از دلِ جگر — نو لوے شاہوار نتواں یافت
روشن است ایں کہ آبِ حیواں را — بے بیابانِ تار نتواں یافت
تا نہ بینی بلاے بے آبی — لذت از جوئبار نتواں یافت
تا نہ سوزی وجود از محنت — بوے مشکِ تتار نتواں یافت

ان اشعار میں "بے زخار" اور "بے زخوناب" کی ترکیب قابل لحاظ ہے۔

(۱۱) مقصود کی بلندی۔

مرا با مال حرصے نیست من اعمال میخواہم — مرا با خلد کارے نیست من دیدار میخواہم

(۱۲) فلسفہ آسائش | اے کہ آسایشے ہمی طلبی — زحمتے اختیار باید کرد
گنج خواہی ز رنج ناچار یست — صید خواہی شکار باید کرد
عافیت در جہاں اگر جوئی — ترک حرص و نقار باید کرد
ہرچہ یابی ز اندک و بسیار — ہم بداں اختصار باید کرد
ہیچ از یں گفت و گوے نکشاید — اصل کار استوار باید کرد

رومال | گر شد رومالِ میخواراں مصلّاے کہ من دارم۔

مشکل طرحیں

مظہر نے اکثر طرحیں شگفتہ اور صاف انتخاب کی ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ ایک سے زیادہ قصیدوں میں مشکل طرحوں کو بھی لیا ہے۔ وہاں بھی بیان کی روانی و شگفتگی قائم ہے۔

ایک قصیدے کی ردیف ہے "اسپ" قافیہ ہے "قرار" "رہوار" ملاحظہ ہو ؎

تا آفرید بہر غزا کردگار اسپ — شد بر جمیع جانوران شہریار اسپ
سوگند خورد حق بشیم اسپ غازیاں — بنگر کہ در چہ پایہ رسانید کار اسپ

. . . .

مردانہ راست یار دوم ور نبرد رخش — فرزانہ راست پاسے سیم در فرار اسپ
مرکب عزیز دار کہ دارد عشیرہ تر — از جان خویش مرد دم خنجر گذار اسپ

تصرّف

بعض جگہ جوشِ بیان میں تصرف کر جاتا ہے۔ ایک شعر ہے ؎

ز مدح و ذم بکراین کاتبین مانیم — کہ نیک و بد ہمہ در طی نامہ بنگاریم

کراما کی جمع کراین خاصہ تصرف ہے۔

مرثیے

مظہر نے مرثیے بھی لکھے ہیں۔ دو مرثیے اس مجموعہ میں ہیں۔ ایک قصیدہ نمبر ۴۶۔ کس کا مرثیہ ہے؟ اس کا پتہ نہیں چلتا۔ مطلع ہے ؎

ز دورِ محنت این سپہر زنگاری
کدام دل کہ نہ خوں گشت از جگر خواری

حسنِ مطلع ؎

کجا بجام طرب مجلسے بنا کردند
کہ از سپہر نبارید سنگ قہاری

یہ وہی مرثیہ ہے جس کو حضرت "شیخ دہلوی" نے حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی کا مرثیہ لکھا ہے شیخ نے جو اشعار نقل کئے ہیں اُن میں یہ شعر بھی ہے ؎

جہاں بماتم خواجہ نصیر دین محمود
ہزار گونہ فغاں کرد و نوحہ و زاری

یہ شعر اس مجموعہ کے قصیدے میں نہیں ہے۔ ممکن ہے کچھ اشعار کاتب کے قلم سے ساقط ہو گئے ہوں۔ مگر ایک مشکل ہے قصیدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو صاحبوں کا مرثیہ ہے۔ تمہیدی چار شعروں کے بعد یہ شعر آتا ہے ؎

بقیۂ سلفِ سادہ یادگارِ کرام | کہ کرد ختم خلافت بہ سالکِ دینداری

(قرینِ قیاس ہے کہ بیچ میں کچھ اشعار چھوٹے ہیں جن میں مرثیے کے ہیرو کا نام آیا ہوگا) اسی طرح چار شعروں میں صفتِ مرحوم بیان کر کے کہتا ہے ؎

دو بودہ اند یکے آفتاب و دیگر ماہ | کہ فیضِ رحمتِ شاں بود روز و شب جاری
چہ اوفتاد ندانم کنوں چہ روز آمد | کہ شد ز روشنیِ ہر دو۔ روز و شب تاری

اسی طرح دونوں مرحوموں کے واسطے آخر تک ماتم کرتا گیا ہے۔ دعا میں کہتا ہے ؎

برحمتِ تو کہ عام است در جہاں بانی | بہ عزتِ تو کہ خاص است در جہانداری
کہ روحِ اعظمِ آں ہر دو پیشوائے کرام | کہ مقتدائے جہاں بودہ اند ز اختیاری

اشکال یہ پیش آتا ہے کہ اگر حضرت شیخ چراغ دہلی مطہر کے پیر تھے تو موصوف کا مرثیہ دوسرے بزرگ کے ساتھ ملا کر لکھنا اور دعا وغیرہ میں دونوں کو مساوی رکھنا آدابِ مریدی کے کہاں تک موافق ہوگا؟ ظاہر ہے کہ خلاف ہوگا!

دوسرا مرثیہ قصیدہ نمبر ۷ ہے۔ یہ مولانا شمس الدین کے ماتم میں ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

ایں چرخِ تیرہ رنگ کہ بحریست پُر حباب | ہر دم کند بہ سیلِ اجل خانۂ خراب
ہر لحظہ بادِ ساحلِ او زیں شگفتہ باغ | سروے بَرَد ز بیخ و چراغے برد ز تاب
مانند بہ آسیائے و ما درمیانِ او | چوں دانہا کہ سودہ شود زیرِ آسیاب

. . . .

آفت بہ دہر چیست کہ شد دہر بس حزیں | غوغا بہ شہر چیست کہ شد شہر بس مصاب
دلہا چرا شدہ است ہمہ چاک بے سلاح | سرہا چرا شدہ است ہمہ پُر ز خاک ہم خراب
گریاں چراست اہلِ زمیں ہر کہ خاص و عام | نالاں چراست خلق ہمہ ہر کہ شیخ و شاب

گوئی مگر کہ قبلۂ آفاق شد نہاں — دانم مگر کہ کعبۂ حاجات شد خراب
یعنی نماند خدمتِ شمس دُنا و دیں — صدر الشیوخ خواجگی آں خواجہ مستطاب
آں ملجاء ممالک و آں منجار ملوک — آں عمدۂ خلافت و آں زبدۂ مناب
آں خاصۂ خدائے کہ رشحۂ مبارکش — بودے دلیل رحمت و آثار فتح باب

گریز کی ندرت

مطلع ہے ؎

ساقی بیار جام مئے سُرخ زاں بُوے — مشکیں چو تابِ صبح و مصفا چو آب جوے

آگے اشعار میں شراب کی تعریف کرتے کرتے کہتا ہو۔

تیز است و تلخ و مردِ شکار و گہرنما — مانند خنجرِ ملک الشرق نامجوے

تغزّل

اس مجموعہ میں مطہر کی کوئی غزل نہیں ہو مگر بہت سے اشعار ایسے ہیں جو عمدہ غزل کے شعر ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ترکیب بند نمبر ۲ کا بند چہارم فارسی نادر غزل کے ہم پہلو رکھا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

کارم از دست رفت ساماں چیست — دردم از حد گزشت درماں چیست
خشت بد نامیم ز بام افتاد — راز در دل ہنوز پنہاں چیست
محتسب گشت و کس نمی پرسد — کہ بگو جرم ایں مسلماں چیست
از من آں شوخ را بگو اے دوست — کیں ہمہ کینہ با محباں چیست
گر تو یوسف شدی ز زیبائی — دلِ من در چہِ زنخداں چیست
ور تو عیدی رخت مبارک باد — سیلے زدی در غمم تو قرباں چیست
(۷) ور نشینی بر آں کہ خوں ریزی — اینک استادہ ایم فرماں چیست
گہ زنی نیشم و گہ دہی نوشم — اگر ایں لطف می کنی آں چیست
ور تو چوں شمع جمع روشن شد — با من ایں گفتنِ پریشاں چیست
من دعا گوے حضرتم آرے — کارِ من جز دعاے سلطاں چیست

شعر نمبر ۵ سے امیر خسرو اور سعدی شیرازی کا رنگ صاف جھلکتا ہے۔

سحر حلال

اکنوں کہ ہوا معتدل و آب مصفاست	وز سبزہ ہمہ روے زمیں سبز چو دیباست
در دامن آفاق نہ گرد و نہ غبار ست	در خلقت ایام نہ گرما و نہ سرماست
ہر سو کہ کنی رخ چمن و آب روانست	ہر جا کہ نہی پاے گل و سبزۂ صحراست
در دست ہوا حقّۂ کافور و عبیر ست	در جیب صبا نکہت عنبر سارا ست
حاصل شدہ از روے زمیں ہر چہ مراد ست	واصل شدہ از دور زماں ہر چہ تمناست
ہنگام مے و مجلس و معشوق و مغنّی است	و ایام نشاط و طرب و عیش و تماشاست
تاخیر مکن ہیچ در آرایش مجلس	کاصحاب طرب حاضر و اسباب مہیّاست
اینک دہل و دفّ و مے و چنگ و چغانہ	و اینک غزل و نقل و گل و ساغر و صہباست
خوباں ہمہ مہ رخ و حریفاں ہمہ خوش خوے	ساقی و مغنّی طرب انگیز و دل آراست
بر سبزۂ سیراب فلک لعل بساطے	وز دیبۂ زربفت بہ یاقوت محشّاست
برخیز بہ شادی کہ گہ نوش و نشاط ست	بنشیں بہ تنعّم کہ گہ نزہت و نعماست
و آہنگ بہ مے کن کہ مہ روشن چاشش	تابندہ تر از چشمۂ خورشید بجوزاست
وز دست بت شنگ کہ از شکل و شمائل	دلبند و دلاویز و دل آرام و دل افزاست
آں ماہ پری روے کہ قرطش و حمائل	بر دوش و بناگوش چو جوزا و ثریاست
شمشاد بہ گیسو و سمن در بر و بازو ست	گلنار بہ رخسار و سہی سرو بہ بالاست
ہر سو کہ رود آفت آفاق در آنسو ست	ہر جا کہ بود فتنۂ عشاق در آنجاست
نقل از لب شیرینش و شراب از لب ساغر	میخواہ کہ ہمشیرۂ مے شیرۂ خرماست
ایں حاصل ایام حیاتست کہ گفتم	وز اعظم لذات کہ در عمر موفاست
دیگر غم و اندوہ جہانست فراواں	خوش وقت کسے کز غم و اندوہ مبراست
قانع بہ قرینہ شدہ خرسند بہ قوتے	نے در غم امروز نہ اندیشۂ فرداست

فارغ دل و فرخنده چنانست که گوئی — منجملهٔ اصحاب یمین و صفدر و والاست

والا ملک الشرق حسام دول و دین — کار استه بفر ملک العرش تعالاست

۲

روز شادی و خوشی وقت سماع و طربست — نوبت نوش و نشاط ست و گه نشو و نماست

گر کسے را سخنے در مے و مطرب باشد — بارے امروز درین حال که ایّام و راست

مطربا نغمه بر آور که اوان طرب است — ساقیا باده بیاور که زمان صهباست

باده بر یاد ملک ده که باقبال ملک — بزم فردوس و قدح کوثر و ساقی حوراست

ملک الشرق فلک قدر ملک عین الملک — کافتاب کرم و سایهٔ الطاف خداست

۳

هر کرا شمع توئی نور قمر حاجت نیست — زلف مشکیں ترا عنبر تر حاجت نیست

خسته کز لب شیریں تو یابد رشحے — شربتے دیگرش از قند و شکر حاجت نیست

عید نوروز جهاں طلعت زیبات خوش است — زینت صبحدم و منت خور حاجت نیست

با رخ و زلف دلبا گوشش قدت مردم را — باغ و بستان و ریاحین و شجر حاجت نیست

چشم خونریز ترا غمزه پسندست سلاح — تیغ و رمحے و گرز و تیر و تبر حاجت نیست

درج دندان تو در درج عقیقین بنهانست — بس بود زینت تو لعل و گهر حاجت نیست

خواجه را نیز پئے ضبط جهاں رائے منیر — کافی آمد و جیش و حشم حاجت نیست

صدر آفاق و زماں قطب جهاں نجیب الدین — که معالیش پدیدست خبر حاجت نیست

ترکیب بند

زمستانست و باد سرد از کهسار می آید — بگرداں آتشیں جامے که آتش کار می آید

فرو کن پردهٔ خرگاه و چنگ آهسته تر می زن — که هر چه آهسته می گیری تو آنها زار می آید

بده در جام کافوری شرابے زعفران گونه — که از بویش نسیم نافهٔ تاتار می آید

غلام آں می لعلم که چوں بر دست میگیرم — بوئے او سر و دم از در و دیوار می آید

۱۱ قصیده

مریز آں جرعہ بر گل کہ چوں زخاک انگیزند — تو از آسماں ہمی دانی مراد شوار می آید

سبو بر سر گرفتن کار رندانست قلاشاں — مرا فرمائے ایں خدمت ترا گر عار می آید

نشاط مے غنیمت داں کہ جمع شادمانیہا — اگرچہ اندک بود بعد از غم بسیار می آید

ندانم محتسب از من چہ میخواہد کہ ہر بارے — بقصد من دواں تا خانہ خمار می آید

ہمی خواہم کہ یک رندے کنم وحشت دلے شہرم — ازاں ریش سپید و گوشہ و دستار می آید

ملک را قصہ خواہم داد در دستے زجفاے او — کہ شورے می فتد آندم کہ در بازار می آید

جہان جود عین الملک والا رستم ثانی
کہ رشک حاتم طائی ست در غم معن شیبانی

(دیگر)

روز شد پردہ ز خرگاہ شبا بر دارید — بادہ در ساغر ریزید و نوا بر دارید

تازہ جشنی ز جہاں تا بجہان است کنید — بس سماعی ز زمیں تا بہ سما بر دارید

بہ نے و بربط و طنبورہ نوا بر دارید — وز دف و نائی و دہل شور صدا بر دارید

ہم بیک زلزلہ و زمزمہ چوں نفخۂ صور — گرد اندوہ و غم از سینۂ ما بر دارید

ہر کہ دارد سر اندوہ ازیں مجلس سور — دست گیرید و را بہر خدا بر دارید

جامے از صدق و صفا بر کف اصحاب نہید — وز دل شاں ہمہ تزویر و ریا بر دارید

قصیدہ نمبر ۲۵ کی تشبیب دیکھو۔ قاآنی کا رنگ صاف جھلک رہا ہے ؎

ابلا و نعم علیمی اے یاد نو بہاری — کز دم عبیر بیزی و ز بوے مشکباری

گلدستۂ جنانی یا شاخ ارغوانی — یا غالیہ یمانی یا نافۂ تتاری

عیسیٰ نہ و در دل صد جان تست حاصل — مانی نہ و بہ گل صد نقش می نگاری

چوں جنیاں نہ پیدا پنہاں رخی و پیدا — چوں عاشقان شیدا نہ ہوش و بیقراری

نقاش سطح آبی فراش پرخیالی — لشکرکش سحابی فرماندہ بخاری

حور و پری سرشتی رضواں باغ و کشتی ‏— دلجوئی چوں بہشتی خوشبوے چوں بہاری

ادریس ہمدانی قیس راہبانی ‏— برجیس بوستانی بلقیس لالہ زاری

ہر صبح چوں طبیباں آئی بر حبیباں ‏— وز مسکن غریباں شبہا خبر تو داری

پیک جہاں نوردی سیاح بادہ گردی ‏— ہر جا کہ عزم کردی گوئی در آں دیاری

امروز با مداداں مست آمدی و شاداں ‏— خرم چہ طبع راداں خوش چوں دل حواری

مشک و عبیر بیزاں گلگیر گل لالہ ریزاں ‏— افتاں زشوق و خیزاں چوں ہم دم خماری

آخر الکلام مظہر کا کلام متانت و بلندی میں معاصرین کے برابر ہی۔ قوتِ مشاہدہ اور قدرتِ بیان، شگفتگی و روانی میں اُن سے بہت بڑھا ہوا ہی۔ میرا خیال ہی کہ اگر مظہر کا کلام رائج و مقبول ہو گیا ہوتا تو ایک سے زیادہ اس کے معاصرین بزم سخن میں وہ مرتبہ بلند نہ پا سکتے جو آج اُن کو حاصل ہے۔

(در رسالہ معارف اعظم گڑھ بابتہ ماہ ہاے جولائی و اگست ۱۹۳۵ء)

آئینۂ سکندری

(ریویو)

بابو ماشنکر صاحب دہلوی نے پچھلے سال انگلینڈ کا سفر کیا تھا اس سال اُن کا سفرنامہ شائع ہوا ہی۔ ہم کو بابو صاحب کے حالات سے سوائے اس سفرنامہ سے دریافت شدہ حالات کے بالکل واقفیت نہ تھی۔ اس سفرنامہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ بابو صاحب ایک لایق انگریزی داں خوش طبع ہوشیار شاعرانہ خیالات کے جنٹلمین ہیں۔ اس سفرنامے کی زبان خوب دلچسپ ہی اور یہ اہتمام کیا گیا ہی کہ جو اجنبی الفاظ انگریزی استعمال کیے گئے ہیں اُن کی تشریح کر دی گئی ہی۔ یہ سفرنامہ دلچسپ واقعات سے مالامال

ہے۔ اور انتخاب کر کے وہ واقعات درج کئے گئے ہیں جن کے دیکھنے سے ہندوستانیوں کو عبرت اور غیرت دونوں حاصل ہوں۔ اس سفرنامہ کے دو حصے ہیں۔ پہلے میں تو سفر کے واقعات عمارت وغیرہ کا مذکور ہے۔ دوسرے حصہ میں خاص کر انڈین اور کالونیل ایگزبشن کا ذکر ہے اور کچھ تھوڑے سے حصہ میں اُن رقعوں کا حال ہے جو مصنف کے پاس نوتہ کے طور پر جلسوں میں شریک ہونے کے لئے آئے تھے۔ بعد اس فہرست کے چند جلسوں کا بیان ہے۔ ۱۸ و ۱۹ صفحہ پر ایک واقعہ کا ذکر ہے جو مصنف کو اس وجہ سے پیش آیا تھا کہ وہ فرنچ نہیں سمجھتے تھے اور انگریزی سے کام بہ دقّت تمام نکلا۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ یورپ کا سفر کرنا چاہتے ہیں اُن کو فرنچ سیکھنا بھی ضروری ہے۔ لندن کے حالات میں چارنگ کراس اور ہائڈ پارک کے حالات پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ وہ شخص ہے کہ الامان! مصنف کی یہ رائے نہایت صائب ہے کہ "میری خواہش ہے کہ میرے اس بیان سے آپ بخوبی سمجھ جائیں کہ جو ان ہندوستانیوں کو (جو برسوں سے تحصیل علوم کے لئے یہاں ہیں یا بہت سے امتحانات وغیرہ دینے کے لئے آئیں گے) اُن کا بہت سے موقعوں پر امتحان کیا جائے گا"

اس سفرنامہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یورپ میں وہ صفت جس کو ہم ایشیائی بے حیائی اور بے شرمی سے تعبیر کرتے ہیں نہایت کثرت سے پائی جاتی ہے۔ جہاں علوم نے اہل یورپ کو دنیا کی قوموں کا سرتاج خزائن فطرت کا مالک بنا دیا ہے وہاں اُن علوم کی بدولت مذکورہ بالا صفتوں میں بھی وہ صفائی اور تراشش خراش ہوئی ہے کہ حیرت ہوتی ہے، اگر بنظر انصاف دیکھا جائے تو ہندوستان کے وہ شہر جو اس معاملہ میں بدنام ہیں بے حیائی میں عشر عشیر بھی اُس درجہ پر نہیں پہنچتے جس درجہ میں لندن سے شائستہ شہر میں یہ صفتِ مذموم پائی جاتی ہے۔ بھلا ہندوستان میں یہ کہاں ہے کہ ہوٹل میں جا کر ایک اجنبی آدمی بیٹھے اور نوجوان حسین عورت خود اپنی زبان سے اپنے حسن اپنے بناؤ سنگار کی تعریف کر کے اس اجنبی کو اپنی طرف مائل کرے اور پھر ایسی سر ہو کہ کپڑے چھٹانا مشکل ہو جائیں یا بو صاحب لکھتے ہیں کہ اگر کوئی جنٹلمین وہاں کی اعلیٰ درجہ کی لیڈیوں کے جوبن اُن کے حسن اُن کے بناؤ کی خود اُن سے یا اُن کے بزرگوں سے تعریف کرے تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ بے حیائی یورپ کے چال

چلن پر ایک بہت بڑا داغ ہی مگر اُس کے ساتھ ہی ہوس آف پارلیمنٹ، ویسٹ منسٹر ابے اور اور بہت سی عمارتوں کے حالات پڑھ کر اُن لوگوں کے علوم کی کثرت، فنون کی افراط، صنعت و دولت کے حالات دیکھ کر شرم آجاتی ہی اور بے اختیار یہ کہنے کو جی چاہتا ہی کہ اگر اُن میں صرف ایک عیب بے حیائی ہی تو ہم میں صدہا عیوب کاہلی، سستی، غلامی، خوشامد وغیرہ وغیرہ بھرے ہوئے ہیں۔ حق یہ ہی کہ یورپ کے حالات دیکھ کر خدا یاد آتا ہی اور یہ خیال پیدا ہوتا ہی کہ آیا ہم بھی انسان ہیں یا نہیں! کیا اہلِ یورپ کے وہی دل و دماغ ہیں جو ہمارے ہیں؟ آیا اُن میں وہی صفات ودیعت رکھے گئے ہیں جو ہم میں ہیں؟ اُس وقت دل کو سخت پیچ و تاب ہوتا ہی کہ اہلِ یورپ بھی ہیں جو ہم ہیں۔ فطرت نے جس فیاضی سے اُن میں صفات ودیعت رکھے ہیں اُسی کشادہ دلی سے ہم کو بھی عطا فرمائے ہیں۔ مگر فرق صرف اتنا ہے کہ وہ اُن صفات سے کام لیتے ہیں اور ہم اُن کو تلف کرتے ہیں۔ صفحہ ۶۴ و ۶۵ میں مصنف نے انگریزی نظم کا جو ایک نوجوان حسین عورت نے گائی تھی فارسی میں خوب ترجمہ کیا ہی اور اُس وقت عجیب لطف آتا ہی جب ایک نظر انگریزی نظم کا شعر دیکھا جائے اور پھر فارسی نظم اُس کے ترجمہ کا شعر۔ صفحہ ۷۲ کا واقعہ بھی عجیب موثر ہی۔ لکھا ہی کہ میں ایک جگہ راستہ بھول گیا ایک شخص سے جو میلے کچیلے کپڑے پہنے کھڑا تھا اُس نے نہ صرف راستہ بتایا بلکہ خود جاکر منزل مقصود پر پہنچا آیا اور جب بابو صاحب نے اُس کو کچھ انعام میں دئیے تو اُس نے کیا بلا کے الفاظ کہے جو دل کے اُس طرف جاکر چھدتے ہیں۔ "آپ ہندوستانی ہیں اور ہندوستان کا دارو مدار انگلستان پر ہی۔ سب انگریزوں کا فرض ہی کہ ہندوستانیوں کی مدد کریں۔ میں چونکہ انگریز ہوں چاہے کتنا غریب ہوں اس فرض سے بری نہیں۔ میں آپ کے ہمراہ روپیہ کے لالچ سے نہیں آیا تھا بلکہ اپنا فرض ادا کرنے آیا تھا" اللہ اکبر ایک ادنیٰ آدمی کے یہ خیالات عالی۔ اہلِ لندن کی ایک یہ صفت بھی انوکھی سی معلوم ہوتی ہی کہ اپنے ہمسایہ سے بالکل اجنبی رہتے ہیں۔ بابو صاحب صفحہ ۷۳ میں لکھتے ہیں: "لندن بھر میں کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جس کی صاحب سلامت تو کیا معنی جو اپنے ہمسایہ کے نام سے بھی واقف ہو چاہے مدت سے برابر رہتا ہو" صفحہ ۸۴ میں سطر میں نہ معلوم کیا رہ گیا ہی جس کی جگہ خالی ہی اور مطلب ندارد۔ صفحہ ۸۵ میں خوب تشبیہ دی ہی کہ ہندوستانی انگلش لیڈیوں میں ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے گوپیوں میں کنھیا۔ حصہ دوم میں نمائش کا حال دیکھ کر دل بے قرار ہو گیا۔

جس ملک کا حال دیکھا وہ اپنی صنعت میں بفضل خدا دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہی۔ مگر بدقسمت
ہندوستان کا یہ حال ہی کہ اپنی صنعت میں تنزل کر رہا ہی۔ جو خوبیاں ہماری صنعتوں میں ہیں ہم خود
اُن سے ناواقف ہیں اور غیر ملکوں میں جا کر اُن کے مبصروں کے سامنے کھلتی ہیں۔ وہ چیزیں جو ہم کوڑیوں
کے نرخ بیچتے ہیں وہ غیر ملکوں میں اشرفیوں کے مول بکتی ہیں۔ افسوس ہم میں اتنی لیاقت بھی نہیں
کہ خود اپنی صنعت سے تمتع اٹھائیں۔ ممالک غیر کی چیزوں کا تو کیا ذکر ہی۔ اس حصہ میں یہ بات بھی قابل
ذکر ہی کہ اہلِ لندن اگرچہ ہندوستانیوں سے نہایت اخلاق سے ملتے ہیں مگر ہمارے انگلو انڈین
بھی ویسے ہی رہتے ہیں جیسے ہندوستان میں۔ چنانچہ دہلی سے جو کاریگر نمایش میں گئے تھے اُن کو
اُن صاحب بہادر کے مارے جو اُن کو یہاں سے لے گئے تھے گردن اُٹھانا بات کرنا دشوار تھا۔ جہاں
کسی نے بات کی اور دوسرے نے کہا میاں صاحب آتے ہوں گے یہ سُننا اور اُس بیچارہ کے ہوش
گئے۔ صفحہ ۱۳۷ میں لارڈ میئر کا ذکر ہی۔ اُس میں لکھا ہی کہ اُن کو اختیارات شاہی حاصل ہیں۔ سواری
ایسی تزک و احتشام سے نکلتی ہی جیسے شاہانِ اسلام کی کبھی دہلی میں نکلتی تھی اور اُن کے کھانے کو
نواب عبدالرحیم خان خانان کے کھانے سے تشبیہ دی ہی۔ مگر لکھا ہی کہ اب بھی اُن کے یہاں بیس
باورچی نوکر ہیں۔ مجھ کو حیرت ہی کہ کہاں وہ زور شور۔ کہاں یہ بے نمکی کہ کل ۲۰ باورچی۔ شاید دوسو ہوں گے۔
اور ایک صفر چھاپہ میں رہ گیا ہو گا۔ یہ سفرنامہ ۱۴۷ صفحہ پر چھپا ہی۔ دہلی مطبع محب ہند واقع دریا گنج
سے بہ قیمت عہ نقد پر مل سکتا ہے۔

جامعہ عثمانیہ کا خطبۂ افتتاحیہ

(بحیثیت نائب امیر جامعہ)

حضرات ارکان مجلس اعلیٰ معزز رفقا، دیگر معززین، اساتذۂ کرام اور عزیز طلبا! آج کا مبارک دن ایک تاریخی دن ہے اور غرہ ذی الحجہ ۱۳۳۷ھ کو اعلیٰ حضرت آصف جاہ سابع خسرو دکن خلد اللہ ملکہ کے عہد ہمایوں کا وہ علمی کارنامہ شروع ہوتا ہے جو بفضل خدا صدیوں تک یادگار رہے گا۔ اس سرزمین میں مدتہائے دراز سے رود موسیٰ جاری ہے جامعہ عثمانیہ کا یہ چشمہ فیض رود عیسیٰ بن کر مردہ دلوں کو زندہ کرنے اور جہالت کے مریضوں کو شفا بخشنے میں اعجاز مسیحا دکھلائے گا۔ جس طرح خلیفہ ہارون الرشید کے بیت الحکمۃ اور خواجہ نظام الملک طوسی کے بغداد و نیشاپور کے مدارس نظامیہ کا نام صدہا برس گزر جانے پر بھی آج تک روشن ہے، اسی طرح جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ اور درسگاہوں کے کارنامے صفحاتِ تاریخ کو صدیوں تک منور و درخشاں رکھیں گے۔ انشاء اللہ العزیز۔

حضرات علم بہت بڑی نعمت ہے اور اس نعمت کو بنی نوع انسان میں پھیلانا سب سے بڑا فیض ہے۔ تعلیم ملکی زبان میں ایک ایسا دلکش خواب تھا جو برسوں ہمارے ملک میں دیکھا گیا۔ مبارک عہد عثمانی کی یہ کیسی برکت ہے کہ ہم اس روح پرور خواب کی تعبیر آج اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں ؎

مہ مصر ست داغ از رشکِ مہتابے کہ من دیدم
زلیخا کور شد در حسرتِ خوابے کہ من دیدم

اعلیٰ حضرت خسرو دکن خلد اللہ ملکہ کی سرپرستی میں مجلس اعلیٰ رفقا و اساتذہ کا یہ مجمع اس لئے قایم ہوا ہے کہ نعمت علم کو زیادہ سہل الحصول اور سریع الفہم بنا کر (جس طرح حضور ملک معظم قیصر ہند نے اپنے شاہی پیام میں فرمایا تھا) "علم اور امید کی کرنیں غریبوں کی جھونپڑیوں تک پہنچا دیں"۔ یہ کام بہت مشکل تھا اور ہے۔ لیکن اعلیٰ حضرت کی شاہانہ سرپرستی اور توجہ سرکار عالی کے محکمۂ تعلیمات کی جانفشانی اور ارکان دارالترجمہ کی

محنت و عرق ریزی نے اس دشوار گزار مرحلہ کو اس قدر آسان کر دیا کہ آج ہمارا پہلا قافلہ بخیر و خوبی جادہ پیما ہوتا ہے۔ خدائے تعالیٰ اُس کو منزل مقصود تک صحیح و سلامت پہنچائے۔ آمین!

جامعہ عثمانیہ کی آیندہ نیک نامی اور کامیابی کا زیادہ تر دار و مدار اُس کے محترم اساتذہ اور عزیز طلبا کی کوششوں پر ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے حکام نے پوری کوشش لایق اور فاضل علما کے فراہم کرنے میں کی ہے۔ اور منشورِ خسروی نے علوم ظاہری کے ساتھ علم دین اور اخلاقیات کو لازم قرار دیا ہے۔ لہٰذا یہ توقع بالکل بجا ہے کہ ہمارے استادوں کی تعلیم میں علوم جدیدہ کی وسعت اور نئے اعلیٰ اصول تعلیم کے دوش بدوش قدیم استادوں کی شفقت و دل سوزی اور متانت و وقار کا جلوہ ہمیشہ نمایاں رہے گا اور ہمارے عزیز طلبا کی پیشانیوں میں مستعدی اور ہوشیاری کے ساتھ ساتھ ادب و سعادت کا نور ہمیشہ تاباں رہے گا جو تعلیم قدیم کا سرمایۂ ناز ہے اور اس طرح جامعہ عثمانیہ کی تعلیم قدیم و جدید دونوں تعلیموں کی برکتوں اور خوبیوں کا مجموعہ ہوگی اور اُس کے شاندار نتایج چار دانگ عالم میں اپنا کوسِ عظمت بجائیں گے۔ ؎

یارب ایں آرزوئے من چہ خوش است
تو بدیں آرزو مرا برساں

اب میں دعا کرتا ہوں کہ خداوند تعالیٰ اعلیٰ حضرت خسرو دکن میر عثمان علی خان بہادر آصف جاہ سابع کو سالہائے دراز تک صحت و قوت کے ساتھ صراط مستقیم اور تخت سلطنت پر قایم رکھے اور ان کے اعزاز و جاہ و اقبال میں روز افزوں ترقی فرمائے اور خاندان شاہی کو باصد جاہ و جلال اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین ثم آمین!!

نوٹ:۔ اختصار کی فرمائش کی تعمیل اس خطبے میں ملحوظ رکھی گئی تھی۔

(پنجشنبہ غرۂ ذی الحجہ ۱۳۳۷ھ)

پیش لفظ

(مکاتیب ڈاکٹر سر اقبال مرحوم)

سنہ ۱۹۰۲ء میں منشی شمس الدین مرحوم نامور سکرٹری کی یاد فرمائی پر میں اول بار انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں شریک ہوا۔ حسن اتفاق یہ ہوا کہ ٹھہرایا گیا یادش بخیر (سر) شیخ عبدالقادر کے پاس۔ یہی قیام زندگی کے ایک اہم پہلو کی آفرینش کا باعث ہوا۔ شیخ مہربان نے اردو کا نامور رسالہ مخزن جاری کر رکھا تھا جس نے انگریزی داں طبقے میں اردو ادب کا ذوق پیدا کیا اور یہ بڑی خدمت تھی۔ اسی خدمت ادبی کے سلسلے میں شیخ کی خانقاہ اردو ادب کے اہل ذوق کا مرجع بنی ہوئی تھی۔ اقبال نیرنگ۔ احمد حسن مصنف، خود شیخ بہ اربعہ عناصر ذوق ادب کے وہاں جمع ہوتے۔ مجھ کو اس صحبت میں ان احباب کو دیکھنے ملنے اور ان سے خصوصیت حاصل ہونے کا موقع ملتا رہا۔ انجمن کی مجالس میں اقبال و نیرنگ کی نظمیں سنیں اور ان کے ترنم سے لطف اندوز ہوا۔

غرض یہ تقریب تھی سر اقبال کی ملاقات و خصوصیت کی۔ ذوق ادب نے تعلقات میں خلوص پیدا کیا۔ خط کتابت جاری رہی۔ وہ خط کتابت کیسی تھی اس کو میں نہ لکھوں گا۔ میرے نام کے خطوط جو شامل مجموعہ ہذا ہیں خود بتا دیں گے۔

یہ زمانہ اقبال کی بلند اقبالی کے آغاز کا تھا۔ ایم اے کی ڈگری لے کر کالج میں پروفیسر مقرر ہو چکے تھے۔ زمانے کے حالات کے اعتبار سے یہ بڑا امتیاز نہ تھا۔ اصل امتیاز جو آیندہ ترقی و سربلندی کی پیشین گوئی کر رہا تھا وہ ان کا ذوقِ معرفتِ ادبی تھا جو عمیق تھا، ہمہ گیر تھا۔

اس کا راز سن لو۔ یاد کر لو نقش دل کر لو۔ اسی کے نہ ہونے سے ہماری علمی مجلسیں بے کیف ہیں۔ آوازِ دہل خالی سے زیادہ ان میں اثر نہیں۔ راز یہ تھا کہ اقبال کو خوش بختی سے اپنے وطن سیالکوٹ کے کالج میں بقول سر شیخ عبدالقادر "علمائے سلف کی یادگار اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے ایک بزرگ

مولوی سید میر حسن صاحب" کی شاگردی کی سعادت حاصل ہوئی جو بقول سر شیخ یہ خاصہ رکھتے تھے کہ جو کوئی ان سے فارسی یا عربی سیکھتا اُس کی طبیعت میں اس زبان کا صحیح ذوق پیدا کر دیتے تھے۔ اقبال نے فارسی اور عربی کی تحصیل مولوی صاحب موصوف سے کی۔ اصل بنیاد اقبال کے اردو اور فارسی ادب میں بلند پایہ ممتاز عصر با معرفت ادیب ہونے کی یہ ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ یورپ کی صحبت و تعلیم نے سونے پر سہاگے کا کام دیا۔ مگر سونا پرانی کان کا تھا۔ آج کے تعلیم یافتہ سہاگہ ڈالتے ہیں مگر سونا کہاں۔ چلا آجاتی ہے جوہر نہیں پیدا ہوتے۔ یہ میرا تجربہ نصف صدی کے ساری ہندوستان کی سیاحی اور دورے کا ہے۔ ۱۹۰۵ء تک اقبال ہندوستان میں رہے اُس وقت تک اردو شاعری کا ذوق کار فرما رہا۔ میری ملاقاتیں جا بجا ہوتی رہیں۔ خط کتابت جاری رہی۔ اُن کے یورپ جانے کے بعد سلسلہ مراسلت موقوف ہو گیا۔ وہاں اُن کا دوسرا جوہر مخفی جلوہ فرما ہوا یعنی فارسی شاعری جس کی صدا سے آج ایک عالم گونج رہا ہے۔ یہ جلوہ فرمائی کس طرح ہوئی اس کا حال بانگ درا کے مقدمے میں پڑھو جو سر شیخ کا لکھا ہوا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ صدائے مذکور صدا بصحرا ثابت ہوئی ہے یا صدائے حادی یعنی یہ دیکھنا ہے کہ شور کرنے والوں میں سے کتنے جادۂ اقبال پر گام زن ہو کر اُن کے فیض سے کامیاب ہوتے اور شاعر حقیقی بن کر اقبال کی حکمت کو دنیا میں ترقی مزید دیتے ہیں۔

یہ مجموعۂ خطوط شیخ عطاء اللہ صاحب (ہماری یونیورسٹی کے استاد گرامی اکنامکس کے چیرمین) شائع کر رہے ہیں۔ میں علی گڑھ کانفرنس کی خدمت کے سلسلے میں شیخ صاحب سے اچھی طرح واقف ہوں! ور اُن کی سلامت روی معاملہ فہمی کا معترف۔ میرا گمان بھی نہ تھا کہ ان میں ذوق ادبی بھی ہے بلکہ جس تعلیم سے اُن کا تعلق ہے اُس کے لحاظ سے بیگانگی کی بدگمانی تھی۔ اسی لئے مجھ کو حیرت ہوئی جب میں نے اخباروں میں اُن کا یہ اعلان دیکھا کہ وہ اقبال کے خطوط شائع کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ حیرت نے مسرت کی صورت اختیار کی اور میں نے وہ خطوط شیخ صاحب کے پاس بھیجدیے، جو اقبال مرحوم کے میرے نام تھے۔ اور شیخ صاحب نے مقدمے میں لکھا ہے کہ اس سلسلے میں سب سے پہلی قدر میری تھی

خدمت کی تھی۔

شیخ صاحب نے ازراہِ کرم جو الفاظ میری نسبت لکھدئے ہیں اُن کو پڑھ کر میں شرمندگی کی وجہ سے لرزہ براندام ہوا۔ بہرحال شکرگزار کرم ہوں اور شیخ صاحب کی کامیابی کا دل سے آرزومند۔ خطوط پر کچھ لکھنا آیندہ جلد کی اشاعت پر ملتوی رکھا ہے، اور یہی مناسب معلوم ہوا۔

(۵ رجب المرجب ۱۳۶۳ھ)
(۲۷ جون ۱۹۴۴ء)

چودھری عبدالحمید خاں صاحب

(رئیس سہاور ضلع ایٹہ)

چودھری صاحب نے بتاریخ ۷ رمضان المبارک (۱۳۵۵ھ) روز دوشنبہ صبح کے وقت بمقام علی گڑھ میری کوٹھی حبیب منزل میں رحلت کی۔ مہینہ مبارک، دن بابرکت، وقت پُرسعادت۔ آخرین دن میں جو حالت مرض کی قوت اور جسم کی کمزوری کی تھی اُس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ روح دوشنبہ کے انتظار میں بصد دشواری وقت گزار رہی تھی غفرلہ۔ عمر ۷۳ سال۔

چودھری عبدالحمید خاں، چودھری نوراللہ خاں صاحب رئیس سہاور کے منجھلے فرزند تھے۔ عربی۔ فارسی کی تحصیل کی تھی۔ تھوڑی انگریزی بھی پڑھی تھی۔ اپنے خاندان میں وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے عربی پڑھی تھی۔ فقہ کا مطالعہ وسیع تھا۔ تحقیق بھی تھی۔ چنانچہ فقہ میں کتاب کنزالآخرۃ نظم میں لکھ کر شائع کی تھی۔ کتاب کا حجم ۱۵۹ صفحات ہے۔ عبادات، معاملات اور فرائض کے ضروری مسائل اُس میں ہیں۔ مفصل حاشئے دئے ہیں جن سے ناظم کی وسعتِ نظر اور تحقیق کا پتہ لگتا ہے بڑی سند یہ ہے کہ مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی مرحوم نے اُس کو دیکھا اور پسند فرمایا تھا۔ چودھری صاحب سے مولٰنائے مغفور کو دلی اُنس تھا۔ کنزالآخرۃ کے دیباچے میں لکھا ہے کہ اُن کے اُستاد مولوی امیر حسن صاحب سہسوانی نے (جو مولوی تراب علی

صاحب فرنگی محلی کے شاگرد تھے) طالب علمی کے زمانہ میں مسائلِ فقہ یاد رکھنے کی یہ تدبیر بتائی تھی کہ مسائل ترجمہ کرکے اردو میں نظم کئے جائیں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ چودھری صاحب شرح وقایہ اور مشکوٰۃ شریف پڑھتے تھے۔ اس کتاب کی اشاعت اپنی والدہ مرحومہ کے ایصالِ ثواب کے لئے کی ہے۔ خاندانِ مجدّدی میں شاہ عبدالغفور خاں صاحب مرحوم مغفور شاہ جہاں پوری کے مُرید تھے، پیر کے پیارے تھے۔

طالب علمی سے فارغ ہوکر چودھری صاحب کے دو شوق رہے۔ شکار اور شطرنج۔ ایک لطیفہ یاد آیا۔ ہمایوں بادشاہ سے ایک روز اُس کے ایک مشہور امیر نے کہا کہ تین شینوں میں مجھ سے کوئی بازی نہیں لے جاسکتا۔ شعر۔ شکار۔ شمشیر بادشاہ نے مسکرا کر کہا "ایک شین اور ملالو۔ شطاحی (عیاری)

چودھری صاحب نے ان دونوں شینوں میں پوری مہارت پیدا کی تھی۔ اُن کی طبیعت ابتدا سے معاملہ فہم، سلامت پسند واقع ہوئی تھی۔ اُن کے والد مرحوم مقروض ہوگئے تھے۔ سودی قرضہ، ریاست خطرے میں آگئی تھی۔ میرے عزیز دوست نے اپنے والد کی حیات میں کوشش کرکے ریاست کورٹ کرائی (حالانکہ اُس زمانہ میں ریاست کا کورٹ ہونا سخت دشوار تھا) خود مینیجری کی اور پوری جانفشانی کے بعد کل قرضہ ادا کرکے ریاست واگزاشت کرالی۔ اس کے بعد بھی اُن کے والد نے ریاست اُن ہی کے اہتمام میں رکھی۔

والد کے انتقال کے بعد ریاست ورثا میں بہت کشادہ دلی اور حق رسی کے ساتھ تقسیم کردی۔ تین بھائی تھے ایک بہن۔ سب سے اوّل پوری جمعبندی بہن کے سامنے رکھ دی کہ جو جائداد پسند کریں لے لیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس کے بعد بڑے بھائی کو اُن کے مصارف زیادہ ہونے کی وجہ سے اپنے حصہ میں سے کم کرکے زیادہ حصہ دیا۔ بڑے بھائی کا انتقال ہوا تو اُن کی پوری جائداد جس میں زائد حصۂ جائداد بھی شامل تھا اُن کے ورثا میں تقسیم کردی۔ بھتیجوں کے ساتھ بھتیجی کو بھی حصہ دیا۔

اپنی ریاست کا انتظام اس خوبی سے کیا کہ آمدنی سے خرچ ہمیشہ کم رکھا۔ پس انداز سے جائداد میں اضافہ کیا۔ بعض عزیزوں کو بے سود روپیہ دے کر ان کا سودی قرضہ ادا کیا۔ عزیزوں اور رعایا کے پورے غمخوار اور پشت پناہ تھے۔ بعض حالات میں اُن کا عزم حیرت خیز تھا۔ دوسروں کے لئے اپنے آپ کو خطرے

میں ڈال دیتے تھے۔ ایک مقدمۂ قتل میں ایک عزیز کی پوری ایک لاکھ روپیہ کی ضمانت کر دی تھی۔ نتیجہ یہ کہ رعایا بلا امتیازِ مذہب و ملت ان پر فدا تھی۔ بہت سے بیکاروں کو زمین دے کر، دکانیں دے کر، باغات دے کر باکار بنا دیا تھا۔

عادتیں بہت سادہ تھیں۔ کھانے اور لباس وغیرہ میں کوئی تکلف نہ تھا۔ نئی روشنی سے اتنے دور تھے کہ انیسویں بیسویں صدیاں گویا اُن کے لئے دنیا میں آئی ہی نہ تھیں۔ دین کے پورے پابند، معاملات میں محتاط، لغویات سے یکسو۔

علاوہ عزیز بھائی ہونے کے میرے اُن سے دوستانہ تعلقات بھی تھے جو چھپن برس قائم رہے۔ رسمی نہیں۔ سچے دلی تعلقات۔ اور دیکھو اس چھپن برس میں چھپن منٹ بھی ایسے نہیں آئے کہ اُن تعلقات میں ذرا بھی فرق آیا ہو۔

میرے حیدرآباد جانے پر جو نظم لکھی تھی اُن کی قلبی محبت کی شان ہے۔ فرماتے ہیں:-

تو اے نسیم چو پیچی بہ زلفِ مشکینش — سلامِ شوق رساں از حمیدِ مسکینش
پیامِ مایوس ازاں بے وفا بگوش گزار — کہ بے تو حالِ دلِ زارِ ماست زار و نزار
فراقِ روئے تو جانم بہ قیدِ غم افگند — الا کہ نیست مرا سودمند وعظ نہ پند
تو محوِ دیدِ گل و بلبل و بہارِ چمن — مرا رسید کنوں بے تو دست تا دامن
تو در حریمِ دکن بزمِ عیش آرائی — مرا خیالِ جمالِ تو کرد صحرائی
ترا خوش ست تماشائے شمع و پروانہ — مرا بس ست خرابات و دشت و ویرانہ

حیف کہ دستِ اجل نے ایسے عزیز دوست اور بھائی کو جدا کر دیا۔ رضینا بقضاء اللہ۔ آنکھوں سے دور سہی دل سے دور ہے نہ ہو سکتا ہے۔ ؎

اے ہمنفسانِ محفلِ ما — رفتید، ولے نہ از دلِ ما

اللھم اغفر لہ وارحمہ وادخلہ جنات النعیم

(کانفرنس گزٹ علی گڑھ مورخہ یکم دسمبر ۱۹۳۶ء)

شیخ محمد بن طاہر گجراتی

خاک ہندوستان میں جو نامور علمائے دین پیدا ہوئے ہیں اُن میں شیخ محمد بن طاہر رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں۔ شیخ ممدوح اس ملک کے اُن معدودے چند علماء میں سے ہیں جن کی قسمت میں فن حدیث کی خدمت اور احیاء سنۃ کی سعادت لکھی تھی۔ مغلیہ سلطنت جہاں اور بہت سی برکتیں لائی تھی وہاں حدیث و سنۃ کا رواج بھی تھا۔ اکبری و جہانگیری عہد میں شیخ محمد بن طاہر اور شیخ عبدالحق دہلوی یہ رحمت کا چشمہ اس کے سرچشمہ (ملک عرب) سے لائے اور فیض سے دلوں کو شاد و شاداب فرمایا۔ شیخ نورالحق محترم باپ کے ارجمند فرزند تھے۔

مصنف کنزالعمال نے اگرچہ عمر عرب میں بسر کی لیکن تھے اسی ملک کے فرزند اور یہیں کے دامن فیض کے تربیت یافتہ۔ امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی نے طریقہ مجددیہ رائج فرمایا جس میں تمام ترقی کا دارومدار اتباع سنۃ پر ہی۔

مغلیہ سلطنت کا آفتاب لب بام آپہنچا تھا کہ ایک اور آفتاب علم طالع ہوا۔ شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم ملک عرب کو گئے اور چشمۂ رحمت کا صاف اور خالص آب حیات دل سے لگا کر لائے۔ شاہ صاحب کا فیض تھا کہ دریا بن کر ملک میں پھیلا۔ سرد دلوں کی خشک کشت زار سرسبز ہو کر لہلہانے لگی۔ کون ہے جو شاہ عبدالعزیز صاحب کے نام سے نا آشنا ہی۔ مولانا اسمٰعیل صاحب اور مولانا سید احمد صاحب کی کوششیں اظہر من الشمس ہیں۔ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔

عہد اکبری الحاد اور دہریت کے لئے بدنام ہی۔ لیکن نگاہوں سے احیاء سنۃ کی وہ برکتیں نہاں ہیں جو شیخ محمد بن طاہر کی کوششوں سے ظہور میں آئیں۔ ان الحسنات یذھبن السیئات۔ نیکیاں برائیوں کو محو کر دیتی ہیں، کیا عجب ہے کہ اس عہد کی آزادیوں کی تلافی سعادت سے ہو گئی ہو۔ آگے چل کر تم پڑھو گے کہ اس کوشش میں شیخ کا ہاتھ بادشاہ نے بھی بٹایا تھا۔

ولادت ونسب شیخ محمد بن طاہر قوم کے بوہرے تھے اور پٹن (گجرات) میں پیدا ہوئے۔ سنہ ولادت نظر سے نہیں گزرا[1] بوہرہ قوم آج بھی تمول کے لحاظ سے مشہور ہے۔ اس قوم کو چونکہ تجارت سے تعلق قدیم ہی اس لئے یہ لقب ملا۔ ابتداءً یہ لوگ بت پرست تھے۔ کوئی چھ سو برس گزرے ہوں گے کہ ایک فاضل ملا علی کی ہدایت سے دولت اسلام سے مالا مال ہوئے۔ ملائے ممدوح کھنبات میں مدفون ہیں۔ چونکہ ملا علی امامیہ تھے انھوں نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا۔ جب احمد شاہ کا دور دورہ گجرات میں ہوا اور اسلام کو ترقی ہوئی تو علمار وقت کی تلقین سے (جو اہل سنت والجماعت تھے) بہت سے بوہرے سنّی ہو گئے۔ اختلاف عقیدہ نے اس فرقہ میں بہت سے نزاع پیدا کر دئے۔ نواب صمصام الدولہ لکھتے ہیں کہ جو بوہرے شیعہ ہیں وہ ہمیشہ امور شرعیہ میں ایک فاضل صالح کے ماتحت رہتے ہیں۔ مال کا پانچواں حصہ سادات مدینہ منورہ کے واسطے بھیجتے ہیں۔ زکوٰۃ کا روپیہ رئیس مذکور کو دیتے ہیں تاکہ محتاج بوہروں میں صرف ہو۔

تحصیل علم شیخ محمد بن طاہر نے ابتداءً علوم کی تحصیل وطن میں کی۔ اس کے بعد حج اور تکمیل علم کے واسطے حجاز کا قصد کیا۔ وہاں خوبی قسمت نے ایک ایسے آستانہ پر پہنچایا جو علوم ظاہر و باطن کا مرجع تھا ؎

> از برائے سجدۂ عشق آستانے یافتم
> آستانے بود مطلوب آسمانے یافتم

یعنی حضرت شیخ علی متقی ؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر شرف بیعت و تلمذ سے مشرف ہوئے۔ شیخ ممدوح اولیار کاملین میں سے ہیں۔ کمالات باطنی کے ساتھ علوم ظاہری میں بھی باکمال تھے۔ کنز العمال اُنہی کی تصنیف ہے۔ علاوہ اس معرکۃ الآرا تصنیف کے بہت سی کتابیں تصوف میں ہیں۔ شیخ عبدالحق ان تصانیف کی نسبت فرماتے ہیں کہ ایسی تصانیف اسی کامل کے قلم سے نکل سکتی ہیں جس کو درجۂ استقامت اور مرتبۂ ولایت دونوں کا کمال حاصل ہو۔

کنز العمال سیوطی کی جامع صغیر اور جمع الجوامع سے ماخوذ ہے۔ شیخ دہلوی نے لکھا ہے کہ سیوطی کی دونوں کتابوں کا کنز العمال سے مقابلہ کرو معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف کنز العمال نے کیا کام کیا ہے۔ شیخ علی متقی اور ان کے خلفا

---

[1] سنہ ۹۱۴ھ میں نہروالہ میں پیدا ہوئے۔ (الندوہ)

کے حالات اخبار الاخیار میں پڑھو اور دیکھو کہ وہ کیسے دامن فیض تھے جن کے سایہ میں شیخ محمد بن طاہر اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے شاگرد تربیت پاتے تھے۔ شیخ محمد بن طاہر نے شیخ ممدوح سے علم حدیث کی تحصیل کی اور فیض باطن حاصل کیا۔

مراجعت

شیخ محمد بن طاہر جب عرب سے خزانۂ علم سے مالامال ہو کر وطن میں آئے تو اُنھوں نے اُن بدعتوں کی بیخ کنی پر کمر ہمت باندھی جو اُن کی قوم میں پھیلی ہوئی تھیں۔ فرقہ مہدویہ کے استیصال میں سخت کوشش کی۔ احیاء سنت کا جو جوش شیخ کے دل میں موج زن تھا اُس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکے گا کہ انھوں نے عمامہ سر سے اتار کر رکھ دیا تھا اور یہ عہد کر لیا تھا کہ جب تک تشیع اور دوسری بدعتوں کو جڑ سے اُکھیڑ کر نہیں پھینک دوں گا عمامہ نہیں باندھوں گا۔ شیخ اپنی کوششوں میں سرگرم تھے کہ ۹۸۰ھ میں خیمۂ شاہی گجرات میں پہنچا۔ بادشاہ نے شیخ سے ملاقات کی اور کہا کہ آپ کی نذر (منت) کا پورا کرنا میرے ذمہ ہے۔ آپ عمامہ باندھیں۔ یہ کہہ کر اپنے ہاتھ سے عمامہ اُن کے سر پر باندھا۔ وعدۂ شاہی اس طرح پورا ہوا کہ خان اعظم (جو راسخ عقیدہ حنفی تھے) صوبہ دار گجرات مقرر کئے گئے۔ خان اعظم نے شیخ اجل کو پوری مدد دی اور دونوں کوششوں نے مل کر بہت سی بدعتوں کی جڑ کاٹ دی۔ اس موقعہ پر یہ نہ کہہ اُٹھنا کہ اکبر نے تالیف قلوب کے لئے ایسا کیا ہوگا۔ کیونکہ جم غفیر شیخ کے خلاف تھا اور تالیف قلوب کی حکمت عملی دوسرا پہلو اختیار کرنے کا مشورہ دے سکتی تھی نہ شیخ کی تائید کا۔ خان اعظم تقریباً چار برس صوبہ دار گجرات رہے۔ اُس کے بعد اُن کا تبادلہ ہو گیا۔ بجائے اُن کے ایک ایرانی امیر گجرات پہنچا۔

اس تبدیلی سے بوہروں میں از سر نو شورش اور شیخ کے کام میں رکاوٹ پیدا ہو گئی۔ شیخ نے عمامہ سر سے اُتار کر پھر رکھ دیا اور فریادی بن کر دربار کو چلے۔ ہنوز آگرہ نہ پہنچے تھے کہ اُجین و سارنگ پور (مالوہ) کے درمیان بعض سیاہ باطنوں نے حملہ کر کے شہادت سے سرخرو کیا۔ یہ واقعہ ۹۸۶ھ کا ہے۔ لاش پٹن لا کر شیخ کے بزرگوں کے مقبرہ میں دفن کی گئی۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ۔

درس و تدریس

علاوہ استیصال بدعت کے شیخ نے ترویج حدیث میں بھی بہت کوشش کی طلبا کو برابر علم حدیث پڑھاتے رہے۔ اپنے شیخ کی ہدایت کے بموجب طالب علموں کے واسطے سیاہی

اپنے ہاتھ سے تیار کرتے تھے۔ پڑھاتے وقت بھی سیاہی گھسنے کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ فرماتے تھے ایک حصہ دوسرے کام سے کیوں مانع ہو۔ دل بیار دست بکار۔

تصانیف سب سے زیادہ مشہور تصنیف مجمع بحار الانوار ہے۔ اس میں کلام مجید اور حدیث کے مشکل لغات کا حل اس انداز سے کیا ہے کہ صحاح ستہ کی شرح بھی ضمناً ہو گئی ہے۔ شیخ نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ میں نے اس کتاب کی بنیاد نہایہ ابن اثیر اور ناظر عین الغریبین پر رکھی ہے۔ کتاب مذکور ۹۷۸ھ میں ختم ہوئی۔ برخلاف متاخرین شیخ، ماقل و دل کے اصول پر کاربند ہیں۔ اسی سے اُن کی تحریر میں زائد و فضول الفاظ کم ملیں گے۔ علاوہ مجمع بحار الانوار کے اور تصانیف بھی ہیں۔ ایک رسالہ مغنی ہے جو فنِ رجال میں ہے۔ شیخ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ "اس کتاب میں اسمار رجال کی صرف تصحیح کی ہے۔ حال نہیں بیان کیا۔ نہایت مختصر و مفید کتاب ہے۔ مجمع بحار الانوار کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک کتاب سیر میں بھی لکھی ہے اُس کے حوالہ سے اکثر فوائد خاتمہ کتاب مذکور میں نقل کئے ہیں۔ مجمع بحار الانوار کے خاتمہ میں ایک عالمِ شوق میں فرماتے ہیں کہ غرض اس تصنیف سے یہ ہے کہ "ذکر پاک میں عمر صرف ہو"۔ دیکھو پاک روحیں تھیں پاکیزہ باتوں سے تسلی پاتی تھیں اور سرور حاصل کرتی تھیں۔ یہی پاک نیت تھی جس سے مقبولیت نصیب ہوتی تھی۔ مجمع بحار الانوار کا چشمۂ فیض آج تک جاری ہے۔ پانی کی جگہ انوار موجیں مار رہی ہیں۔

(رسالہ الندوہ لکھنو بابتہ ماہ جولائی ۱۹۰۷ء)

منشی محمد احتشام علی صاحب رئیس کاکوری

آج سے باون برس پہلے کانپور میں مولانا احمد حسن صاحب مرحوم کے مدرسے میں دستار بندی سال بہ سال بڑے اہتمام سے ہوتی تھی۔ خاکسار بھی حاضر ہوتا تھا۔ ایسے ہی ۱۳۱۱ھ میں پہلی ملاقات منشی صاحب مرحوم سے ہوئی۔ ہم دونوں "پرانے فیشن" کے لوگ تھے۔ اس لئے واقعی "پرانے دوست" بنے نہ جدید "پرانے دوست"

ربط کے قایم ہونے، بڑھنے اور معیار پر پہنچنے کے لئے ایک زمانہ لگا۔ مگر اس عرصے میں بھی نہ صرف قایم رہا بلکہ بڑھتا رہا۔ بالآخر خلوص و محبت کے اُن مراتب پر پہنچا جو اُس عہد میں کمیاب یا شاید نایاب ہیں۔

اس طویل زمانہ میں بہت کچھ منشی صاحب کو دیکھا۔ میں لکھنؤ جاتا اور اکثر جاتا، ناممکن تھا کہ کسی دوسری جگہ ٹھہروں۔ منشی صاحب علی گڑھ تشریف لاتے تو لازماً میرے یہاں کرم فرماتے۔ جتنا دیکھا منشی صاحب کے اوصاف کا نقش دل پر گہرا ہوتا گیا۔

قصبۂ کاکوری اپنے بعض اوصاف میں اودھ کے دوسرے قصبات سے ممتاز رہا ہے یہاں تک کہ عالمگیری یہ مقولہ زبان زد ہے "بدتمغان کاکوری"۔

یہ قصبہ جہاں تک میرا علم ہے اودھ کے تمام مشہور اور عظیم بالشان قصبات میں سب سے زیادہ لکھنؤ سے قریب ہے، نہ صرف مسافت میں بلکہ تعلقات میں بھی۔ شاہی زمانے میں عمائد کاکوری ممتاز مراتب پر سربلند و معتمد رہے۔ اخیر شاہی قافلہ انگلستان مولوی مسیح الدین خاں صاحب مرحوم کی قیادت میں گیا جو کاکوری کے نامور فرزند تھے۔

باوجود اس کمال قرب کے کمال یہ ہے کہ لکھنؤ کے خاص اثر سے ہر طرح دور بلکہ نفور رہا۔ تفصیل بے موقع ہوگی کاکوری میں علم تھا، درویشی تھی، دانشمندی و معاملہ فہمی تھی۔ دنیاوی مراتب کی بلندی تھی۔ اور اول سے تمی آخر تک رہی۔

منشی صاحب کے والد منشی امتیاز علی صاحب مرحوم اپنے عہد میں لکھنؤ کے ممتاز اور عالی مرتبہ وکلار میں تھے جن کی قانون دانی اور معاملہ فہمی کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ اسی کے ساتھ پاکیزگیٔ اخلاق۔ باوضعی دینداری زمانہ شناسی میں با امتیاز و بلند پایہ تھے۔ حضرت مولٰنا فضل الرحمٰن قدس سرہٗ سے عقیدت و بیعت تھی۔ سرسید کی تحریک کے مردانہ حامی تھے۔ اور شاید اودھ میں اس میں مستثنیٰ تھے۔ کانفرنس کا اجلاس لکھنؤ ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ میرے محب قدیم منشی احتشام علی صاحب اسی آہنی حصار قصبہ کاکوری کے چشم و چراغ اور نامور اور مستحکم آئین باپ کے فرزند۔ ان کی صفات میں دونوں کا جلوہ تھا نیز لکھنؤ کی شائستگی کا لباس میں۔ کھانے میں۔ نشست برخاست میں۔ معاشرت میں۔ گفتگو میں پورا جلوہ شائستگی

کا نمایاں بلکہ تاباں تھا۔ لباس میں وہی انداز جاڑے اور گرمی کا تھا جو عمائد لکھنؤ کا تھا۔ جاڑوں میں شال اور جامہ وار کے جلوے اور جو ہر نظر آتے گرمیوں میں جامدانی وغیرہ نگاہ کو تازگی بخشتی۔ یہی نہیں۔ شال۔ جواہرات۔ عطر وغیرہ کی شناخت اس کے مالہ وما علیہ کی واقفیت اور پرکھ میں اعلیٰ دماغ تھا۔ اب بھی خربزے اور آم کا شوق لکھنؤ کے اجڑے گھروں سے بعض نادر نمونے شال وغیرہ کے باہر لے آتا ہے۔ جب ایسا موقع ہوتا میں ضرور یاد آتا۔ قریباً ہر سال شال کا کوئی نہ کوئی نادر نمونہ میرے واسطے خریدا جاتا درست کرایا جاتا۔ اگر کنارہ حاشیہ وغیرہ کی ضرورت ہوتی توشہ خانہ سے نکلوا کر اضافہ کیا جاتا۔ غرض پرانا بوسیدہ ٹکڑا نیا اور رعنا بن کر میرے سامنے آتا۔ متعدد ایسی نادر یادگاریں میرے یہاں ہیں۔

منشی صاحب کا دسترخوان قدیم مہمان نوازی۔ خوبی مذاق۔ بلند حوصلگی۔ اور لطافت کا نمونہ ہوتا تھا۔ برسوں دیکھا لطف اُٹھایا۔ ایک معیار بلند تھا جس سے کبھی نیچے نہ گرا۔ ہر کھانا دال سے لے کر بریانی اور مزعفر تک اپنے معیار پر ہوتا۔ جس کو آپ کھا کر اندازہ کر سکتے تھے کہ اس کھانے کا معیار خوبی کیا ہے۔ دسترخوان ہمیشہ وسیع پایا۔ عزیز۔ احباب۔ طلبا صادر وارد بھی ہوتے۔ سب کی نشست۔ مدارات یکساں بلا فرق ہوتی۔ کھلانے میں منشی صاحب کی شگفتگی۔ لطف پروری۔ جان نوازی فرماتی۔ کھانے ہر ہر موسم کی رعایت سے تیار ہوتے۔

خربزے سے مناسبت نہ تھی۔ آم! یادش بخیر۔ ذوق پر کار فرما تھا۔ شوق کی انتہا نہ تھی۔ اس کے ذکر میں لطف بلکہ استغراق تھا۔ فکر میں اس کے تمام مراتب کا اندازہ۔ نقائص کے رفع کرنے کی تدابیر خوبی بڑھانے کے وسائل۔ درختوں کی بیماریاں دور کرنے کے معالجے سب کچھ ذہن میں تھے۔ عمل میں تھے۔ باغات کا وسیع سلسلہ تھا۔ پورا سال ہر موسم کے لحاظ سے اُن کے غور و پرداخت میں ذوق و شوق کے ساتھ بسر ہوتا۔ موسم گرما سول پور کے خانہ باغ میں بسر ہوتا۔ میں بھی ایک بار حاضر ہوا تھا باغ کا ایک ایک درخت دکھایا۔ خوش ہوا مقام تھا۔

آم کھلانے کی صحبت ایک یادگار زمانہ صحبت تھی۔ احباب بے تکلف کا مجمع نادر اور چیدہ آموں کی کثرت اور یہ کثرت ٹبوں میں بھیگتے اُس مجمع کے صدر نشیں منشی صاحب کا رد بعت تیقت تب سے آم کی

قاشیں سب کو پہنچائی جاتیں۔ مسلسل تراش تراش کر۔ ایک ہاتھ کی محبت و شوق کی تاثیر سے یہ قوت بارہا دیکھی کہ مجمع کا مجمع تا بگلو پڑا اور سیر ہو کر وہیں لوٹ جاتا۔ چلنا تو بڑی بات، ہر بات کرنے کی تاب نہ ہوتی۔ کوئی اگر کچھ کہتا تو ہاتھ سے اشارہ کرتے کہ بولنے کی تاب نہیں۔ سانس لینا دشوار ہو جاتا۔ اس میں تنومند اور برخور احباب بھی ہوتے۔ نہایت نفاست یہ تھی کہ یہ بزم آرائی صرف شب میں ہوتی۔ دن میں بکھیوں کے خیال سے آم کا نام بھی زبان پر نہ آتا۔

میں نے اوپر ترتیب کا ذکر کیا تھا۔ مطلب یہ کہ آم کے اقسام پر نمبر لگے ہوئے تھے کہ پہلے کون سا تراشا جائے اس کے بعد کونسا۔ علیٰ ہذا القیاس سب سے آخر میں "رشکِ جہاں" کا نمبر آتا۔ جو مجموعہ صفات تھا۔

عادات میں منشی صاحب تکلف۔ تصنع۔ طمطراق سے بالکل صاف پاک تھے۔ اسی کے ساتھ نہایت شائستہ اور پختہ وضع۔ میں نے باون برس کی مسلسل رفاقت میں کبھی کوئی فرق کسی عادت میں نہیں پایا۔ بے تکلف مخلصانہ، صاف گوئی، کلام میں تھی۔ رائے میں پختہ بلکہ سخت تھے جو کسی رعب۔ طمع یا خاطر داری سے مرعوب واثر پذیر نہ ہوتی۔ پبلک معاملات سے پوری دلچسپی تھی، اصول بالا کی پوری پابندی سے۔ میں نے محمڈن کالج۔ مسلم یونیورسٹی۔ مسلم ڈپوٹیشن شملہ (اسی موقع پر پہلی بار انھوں نے اور میں نے ترکی ٹوپی پہنی۔ اس حکم کی تعمیل میں کہ شملہ میں ریل سے سب ڈپوٹیشن کے ارکان ترکی ٹوپی پہنے برآمد ہوں) ندوۃ العلما۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس۔ وقف کرنال۔ اور مسلم لیگ میں مسلسل اُن کے ساتھ کام کیا۔ یہی اصول اور انداز عمل پایا اور ہر موقع پر اور ہر معرکہ میں پایا۔ منشی صاحب کا جو استقلال جوان اولاد کی وفات اور بعض عظیم الشان مالی نقصانوں میں دیکھا وہ حیرت خیز اور سبق آموز تھا۔

مذہب کے سخت پابند تھے۔ نماز، روزہ، اوراد و وظائف پر پورے عزم سے ثابت قدم۔ عقائد میں مستحکم، یہ اثر تھا حضرت پیر و مرشد کے فیض کا اور منشی امتیاز علی صاحب کی تربیت کا۔

نہایت فیاض تھے۔ عزیزوں، ملنے والوں، صادر وارد، حاجتمندوں۔ غربا و مساکین کی خدمت میں علانیہ اور خفیہ برابر سرگرم رہتے۔ اُن کی عظیم الشان کوٹھی کا ایک حصہ گویا بورڈنگ ہاؤس تھا جو طلبا کے لئے مخصوص تھا متعدد مستقل ٹھہر کر تحصیل کرتے۔ بعض امتحانوں کے موقع پر آتے تیاری کرتے۔ امتحان دیتے

پچلے جاتے۔ اور یہ سب کے سب منشی صاحب کے مہمان ہوتے۔

ایک حصہ کوٹھی کا عزیزوں۔ مہمانوں۔ دوستوں کے تصرف میں رہتا عارضی بھی مستقل بھی۔ دوستی اور دوست نوازی منشی صاحب کے اوصاف میں یوں نمایاں تھی جیسے آفتاب کی کرنیں۔ ہر موقع پر ہر معرکہ میں وہ دوستی کسوٹی پر پوری اترتی محبت پیکر مجسم بن کر سامنے آجاتی۔ بہت کچھ لکھ گیا۔ پھر بھی قلب اور قلم دونوں کہتے ہیں کہ کچھ نہیں لکھا۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت اُن پر ہو۔ ایک نمونہ تھے قدیم پاکیزہ اخلاق۔ وضعداری۔ حسن مذاق۔ شائستگی۔ دوستی اور اسلامی زندگی کا۔

باوجود کمزوری اور اعزار کی ممانعت کے اخیر سفر علی گڑھ کا مسلم یونیورسٹی کانووکیشن اور کانفرنس کے اجلاس سالانہ میں شرکت کے لئے کیا۔ یہی سفر صبر آزما اور سفر آخرت ثابت ہوا۔ واپسی میں بریلی میں مرض کا حملہ ہوا جو پیام وفات لایا۔ عمر ۷۵ برس کی ہوئی۔ ہمیشہ تندرست رہے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

وفات منشی صاحب مرحوم ۵ ربیع الآخر سنہ ۱۳۶۲ھ مطابق ۱۲ اپریل سنہ ۱۹۴۳ء روز چہار شنبہ ساڑھے ۸ بجے صبح۔

(کانفرنس گزٹ بابتہ یکم جون سنہ ۱۹۴۳ء)

دیوانِ عاشق دہلوی

(تلمیذ امیر خسرو دہلوی)

میرے مختصر کتاب خانہ میں اس دیوان کا ایک قدیم نوشتہ نسخہ ہے۔ تین ضخیم تذکرۃ الشعراء عاشق دہلوی کے ذکر سے خالی ہیں۔ دو قلمی (ریاض الشعراء والہ داغستانی، مجمع الغرائب احمد علی سندیلوی) ایک مطبوعہ (مجمع الفصحا، رضا قلی خاں متخلص بہ ہدایت) دیوان خط اور کاغذ دونوں کے لحاظ سے پرانا لکھا ہوا ہے۔ مگر سنہ تحریر نہیں اس لئے کہ نسخہ ناقص ہے۔

عنوان پر درج ہے۔ "دیوان عاشق دہلوی تلمیذ مولانا حضرت امیر خسرو دہلوی طوطی ہند" اس کے نیچے مہر ہے بخط نستعلیق خوشخط۔ اُس میں نام "عبدہ زین العابدین" درج ہے۔ تقطیع چھوٹی $8\frac{1}{2}$ - ۵ انچہ ہے

تعداد اوراق موجودہ ۸۲ ہے۔ اور تلمذ کا ثبوت اشعار ذیل سے ہوتا ہے ؎

عاشق ایں رنگ سخن را ازکجا یافتہ است — ایں ہمہ از چمن خسرو چیدہ گل لعل

ایک قطعہ امیر خسرو کی شان میں لکھا ہے اُس کا پہلا شعر ہے ؎

چو خسرو شاعرے از ہند برخاست — کہ قدر شاعران اصفہان کاست

مقطع ہے ؎

ہمینش بس دلیل پیشوائی — کہ عاشق پیرو گفتار او راست

اس دیوان کا قیاساً زیر مطالعہ مؤلف رہنا محسوس ہوتا ہے بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ بقلم مصنف لکھا ہوا ہے۔ قراین یہ ہیں:۔

خط کی روش دو قسم کی ہے شفیعا اور نستعلیق۔ بسا اوقات نستعلیق میں شفیعا کا رنگ آجاتا ہے۔ ورق ۳۴ کی پوری غزل ملاحظہ ہو جو نستعلیق شفیعائی ہے۔ شعر ”محتسب دوش“ الخ میں لفظ ’مینائے‘ اور ’مستان‘ اور اگلے شعر میں لفظ ’ی زخم‘ کی تحریر میں شفیعائی رنگ نمایاں ہے۔ نیز ورق ۴۷ کی پہلی پوری غزل میرے دعوی کی شاہد ہے۔ ورق ۷ کا چھٹا شعر ملاحظہ ہو پہلا مصرعہ نستعلیق ہے اور دوسرا مصرعہ شفیعائی۔ قلم اور روشنائی اس شعر اور اگلے شعر کی ایک ہے۔ ورق ۶۰ کا چھٹا شعر نستعلیق شفیعائی ہے۔ گویا کاتب دونوں قسم کی تحریر پر پوری قدرت رکھتا ہے عموماً بعض مصرعوں یا الفاظ کی تبدیلیاں بخط شفیعائی ہیں کہیں کہیں بعض الفاظ یا مصرعہ کی تبدیلی بخط نستعلیق بھی ہے۔

مصرعہ یا الفاظ کی تبدیلی سے مضمون میں بلندی اور چستی پیدا ہو جاتی ہے اس طرح یہ تبدیلی اصلاح ہے نہ تصحیح۔

پہلے نوشتہ کو قلم زد کرکے دوسرے الفاظ بدلنا مصنف ہی کر سکتا ہے دوسرا شخص اصلاح تو کر سکتا ہے مگر قلم زد کرنے کا حق حاصل نہیں ورق ۷ ملاحظہ ہو مصرعہ ”چگویم دگر مطلبے نیستم“ بخط شفیعائی قلم زد ہے بجائے اس کے حاشیہ پر قلم روک کر یہ مصرعہ تحریر ہے ”بناشد دگر غیر ازیں مطلبم“ ورق ۱۶ کی پشت پر یہ شعر بھی ملاحظہ ہو۔

درد یک چشمے کند چشم دگر را دردناک
ہمنشیناں ایدرد و رنج دیدن مشکل ست

ثانی مصرعہ بغیر قلم زد کئے اس طرح تبدیل کیا ہے "مردم یک خانہ را در رنج دیدن مشکل ست"۔ ورق ۲۱ پر "عاشق بہشت را نہ پسندد مگر بہش" کو بدل کر "عاشق بہشت را نہ پسندید بہرا و" بنایا ہے مگر پہلا مصرعہ بھی قلم زد نہیں۔ ورق ۴۰ پر۔

خار خارے بہ دل از رشک فتادہ است مرا
تا بہ طرف کلہت جائے گزیدہ گل لعل

اس شعر کا پہلا مصرعہ اس طرح بدلا ہے جو یقینی اصلاح ہے نہ تصحیح۔ دیکھو مصرعہ کتنا بلند ہوگیا۔ ۶

"خار خارے بہ دل خون شدہ ام افتادہ است"

نمونۂ کلام

زہے لبت بشکر خندہ راحت جانہا
گلِ عذار تو رشکِ گل و گلستانہا

لبت چو گاہِ تکلم گہر بیفشاند
شود پر از گہر آبدار دامانہا

دمیکہ سرو روانِ تو جلوہ گر گردد
زچوبِ خشک دہد یاد سرو بستانہا

چہ فتنہ است ندانم بچاکِ دامانت
کہ چاک گشتہ کساں را ز او گریبانہا

تبسمت نمکے تازہ بر جراحت ریخت
کہ ریختند بخاک سینہ نمکدانہا

دو اے درد دل ما نہ بے دوائیہاست
چرا کشیم عبث منتے ز درمانہا

سرے کہ خاکِ رہ دوست گشت چیں عاشق
سرے ندارد با ساز و برگ سامانہا

اس شعر کے ساتھ امیر خسرو کا یہ شعر پڑھو استاد و شاگرد کی یک رنگی محسوس ہوگی۔

خسرو نامی ست و مطرب تو مستیار سر خوش
ہاں بر چنیں نشاطے یک رقص عاشقانہ

آمد بہار خرم ساغر کشاں مبارک
دلہا ز غم سبک گرد رطل گراں مبارک

از ابر سایہ افگن شد تازہ صحن گلشن
گردند عندلیباں بر باغباں مبارک

مشاطۂ بہاراں رخسار گل بیاراست
آئینہ گشت شبنم ای بلبلاں مبارک

باراں فگند روغن اندر چراغ لاله
شد دشت در چراغاں بر شب رواں مبارک

ساقی پیاله در کف مطرب نشسته با دف
خیلِ طرب زده صف اهلِ جهاں مبارک

باده غذای روح است می باعث فتوح است
هاں ساعت صبوح است پیرِ مغاں مبارک

زاهد بیا به گلشن برچیں ز زهد دامن
بشنو ز کوی و برزن بر می کشاں مبارک

شیخ ریاے امروز از زهد توبه بنمود
خرقه بمی بیالود میخوارگاں مبارک

عاشق بتِ تو مست ست جام عیش بدست ست
بستاں پیاله از وے کن نوش جاں مبارک

قرهٔ اشکبار را نازم
رگِ ابر بهار را نازم

نیست در اختیار صبر و خرد
دل بے اختیار را نازم

غنی از سیر لاله زارم کرد
سینهٔ داغدار را نازم

کار ما را بکشتی بگذاشت
گردشِ چشم یار را نازم

خاک گردید و جز بخاک نه ساخت
عاشق خاکسار را نازم

متفرقات

دریا کشیم و چرخ نزیبد ایاغ ما
گم گشته ایم و خضر نیابد سراغ ما

یکے گل چید از بستاں یکے گلدسته می بندد
تو اے نازک بدن جائے گل و گلدستهٔ ما را

برافتد چوں نقاب از ماه رویت
نیارد دید چشم کس بسویت

دمد از هر سر خارے گل مطلب برهش
به نهد هر که براه طلبت گامے چند

در دل از یاد رخت بحر تجلی موج زد
جوششِ نورست از فوارهٔ مژگان ما

مکن فکر علاج و در کمالِ درد کوشش کن
که چوں شد درد کامل خود بخود درماں شود پیدا

عاشق از تلخی غم فرہاد دار | مرگ را بر خود چہ شیریں می کنی
نامم ہر کہ بہ پرسد گویم | عاشقِ زارے سینہ فگارے

(رسالہ معارف اعظم گڑھ بابتہ ماہ رمضان المبارک ۱۳۶۵ھ)

شاہی کتاب خانوں کی کتابیں

(کتاب خانہ حبیب گنج میں)

ربیع الاول سنہ حال کے "معارف" میں ایک جملہ "خطبۂ صدارت شعبۂ علوم و فنون" کے ضمن میں درج ہے "علی گڑھ بھی ایک ایسے ہی شایق ...... کا مسکن ہے، جن کے حبیب گنج میں لکھنؤ، لاہور، دلی اور دکن کے انمول موتی ہیں"۔ اس متن کی شرح میں آج اُن کتابوں کا جائزہ لیا جاتا ہے، جو مختلف شاہی کتاب خانوں کی میرے یہاں ہیں۔

(۱) کلام اللہ المجید کے پانچ ورق بخط کوفی ۱۸۴۲ء میں جب لارڈ ایلنبرا کے عہد میں ملک سندھ کا الحاق ہوا تو وہاں کے کتاب خانے سے ایک کلام مجید کے نسخہ کے پچاس یا ساٹھ ورق مال غنیمت میں کلکتہ آئے۔ یہ نسخہ مختلف بادشاہوں کے کتاب خانوں میں رہ چکا تھا جن کی مہریں اور دستخط اُس پر ثبت تھے منجملہ اُن کے شاہ جہاں بادشاہ کے قلم کی یہ عبارت درج تھی:

"بخط شاہ مرداںؑ بہ یک ہزار مہر طلائی ہدیہ نمودہ شد"

شاہ جہاں کی مہر بھی تھی۔ مولوی مسیح الدین خاں صاحب علوی رئیس کاکوری اس زمانے میں نواب گورنر جنرل کے میر منشی تھے مولوی صاحب موصوف نے گورنر جنرل کی اجازت سے یہ پانچ ورق بطور تبرک اپنے جدِ امجدؓ کے لے لئے۔ مولوی صاحب کے خاندان سے حبیب گنج پہنچے۔ حالات بالا کی تصدیق بقلم

مولوی صاحب موصوف ان اوراق کے ہمراہ داخل کتاب خانہ حبیب گنج ہوئی ہے۔

(۲) حصن حصین امام جزری سنہ ۸۹۰ھ کا لکھا ہوا نسخہ وفات مصنف کے ستاون برس بعد کا لکھا ہوا میرک شاہ مرحوم محدث مشہور کے قلم کے حواشی، خط نسخ جید، مطلا، کاغذ سمرقندی، شاہزادہ اعظم شاہ کی پیشکش عالمگیر بادشاہ کے حضور میں سنہ ۱۱۱۷ھ م سنہ ۵۰ جلوس میں عالمگیر بادشاہ کے قلم کا صاد ثبت ہے شاہی امرا و تحویلداران کتاب خانہ کی مہریں ہیں، جائزے ہیں۔

(۳) مثنوی گوے و چوگان ملا عارفی، پوری کتاب استاد مشہور ملا میر علی کاتب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی خط بھی زمانہ کمال خطاطی کا، بمقام ہراۃ سنہ ۹۲۶ھ میں لکھی گئی۔ اول یہ کتاب قطب شاہیوں کے کتاب خانہ میں رہی، جب عالمگیر بادشاہ نے گولکنڈہ فتح کیا تو تیموری کتاب خانہ میں داخل ہوئی، کتاب پر شاہی کتاب خانے کی جو عبارت درج ہے وہ ان بیانات کی شاہد ہے۔ گردش زمانہ سے قیمت کتاب میں جو تغیرات ہوئے، وہ عبرت افزا ہیں۔ عالمگیری کتاب خانہ کا اندراج قیمت دو ہزار روپیہ ہے۔ سنہ ۱۱۹۷ھ میں دو سو دس روپے میں فروخت ہوئی اس کے بعد سنہ ۱۲۶۲ھ میں قطب الدولہ نے ڈھائی سو روپے میں خریدی، یہاں سنہ ۱۳۲۱ھ میں ایک سو ستر روپیہ میں آئی۔

(۴) مثنوی مولانا روم سنہ ۷۱۲ھ کا لکھا ہوا نسخہ مولانا روم کی وفات سنہ ۶۷۲ھ میں ہوئی اس طرح یہ نسخہ وفات مولانا کے چالیس برس بعد لکھا گیا، جہاں تک علم ہے اس سے زیادہ قدیم نسخہ میونخ کے کتاب خانے میں ہے جو سنہ ۶ھ کا لکھا ہوا ہے، برٹش میوزیم کا نسخہ سنہ ۷۱۸ھ کا ہے کتاب خانہ حبیب گنج کا نسخہ عالمگیر بادشاہ کے کتاب خانے کا ہے اس پر چار مہریں بادشاہ ممدوح کی ہیں، جن میں الفاظ "محمد اورنگ زیب بادشاہ" ثبت ہیں، یہ مہریں مدور ہیں۔

(۵) لوائح مولانا جامی، عنوان طلائی، لاجوردی، مطلا و مذہب، کاغذ دفتی زرافشاں، حاشیہ زرافشاں، مختلف رنگ، خط استادانہ، کاتب محمد محسن الہروی، محررہ ذی قعدہ سنہ ۱۰۰۳ھ، لوح کتاب پر حسب ذیل عبارت درج ہے:

"لوائح بابتہ گذرانیدہ میر معز، چہاردہم ربیع الثانی سنہ ۱۰۹۶ھ داخل کتاب خانہ سرکار عالی شد"

اس عبارت کے اوپر "قابل خاں خانہ زاد عالمگیر بادشاہ" کی مہر ہی۔ ایک اور اندراج سے معلوم ہوتا ہی کہ امیر الامراء شائستہ خاں کے احوال کی بابتہ سنہ ۴۱ جلوس میں داخل ہو کر محمد باقر کی تحویل میں سپرد کی گئی۔ اس کے بعد متعدد تحویلوں اور جائزوں کی عبارتیں درج ہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہی کہ سنہ ۱۰۹۶ھ (مطابق سنہ ۲۷ جلوس) میں امیر الامراء شائستہ خاں کو مرحمت ہوئی اُن کے انتقال کے بعد سنہ ۴۱ جلوس میں مکرر داخل کتاب خانہ شاہی ہوئی ایک اور اندراج سے سنہ ۲۳ جلوس میں بھی داخل کتاب خانہ شاہی ہونا واضح ہوتا ہی۔

(۶) منہاج العابدین امام غزالیؒ چھوٹی تقطیع، متن مفروش بہ طلا، خوشخط نسخ کاغذ باریک چکنا شاہزادہ محمد معظم شاہ عالم بن عالمگیر بادشاہ غازی کے کتاب خانے کی، آخر میں شاہزادہ ممدوح کی مہر ہی جو بالآخر تخت پدری پر بیٹھے۔

(۷) کلام مجید تقطیع اوسط دو صفحہ اول طلائی مینا کار، اعلیٰ نمونہ تذہیب، کاغذ گجراتی زرافشاں، سورتوں کے نام مطلا، بہ خط ولایت، کاتب ابوالفتح۔ فرخ سیر بادشاہ کے کتاب خانہ کا یہ نسخہ ہی۔

(۸) شرح قصیدہ لامیۃ العجم، بخط نسخ غیر جید، بیت اللہ کے سامنے سنہ ۱۰۰۲ھ میں لکھی گئی، آخر میں عبارت درج ہی جس کا خلاصہ یہ ہی کہ "بحکم خزانہ مولانا السید الجلیل الملک الاصیل ..... مولانا سید ادریس (الفاظ بخط طلائی) بن حسن اعلی اللہ کلمتہ یہ کتاب لکھی گئی (اس کا تعلق خاندان شریف مکہ سے ہے) انقلاب زمانہ کے بعد یہ نسخہ میر غلام علی آزاد بلگرامی کے کتاب خانہ میں بھی رہا۔

(۹) دیوان خواجہ آصفی، خوشخط ایرانی قلم، جدول مطلا و مذہب، بین السطور مطلا، کاغذ دفتی حنائی رنگ، دو صفحہ اول طلائی کار لاجورد۔ عبارت ذیل اس پر درج ہی:۔

"کتب خانہ مبارک سلطان محمد صفوی، ملقب بہ سلطان محمد خدا بندہ دام ملکہم و حشمتہم
در سنہ ۹۴۵ قمری فقیر اسمٰعیل ترکان تحویلدار"۔

اس کتاب پر سر گور اوسلے کے بخط انگریزی دستخط ہیں۔

(۱۰) صحیح بخاری المجلد الاول، خط عرب۔ کاغذ سمرقندی۔ سنہ کتابت درج نہیں۔ آخر میں دو تحریریں سنہ ۷۷۴ھ کی ہیں، لوح کتاب پر طلائی غمسے میں عبارت ذیل خط نسخ شنگرفی جلی میں لکھی ہوئی ہی۔

"جلد اول صحیح بخاری بخط نسخ عرب در آخر کتاب خط حضرت شیخ المحدثین عفیف الدین گازرونی ست

جلد سیاہ ترنج سرخ و جدول طلا نو بستہ با بتہ فتح شیر محمد آباد المعروف بہ بیدر جمع کتاب

خانہ معمورہ عالم پناہ ابراہیم عادل شاہ خلد اللہ ملکہ شدہ - ۹ر شعبان ۱۰۲۸ھ"

شیخ عفیف الدین گازرونیؒ شارحین صحیح بخاری میں سے ہیں کشف الظنون میں ان کا اور ان کی شرح کا ذکر ہے۔

(۱۱) مشکوٰۃ المصابیح - خط نسخ جید - کاغذ باریک چکنا - مطلا و مذہب - فہرست بخط طلائی - محشی۔ ۸۸۸ھ میں شہر بیدر میں لکھی گئی - کاتب ابو سعید بن حسین تاجر مشہور بہ مال امیری - عبارت لوح کا ایک حصہ محو شدہ ہے - تاہم اس قدر واضح ہے کہ یہ کتاب سلطان محمود شاہ بہمنی سلطان بیدر کی نذر کی گئی، وفات محمود شاہ بہمنی ۹۲۴ھ (فرشتہ)

(۱۲) تفسیر جلالین، تقطیع کلاں، مطلا و مذہب، خط کلام اللہ نسخ شنگرفی خط تفسیر شکستہ تعلیق ۱۰۷۹ھ میں رضی الدین محمد تفرشی نے دار السلطنت حیدر آباد میں بعہد تانا شاہ لکھی، اس تفسیر میں دو جگہ سلطان ابو الحسن قطب شاہ عرف تانا شاہ کے حاشیے ہیں۔

(۱۳) مثنوی مجمع البحرین، قصہ ناظر و منظور کاتبی نیشاپوری، تقطیع خرد خوشخط، خط سمرقندی قدیم کاغذ سمرقندی، اس پر تین سلاطین قطب شاہی کی مہریں ہیں، ایک سلطان محمد قطب شاہ کی ہے

مہر سلیماں زحق گشتہ میسر مرا	نقش نگیں دل شد صفدر حیدر مرا

مہر کے درمیان یہ الفاظ ہیں "العبد سلطان محمد قطب شاہ"

دوسری سلطان محمد ابراہیم قطب شاہ کی ہے

کسے کہ ساخت نقش نگیں مہر آل عظیم	بود سپہر کرم قطب شاہ ابراہیم

تیسری محمد قلی قطب شاہ کی اس میں درج ہے "العبد محمد قلی قطب شاہ"

(۱۴) دیوان امیر شاہی سبزواری، خوشخط نستعلیق جلی قلم - کاغذ گلابی - تقطیع اوسط - کاتب فتح چند - بے تاریخ کتابت - اس پر تین مہریں ہیں ایک مربع کلاں بخط سیاہ، نواب آصف الدولہ بہادر کی - دوسری

مہر چہارم نصیر الدین حیدر کی۔ تیسری امجد علی شاہ کی (دونوں خوشخط شنگرفی) نواب آصف الدولہ کی مہر کی عبارت "یحییٰ خاں بہادر ہزبر جنگ آصف الدولہ"۔ شاہ نصیر الدین حیدر کی مہر کی عبارت ہے

خوش ست مہر کتب خانۂ سلیمان جاہ　　بہر کتاب مزین چو نقش بسم اللہ"

امجد علی شاہ کی مہر ہے

ناسخ ہر مہر شد چوں شد مزین بر کتاب　　خاتم امجد علی شاہ زماں عالی جناب

(۱۵) بوستان شیخ سعدی شیرازی، خوشخط، جدول زرد و سرخ۔ مورخہ ۱۲۰۶ھ بے اسم کاتب شاہان اودھ کی مہریں، ایک نصیر الدین حیدر کی۔ دوسری امجد علی شاہ کی۔ تیسری واجد علی شاہ کی۔ عبارت مہر واجد علی شاہ ہے

ثابت و پر نور بادا تا فروغ آفتاب　　خاتم واجد علی سلطان عالم بر کتاب

اس پر جان بیلی ریزیڈنٹ لکھنؤ کے دستخط و مہر بھی ہے دستخط انگریزی ۱۸۱۰ء مہر بخط نسخ طغرائی۔

(۱۶) تاریخ فارس۔ خط جلی صاف۔ کاتب خانہ زاد دیلدگاہ آسمان جاہ سلطانی حسین علی۔ تاریخ کتابت ۱۲۳۸ھ رائٹ پائر نامی ایک سیاح پیٹربرگ سے فتح علی شاہ قاجار کے عہد میں ایران گیا۔ تین برس وہاں رہا۔ اس کا سفرنامہ ہے۔ اس میں علاوہ ایران کے روسی شہروں کا بیان بھی آگیا ہے۔

غازی الدین حیدر بادشاہ لکھنؤ کے حکم سے محمد صالح نے کرشن موہن انگریزی داں کی مدد سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ دیباچہ میں لکھا ہے کہ

"ہر روز جس قدر ترجمہ کیا جاتا شاہی ملاحظہ میں پیش ہوتا۔ خود بدولت کی اصلاح کے بعد درج کتاب ہوتا اسی طرح ساری کتاب شاہی اصلاح سے مزین ہے۔"

اس نسخے پر شاہان اودھ کی چار مہریں ہیں۔ ایک نصیر الدین حیدر کی۔ دو امجد علی شاہ کی ایک لوح پر۔ ایک آخر میں۔ چوتھی واجد علی شاہ کی۔ متعدد جائزے ہیں۔

شاہی کتاب خانوں کا گوشوارہ جن میں مذکورہ بالا کتابیں رہیں

سلاطین تیموریہ ہندوستان (سات) شاہان صفویہ ایران (ایک) شریف مکہ (ایک)، سلاطین بہمنیہ بیدر (دو) قطب شاہی (تین)

عادل شاہی (ایک)، بادشاہان اودھ (تین)

جملہ ۱۸ دو کتابیں شمار میں مکرر ہیں جو دو دو کتاب خانوں میں رہیں۔

تازہ فتوح

"شاہی نسخوں" کے سلسلے میں ایک تازہ فتوح مضمون بالا لکھنے کے بعد حاصل ہوئی۔ قدردانان معارف کی ضیافت طبع کے لئے کیفیت عرض کرتا ہوں۔

یہ مطول علامہ تفتازانی کا نسخہ ہے۔ مکمل محشّٰی اور خوشخط جلی لکھا ہوا۔ لوح کتاب پر جہانگیر بادشاہ کے ہاتھ کی یہ عبارت ہے۔ لوح کا اخیر حصہ کرم خوردہ ہے۔ جو الفاظ باقی ہیں وہ کشادہ اور جو کل یا کسی قدر کرم خوردہ ہیں وہ قیاساً قوسین کے اندر درج کئے جاتے ہیں۔

۱	مطول در علم فصاحت	(و بلاغت)
۲	بخط سید المحققین	(و سند)
۳	المدققین میر سید	(شریف)
۴	جرجانی......بلے	(بعد ملا)
۵	خطہ داخل کتابخانہ ۲۱	(ین نیاز)
۶	مند درگاہ الٰہی شد سنہ	(۱۰ جلوس)
۷	مطابق سنہ ۱۰۲۳ ہجری	(حررہ محمد)
۸	نورالدین جہانگیر ابن	
۹	اکبر بادشاہ غازی	

۱۰۲۱ [illegible]

شاہی عبارت کے علاوہ تیرہ مہریں اور متعدد "عرض دیدہ" لوح اور خاتمے کے ورق پر ہیں۔ مہروں میں سے چھ شاہی امراء کی ہیں۔ شاہ جہانی۔ عالمگیری اور داراشکوہی۔ شاہ جہانی امراء میں صادق خاں عثمان خاں ہیں۔ عالمگیری میں عبداللہ خاں۔

اس موقع پر دربار جہانگیری نے ایک مغالطہ کھایا ہے۔ آخر کتاب کی عبارت ہے۔ "تم الکتاب بعون اللہ الملک الوہاب علیٰ ید العبد الضعیف سید شریف یوم الجمعۃ الرابع من شہر رمضان سنۃ تسع وثلاثین وثمانمائۃ (محوطہ) سمرقند حماہا اللہ عن الآفات۔ مغالطہ یہ ہے کہ میر سید شریف جرجانی کی وفات بالاتفاق ۸۱۶ھ میں ہے۔ (دیکھو شذرات الذہب[1]، کشف الظنون[2]۔ طبقات شاہ جہانی[3]) اس طرح یہ نسخہ ان کی وفات کے تیئیس[23] برس بعد لکھا گیا۔ کاتب کی ہمنامی نے اُن کو میر سید شریف کا مرتبہ دیا اور بادشاہ نے جرجانی کا اضافہ کرکے سند بخشدی۔ اگر علامہ جرجانی کی تاریخ وفات پیش نظر ہوتی تو غالباً یہ مغالطہ نہ ہوتا۔

میرے پاس بھی یہ نسخہ دو ندرتیں لے کر آیا تھا۔ جہانگیر بادشاہ کے ہاتھ کی عبارت، میر سید شریف جرجانی کا نوشتہ۔ تحقیق سے ایک ندرت قایم رہی۔ دوسری معدوم ٹھہری۔ خیر ایک ندرت بھی سو خوبیوں سے بڑھ کر ہے۔

(رسالہ معارف اعظم گڑھ بابتہ ماہ ستمبر ۱۹۳۷ء)

تقریظ

(بر کلام محوی)

ایک وقت تھا کہ شیراز اور اصفہان کی باد بہاری فلک نما پہاڑوں کو طے کرکے ہندوستان کے میدانوں کو بھی رشک گلزار بناتی تھی۔ یہ بہاریں صدیوں تک آتی اور ہندوستان کو چمنستان بناتی رہیں۔ یہ مبالغہ نہیں واقعہ ہے۔

لوگ کہیں گے گل و بلبل شمع و پروانہ کی داستانوں میں کیا رکھا تھا۔ یہ وہ کہیں گے جو حقیقت سے بیگانہ ہیں۔ واقعات سے ناآشنا۔ ع چوں ندید ند حقیقت رہ افسانہ زدند۔

ادب فارسی نے اہل ہند کے دل و دماغ کے شگفتہ کرنے۔ معاملہ فہم اور حقیقت سنج بنانے میں جو حصہ لیا وہ بہت بڑا حصہ لیا اُس کے آثار شکر ہے اب بھی بہت کچھ باقی ہیں۔

عمارتوں میں تاج گنج۔ دلی کی جامع مسجد مثالاً لو۔ معاملہ فہمی میں ٹوڈرمل اور ابوالفضل کو لو۔ بالآخر سب

کا مجموعہ شاہان تیموریہ کو لو وہ سب کے سب فارسی ادب کے فیض یافتہ تھے جن کی ممنون ایجادیہ عمارتیں یہ صنعتیں اور اراضی کے بندوبست وغیرہ بیسیوں ترقی انسانی کے سرچشمے تھے۔

شیر شاہ جس نے اپنی جہاں بانی کی قوت سے ایک عالم کو حیرت میں ڈالا ہی اُس کے مورخ لکھتے ہیں کہ گلستاں اور بوستاں کی اکثر حکاتیں اُس کو ازبر تھیں اور اُس کی خلوت وجلوت اور رزم و بزم کی رفیق و رہنما۔

آج کشمیر کی بہاریں دنیا کو کھینچ رہی ہیں۔ گوناگوں نفعے اُس سے حاصل کئے جا رہے ہیں۔ تاریخ دیکھو سارا کرشمہ فارسی ادب کے فیض کا ہی۔ چالیس برس کی مسلسل محنت میں سلطان زین العابدین نے کشمیر کو کشمیر بنایا۔ وہ فیض لایا تھا سمرقند و بخارا سے۔

اس کو یاد رکھنا کہ فارسی کی پشت وپناہ عربی تھی وہاں سے فیض لے کر فارسی دنیا کو فیض پہنچاتی تھی۔

آج انگلستان جو اہتمام مولنائے رومؒ کی مثنوی کی اشاعت کا کر رہا ہی وہ زندہ مثال فارسی ادب کے فیض کی ہی۔ فارسی ادب کی حیات بخشی کا نادر ثبوت وہ فضا ہی جو اس ادب کی فیض باری سے سرزمین ہند میں پیدا ہوئی۔ اس فضا کی روح پروری سے سارے مذہبی اور فرقہ داری اختلاف صلح سے بدل گئے۔ ہندو۔ مسلمان۔ شیعہ۔ سنّی سب کے سب ایک رنگ میں رنگ گئے۔ رنگ پوڈر کا نہیں محبت اور یک جہتی کا۔ گجراتی۔ مرہٹی۔ ہندی۔ بنگالی۔ گرمکھی وغیرہ جس زبان کو لوگے ادب فارسی کی گرمی سے اُس کی نبض میں جنبش پاؤگے۔ آج کل کی تصانیف نہیں اُس زمانے کی تصانیف پڑھو اس رنگ بلکہ بیرنگی کا واضح ثبوت پاؤگے۔

عارف رومؒ کی دو بیتیں بر سبیل تنزل یہاں سبق آموز ہوں گی ؎

چونکہ بیرنگی اسیر رنگ شد   موسی و فرعون اندر جنگ شد

چوں بہ بیرنگی رسی کان داشتی   موسی و فرعون دارند آشتی

حال و ماضی پر نظر ڈال کر یہ شعر مکرر پڑھو۔ مرقع عبرت نگاہ کے سامنے پھر جائے گا۔

افسوس کہ دیکھتے دیکھتے اس بہار پر خزاں آگئی۔ وہ فضا بھی مٹ گئی۔ خاقانی و انوری کا درس ہے

مگر مندرس، مٹا ہوا برائے نام بلکہ نام کو نہیں۔ کیوں؟ ادبی فضا نہیں۔

نتیجہ آنکھوں کے سامنے۔ جو لوگ زمانۂ حال کو بنا گئے اُن کو آنکھیں ڈھونڈتی ہیں۔ نہیں پاتیں۔ راجہ رام موہن رائے۔ پنڈت اجودھیا ناتھ۔ سرسید احمد خاں۔ محسن الملک اور وقار الملک آج کہاں ہیں اور اُن کے نہ ہونے کو ملک شدت سے محسوس کر رہا ہے۔ اس بے کیفی کی تاریکی میں اگر کسی طرف سے روشنی آجائے تو اول حیرت اُس کے بعد مسرت ہوتی ہے۔

یقین کیجئے کہ جب مولوی مسعود علی صاحب محوؔی میرے مکرم کا خط آیا کہ فارسی کلام اُن کا طبع ہوا ہے اور اس کا نسخہ میرے پاس آئے گا تو مجھ کو بھی اول حیرت اُس کے بعد مسرت ہوئی۔ حیرت اُس پر کہ اب بھی زبان قلم پر فارسی کلام کے الفاظ آتے ہیں۔ مسرت اس پر کہ ابھی کچھ چنگاریاں باقی ہیں کیا عجب کہ کسی روز بھڑک اٹھیں، دلوں کو گرما دیں، خرمن جنگ و جدل کو پھونک دیں۔

اس مجموعہ کا نام "نذر عقیدت" ہے۔ اس کا افسوس ہے کہ جہاں استادان سلف کی ادبی روش میں جناب محوی محو ہیں وہاں ائتلاف کلام میں بھی اُن کے قدم بہ قدم چلنا پسند کیا۔ عرفی نے ایک مجموعہ کھویا تھا تو یہ بھی کھو بیٹھے۔ نقصان یہ ہوا کہ غزل سے کلام خالی ہے۔ صدہا برس سے فارسی کا سرمایۂ ناز غزل ہے جس کو متاخرین کی نکتہ سنجی اور سحر آفرینی نے سحر حلال کا مرتبہ بخشا ہے۔ تصوف کی آمیزش نے اُس کو مثنوی و قصیدے کی صف میں جا بٹھایا ہے۔ صرف قطعات و قصائد اس مجموعے میں ہیں۔ اُن کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ اہلِ زبان کے انداز بیان اور طرز سخن کا گہرا مطالعہ شاعر نے کیا ہے۔ اور اس لئے فارسی ادب کا لطف اس کلام کو پڑھ کر حاصل ہوتا ہے۔

ایک خوش قسمتی محوی کی قابل رشک ہے۔ اُن کو مواقع ایسے ملے کہ جنھوں نے اُن کے کلام میں زندگی کی قوت اور واقعیت کی روح پھونک دی۔ حیدر آباد فرخندہ بنیاد میں عہد عثمانی خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ اُن کو نصیب ہوا اور متواتر ایسے موقعے آتے رہے کہ جو ادب فارسی کے فروغ کے مناسب بلکہ ہنگامہ گرم کن تھے محوی نے ہر موقعہ کی مناسب نظم ادیبانہ روش سے لکھی۔ خوبی یہ کہ مبالغہ کی پرواز سے عدم آباد میں نہیں بسایا بلکہ اسی دنیا میں وہ گروہ واقعات نظم کئے جن کی حقیقی شان اور رفعت مبالغہ کی محتاج نہ تھی اور اپنے زور

طبیعت اور لطف بیان سے مبالغہ سے زیادہ دلکشی پیدا کی۔ روانیؔ تاثیر اور بلاغت کے نمونے دکھائے۔

آخر میں اُس یک رنگی کو پھر یاد کرو جس کی داستان میں نے آغاز کلام میں چھیڑی تھی۔ اور محوی کا یہ فقرہ پڑھو اور میرے بیان کی تصدیق کرو۔

"اگر اعلیٰ حضرت خداوند نعمت بندگان عالی متعالی میر عثمان علی خاں آصف ہفتم خلد اللہ عمرہ وسلطنتہٗ سے خسرو اقلیم سخن کی نظر تربیت و اصلاح اور عالی جناب سر مہاراجہ کرشن پرشاد یمین السلطنت دام اقبالہٗ سے کہنہ مشق سخن گو اور سخن شناس کی دل افزائیوں کا اضافہ کر لیا جائے تو میرے مختصر سرمایۂ استعداد کا سرسری اندازہ ہو جائے گا"

آخر میں دعا ہے کہ محوی کی محنت بارآور ہو۔ اُن کے کلام کی اہل ملک قدر کریں۔ اور اُس سے فیض یکجہتی حاصل جس کا ملک آج اسی طرح محتاج ہے جس طرح پیاسا پانی کا بھوکا روٹی کا۔

تقریظ

(برمئے دو آتشہ)

نظم کے اقسام چہارگانہ۔ غزل۔ قصیدہ۔ مثنوی۔ رباعی میں قسم چہارم سب سے مختصر اور مشکل ہے۔ گویا اس رباعی کا مصرعہ چہارم ہے۔ غزل کے استاد سو دو سو [۲۰۰]۔ قصیدے کے بیسیوں۔ مثنوی کے دس بیس [۱۰، ۲۰]۔ رباعی کے پانچ سات [۵، ۷] گزرے ہیں۔ حضرت ابو سعید ابو الخیر۔ حکیم عمر خیام۔ مولانا سحابی نجفی۔ سرمد۔ ایک دو اور ہوں گے۔ یہ مطلب نہیں کہ رباعی کہنے والے اسی قدر ہیں۔ کلام استادی یہی ہے۔ شیخ علی حزیں کی رباعیوں کا حجم ایک دیوان کے برابر ہے مگر بہت شبہ ہے کہ ان میں سے چند میں بھی سحابی نجفی کے "دُر ہائے یتیم" کی آب و تاب ہو۔

سلہ یعنی اگلے ہم دموں کے فیض صحبت پر۔ ۱۲۔ شیرانی

وجہ زیادہ مخفی نہیں۔ رباعی کا وزن مخصوص ہے۔ زبان مخصوص۔ خیال پورا ہو۔ نادر ہو۔ توحید۔ حکمت یا عشق کا نچوڑ اس میں ہو۔ ان قیود کے ساتھ چاروں مصرعے باہم ایسے مربوط ہوں کہ ایک پھول کی چار پنکھڑیاں معلوم ہوں۔ قلم شکن یہ کہ چوتھا مصرعہ کڑی کمان کا تیر بن کر نکلے جو دل پر جاکر بیٹھے۔

خلاصہ یہ کہ ہر صنف سخن کی جان رباعی میں کھپانی پڑتی ہے۔ غزل کی تڑپ قصیدے کی متانت مثنوی کا تسلسل رباعی میں ہو۔ اس کے ساتھ رباعی کا مخصوص اختصار میدان سخن کو تنگ کرکے اشہب قلم کی کمر توڑ دیتا ہے۔ حاصل کلام عطرِ سخن رباعی ہے۔

نیشاپور کے میخانۂ قدیم میں ایک پیر میکدہ خیام تھا جس کے جام میں حکمت کا امتزاج ہوا۔ اس امتزاج سے نشہ دوبالا ہو کر جو رنگ لایا اُس کی جھلک اس بادۂ شیراز میں ہے ؎

ازاں افیوں کہ ساقی در مے افگند
حریفاں را نہ سر ماند نہ دستار

ممالک ایشیا اس نشہ سے جھوم ہی رہے تھے۔ یورپ بھی جام اول میں بیخود ہو گیا۔ افلاطون کدۂ بلگرام کے خم نشیں شوکت نے اس بادۂ کہن کو تازہ روانی بخشی اور دور جدید سے آشنا کیا یعنی نیشاپوری شراب اُردو کے کیمپ میں لنڈھائی۔ اس دور جدید سے نشہ کی رسائی دوبالا ہو گئی۔ اسی مئے دوآتشہ پر اس وقت ایک نظر ڈالنی ہے مبادا دامنِ طہارت پر دھبہ لگے۔ اس لئے ایک شعر اول سنا دیتا ہوں ؎

نہ من تنہا دریں میخانہ مستم
جنید و شبلی و عطار شد مست

خیام غم دنیا اور مصائب زندگی کو ساغر بادہ کی مدد سے فراموش یا گوارا کرنا چاہتا ہے۔ بے ثباتی دنیا کا نقشہ ہمہ وقت پیشِ نظر ہے۔ اس لئے وہ دل لگانے کے لائق نہیں نہ اُس کی مصیبتوں کا دردِ سر مول لیا جا سکتا ہے۔

یہاں تک خیام و حافظ کی حد مشترک ہے مگر حافظ کے رنگ میں رندی و مستی کا غلبہ ہے۔ اس لئے غزل کے رنگ میں ترنم ریز ہیں۔ خیام کے یہاں حکمت و فلسفہ کا انبار ہے اس لئے رباعی کے وقار سے گرانبار ہیں۔ اس گرانباری نے خود رباعی کے وقار کو بڑھا دیا اور مضمون خشک سے خشک تر ہو گیا۔

رباعیاتِ خیام کا ترجمہ اردو رباعی میں معلوم نہیں کس ستم ظریف نے یہ ستم ایجاد کیا۔ اوّل تو اردو

رباعی کا میدان فارسی سے بھی زیادہ تنگ ہے۔ انیسؔ و دبیرؔ اگلوں میں اور حالیؔ پچھلوں میں ایسے ہوئے کہ اُن کی رباعیاں مطبوع طبائع ہوئیں۔ اس پر طرّہ یہ کہ خیام کی رباعیاں ترجمہ کے لئے منتخب ہوئیں اردو میں اور رنگ ہو تو ہو مگر فلسفہ کا رنگ تو ہنوز مرہون بیرنگی ہے۔ غالب نے ضرور اس پر قلم اٹھایا مگر وہاں شگفتگی و رنگینی ہے۔ خیام کے یہاں رنگ صوفیانہ ہے اور اسی لئے ہوئے اور یہی فلسفہ کا اصلی رنگ ہے۔

لوگ اب تک یہ نہیں سمجھے ہیں کہ نظم کا ترجمہ نظم میں کیا معنی رکھتا ہے۔ ترجمہ موزوں ہو کر نظم بے لطف نثر بن جائے یہ ظلم ہے۔ حال میں ایک ادب شناس نے غزل خسرو ترجمہ کے واسطے پیش کی ترجمہ ہوا۔ موزوں ہوا۔ مگر نہ شعر تھا نہ تغزل۔ ترجمہ نگار کو چاہیے کہ اصل کلام میں غوّاصی کرے دُرِ مقصود کو تہ سے نکالے اپنے انداز سے سجائے۔ اور اربابِ نظر کے سامنے پیش کرے۔ جناب شوکت کے ترجمہ میں یہ مراتب ملحوظ ہیں ملاحظہ ہو۔

خیام
رفتیم و زما زمانہ آشفتہ بماند — با آنکہ زصد گہر یکے سفتہ بماند
افسوس کہ صد ہزار معنے دقیق — از بیخردی خلق ناگفتہ بماند

شوکت
مٹنے پہ بھی ہم سے خلق آشفتہ رہی — سلک گہر امید ناسفتہ رہی
جو منہ سے کہا اُسے نہ سمجھا کوئی — کہنے کی جو بات تھی وہ ناگفتہ رہی

"صد ہزار معنے دقیق" کے مقابلہ میں "کہنے کی جو بات تھی" ہر چند کہ لفظی ترجمہ نہ ہو مگر ذوق سلیم کہہ اُٹھے گا کہ وہی کہا کہ جو کہنا تھا۔ دوسرے مصرعہ کا ترجمہ کیسا بے لاگ ہو گیا ہے۔ اس نکتہ کو نہ بھولنا کہ اداسی کی لے اصل سے ترجمہ میں بڑھ گئی ہے۔

خیام
این کوزہ چو من عاشق زارے بودہ است — در بند سر زلف نگارے بودہ است
این دستہ کہ در گردنِ او مے بینی — دستیست کہ بر گردن یارے بودہ است

شوکت
غم ہجر کا میری طرح سہتا ہوگا — مے کیسی دل کا خون بہتا ہوگا
یہ دستۂ گردن صراحی بھی کبھی — ساقی کے گلے کا ہار رہتا ہوگا

شعر اول میں ترقی مضمون صاف عیاں ہے۔ عیاں راچہ بیان۔ "گلے کا ہار" کیا خوب محاورہ بندھ گیا

انگریزی ترجمہ میں یہ لطف پیدا نہ ہو سکا۔

خیام	ہر چند کہ رنگ و بوے زیباست مرا	چوں لالہ رخ و چو سرو بالاست مرا
	معلوم نہ شد کہ در طرب خانہ خاک	نقاش من از بہر چہ آراست مرا
شوکت	شمشاد سا قد ہی پھول سا چہرا ہے	لیکن اس رنگ و بو سے حاصل کیا ہے
	نقاش ازل نے اس نگارستان میں	تصویر بنا کے مجھ کو کیوں رکھا ہے

دونوں رباعیوں کے آخری مصرعوں کو باہم مقابل کرو۔ "نقاش من از بہر چہ آراست مرا۔" "تصویر بنا کے مجھ کو کیوں رکھا ہے"۔ تصویر کے مختلف پہلوؤں پر اول غور کرو۔ پھر دیکھو گے کہ خیام کے مصرعے میں وہ پہلو نہیں ہیں۔

خیام	ہر سبزہ کہ در کنار جوے رستست	گوئی ز لب فرشتہ خوے رستست
	ہاں بر سر سبزہ پا بخواری نہ نہی	کاں سبزہ بخاک لالہ روئے رستست
شوکت	ہیں سب لب جو میں لعل لب کے انداز	بھیگی ہیں مسیں ہوا ہے سبزہ آغاز
	اے سبز قدم گیاہ مرقد کو نہ روند	اس سبزہ پر سبزہ رنگ کرتے تھے ناز

ترجمہ کے دوسرے مصرعہ میں "بھیگی ہیں مسیں" کیا لطف دے گیا ہے۔ کیسے پاکیزہ الفاظ مل گئے۔ خیام کے دوسرے مصرعہ میں "گوئی" اور "لب" لطفِ سخن کو دوبالا کر رہے ہیں۔ مگر "لب جو" کے لئے "بھیگنا" جیسا مناسب واقع ہوا ہے اور "سبزہ آغاز" نے جو دلآویزی پیدا کی ہے اُس سے کیفیت کلام بہ مراتب بلند ہو گئی ہے۔ ترجمہ کے اخیر کے دونوں مصرعوں میں بھی سبزہ کی رعایت نے رباعی کو سراپا مرصع کر دیا ہے۔ اس خصوصیت میں انگریزی ترجمہ بالکل ماند ہے۔ اگر جناب شوکت سب رباعیوں کا ترجمہ کر سکے تو کچھ شبہ نہیں کہ سرمایہ اردو میں جواہر بے بہا کا اضافہ ہو گا۔

تقریر جلسۂ ٹرسٹیان

(منعقدہ ۲۷ اکتوبر ۱۹۲۰ء بمقام اسٹریچی ہال مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

جناب صدر انجمن، معزز حاضرین، اس جلسہ میں بار بار یہ کہا گیا ہے کہ کالج میں طلبا کی اسٹرائیک کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ ایک مذہبی فرض ہے "نیز یہ کہ" ہمارے دوست "دعوتِ حق" دینے کے واسطے تشریف لائے ہیں اور جس میں ذرہ برابر بھی ایمان ہے وہ ضرور ان کی دعوت قبول کرے گا۔ یہ تحریک اتنی بار مذہبی بتائی گئی کہ میں اس کو اپنا فرض محسوس کرتا ہوں کہ اس کی نسبت جو میرا خیال ہے اس کو ظاہر کروں۔ آپ اس کا یقین فرمائیں کہ میں وہی بیان کروں گا جو میرا دلی اعتقاد ہے میں نے یہ کوشش کی کہ اس جلسہ سے ایک روز پہلے علی گڑھ آجاؤں تاکہ موقع پر تمام حالات کو دیکھ کر رائے قایم کروں۔ چنانچہ میں نے بعض طلبا سے گفتگو کی۔ اُن حضرات میں سے بھی بعض سے گفتگو کی جو قوم کے لیڈر اور مذہبی رہنما ہیں۔ ان گفتگوؤں سے جو خیالات معلوم ہوئے اور جو حالات میں نے دیکھے اُن پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں جو اپنی تقریر میں بیان کروں گا۔

حضرات! میں علی گڑھ اس خوشی کے خیال کو لے کر آیا تھا کہ حالیہ تحریک کے اثر سے میں کالج کے طلبا میں مذہب کا وہ جلوہ دیکھوں گا جس کی تمنا برسوں سے دل میں تھی اور جو باوجود گوناگوں کوششوں کے اب تک حاصل نہ ہوسکا تھا۔ لیکن حالات دیکھ کر مایوسی ہوئی۔ جن طلبا سے میں نے گفتگو کی انھوں نے کہا کہ مذہب کے لئے تمام قربانیاں جائز ہیں۔ میں نے اُن سے سوال کیا کہ آیا جس مذہب کے لئے تمام قربانیاں جائز ہیں اُس کے فرائض بھی اُن کو بتائے گئے ہیں، ان کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ ہر مسلمان پر نماز پڑھنا اور روزہ رکھنا فرض ہے۔ اور آیا اس کی پابندی انھوں نے کی ہے۔ اس کے جواب میں انھوں نے مجھ سے کہا کہ ہم سے یہ کہا گیا ہے کہ نماز روزہ ہوتا رہے گا اس وقت ہم کو وقتی تحریک سے نفع اٹھالینا چاہیے۔

رات میں نے عشا کی نماز کالج کی مسجد میں جماعت کے ساتھ پڑھی - میرا خیال تھا کہ اب جب کہ مذہبی روح طلبا میں سرایت کر چکی ہے ایک دیرینہ آرزو پوری ہوگی اور کم سے کم ایک پوری صف جماعت میں طلبا کی دیکھوں گا - مگر افسوس کہ یہ آرزو پوری نہ ہوئی - جماعت صرف درمیانی دو محرابوں کے بیچ میں تھی - ان میں بھی کم از کم دس بارہ آدمی باہر تھے -

کیا حضرات! یہی جوش مذہب ہے جو طلبا میں پھیلایا جاتا ہے اور یہی دعوتِ حق اُن کو اور عامۃ المسلمین کو دی جاتی ہے - ہم سے کہا جاتا ہے کہ "ترک موالات" کرو "ترک موالات" کا فتویٰ کون دیتا ہے؟ گاندھی کیا اسلام وہ مذہب ہے جس کو ہم مشرک سے سیکھیں، نہ ہمارا یہ مذہب ہے نہ ہم اس کے لیے تیار ہیں کہ اپنا مذہب مشرکین سے سیکھیں - اسلام میں فرض دو قسم کے ہیں ایک فرض عین دوسرا فرض کفایہ - فرض عین وہ ہے جو ہر عاقل بالغ مسلمان پر فرض ہے، حضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی بنیاد پانچ فرض بتائے ہیں جن میں نماز روزہ شامل ہیں - فرض کفایہ وہ ہے جو بعض مسلمانوں کے ادا کرنے سے سب کی طرف سے ادا ہو جاتا ہے - اب ایک تیسرا فرض اور نکلا ہے اور وہ صرف محمڈن کالج کے محدود رقبہ کے طلبا پر فرض عین ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ کالج چھوڑ دیں - اس طرح ایک نیا اسلام بنایا جاتا ہے - کیا یہ اسلام ہے کہ ہم مندروں میں جائیں اور وہاں اپنی پیشانیوں پر قشقہ لگوائیں، کبھی مسلمانوں کی یہ شان تھی کہ سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود (اُن کی شان اثر سجدہ ہے جو اُن کے چہروں سے عیاں ہے) آج یہ شان ہے کہ مسلمانوں کی پیشانیوں پر نشان قشقہ نمایاں ہو مسلمان ہندوؤں کا جنازہ اٹھاتے ہیں اور "رام رام ست ہے" کے نعرے لگاتے ہیں - کیا یہ مذہب ہے - مسجدوں میں ہندوؤں کے سوم ہوتے ہیں، اور اُن کو ثواب پہنچانے کے لئے چنے پڑھے جاتے ہیں - کیا یہ مذہب ہے - مجمعوں میں "اللہ اکبر" کے نعروں کے ساتھ "گاندھی جی کی جے" پکاری جاتی ہے اب تک مسلمانوں کے کان کلمہ "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" سے آشنا تھے اب یہ نیا جز پیدا ہوا ہے - یہاں تک تقریر سن کر مسٹر محمد علی، شیم شیم کہتے ہوئے ہال سے باہر جھپٹ کر چلے گئے -

حضرات! اسلام زندہ مذہب ہے اور جب تک دنیا قایم ہے اسلام بھی قایم رہے گا وہ زندگی کا ایک خاص قانون لایا ہے جس کی پابندی عملاً ہر مسلمان پر واجب ہے - کہا یہ جاتا ہے کہ "ترک موالات" کرو مگر

ہماری صورت، ہمارا طرز کلام، نشست و برخاست، کھانا اور پینا موالات کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے اگر ہمارے دل میں مذہب کا سچا جذبہ ہوتا تو ناممکن تھا کہ ہم اپنی صورتیں۔ سیرتیں، اس کی ہدایت کے مطابق نہ رکھتے۔ اسلام نے ترک موالات ضروری بتایا ہے مگر سب سے اول اپنے نفس سے اسلام کی تعلیم ہے کہ سب سے اول اپنے نفس کو دشمن کی طرح دیکھو۔ بزرگانِ دین سوتے وقت اپنے نفس کا حساب لیتے تھے کہ آج کیا اچھا کام کیا اور کیا برا کام کیا۔ ہم کو دیکھنا چاہیے کہ مذہب کی آڑ میں خود ہم کو ہمارا النفس تو دھوکا نہیں دے رہا ہے اور جس کو ہم مذہب کی خدمت کہتے ہیں وہ اس کی مخالفت تو نہیں۔ ہم کو اس پر غور کرنا چاہیے کہ اس تھوڑے سے عرصہ میں ہم نے اصول مذہب کو پامال کر دیا ہے۔

میں نے ایک محترم مقتدائے وقت سے 'ترک موالات' کا اصول دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا کہ چونکہ سب سے پہلے کالج کے طلبا میں استطاعت (قدرت) آگئی ہے لہذا ان پر سب سے اول ترک موالات کرنا ضروری ہوا۔ اسی لئے ہم نے اول طلبا میں تحریک ترک موالات کی جاری کی ترک موالات کے متعلق باقی چند امور ہم میں متفق علیہ ہیں اور چند میں اختلاف ہے۔

حاشا میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسلام کی تعلیم تو کثرت سے یہ ہے کہ ان الذین امنوا وعملوا الصالحٰت (وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنھوں نے عمل صالح کئے) اس طرح ایمان کے ساتھ عمل صالح ہے۔ یہاں اعمال صالحہ بالائے طاق ہیں محض زبانی جوش کو انتہائے مذہب قرار دے دیا ہے پہلے ہم کو خود اسلام کے احکام کی پیروی کرنی چاہیے۔ اس کے بعد دوسروں کا ہادی و رہنما بننا چاہیے۔ میں کسی کی نیت پر حملہ کرنا روا نہیں سمجھتا اسی کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ جب مذہب کی تعلیم اس کے مطابق آپ نہیں دیتے تو یہ کہنا چھوڑ دیجیے کہ مذہب کی وجہ سے آپ یہاں آئے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ "ترک موالات" اس لئے واجب ہے کہ گاندھی کہتے ہیں مقدس مقامات پر انگریزوں کا حملہ ترک موالات کی وجہ بتائی جاتی ہے مگر یہ خیال نہیں کیا جاتا کہ ترک موالات کرنے والے خود اپنے ہاتھوں سے مقدس مساجد کی کیا توہین کر رہے ہیں۔ دہلی کی مشہور جامع مسجد میں میرے ایک مخدوم نے ایک ہندو کو منبر پر کھڑا کر دیا اور اُن سے یہ درخواست کی کہ وہ مسلمانوں کو تلقین کریں۔ ذرا سوچئے اور انصاف

کیجئے۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کفار مسجد نبوی میں داخل ہوتے تھے یہ صحیح ہے۔ لیکن آپ نے کبھی کسی مشرک سے یہ نہیں فرمایا کہ وہ مسلمانوں کو مسجد میں آکر تلقین کرے اور وعظ سنائے۔ کیا جو لوگ مشرکوں سے ایمان و مذہب حاصل کر رہے ہیں اُن کا ایمان قایم رہا ہے۔ میں بلا اعلان کہتا ہوں کہ وہ مسلمانوں کو تباہ کر رہے ہیں۔ میں نے مولانا عبدالباری صاحب سے بھی اس بارے میں گفتگو کی تھی۔ جب میں نے مسلمانوں کے مندروں میں جاکر اپنی پیشانیوں پر قشقہ لگوانے کا واقعہ بیان کیا تو انھوں نے اظہار ناپسندیدگی کے ساتھ متاسفانہ فرمایا کہ مجھ کو اس کا علم نہیں۔ میں نے اُن سے یہ بھی عرض کیا کہ ہندو مسلمانوں میں اتحاد ضرور ہونا چاہیے ملک اور قوم کی بہبود اس پر منحصر ہے۔ لیکن ایک رسالہ کے ذریعہ سے آپ یہ حدود صاف صاف مقرر فرما دیں کہ یہاں تک اتحاد کی حد ہے اس سے آگے مذہب ہے۔

اتحاد پر قایم رہو مگر مذہب میں دخل نہ دو۔ میرے نزدیک کالج سے جو مطالبات کئے جاتے ہیں وہ ترک موالات میں داخل نہیں ہیں نہ ہو سکتے ہیں۔

وقت ختم ہو جانے کی وجہ سے میں اس سے زیادہ عرض نہیں کرسکتا۔

نوٹ۔ (یہ تقریر زبانی وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی مہاراجہ سر علی محمد خاں تعلقدار محمود آباد کی فرمایش پر اُس موقع پر کی گئی تھی جب کہ پورا گروہ نان کوآپریٹرز کا گاندھی کی رہنمائی میں محمڈن کالج کو نیست نابود کرنے کے عزم سے علی گڑھ آیا تھا)۔

مقدمہ وقارِ حیات

(سوانح عمری نواب وقار الدولہ وقار الملک انتصار جنگ مولوی حاجی مشتاق حسین مرحوم سابق ریونیو سکرٹری دولت آصفیہ و آنریری سکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ و مدرستہ العلوم مسلمانانِ علی گڑھ)۔

الحمد للہ دل کا ایک دیرینہ خیال عمل پذیر ہو کر آنکھوں کے سامنے ہے۔ دیر آید درست آید کا مصداق بن کر۔ نواب وقار الملک مرحوم زندہ تھے تو اُن کی زندگی ہر شعبۂ عمل میں وقار آفریں رہی۔ اُن کا ہر کام کارنامہ بنا۔ بعد وفات اُن کی "حیات" ادبِ اُردو کے واسطے رُوح تازہ ہے اور اُس کا وقار بڑھا رہی ہے اسی لئے اُس کا نام "وقارِ حیات" رکھا گیا۔

مسلمانانِ ہند میں جدید خیالات کی عمومی اشاعت کا سہرا سرسید کے سر ہے۔ یہ صور علی گڑھ میں پھونکا گیا۔ میں نے جب ہوش سنبھالا سید احمد خاں کا نام سنا۔ کبھی تعریف سنی کبھی مذمت۔ لبسا اوقات تکفیر۔ سر کا بکنا اور مرنے کے بعد کاٹا جانا ایسا مسلم واقعہ تھا جس میں چون وچرا کی مجال نہ تھی۔ میرا ننھیال ددھیال ایسے خاندان میں ہوا جو مخالف و موافق دونوں خیالوں کا مرکز تھا۔ مذہبًا مخالف تعلیمی مقاصد میں موافق بلکہ موید۔ اور یہ دونوں پہلو صاف صاف عیاں تھے۔ میرے محترم عم مولوی عبد الشکور خاں صاحب مرحوم سرسید کے تعلیمی خیالات کے مؤید تھے اور تا بزیست رہے۔ مذہبی خیالات کے علانیہ مخالف۔ مذہبی صداقت عجب شان رکھتی ہے۔ سرسید مرحوم کی رحلت کے بعد میں نے اُن کی نسبت چچا صاحب سے رائے پوچھی تو فرمایا "سید کی راستبازی میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں اسی کا اثر تھا کہ عدالتی فیصلوں میں انصاف کے مقابلے میں کبھی قانون کا لحاظ نہیں فرمایا۔" تائید میں خود اپنا ایک تجربہ بیان فرمایا دوسری جانب فیشن اور خود غرضی کی بے ثباتی دیکھی۔ ایک بڑے نام نہاد نیچری سے (جو غائبانہ بھی سرسید مرحوم کی دعا پر آمین جہری سے کہتے تھے) حیات جاوید کی اشاعت پر جب میں نے سوال بالا کیا تو کہا سید محمود بہت خوفناک آدمی ہیں ورنہ ریویو لکھ کر صداقت کا انکشاف کیا جاتا۔ سید احمد خاں نہایت خود غرض

اور بد باطن شخص تھا" میں اس رائے کو اُن کے منہ سے سُن کر متحیر رہ گیا! اور آج تک حیرت باقی ہے جب اظہار عقیدت اور اس رائے کا تصور بندھتا ہے انسانی باطنی کیفیت کی ایک عجیب تصویر ذہن میں پھر جاتی ہے۔

خلاصہ کلام، سر سید مرحوم کے ذکر کے ساتھ ساتھ اُن کے رفقا کا ذکر بھی ہوتا۔ علی گڑھ میں تو مولوی سمیع اللہ خاں مرحوم اور خواجہ محمد یوسف مرحوم کا بول بالا تھا۔ محسن الملک مرحوم اور وقار الملک مرحوم خود ہرچند دور تھے مگر اُن کا ذکر بھی زبانوں سے قریب تھا بلکہ زبانوں پر تھا۔ ٹرسٹیز بل کے پیش ہونے پر رفقا کا تذکرہ بہت زیادہ بلند آوازہ رہا۔ بعض شدید مخالف ہو گئے۔ بعض شدید موافق، بعض اعتدال پسند۔ اُسی زمانے میں نواب وقار الملک مرحوم کی وہ مشہور رائے شائع ہوئی جس میں مخالفت کرتے ہوئے عمارت عدالت کی جانب اشارہ تھا۔ سر سید مرحوم نے باوجود مخالفت اس رائے کا باعلان احترام کیا اور صداقت پر آفریں فرمائی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وقار الملک مرحوم کی صداقت کا اثر دل نے محسوس کیا۔

سر سید مرحوم کی زندگی کے آخری دنوں میں جانشینی کا مسئلہ اکثر زبانوں پر رہتا تھا۔ اس سلسلے میں نامور رفقا کے کارنامے مذکور ہوتے۔ اُن پر اظہار رائے کیا جاتا۔ میں نے دیکھا کہ مخالف و موافق دونو رائیں اُن کی صداقت کی معترف تھیں۔ مخالفت تھی تو اُن کی رائے کی سختی کے خیال سے۔

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے ایک بار فرمایا تھا اور خوب فرمایا تھا "محسن الملک تیل ہی تیل ہیں وقار الملک لوہا ہی لوہا جب تک دونوں نہ ملیں کالج کی مشین نہیں چل سکتی"۔

بالآخر حیدر آباد کے انقلابوں نے ان دونو کو بھی علی گڑھ پہونچا دیا۔

ایک بار سر سید مرحوم نے مجھ سے وقار الملک مرحوم کی دیانت کی تعریف فرمائی کہ سر آسمان جاہ کے ساتھ علی گڑھ آئے تو پتلون میں پیوند لگے تھے۔ اسی سلسلے میں اُن کے نامور رفیق کی نسبت فرمایا کہ جب کوٹھی بنائی تو ستر ہزار روپیہ کا فرنیچر ولایت سے آیا۔ لیمپ کی چمنیوں پر مانوگرام منقوش ہو کر ولایت سے آتا تھا۔

خلاصہ قبل اس کے کہ وقار الملک مرحوم سے نیاز حاصل ہو اُن کی دیانت و صداقت دل پر نقش ہو چکی تھی۔ سب سے اوّل نواب محسن الملک مرحوم کے یہاں ملاقات ہوئی اور اسی موقع پر نماز مغرب ساتھ

ساتھ ادا کی۔ اس کے بعد نواب صاحب کو بہت کچھ دیکھا۔ سکرٹری شپ کے زمانے میں تعلیمی و سیاسی دونوں میدانوں میں ساتھ کام کرنے کی عزت حاصل ہوئی۔ پاس رہنے کا اتفاق ہوا۔ حیدرآباد آکر اُن کے متعلق اتنا سُنا کہ اُس سے زیادہ ممکن نہیں۔ جتنا دیکھا جتنا سُنا اسی قدر دیانت و صداقت کا نقش گہرا ہوتا گیا۔ یہ اوصاف خاص نتیجہ تھے مذہبی عقیدہ کی پختگی اور فرائض مذہبی کی پابندی کے۔

سید محمود مرحوم کی سکرٹری شپ کے زمانے میں اُن کے جانشین کا انتخاب شدید ضروری ہو گیا تھا۔ کالج کے بنگلہ میں ایک بار جلسۂ شوریٰ ہوا بہت سے نامور ٹرسٹی شریک تھے۔ متوفی مسٹر بیک کا اثر کام کر رہا تھا۔ دروازے بند کر کے مشورہ کیا گیا۔ سوال ہوا جدید آنریری سکرٹری کون ہو۔ کثرت رائے نواب محسن الملک مرحوم کے حق میں تھی۔ وقار الملک مرحوم نے مولوی سمیع اللہ خاں مرحوم کا نام لیا میں نے وقار الملک کا۔ اُس وقت کی محسن الملک مرحوم کی نگاہ غلط انداز اب تک مجھ کو یاد ہے۔

خلاصۂ کلام۔ تجربہ کی مضبوط بنیاد پر میرا یہ عقیدہ ہے کہ رفقائے سرسید مرحوم میں وقار الملک صداقت و دیانت میں پایۂ بلند رکھتے تھے۔

۱۹۱۷ء میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب انڈیا کونسل کے ممبر ہو کر انگلستان تشریف لے گئے۔ اُن کی جگہ میں کانفرنس کا جنٹ سکرٹری مقرر ہوا۔ مجھ کو اب تک اقرار نہیں کہ یہ انتخاب بجا ہوا۔ اس انتخاب کے بعد میں نے کانفرنس کے مقاصد قواعد میں دیکھے ادبی پہلو میں ترقی کی گنجائش پائی اہلِ علم و قلم کو متوجہ کیا۔ ذرائع محدود تھے۔ تاہم بعض نادر نمونے پیش نظر آ گئے۔ مثلاً تاریخ گجرات پر مولوی سید عبدالحی صاحب مرحوم کا رسالہ "یاد ایام"۔ اس کو تاریخی مضامین کا نمونہ کہہ سکتے ہیں۔ یا مذہب و عقل کی بحث پر مولوی عبدالباری صاحب ندوی کا رسالہ "مذہب و عقلیات" اس نازک بحث میں قول فیصل کہ یہ رسالہ سنگ بنیاد ہی بلکہ بنیاد۔

کانفرنس کا ایک مقصد مشاہیر کی حیات لکھوانا بھی ہے۔ میں نے خیال کیا کہ رفقائے سرسید مرحوم سب سے اوّل (بلحاظ اپنی قومی خدمات کے) توجہ کے مستحق ہیں۔ یہ علمی خدمت بھی ہے اور ادائے شکر بھی۔

نواب وقار الملک مرحوم کے اسلامی خصائل ملک و ملت کے واسطے کامل رہنما ہیں اس لئے میں نے

LIBRARY
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)

رفقا میں سے اوّل حیات نگاری کے لئے منتخب کر کے کانفرنس کے سامنے پیش کیا۔ اس تجویز کو کانفرنس کے اجلاس نے بالاتفاق منظور فرمایا۔

اب سوال تھا سرمایہ، مواد تاریخی اور حیات نگاری کا سرمایہ تو واجبی ہی ملا۔ مواد وافر دستیاب ہوا۔ اس کے لئے عزیز سعید مولوی مشتاق احمد صاحب سلمہٗ دلی سپاس بلکہ تحسین کے مستحق ہیں۔ جزاہ اللہ خیراً۔

مولوی محمد امین صاحب زبیری مہتمم دفتر تاریخ بھوپال کی مدد بھی لائق شکر ہے۔ ایک معمّر بزرگ ایسے ملے جنھوں نے وقار الملک مرحوم کا شباب دیکھا تھا۔ جن ابتدائی حالات سے کاغذ ساکت تھا اُن کی زبانی معلوم ہوئے۔ اسی عرصہ میں اعلیٰ حضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہٗ وسلطنتہٗ نے بکمال ذرہ نوازی اس ناچیز کو حیدر آباد طلب فرما لیا۔ یہاں کی حاضری گویا تکمیل وقار حیات کا مقدمہ تھی۔ یہاں دو صاحب ایسے ملے جنھوں نے سالہا سال وقار الملک مرحوم کی پیشی میں کام کیا تھا۔ ایک نواب عزیز جنگ دوسرے نواب لطیف یار جنگ بہادر، یہ دونوں صاحب واقفیت کے ساتھ ساتھ صاحب نظر اور صاحب الرائے بھی تھے۔ گراں بہا مدد اُن کی رہنمائی اور بیان سے ملی۔ اوّل الذکر اب مرحوموں کی فہرست میں داخل ہو چکے غفرلہٗ۔ دوسرے زندہ ہیں۔ سلامت رہیں۔ دلی سپاس قبول فرمائیں۔ صوبہ ورنگل وقار الملک مرحوم کی انتظامی کوششوں کا دار العمل رہ چکا ہے۔ وہاں سے بھی مواد فراہم کیا گیا۔ ایک بوڑھے ہندو جو وقار الملک مرحوم کے زمانہ میں تحصیلدار رہ چکے تھے ملے۔ انھوں نے جب سُنا کہ وقار الملک کے حالات لکھے جاتے ہیں تو جوشِ عقیدت میں یہ کہہ کر سوانح نگار کے ہاتھ چومے کہ جو ہاتھ ایسے بزرگ کے حالات لکھیں وہ چومنے کے لائق ہیں اُس کے بعد بچشم پُرنم چشم دید حالات بیان کئے غرض جس مواد تاریخی پر اس حیات کی بنیاد ہے وہ تمامتر تحریری اور مستند تحریری ہے یا خود نواب صاحب مرحوم کی یادداشتوں اور محفوظ خطوط سے لیا گیا ہے۔ یا سرکاری مثلوں اور کتابوں سے بہت سا حصہ معتمد اور واقفکار اصحاب کی زبانی شہادت ہے جو عینی شاہد ہیں۔ خلاصہ یہ کہ جو مواد استعمال ہوا ہے وہ اتنا ہی معتمد ہے جو کسی سوانح عمری کا ہو سکتا ہے۔

کیسی خوش قسمتی تھی کہ حیات نگار مولوی محمد اکرام اللہ خاں صاحب ندوی ملے۔ مولوی صاحب قدرتاً

متین، صاحبِ فکر، اور جفاکش واقع ہوئے ہیں۔ اسی کے ساتھ وقائع نگاری میں ملکہ رکھتے تھے۔ رسالہ الندوہ کے ایڈیٹر رہ چکے تھے۔ عجب اتفاق ہے کہ جسماً بھی وہ اپنے ہیرو سے بہت مشابہ ہیں۔ نواب لطیف یار جنگ بہادر نے دیکھ کر فرمایا کہ ان کا تبسم بالکل نواب صاحب مرحوم کا تبسم ہے۔

مولوی صاحب نے نہایت انہماک اور محنت سے اس کام کو انجام دیا ہے۔ حیدرآباد پہنچ کر میں نے اُن کو بھی یہاں آجانے کی زحمت دی تاکہ مواد اطمینان سے فراہم ہو سکے اسی دوران میں رمضان المبارک کا مہینہ آگیا۔ موسم نہایت گرم مئی جون کا تھا۔ مولوی صاحب صبح سے تلاشِ مقصود میں نکل جاتے شام کو واپس آتے۔ اس اثنا میں کاغذات گھنٹوں پڑھتے۔ لوگوں سے ملتے۔ ضرورت ہوتی تو میلوں پیدل چلتے۔ شام کو یہ حالت ہوتی کہ دیکھنے والوں کو رحم آتا۔ میں نے اس اندیشہ سے کہ بیمار نہ پڑ جائیں محنت کم کرنے کی فرمایش کی۔ بے سود۔ ہدایت کی بیکار، تاکید کی اب اثر ہوا اور مولوی صاحب نے سواری کی مدد لی۔ محنت وانہماک کے ساتھ مولوی صاحب کی نظر بالغ ہے تحریر بلیغ مورخانہ، واضح، مسلسل، اور فضول نویسی سے پاک۔ اُن کو یہ ملکہ حاصل ہے کہ صدہا صفحے پڑھیں، نگاہ کو ثابت قدم رکھیں کارآمد باتیں اخذ کرلیں اور بیکار باتوں سے متاثر نہ ہوں۔ اس کے بعد صورتِ واقعہ و معاملہ مورخانہ لکھ دیں۔ ایک حیات نگار ایسا ہی ہونا چاہیے مولوی صاحب کا شکر جس قدر ادا ہو کم ہے بلکہ بہت کم، جزاہ اللہ عنا خیر الجزاء۔

غرض نہایت مستند مواد اور فاضل وقائع نگار کی کئی برس کی جانکاہ محنت کا ثمرہ وقار حیات کی شکل میں جلوہ فرما ہے۔ اہلِ خدمت اپنا کام کر چکے اب قدر اہلِ نظر کے ہاتھ ہے۔ وقار حیات کی شان بے تکلف یہ کہنے کی اجازت دیتی ہے کہ حیاتِ جاوید کی بہترین رفیق ہے۔ یہی مرتبہ رفقا میں اُس کے ہیرو کا تھا۔ خدا کرے دوسرے رفقا کی حیات نگاری سے بزم معنوی ایسی ہی آباد ہو جیسی سرسید مرحوم کی جسمانی بزم معمور تھی۔ کانفرنس تجویز کر چکی ہے کہ وقار الملک مرحوم کے بعد نواب محسن الملک مرحوم کی حیات لکھی جائے۔ حال میں یہ خبر خوش کان میں آئی ہے کہ ایک لائق اہلِ قلم کا نوشتہ قاضی رضا حسین مرحوم کی حیات کا مسودہ کانفرنس کو ملنے والا ہے۔ یاد ہوگا کہ قاضی صاحب واحد نمایندے بہار کے سر سید مرحوم کی بزم عالی میں تھے کیا ادب اس کہنے کی اجازت دیگا کہ حیات جاوید اور وقار حیات قدیم تعلیم کے فرزند دل کی محنت کا ثمرہ ہیں۔ جدید

اہلِ قلم بھی اپنا عالی دماغ اس جانب مائل فرمائیں گے۔

بات میں بات پیدا ہوتی ہے۔ مسلم یونیورسٹی پر نظر ڈالو۔ مولوی سمیع اللہ خاں مرحوم نے چھپر کے نیچے اسکول کا آغاز کیا۔ سرسید مرحوم کی کوشش نے پختہ عمارتوں میں کالج کا جلوہ دکھایا۔ محسن الملک مرحوم نے چار دانگ ہندوستان کو سرسید کے جھنڈے کے نیچے جمع کر دیا۔ وقار الملک مرحوم نے محسن الملکی فتوح کو عمیق کیا مضبوط کیا۔ سطح کو عمق بخشا۔ کالج کو اُس وقت چھوڑا جب وہ یونیورسٹی بن چکا تھا۔ تعلیم جدید کے جوہر دیکھنے کے لئے نگاہیں مشتاق ہیں۔ خداوند تعالیٰ مبارک فرمائے۔ اس دور کی ترقیوں کی فہرست اس سے بھی طویل ہو۔

خصائل وقار الملک ۔ مشک عطار کے تعارف کا محتاج نہیں ہوتا۔ وقار حیات اپنی داستان خود ہی سنا رہی ہے تاہم مقدمہ نگاری خلاصہ نگاری کی متقاضی ہے۔

وقار الملک مرحوم معمولی حیثیت کے شریف گھر میں پیدا ہوئے۔ مکتب کی تعلیم پائی ابتدائی کاروبار بھی محض معمولی تھے۔ ملازمت دس روپیہ ماہوار سے شروع کی۔ ترقی آہستگی سے کی تنخواہ میں بھی اور مراتب میں بھی۔ میدان عمل وسیع پایا۔ ایک وقت حیدرآباد کی سلطنت میں اصلی کار فرما اُن کی قوت تھی۔ زندگی کے کارنامے دفتر اور حکومت دونوں میں عیاں ہوئے۔ حاکم بھی رہے محکوم بھی۔ ادنیٰ محکومی ایک کنارہ پر اور حاکمی دوسرے کنارہ پر اس میدانِ عمل کے ہے۔

مسلمانوں کی سیاسی خدمت بورڈنگ ہوس کی سپرنٹنڈنٹی سے کالج کی اور لیگ کی آنریری سکرٹری شپ تک کی۔ کالج کا سکرٹری ہونا مسلمانان ہند کا سردار ہونا تھا۔ یہ مرتبہ اس منصب کو سرسید مرحوم سے لے کر وقار الملک مرحوم کے عہد تک رہا۔ زمانے کی ترقی کے ساتھ نزاکتیں بڑھیں نزاکتوں کے ساتھ ذمہ داری۔ کراچی میں کانفرنس کا اجلاس نواب وقار الملک مرحوم کے اقبال کی شہادت تھا جب تمام ملک کے نمائندوں نے بالاتفاق اُن کو اپنا لیڈر (سالار) تسلیم کیا۔

انہی مصروفیتوں میں فرصت ملی تو قلمی علمی خدمت بھی کی۔ نپولین کی سرگزشت اس کی یادگار ہے۔ تہذیب الاخلاق شاہد صادق ہے۔

ایک ممتاز پہلو اُن کی زندگی کا سرسید مرحوم کی رفاقت ہے۔ پہلو نہیں کارنامۂ اعظم خود مجھ سے بیان

فرمایا تھا کہ پہلی بار سرسید مرحوم سے اُس وقت ربط حاصل ہوا جب دونو مرادآباد کے قحط کے اہتمام میں یکجا ہوئے۔ سرسید مرحوم اعلیٰ افسر تھے یہ اہلکار۔ ایک نے دوسرے کو دیکھا جانا، مانا، ایک نے رفیق دوسرے نے سردار بلکہ پیر و مرشد۔ یہ عقیدت اور اعتقاد زندگی کے ساتھ رہا جان کے ساتھ گیا ؎

با تو آں عہد کہ در وادیِ ایمن بستیم
ہمچو موسیٰ ارنی گوئے بمیقات بریم (حافظ)

اس رفاقت کا دَوران صدی کا ایک ثلث زمانہ ہے۔ اس دراز مدت میں ایک بار سے زیادہ اختلاف ہوا۔ شدید ہوا اظہار اختلاف کا لہجہ بھی مریدانہ اور عقیدتمندانہ تھا۔ اختلاف پر اصرار کے وقت بھی تحریر سے، تقریر سے، حرکات سے، سکنات سے، جوشِ عقیدت ٹپکتا تھا۔ ہر ادا ثابت کرتی تھی کہ ایک عقیدتمند مرید اپنے مرشد کی خدمت میں عرض پرداز ہے۔ مثال۔ عروجِ حیدرآباد کے زمانے میں ایک مجمع اکابر نے یہ سماں دیکھا کہ وقارالملک کی ترکی ٹوپی اُن کے ہاتھ میں ہے گھٹا ہوا سر سرسید کے سامنے جھکا ہے زبان سے کہہ رہی ہیں "یہ سر حاضر ہے جوتیاں ماریئے مگر عرض یہی کرونگا کہ رائے آپ کی غلط تھی۔"

سرسید مرحوم کی وفات کے بعد قریباً بیس برس زندہ رہے۔ مرشد سے بہت زیادہ مرید کو ہندوستان کے عرض و طول میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ وفاداری کی داد دیجیے کبھی مرید سے زیادہ اپنے آپ کو نہیں سمجھا۔ مرشد کا سجادہ مرشد کی طرح واجب الادب رہا بلکہ ادب آموز جوہر وفاداری میں وقارالملک منفرد نہ تھے محسن الملک مرحوم مولوی زین العابدین خاں مرحوم۔ برکت علی خاں مرحوم۔ خلاصہ باستثنائے قلیل سرسید مرحوم کے سارے رفیق اُن کی عقیدت و محبت جان کے ساتھ لے گئے۔ ہاں اس میں منفرد تھے کہ اختلاف کی جرأت کرتے تھے، جرأت کے بعد اظہار، اظہار پر اصرار، اصرار پر استحکام اسی کے ساتھ عقیدت مستحکم۔

ان چہارگانہ خصائل میں اُن کو جب اور جہاں دیکھو گے دلیر اور مستعد پاؤ گے۔ بزدلی اور کاہلی یہ لفظ اُن کی لغاتِ زندگی میں لکھے ہی نہیں گئے۔ آخر عمر میں کمزوری ہے گھٹنوں میں درد ہے۔ تاہم بلند زینہ پر چڑھتے اُترتے ہیں۔ جب عرض کی اس زحمت فرمانے کی کیا ضرورت تھی جواب دیا بلکہ دل پر لکھ دیا کہ انسان

کو اتنی محنت کا خوگر رہنا چاہیے۔

اُن کی زندگی کی کل جس طاقت سے چل رہی تھی اور چلتی رہی وہ اُن کی مذہبی زندگی تھی۔ بچپن میں نماز کے گھر میں پابند تھے۔ بڑے ہوئے تو نماز کے پیچھے انگریزی ملازمت چھوڑی۔ عروج حیدرآباد کے دور میں شاہی اسپیشل اُن کی نماز کے واسطے روکی گئی۔ علیٰ ہذا القیاس۔ اس زندگی میں اُن کی اوّلیں سعادت یہ تھی کہ اُن کے قلب نے قوت کے ساتھ صداقتِ ایمانی کو جذب کیا اور یہ انجذاب تہ تک پہنچا۔ اسی کا نام ہی قوتِ ایمانی قوتِ ایمانی کو لازم ہی پابندیِ ارکانِ اسلام۔ قوتِ ایمان اور پابندی ارکان کا نتیجہ تھی وہ پرعظمت زندگی جس کا کارنامہ آپ کی آنکھوں کے سامنے ہی۔ اس کارنامہ کا طرۂ امتیاز صداقت و جانفشانی تھی۔ یہی سبق تم اس شاندار زندگی سے حاصل کر سکتے ہو مگر یاد رکھو ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ (سعدی)

حیدرآباد ۲۱ نومبر ۱۹۲۵ء — محمد حبیب الرحمٰن صدر یار جنگ

مقدمہ خزینۃ المعانی

(مجموعۂ قصائد و قطعات مولانا محمد عبدالغنی خاں صاحب مرحوم المتخلص بہ غنی تلمیذ رشید

حضرت مفتی محمد لطف اللہ صاحب رحمہ اللہ۔

ارباب معنی پر مخفی نہ رہے کہ "خزینۃ المعانی" نام ہی مجموعۂ قصائد کا جو تصنیف ہیں استاذی و مولائی مولانا عبدالغنی خاں صاحب غنی تخلص کے غفرلہ۔

اہلِ غنا کا خزانہ لٹا کرتا ہی۔ جو اُن کو مبدءِ فیاض سے ملتا ہی دوسروں کو پہنچا دیتے ہیں، بخشتے ہیں اور ٹکسالی مال بخشتے ہیں۔ یہ قصائد بھی خزینۃ المعانی کا ٹکسالی مال ہیں، اہلِ نظر ملاحظہ فرمائیں۔ مشک عطر بیزی عطار خاموش۔

اُستاد مبرور نکتہ رس، معنی آفریں طبیعت لے کر اس عالم میں آئے تھے۔ جودتِ استعداد اور سلامت نطرۃ فضلائے عصر کو تسلیم تھی۔ استاد العلما مولٰنا لطف اللہ صاحب مغفور کا یہ مقولہ تلامذہ خاص کی زبانوں پر رہا کہ "عبد الغنی نے گیارہ برس مجھ سے پڑھا کبھی بیجا اعتراض نہیں کیا"۔ مرحومی مولانا عبد الحی صاحب فرنگی محلی کی ایک تحریر دستِ خاص کی میرے پاس محفوظ ہے اُس میں استعداد علمی اور حسنِ تعلیم کی تعریف کی ہے۔

فارسی سے مناسبت طبعی تھی۔ مطالعہ وسیع تھا اور عمیق۔ شاہد عدل کتاب ارمغانِ آصفی ہے۔ نثر فارسی کا ایسا ہی ذوق تھا جیسا نظم کا۔ یہ وصف کمیاب ہے، خصوصاً دورِ حاضر میں۔ بیاض نثر اُسی طرح مہیا کی تھی جس طرح نظم کی بیاض مہیا کی جاتی ہے۔ ایک یادگار میرے کتاب خانہ میں بھی ہے۔ اس میں مختلف عنوانوں پر ممتاز نثریں اساتذۂ نثر کی جمع کی گئی ہیں۔

طالب علمی مولوی احمد شیر خاں، مولوی عبداللہ خاں علوی کے داماد محلہ میں مکتب پڑھایا کرتے تھے۔ یہ مکتب مولوی صاحب کے مکان سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر تھا۔

دہلی مرحوم کی آخری بہار جن فارسی اہلِ کمال پر نازاں تھی اُن میں علوی بھی تھے۔ صہبائی اُن کے شاگرد تھے۔ اس تقریب سے مولوی احمد شیر خاں نے دلی کی صحبتیں اچھی طرح دیکھی تھیں۔ مکتب میں ان صحبتوں کا ذکر کرتے شاگردوں سے فارسی کے نکات بیان کرتے۔ اس طرح مولوی صاحب کے دل میں علم کا ایک ذوق پیدا ہوا۔ شوق طلب کا یہ عالم تھا کہ نشست کے تخت کی کیلوں کے شمار پر سبق یاد کرتے۔ جتنی کیلیں تھیں سب کی تعداد کے مطابق سبق دہرالیتے۔ صبح کھانا کھا کر گھر سے نکلتے شام کو آتے۔ دن بھر مکتب میں رہتے۔ استاد یہ شوق دیکھ کر بے تکلفانہ کہتے "لڑکے تو نے تو تسلّی (تحصیل) تمام کرلی"۔ جب فارسی کی اوپر کی کتابیں پڑھنے لگے تو حسب حال اُستاد کی تقریریں مطالب ہوتے ساتھ ہی کہتے کہ اس سے زیادہ کا سمجھنا عربی جاننے پر منحصر ہے۔ اس سے عربی کا شوق پیدا ہوا۔ مگر وطن میں اس کے پورے ہونے کا سامان نہ تھا۔ بالآخر گھر چھوڑا۔ فرغل اوڑھے ہوئے ایک بغل میں کتابیں، دوسری میں ایک جوڑا کپڑوں کا لئے گھر سے بے اطلاع نکل کھڑے ہوئے۔ زادراہ یہ تھا کہ بڑی بہن نے چھپا کر دو روپیہ دیدئے تھے۔ یہ واقعہ

علامۂ قوشجی شارح چغمنی کے واقعہ سے کس قدر مناسب ہے۔ علامۂ ممدوح بھی گھر سے چھپکر طالب علمی کے لئے نکلے تھے۔ بہن نے اپنا زیور کتابوں میں چھپا کر رکھ دیا تھا۔

غرض پیادہ پا فرخ آباد پہنچے۔ وہاں نواب عبدالعزیز خاں صاحب مرحوم عزیز (حافظ رحمت خاں مرحوم والیِ روہیلکھنڈ کے گھرانے کے چشم و چراغ) وکالت کرتے تھے۔ مفتی عنایت احمد صاحب مغفور کے ارشد تلامذہ میں سے تھے ان سے عربی شروع کی صرف کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ شوق بلند تر استانہ کا متقاضی تھا۔ فرخ آباد سے پیادہ پا کانپور پہنچے۔ شوق نے کہا ع

آستانے بود مطلوب آسمانے یافتم

مدرسۂ فیض عام مولانا سید حسین شاہ صاحب واصف بخاری اور مولانا لطف اللہ صاحب کے فیوض تدریس سے رشک بخارا و شیراز بنا ہوا تھا۔ حافظ برخوردار مہتمم تھے۔ رہنے کو تو ایک تکونا مختصر حجرہ مسجد میں ملا مگر شوق نے حسب حوصلہ سامان کمال پا لیا۔ پورے انہماک سے تحصیل علم میں مصروف ہو گئے۔ مولانا سید حسین شاہ صاحب سے سبق شروع ہو گیا۔ مدرسہ جاتے تو راستہ میں شرح مائۃ عامل ہدایۃ النحو زبانی پڑھتے جاتے اس طرح یہ وقت بھی ضائع نہ ہوتا۔ کاش یہ واقعہ آج کل کے فیشن ایبل طلبا کے کان تک پہنچ جاتا۔

ابتدائی زمانہ میں مہینوں ایک وقت چنے کھا کر بسر کی۔ مسجد کے نیچے بھڑبھونجے کی دوکان تھی شام کو اندھیرا ہو جاتا تو رومال میں دو پیسے باندھ کر چپکے سے دوکان میں پھینک کر آگے بڑھ جاتے۔ بھڑبھونجا چنے تول کر باندھ رکھتا۔ واپسی میں چلتے چلتے رومال لے لیتے۔ عرصہ تک کسی کو پتہ نہ چلا کہ کیا اور کہاں کھاتے ہیں مولانا سید حسین شاہ صاحب کے ایک مخلص تحصیل کے جمعدار تھے انھوں نے اپنی پنج سالہ بچی کی تعلیم کے لئے معلم کی فرمائش کی سید صاحب نے اُن کو باصرار مقرر فرما دیا۔ معاوضۂ تعلیم ایک وقت کا کھانا ٹھیرا اس شرط پہ کہ مکان پر کھانے نہ جائیں گے کھانا قیام گاہ پر آجائے۔

لطیفہ۔ ایک روز جمعدار نے روغنی روٹیاں بھیجیں۔ حجرہ میں بعض اور طلبا کے ساتھ مل کر بیٹھے کھا رہے تھے۔ اُستاد تشریف لے آئے۔ دیکھ کر برجستہ فرمایا ؎

دَور دَورِ مولوی عبدالغنی   رات دن کھاتے ہیں روٹی روغنی

یہ شعر کچھ ایسے انداز شفقت سے فرمایا تھا کہ شاگرد کو آخر عہد تک یاد رہا۔ پڑھتے تھے اور لطف حاصل کرتے تھے۔

جو فرغل گھر سے ساتھ لائے تھے ایک سال کے بعد جاڑے کے مقابلہ کی تاب اُس میں نہ رہی صرف چادر رفیق رہی۔ کتنی سرد راتیں شوق کی پشت گرمی سے اس چادر میں بسر ہوئیں، خدا تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ درس میں جب بدن سردی سے کانپتا تو جا بجا نوچتے کہ کانپنا موقوف ہو اور پاس بیٹھنے والوں پر راز نہ کھل جائے۔

الغرض۔ چند ہی روز میں ابتدا انتہا کی خبر دینے لگی۔ ایک روز آواز آئی مولوی عبدالغنی۔ یہ اُستاد کی آواز تھی۔ گھبرا گئے کہ نام کے ساتھ مولوی کا لفظ تھا۔ یہ ابتدائی کتابیں پڑھتے تھے۔ نہ روئے ماندن نہ پائے رفتن دوسری آواز آئی۔ اب توقف محال تھا۔ حاضر ہو گئے۔ معلوم ہوا حاضری بجا تھی ایک روز جرأت کر کے عرض کی۔ "اُس دن مولوی کے ساتھ یاد فرمایا گیا" فرمایا "ہاں تم مولوی ہو جاؤ گے"۔

چند روز کے بعد شاہ صاحب بھوپال تشریف لے گئے۔ سبق مولانا محمد لطف اللہ صاحب سے ہونے لگے۔ اسی آستانۂ مبارک سے خلعتِ کمال کا ملنا مقدر و مقرر تھا۔

مولانا سید حسین شاہ صاحب بہت ذی وجاہت تھے۔ قوی سرد ممالک کے تھے۔ مزاج میں شان اور دبدبہ تھا جس کا اثر تلامذہ اور حاضرین پر پڑتا۔ نشست برخاست گفتگو بہت باوقار اور شائستہ تھی۔ مزاج شگفتہ تھا۔ خانہ داری کے تعلقات سے بالکل بے تعلق تھے۔ صحیح اُردو خصوصاً تذکیر تانیث کی صحت کا بہت خیال رکھتے تھے۔ مدرسہ کے سلسلہ میں جو دعوتیں ہوتیں اُن میں کبھی شرکت نہ فرماتے۔ فارسی نظم و نثر پر پوری قدرت تھی۔ نثر میں کتاب خلعۃ العنود یادگار رہی۔ نظم کا نمونہ ؎

زاہد ہوائے آں قدِ رعنائی کند

ایں سفلہ رو بہ عالم بالائی کند

عبدالرحمٰن خاں صاحب مرحوم (مالک مطبع نظامی) کا زہد اس شعر کو سن کر کانپ کانپ جاتا۔

حاصل کلام۔ اُستاد مرحوم کی شانِ طلب علم یہ تھی کہ سوائے علم کے کوئی شے مطلوب نہ تھی۔ فرماتے تھے سبق سے فارغ ہو کر سب سے مقدم فکر یہ ہوتی کہ اُستاد کی تقریر کے الفاظ ذہن میں نقش ہو جائیں نقش

ایسا گہرا ہو کہ مٹائے نہ مٹے۔ ذہن میں تقریر کا بار بار اعادہ فرماتے۔ قلم سے لکھتے۔ ہم سبقوں سے مذاکرہ کرتے۔ ان مدارج سے فارغ ہو لیتے تب دوسرے مشاغل کی جانب متوجہ ہوتے۔

انہی ایام کا واقعہ ہے کہ میرزا دبیر مرحوم واردِ کانپور ہوئے۔ مجالس کی شہرت سے فضائے شہر گونج اٹھی۔ جا بجا یہی چرچا تھا اور یہی تذکرہ طلبار کو عام اجازت ہو گئی کہ جس کا دل چاہے جمال کمال سے آنکھیں روشن کرلے۔ مولوی صاحب نے بھی ارادہ کیا۔ طالب علمی کی مصروفیت نے فرصت نہ دی۔ آخر عمر تک میرزا دبیر کے نہ دیکھنے کا افسوس رہا۔

الشئی بالشئی یذکر۔ امام یحییٰ مصمودی راوی موطا کا واقعہ اس واقعہ سے کس قدر ملتا جلتا ہوا ہے۔ امام ممدوح مدینہ طیبہ میں حضرت امام مالکؒ کی خدمت میں حاضر تھے۔ غل ہوا کہ ہاتھی آیا ہے۔ حجاز میں فیل! سارا درس خالی ہو گیا۔ یہ بدستور بیٹھے رہے۔

شیخ محترم نے فرمایا یحییٰ "اندلس (اسپین) میں ہاتھی نہیں ہوتا تم بھی دیکھ آؤ"۔ ادب سے عرض کی اندلس سے آپ کو دیکھنے حاضر ہوا ہوں ہاتھی دیکھنے نہیں آیا"۔ غرض نہ اُٹھے نہ ہاتھی دیکھا۔ آج طلبا کی کتنی راتیں تھیٹر دیکھنے میں صرف ہوتی ہیں۔ اس کا جواب شاید بورڈنگ ہوسوں کے رجسٹر بھی نہ دے سکیں گے۔

الحاصل۔ توجہ کی یکسوئی اور اہتمام طلب مولانا کی طلب علم کا طرۂ امتیاز تھا جب استاد علامہ علی گڑھ تشریف لے آئے تو یہ بھی ہمرکاب تھے۔ جامع مسجد کے حجرے میں قیام ہوا۔ اس مسجد کے بلند مناروں کے دروازے جو کواڑوں سے محفوظ ہیں۔ حجروں کا کام دیتے تھے۔ جب کواڑ بند ہو جائیں تو اندر بیٹھنے والے کو دنیا و مافیہا سے بے خبری ہو جاتی ہے۔ یہ خصوصیت تھی جس کی وجہ سے وہ حجرے شایقِ مطالعہ طلبار کے محبوب تھے۔ خالی ہوتے ہی پہلے درخواستیں استاد کی خدمت میں پیش ہو جاتی تھیں۔ مولانا کو بھی ان میں سے ایک حجرہ ملا تھا۔ وہاں کے مطالعہ کی محویت کا ذوق آخر عمر تک یاد رہا۔

ایک واقعہ بیان کر کے یہ حصہ ختم کر دیتا ہے۔ ابتداءً گھر سے نکل جانے کے بعد دو برس تک گھر والوں کو پتہ نہ چلا کہ کہاں ہیں۔ جب کانپور کا قیام معلوم ہوا تو والد وہاں پہنچے۔ استاد سے ملے طلبار میں دیکھ کر پہچانا۔ کوششِ طلب دیکھ کر خوش ہوئے۔ چند روز کے لئے گھر لے آئے کہ اعزہ مطمئن ہو جائیں۔ جب سب سے

مل کر کان پور جانے لگے تو والدۂ ماجدہ نے کان کی چاندی کی بالیاں اُتار کر دیں کہ ان کو خرچ کرنا جب پڑھ کر کماؤ تو سونے کی بالیاں اُن کے بدلے میں بنوا دینا مولنا کو موقع نہ ملا کہ اس فرمائش کی تعمیل کرتے۔ والدہ کا انتقال ہوگیا۔ مدت کے بعد خواب میں دیکھا کہ سونے کی بالیاں کانوں میں پہنے ہیں۔ پوچھا یہ بالیاں کہاں سے آئیں۔ جواب دیا جو بالیاں تم کو دی تھیں اُن کے بدلے میں، یہ یہاں ملی ہیں۔

نثر نگاری | مولنا نے نثر نگاری میں نظم کی دلکشی پیدا کر دی تھی۔ علامہ شبلی نے جب ارمغانِ آصفی کا دیباچہ دیکھا تو بہت محظوظ ہوئے۔ بوقتِ ملاقات اس کے یہ فقرے مثل چیدہ اشعار کے زبانی سنائے:۔

"از گراں مائگی نقد روایات ہمسنگ ذہبی و این حجر ست، و در میزانِ اعتدال رواۃ از سبکی گراں پلہ تر۔"

کلام میں متانت ہے، خیالات میں دقت اور علو۔ دل و دماغ مضامین علمیہ سے معمور تھے۔ اساتذہ کے کلام کا تتبع تام تھا۔ یہی لوازمہ ہے قصیدہ کا۔ قصائد کا مطالعہ میرے کلام کی تصدیق کرے گا۔ نمونہ ملاحظہ ہو

دی دمِ صبح بدیدم کہ چو شمع ایمن ... از سوادِ افق افروخت بیاضِ روشن
طالعش را ز فلک کوکبہ ارزانی ... کہ کواکب شدہ زو خیرہ برنگِ ارزن
مہر از شبِ چو در آمد بکنارش گفتم ... بط کشیدست بخود بیضہ کہ دادست عن
یا مگر دایہ حبشی ست کہ شیرش خوردست ... طفل رومی کہ بزاد از شکم زنگی زن
راحت انگیز و طرب خیز چو صبح امید ... یا پسِ شام غریب آمدہ صبح وطن
یا بہارے ہست کہ از عنبر سارا گل شد ... چون فرو ریختہ نافہ شب گل مشکِ ختن
خواب می آمد و بادِ سحری خوش می رفت ... دل سکون داشت ازین آمدن و زان رفتن
میر و دیا دکہ آید بہ چمن ابرِ بہار ... ابر آید کہ رود آب بہر جوے چمن
باد بر آتشِ گل ژالہ دامان زدنست ... ابر بر خاک چمن غرقہ آب افشاندن
بادمی خیزد و بیزد ہمہ جا مشکِ تتار ... ابر بنشیند و ریزد ہمہ سو درِ عدن
ابر بہ کشاد چو از خدمت گلزار کمر ... آب از موج زہر جو بشکند دامن

از گل و لاله و نسریں سبد گل چیں شد — بام و دیوار و در و عرصهٔ کوی و برزن
خرم و تازه و شاداب و شگفته همه جا — چه بساتیں چه صحارا چه تلال و چه دمن
سبز همچوں فلک از سبزهٔ خود در و کهسار — سرخ چوں نار خلیل از گلِ نازاں گلشن
دامنِ دشت زگلگشت گریبانِ عروس — روئے صحرا ز ریاحیں همگی پشت چمن
کوه انداخته یک چادر کاهی بر دوش — دشت پوشیده یکے حلّهٔ حمرا بہ بدن
نامیه دوخت دگر بر تنِ گلزار امروز — از حریرِ یمن و اطلسِ گل پیراهن
سرو راز آبِ رواں ست قبا سیمابی — لاله را کرته گلابی ست ز شبنم بر تن
باغ شاداب و شگفته چو بهشت علیا — نخل چوں سدرهٔ و طوبیٰ ز زمیں سایه فگن
نخلبندِ چمنِ خلد به پیرامنِ باغ — خار چیں بند و گوید که چمن پیراهن
گردن و دست عروس ست تو گوئی هر شاخ — بس که با غنچه و گل آمده دست و گردن
قوتِ نامیه از تارِ عروقِ اشجار — میکند جامهٔ خورشید رفو چوں درزن
مشعل لاله و گلنار شد از بادِ خزاں — همچو شمع شجرِ وادیِ ایمن ایمن
لالهٔ آل میانِ گلِ مهتاب بود — شمع تابندهٔ ناهید به قندیلِ پرن
در شقایق گلِ مهتاب شگفته باشد — ماه و پروین که گرفت ست شفق پیرامن
لاله هندوی سیه مست که سازد در عید — کاسه لبریز گلال از نیلم و از ردین
شاخِ شب بوی شگفته به سفالِ ریحاں — صورتِ شمع شبی فروزنده به لگن
هر کجا چشم گشائی همه نرگس بینی — هر کجا گوش نهی مرغ نوا زد ارغن
هر کجا بو طلبی نکهتِ آراسته بوست — هر کجا ذائقه جوئی گل حلوا بدهن
هر کجا پای نهی مخمل سبزه فرش ست — هر کجا دست برآری پر از گل دامن
طارم تاک نماید فلک و کاهکشاں — تاک از خوشهٔ انگور چو پروین و پرن

اخلاق مولانا کے اخلاق، کلام، نشست و برخاست غرض جملہ حرکات و سکنات مہذب و باوقار تھے۔ محسوس ہوتا

تھا کہ اخلاق ناصری اور اخلاق جلالی کے عمیق مطالعہ کے بعد عمل پیرا ہونے کی کوشش کی ہی، اور سعی عمل نے اوصاف کو ملکہ اور طبیعت ثانیہ بنا دیا ہی۔ شان علمی میں بھی یہی وقار اور تعمق تھا۔ آخر تک میں نے دیکھا کہ فیض تربیت اور قوتِ مطالعہ سے جو دقّتِ نظر حاصل کی تھی اُس کی حفاظت میں اہتمام بلیغ فرماتے تھے۔ سرسری مطالعہ اور رکیک مطالب و مضامین سے بہت اجتناب تھا۔ نظر میں بلندی اور سیر چشمی تھی۔ طرز ماند و بود باقاعدہ اور شائستہ تھا۔ لباس وثاقت اور صفائی کی شان لئے ہوئے ہوتا تھا۔ مزاج میں شگفتگی تھی، عبوست نہ تھی۔ مہذب مزاح پسند تھا، ذوقِ ادب پورا تھا، اساتذہ کے کلام میں جہاں متناسب الفاظ بندھ گئے تھے، بہت پسند آتے تھے۔ اس سلسلۂ درس میں ذوق ادب تمام اساتذۂ کرام کو رہا ہی۔

معاملہ فہمی | عقل معاش نہایت سلیم تھی، معاملہ فہمی سے پورا حصہ پایا تھا۔ عدالت میں بعض مقدمات لڑانے پڑے تو اس خوبی سے اہتمام کیا کہ اہلِ نظر مان گئے۔ پنڈت اجودھیا ناتھ، الہ آباد کا نامور وکیل، قابلیت کا لوہا مانے ہوئے تھا۔ ہبۂ مرض الموت کی اس مقدمہ میں بحث تھی، میں نے دیکھا کہ برسوں تک اس مسئلہ میں مشورہ کرنے اہل معاملہ مولانا کی خدمت میں آیا کرتے تھے۔

خانہ داری سلیقہ اور ستھرائی کے ساتھ تھی۔ اولاد کی تعلیم و تربیت میں اہتمام بلیغ تھا۔ اس طرح پرورش کی کہ بلند نظری پیدا ہو، دنارت اور پست خیالی سے دور رہیں۔

طرز تعلیم | طرز تعلیم استادانہ تھا۔ درس کے وقت شان وقار ہیبت زا ہوتی تھی۔ جو قواعد تعلیم اساتذہ سے ملے تھے اُن پر پورا عمل تھا۔ فرماتے تھے کہ شاگرد کو استاد کی توجہ سے فیض پہنچتا ہی۔ درس کے وقت شاگرد کو سامنے بٹھانا چاہیے۔ مطالعہ اور صحت عبارت پر بہت توجہ رہتی تھی۔ لغزش پر ناخوش ہوتے، مگر لغزش ہوتی تو نفریں فرماتے۔ فرماتے تھے کہ طالب علم کو اس سے بہت نفع ہوتا ہی کہ فراغ سبق کے بعد مطالب کتاب پر وقتاً فوقتاً غور کرے۔ اُستاد کی تقریر پیش نظر رکھے، سوچے کہ اعتراض کیا تھا اور جواب کیا۔ مطالب کتاب کو اپنی عبارت میں قلمبند کرنے پر زیادہ زور دیتے تھے۔ اس سے مطالب ذہن نشیں ہو جاتے ہیں۔ مختصر المعانی کے بیسیوں صفحے میں نے فارسی میں لکھے تھے جن پر زبان اور مطالب دونوں کے لحاظ

سے باقاعدہ اصلاح فرمائی جاتی تھی۔

میں اپنی خوش قسمتی پر نازاں ہوں کہ ایسے نکتہ سنج اُستاد سے استفادہ کا موقع ملا۔ ۱۳۰۰ھ میں مولٰنا بھیکن پور تشریف لائے۔ میں شرح جامی اور شرح تہذیب اور فقہ میں منیۃ المصلّے اور کنز الدقایق اُس وقت پڑھ چکا تھا۔ قطبی مع میر مولانا سے شروع کی۔ پھر مختصر المعانی۔ یہ دونوں کتابیں پورے اہتمام سے پڑھائیں۔ مطالعہ، روک ٹوک، تاکید، زجر و توبیخ، بحث و مباحثہ، فارسی ترجمہ، یہ تمام مدارج طے ہوئے۔ میرا خیال ہے کہ ان دونوں کتابوں سے استعداد کو پورا نفع پہنچا۔ میں نے مولٰنا سے منطق میں قطبی مع میر، ملا حسن، حمداللہ، حکمت میں ہدیۂ سعیدیہ و میبذی، اصول میں نورالانوار، توضیح تلویح تا مقدمات اربعہ، معانی میں مختصر المعانی، فقہ میں شرح وقایہ اور ہدایہ (کتاب الرہن تک) عقائد میں شرح عقائد نسفی، حدیث میں مشکوٰۃ المصابیح، تفسیر میں جلالین اور تفسیر بیضاوی (سورۂ فاتحہ و ابتدائے سورۂ بقرہ)۔

جو حاصل ہوا فیض استاد سے، جو رہ گیا اپنے قصور استعداد سے۔ مولانا نے قریباً تمام علوم اُستاد العلما مولانا محمد لطف اللہ علیہ رحمۃ اللہ سے پڑھے تھے۔ اُستاد کا ادب نمونہ سعادت تھا۔ سعادتِ خدمت تمام تلامذہ سے زیادہ حاصل ہوئی۔ زندگی یوں بسر ہوئی اور آخرت کا آغاز اس طرح ہوا کہ استاد سے آٹھ روز بعد وفات پائی اور جوار میں دفن ہوئے۔ اسکنہما اللہ تعالیٰ فی جوار رحمتہ بحرمتہ سید المرسلین الذی ارسلہ رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ اجمعین۔

مرض الموت کا ایک واقعہ عجیب ہے، اور تلمذ کے تعلق روحانی پر شاہد عدل۔ اُستاد کی رحلت عرفہ کے دن عصر کے وقت ہوئی، تلمیذ پر مرض الموت تسلط تام پا چکا تھا، غفلت طاری تھی۔ رحلت اُستاد کی خبر باحتیاط تمام مخفی رکھی گئی، کان بے خبر رہے جان بے خبر نہ تھی۔ بہت بے چین تھے۔ شب کو غذا نہیں کھائی۔ اعزہ نے کہا کہ آج آپ اس قدر بے چین کیوں ہیں، غذا بھی نہیں ہوئی، ضعف زیادہ ہو جائے گا فرمایا ہم غذا کیا کھائیں ساری دنیا بے چین ہے۔ پوچھا کیوں؟ فرمایا مولٰنا نے رحلت فرمائی۔ تردید شدید کی بے سود۔ صبح کو بسلسلۂ تردید ایک عزیز نے کہا کہ مولٰنا کی مزاج پرسی کو گیا تھا، الحمد للہ مزاج اچھا ہے فرمایا بکتے ہو۔ الحق ع

بے واسطہ گوش و لب از راہِ دل و چشم
بسیار سخن بود کہ گفتیم و شنیدیم

حیدرآباد (دکن) ۲۳ محرم الحرام سنہ ۱۳۴۳ھ   محمد حبیب الرحمن

گزارش

(متعلق کتاب الحج مؤلفہ مولانا سید محمد سلیمان اشرف صاحب بہاری صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی)

حسب ارشاد نبوی اسلام جن پانچ ستونوں پر قائم ہی اُن میں سے ایک حج بھی ہی۔ اُس کے ادا کرنے کے بڑے بڑے فضائل ہیں نہ کرنے پر نہایت شدید وعید۔ تمام عمر میں صرف ایک مرتبہ یہ فرض ادا کرنا ہوتا ہی۔ اس سے واضح ہوگا کہ حج کا سفر کس قدر مہتم بالشان سفر ہی۔ خدانخواستہ اگر اس سفر میں آداب و فرائض کا اہتمام نہ ہوا تو گویا ساری عمر کی محنت برباد ہوئی، ثواب واجر سے محرومی جداگانہ اس کے علاوہ دوسرے فرائض مثلاً نماز و روزہ ایسے ہیں کہ انسان اُن کو دوسروں کو ادا کرتے دیکھتا رہتا ہی۔ مع ہذا چونکہ نماز ہر روز ادا ہوتی ہی روزے ہر سال آتے ہیں اس لئے اُن کے مسائل بھی بہت کچھ علم و عمل میں ہیں۔ ایک ان فرائض کے ادا کرنے میں یہ سہولت بھی ہی کہ گھر پر ادا ہوتے ہیں۔ برخلاف حج کے کہ وہ عمر میں اکثر ایک ہی مرتبہ ادا کیا جاتا ہی۔ اس لئے اُس کے مسائل کا چرچا اور علم بہت کم ہوتا ہی۔ اس بے علمی کے ساتھ سفر کی صعوبت اور مصروفی ایسی ہوتی ہی کہ مسألہ معلوم بھی ہو تو اس کا ذہن میں رہنا اور اُس پر عمل ہونا آسان نہیں۔

سفر کا تجربہ بتاتا ہی کہ بہت کم لوگ ضروری مسائل سے واقف ہوتے ہیں۔ جو لوگ لکھے پڑھے نہیں وہ ایک طرف اچھے لکھے پڑھے بھی ضروری مسائل سے واقف نہیں ہوتے۔ حرمین محترمین میں پہنچ کر ایسے لوگوں کے ہاتھ میں پڑ جاتے ہیں جو اکثر بے علم اور اس لئے صحیح مسائل سے کم واقف

ہوتے ہیں۔ حجاج اپنے آپ کو اُن کی سپرد کر دیتے ہیں اور جو وہ بتاتے جاتے ہیں اُس پر عمل کرتے جاتے ہیں۔ اس لئے ایسے عام فہم رسالوں کی شدید ضرورت ہی جن میں ضروری مسائل حج و زیارت بیان کئے گئے ہوں۔ علمائے کرام نے وقتاً فوقتاً اس جانب توجہ فرمائی ہی۔ میرے ساتھ سفر حج میں ایک سے زیادہ ایسے رسالے تھے۔ فقہ کی کتابیں بھی تھیں۔ تاہم تجربہ ہوا کہ مسائل کا اُن رسالوں سے اور کتابوں سے عین وقت پر معلوم ہونا آسان نہیں۔ عموماً رسالوں میں مسائل حج متفرق طور پر لکھ دیئے گئے ہیں۔ عبارت کی صفائی و شگفتگی پر کم لحاظ کیا گیا ہی مع ہذا اُن کے بیان میں وہ ذوق نہیں جو سفر حج کا رکن اعظم ہی۔ پس ان رسالوں اور کتابوں کے ہوتے ہوئے بھی ایسے رسالے کی ضرورت تھی جو شگفتہ و پاکیزہ، ذوق آفریں، شوق افزا بیان و عبارت میں ترتیب و تفصیل کے ساتھ لکھا گیا ہو۔ اور ترتیب ایسی ہو کہ ہر موقع کا مسئلہ وقت پر بہ آسانی نکل سکے۔ میرے سفر حج کے وقت محبی فی اللہ فضائل پناہ مولانا سید سلیمان اشرف صاحب نے غایت کرم سے رسالۂ ہذا کا مسودہ بطور زاد راہ میرے ساتھ کر دیا تھا۔ میں نے اُس کو حرز بازو بنایا اور برابر زیر مطالعہ رکھا۔ میں صاف اقرار کرتا ہوں کہ یہ رسالہ ساتھ نہ ہوتا تو یا تو بہت سے مسائل معلوم ہی نہ ہوتے یا دقت سے ملتے اور یہ دقت سفر کی دقتوں میں ایک اور دقت کا اضافہ کرتی۔ آسانی اس سے سمجھو کہ بعض دوسرے رسالوں میں دعائیں ایسی ایسی طویل تھیں کہ اُن کا یاد کرنا اور پڑھنا دشوار بلکہ بعض وقت شاید غیر ممکن ہوتا مثلاً طواف کی دعائیں کہ ایک طواف میں متعدد دعائیں پڑھنی ہوتی ہیں اور مختصر دعاؤں کی گنجائش بھی اس دقت میں دقت سے نکلتی ہی۔ بہرحال اس رسالے نے مجھ کو بہت کچھ بصیرت اور سہولت بخشی۔ اللہ تعالیٰ مؤلف عالی مرتبہ کو جزائے خیر بخشے اُس وقت تک یہ رسالہ صرف مسائل حج تک مرتب ہوا تھا۔ زیارت مدینہ طیبہ کے مسائل قلمبند نہ ہوئے تھے۔ اس لئے میں نے حضرت شیخ دہلوی قدس سرہٗ کی کتاب جذب القلوب سے استفادہ کیا۔ اب مولانا نے مسائل زیارت شریف کو بھی اضافہ فرما کر رسالہ مکمل فرما دیا ہی۔ اس کے ساتھ ساتھ حرمین محترمین کے ضروری حالات، قابل زیارت مقامات کی تفصیل بھی درج فرما دی ہی تاکہ مزید بصیرت

وتعلق حاصل ہو۔

ابھی آپ دیکھیں گے کہ غیر ضروری مسائل درج نہیں کئے۔ ضروری مسائل مرتب ابواب اور نہایت سلیس وصاف بیان میں ایسے دل کش اور شوق آفریں انداز سے تحریر فرمائے گئے ہیں کہ ہر موقع کا مسالہ فوراً نکل آئے گا۔ پڑھنے پر بے دقت سمجھ میں آجائے گا۔ اسی کے ساتھ دل میں ایک کیفیت شوق ونیاز پیدا کر دے گا۔ اب اس کے آگے اللہ کا نام اور اُس کا فضل اور اُس کے حبیب پاک کا کرم درکار ہے۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ جب عاجز بندہ شوق سے ادائے ارکان وآداب کرے گا فضل وکرم کی اُمید واثق ہے۔

مسائل کی صحت کا پورا اطمینان اس سے ہو سکتا ہے کہ مستند فقہ کی کتابوں کی اصل عبارتیں حوالہ کے ساتھ درج فرما دی گئی ہیں۔ ان عبارتوں کا اور دعاؤں کا سلیس ترجمہ بھی فرما دیا ہے۔ دعاؤں کا ترجمہ اُن کے اثر ونیاز میں مددگار ہو گا۔

اے عازمانِ حج، مولنا اپنا فرض ادا فرما چکے اب تمہارا کام ہے کہ عمل کی کوشش کرو اور دارین کی فلاح حاصل۔ [له]

اللہ تعالیٰ یہ سعی مشکور فرمائے۔ حضرت مؤلف کو جزائے خیر بخشے اور جس ذات گرامی نے عامۂ مسلمین کی حج کی مقبولی کی فکر فرمائی ہے اُس کا اور اُس کے رفقاء کا سفر حج (جو اس سال مع الخیر والعافیہ انشاء اللہ تعالیٰ ہونے والا ہے) مقبول ومبرور ہو۔ آمین یا رب العالمین بجاہ حبیبک سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ اجمعین۔

حبیب گنج:
۲۸ رمضان المبارک ۱۳۴۶ھ

نیازمند
حبیب الرحمن خاں (صدر یار جنگ)

[له] یہ کتاب نہایت عمدہ اور صحیح چھپی ہوئی مولوی حاجی محمد مقتدی خاں شروانی پرنٹنگ پریس علی گڑھ کے پتہ پر مل سکتی ہے۔

اصلاح معاشرت

گزشتہ صدی کا ایک سبق آموز واقعہ

(تقریر جو فروری ۱۹۴۳ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں کانفرنس کے شعبۂ اصلاح معاشرت کے جلسہ میں کی گئی)۔

آج سے سو برس اُدھر کا زمانہ جو تاریکی و جہالت کا دور مانا جاتا ہے اُس میں بھی ایک اجلاس شعبۂ اصلاح معاشرت کا ہوا تھا اسی علی گڑھ کے ضلع میں بھیکن پور کے قلعہ کے صحن میں ایک خیمہ کے نیچے۔ اُس کی روئداد خالی از دلچسپی نہ ہوگی۔

محمد خان زماں خاں صاحب مرحوم (میرے جد امجد) شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کے مرید تھے۔ ایک بار رسوم شادی و غم کے متعلق خاں صاحب ممدوح نے ایک استفتاء مرتب فرمایا جس میں چھتیس سوال شادی و غم کی رسوم مروجۂ خاندان شروانی کی بابت درج تھے۔ یہ استفتاء جواب کے لئے شاہ محمد اسحٰق صاحب محدث دہلوی کی خدمت میں مولوی سید ابو محمد صاحب جلیسری کی معرفت (جو شاہ صاحب کے شاگرد تھے) پیش کیا گیا۔ شاہ صاحب نے چار سوال کا اضافہ فرما کر جواب تحریر فرمایا۔

اب یہ فتویٰ بھیکن پور آیا۔ دادا صاحب نے اپنے بڑے بھائی حاجی محمد داؤد خاں صاحب مرحوم کو دکھایا جو سردار خاندان تھے۔ بڑے بھائی نے دیکھ کر فرمایا منجھلے میاں فتویٰ آیا ہی تو اس پر عمل ہونا چاہیے۔ خاندان کے سرگروہ پٹھانوں کو طلب کرو۔ اُن کو دکھاؤ چنانچہ اجلاس طلب ہوا۔ پٹھانوں نے فتوے سے اظہار عقیدت کیا۔ اس پر حاجی محمد داؤد خاں صاحب نے فرمایا کہ عقیدت ہے تو اس پر عمل کرو۔ اُس زمانہ میں خاندان شروانی میں مثل دیگر خاندانوں کے رسوم کا شادی و غمی میں ایک طوفان برپا تھا۔ مثلاً شادی میں ناچ رنگ، آتشبازی آرائش وغیرہ ساری رسمیں جاری تھیں، علیٰ ہذا القیاس۔

عمل کا ارشاد سن کر مزید بحث ہوئی۔ قرار یہ پایا کہ اس جلسہ کے بعد جو شادی ہو اُس میں فتوے کے مطابق اصلاح جاری ہو جائے۔ معلوم ہوا کہ اُس کے بعد پہلی شادی **اللہ وردی خاں** رئیس چھرہ کے یہاں ہونے والی تھی۔ اُن سے فرمائش ہوئی کہ **اصلاح** پر پہلا قدم وہ اٹھائیں اور خلاف شرع تمام رسوم ترک کر دیں۔ وہ سن کر گھبرا گئے اور کہا داؤد خاں جی سارا خاندان بگڑ جائے گا اور مجھ کو چھوڑ دے گا۔ فرمایا ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ اس سے ہمت ہوئی اور کمربستہ ہو گئے چنانچہ شادی سے قبل اعلان کیا کہ میرے یہاں شادی میں کوئی رسم خلاف شرع نہ ہوگی، نہ ناچ رنگ نہ آتشبازی اور نہ کوئی اور ایسی رسم۔

اس پر سارا خاندان بگڑا اور اعلان کیا کہ ہم اس شادی میں شریک نہ ہوں گے جو بزم ماتم بنے۔ حاجی محمد **داؤد خاں** صاحب نے اعلان کیا کہ ہم شریک ہوں گے۔ اس پر خاندان کی جہالت کا جوش کم ہوا۔ شادی ہوئی رسوم بد موقوف۔ اسی کا رواج سارے خاندان میں ہو گیا۔ اس واقعہ کو سو برس سے زائد زمانہ گزر چکا۔ **شروانی خاندان** کی مردم شماری کم و بیش دو ہزار ہے۔ قریباً دو سو میل مربع کے رقبہ میں پھیلا ہوا ہے۔

اس تمام خاندان میں سو برس کے عرصۂ دراز میں ایک شادی کا واقعہ بیان نہیں کیا جا سکتا جس میں ناچ ہوا ہو، آتشبازی چلی ہو یا اور کوئی خلاف شرع رسم ہوئی ہو۔ آج تک سارے خاندان میں پیدائش سے لے کر وفات تک ساری رسمیں اسی طریقہ پر جاری ہیں جو اُس وقت اللہ کے بندوں نے جاری فرمایا تھا۔

یہ تھی اُس زمانہ کے شعبۂ اصلاح کے ایک اجلاس کی روداد اور اُس کے نتائج۔

(کانفرنس گزٹ مورخہ ۱۶ اپریل سنہ ۱۹۴۳ء)

مقدمہ وقائع عالمگیر

(مرتبہ خان بہادر چودھری نبی احمد صاحب سندیلوی ایم۔آر۔اے۔ایس ریٹائرڈ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولس)

"وقائع عالمگیر" اُن کوششوں میں سے ایک کوشش ہے جو اس زمانے میں (بطور ردِّ عمل اُن کوششوں کے جو عالمگیر بادشاہ کو بدنام و رسوا کرنے کی کی جا رہی ہیں) اس بادشاہ کی اصلی تصویر بر روئے کار لانے کی ہو رہی ہیں۔ مثالاً علامہ شبلی مرحوم نے اُس زور قلم کے ساتھ جو اُن کا حصہ تھا اس میدان کو طے کیا "مضامین عالمگیر" یادگار ہیں۔

نواب میرزا یار جنگ نے "عالمگیر پر ایک نظر" لکھ کر حق انصاف ادا کیا۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی یہ رسالہ بھی ہے جسے چودھری نبی احمد صاحب نے لکھا ہے۔

اصل کتاب پر کچھ لکھنے سے پہلے خود چودھری صاحب کی بابت دو ایک باتیں لکھ دینا بصیرت افروز ہوگا۔ موصوف پولس کے محکمہ میں ملازم ہیں جو اپنی نوعیت کار کے لحاظ سے اُس دماغی شگفتگی سے بیر رکھتا ہے جو ایک تاریخی مضمون لکھنے کے لئے درکار ہے۔ آسانی سے کہا جا سکتا کہ ہر کلیہ استثنا رکھتا ہے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا تاہم صرف اس قدر کہہ دینا ایک دوسری حقیقت کا پردہ دار ہو جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ "وقائع عالمگیر" کے مؤلف میں بعض اُن اوصاف نے ظہور کیا ہے۔ جو ہمارے قصبات کی آب و ہوا میں صدیوں تک پرورش پاتے رہے تھے یہی وہ قصبات تھے جہاں امیر خسرو، ابوالفضل فیضی، نصرت خاں ورا ور ہزاروں نامور پیدا ہوئے جنہوں نے ہندوستان کے علمی، اخلاقی، سیاسی زندگی کو خونِ جگر سے سینچا اور پروان چڑھایا۔

ایک قصبے کی خصوصیات کیا تھیں، شہری شرفا کے جو خاندان ضروریات معاش سے فارغ کر دیئے جاتے تھے۔ علمی درسگاہیں، خانقاہیں، کتاب خانے، صنعت و حرفت، اس نظم کے مجموعی اثر سے ایک زندگی پیدا ہو جاتی تھی جو شہروں کے اثرات سے شکست ہو جانے والے دماغوں کو تازگی بخشتی رہتی تھی اور ملک اس کی برکت سے سدا بہار رہتا تھا۔ اپنی خاص نوعیت کے اعتبار سے قصبات اُن آفتوں سے بھی محفوظ رہتے تھے جو دار السلطنت اور بڑے بڑے شہروں میں انقلاب کے ہاتھوں نازل ہوتی رہتی تھیں۔

اس طرح قصبات کی زندگی پوری قوت کے ساتھ صدیوں تک ملکی زندگی میں قلب کا کام کرتی رہی جو افسوس ہے کہ آج قلب بے حرکت ہے۔ آثار پیش نظر۔

"پورب" جو شاہجہاں کا "شیراز" تھا اُس کے مردم خیز علم آور قصبات میں سے ایک سندیلہ بھی تھا جس کا طرۂ امتیاز غالباً سلامت فہمی تھی۔ اس سلامتی فہم کی اخیر یادگار مولوی حمد اللہ شارح "سلم العلوم" تھے۔

قصبۂ مذکور کے ایک فرزند مؤلف "وقائع عالمگیر" ہیں۔ سلامت روی اس تالیف کا جوہر ہے۔

"وقائع عالمگیر" میں کوشش کی گئی ہے کہ خود بادشاہ عالمگیر کی تحریروں سے اُن کی تصویر ناظرین کتاب کی آنکھوں کے سامنے پیش کر دی جائے اور اُن کو موقع دیا جائے کہ وہ اپنی نگاہ سے دیکھ کر رائے قائم کریں۔ ظاہر ہے کہ ایسی رائے کس قدر صحیح ہوگی۔

مختلف اجزا کی ایسی ترتیب جس سے مدعا کی صورت آنکھوں میں پھر جائے مؤلف کے خوبی مذاق کی شاہد عدل ہے۔

عالمگیر بادشاہ کی مختلف تحریروں سے اُن کی زندگی کے مختلف پہلو نمایاں کئے گئے ہیں۔ دعویٰ اتنا ہی کیا ہے جتنا تحریر سے ثابت ہو سکے یہ شاید سچی تفتیش کا ایک دلچسپ نمونہ ہے۔ تحریروں کا مفہوم واقعات سے واضح کیا ہے۔

جن اشخاص یا مقامات کا ذکر اُن تحریروں میں آگیا ہے اُن کی مختصر تفصیل حاشیوں میں کر دی ہے جو بجائے خود ایک دلچسپی رکھتے ہیں۔ عالمگیری ہندو امرا کی بصیرت افروز طویل فہرست شامل کی ہے اور ایک بہت اہم اصل فارسی فرمان عالمگیری کی نقل درج کی ہے جو بنارس کے ایک پوجاری کے قبضے میں ہے اور جو گویا بے تعصبی و رواداری کی پکی سند ہے۔ ایک بار خود میں نے جنگم باڑے میں وہاں کے جنگم کی مہربانی سے عالمگیری اصلی فرامین دیکھے تھے جو مثل فرمان بالا مجسم شہادت وسعت مشرب کے ہیں۔

بہر حال چودھری صاحب نے اپنے ذوق سلیم کی مدد سے تاریخی ذوق رکھنے والے اصحاب کے لئے ایک صحت بخش ضیافت مہیا فرمائی ہے جس کی نسبت یہ اُمید بیجا نہیں کہ اہل ملک شکر کے ساتھ اُس سے فیضیاب ہوں گے۔ پہلی مرتبہ کے مطبوعہ نسخوں کا کامیابی سے شائع ہو کر دوبارہ طبع کا سامان ہونا بجائے خود مقبولیت کی علامت بلکہ دلالت ہے۔ اللھم زد فزد۔

خاکسار

محمد حبیب الرحمن خان شروانی (صدر یار جنگ)

حبیب گنج ضلع علی گڑھ
۱۲ مارچ سنہ ۱۹۳۰ء

تحریر

درباره

مدرسۂ قومی

سرسید مرحوم کے آخری زمانۂ حیات میں یہ تحریک ہوئی تھی کہ مدرستہ العلوم علی گڑھ کے نمونہ پر مسلمانوں کے اور مدارس بھی جاری ہونے چاہئیں۔ اس تحریک کے پہلے محرک پروفیسر مارسین تھے جو آخر تک اس کے روح رواں بھی رہے۔ اس تحریک کی تائید میں مختلف مقامات پر چھوٹے چھوٹے مدرسے قائم ہوئے جن میں سے بعض بڑھ کر اب کالج کے درجہ تک پہونچے ہوئے ہیں۔

اسی تحریک کی تائید میں خود علی گڑھ کے قرب وجوار میں چار مدرسے قائم ہوئے۔

(۱) تقریباً بارہ میل کے فاصلہ پر قصبۂ جلالی سادات میں۔

(۲) تقریباً انیس ۱۹ میل کے فاصلے پر قصبۂ سکندرہ راؤ میں۔

(۳) تقریباً چھبیس ۲۶ میل کے فاصلہ پر قصبۂ پھرہ میں۔ یہ تینوں مدرسے خود ضلع علی گڑھ میں تھے۔

(۴) تقریباً چھتیس ۳۶ میل کے فاصلہ پر قصبۂ مارہرہ ضلع ایٹہ میں۔

یہ چاروں مدرسے مڈل اسکول تھے۔ پھرہ کا مدرسہ جس کا تعلق خاندان شروانی سے تھا، ان سب میں ممتاز تھا۔ اس کا افتتاح اگست ۱۸۹۶ء میں ہوا تھا۔ مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب (نواب صدر یار جنگ) اس کے پہلے سکریٹری تھے۔ صدر کوئی خاص صاحب نہ تھے۔ ایک عمدہ وسیع بورڈنگ ہاؤس تھا جس کے وسط میں مدرسہ کی خوبصورت اور ربک عمارت تھی۔ انگریزی کے ساتھ عربی کی بھی تعلیم ہوتی تھی۔ انگریزی کی مڈل کی جماعت کے ساتھ فارسی

میں گلستان بوستان تک اور عربی میں شرح تہذیب، قدوری اور ترجمۂ کلام مجید تک ہوتی تھی۔ عربی کے مدرس اوّل و دویم مفتی لطف اللہ رحمہ اللہ کے ارشد شاگرد تھے۔ مدرسۃ العلوم کے نمونے پر دارالمطالعے اور کئی قسم کی سوسائٹیاں قائم تھیں اور مدرسہ کی شہرت ہندوستان سے باہر اسلامی و غیر اسلامی ممالک تک پہونچ گئی تھی۔ سید صاحب مرحوم کو بھی اس کے قیام اور ترقی پذیری سے بہت خوشی تھی۔ پروفیسر ماریسن اور پرنسپل بیک اکثر اس کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ اس کا سالانہ خرچ صرف اٹھارہ سو روپیہ (ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار) تھا۔ ہیڈ ماسٹر کی تنخواہ چالیس اور ہیڈ مولوی کی پچیس روپیہ تھی اور طالب علموں کا خرچ اول نمبر کی خوراک کے ساتھ فی کس ساٹھ۔ آٹھ روپیہ ماہوار ہوتا تھا۔ مسٹر صابر علی خاں شروانی ایم اے ایل ایل بی سابق ڈپٹی کلکٹر، مسٹر عباس خاں شروانی بی اے، مسٹر نثار احمد خاں شروانی بی اے ایل ایل بی جو اس وقت اس صوبہ کی حکومت میں وزیر زراعت ہیں اور مسٹر تصدق احمد خاں شروانی مرحوم (جن کی شہرت ہندوستان کی سیاست میں محتاج بیان نہیں) خان بہادر عبد المقیت خاں صاحب چیرمین میونسپل بورڈ علی گڑھ مولوی حاجی عبید الرحمٰن خاں صاحب ٹریزرر قائم مقام وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی اسی مدرسہ کے تعلیم و تربیت یافتہ تھے۔ راقم الحروف نے بھی مدرسۃ العلوم کی طالب علمی کے زمانہ میں وہاں کی تعطیلات کلاں کے دوران میں جا جا کر عربی کی تحصیل اسی شروانی اسکول چھرہ میں کی تھی۔

افسوس ہے کہ چند سال تک ایسی کامیابی اور فائدہ رسانی کے ساتھ چل کر عہدہ سکرٹری شپ کے انتخاب کے نزاعات کی نذر ہو کر بند ہو گیا۔ اور اب کھنڈر ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یہ تحریر ۱۲ شعبان ۱۳۱۳ھ کو بمقام برہرہ ایک شادی کے موقع پر اصحاب خاندان کے سامنے پڑھی گئی تھی ؎

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ
آثار پدید ست صنادید عجم را

محمد مقتدیٰ خاں شروانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بزرگان و برادران من! جب کوئی شخص کسی مجمع میں گفتگو کرنے کے واسطے کھڑا ہوتا ہے تو اہل جلسہ کی آنکھیں بیتابی سے اُس کی طرف اُٹھتی ہیں اور ہر ایک اپنے دل میں سوال کرتا ہے کہ دیکھئے کیا بیان ہو۔ لیکن اے حضرات جو کوئی شروانی پٹھانوں کے جلسہ میں تقریر کرنے کھڑا ہو گا اگر وہ خاندانی حالات سے بحث کرنا چاہتا ہے تو سوائے غم واندوہ کے افسانوں کے کیا کہے گا اور اُس سے یہ امید ہرگز نہ رکھنی چاہئے کہ وہ کوئی فرحت انگیز اور دل کی خوش کرنے والی تقریر کرے گا۔ پس میں جب آپ کی خدمت میں کھڑا ہوا ہوں تو سوائے خاندانی دُکھڑا رونے اور اہل خاندان کی مصیبت بیان کرنے کے آپ کی خدمت میں کیا عرض کر سکتا ہوں۔ اس کی مثال بعینہ ایسی ہی جیسی عشرۂ محرم کی مجالس۔ وہ مجلس اگرچہ کیسی ہی آراستہ ہو اور سامان بزم کیسا ہی دل آویز ہو لیکن جو لوگ اُس میں آئیں گے وہ سوا اس کے کہ اپنے رومال تر اور آنکھیں سرخ لے کر اٹھیں کیا کریں گے اور اُس محفل کے ممبر پر بیٹھنے والے سے یہ توقع رکھنا کہ وہ کوئی ایسی نقل بیان کرے گا جس سے سننے والوں کے پیٹ میں ہنستے ہنستے بل پڑ جائیں خلاف انسانیت ہے صاحبو! کبھی ہم بھی ہنستے تھے اور ہمارے مرحوم بزرگ زندہ دلی کی جیتی جاگتی تصویریں تھیں اور چلتی پھرتی مورتیں۔ مگر حیف کہ اب وہ زمانہ گیا اور خاندان کی اس اُجڑی حالت اور بگڑی حیثیت میں ہنسنا بھلا بھی نہیں معلوم ہوتا ؎

آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی　　　اب کسی بات پر نہیں آتی

تو حضرات! میری تقریر کا موضوع تو آپ کو معلوم ہو گیا کہ کیا ہے مگر مجھ کو حیرت ہے کہ میں کونسی بگڑی حالت بیان کروں کیونکہ جس حالت کو دیکھئے وہی بگڑی ہوئی ہے اور جس پہلو پر نظر ڈالئے بیکل ہے ؎

کیا پوچھتے ہو ہمدم اس جسم ناتواں کی　　　رگ رگ میں نیش غم ہے کہئے کہاں کہاں کی

لیکن نہیں مجکو حیران نہ رہنا چاہئے۔ ہماری بگڑی حالت ہماری صورتوں سے ہمارے گھروں سے ہماری شادی بیاہ کی مجلسوں سے ہماری عیدسے بقرعید سے غرضکہ ہر بات سے بالکل عیاں ہے۔

اور عیاں کو بیان کی کچھ حاجت نہیں۔ شادیوں کے جلسے اور عید بقرعید کے تیوہار ایسی افسردگی اور اُداسی سے گزر جاتے ہیں کہ ہم کو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ کوئی خوشی کا موقع آیا تھا۔ اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ پہلے ہمارے یہی دیہات کچھ ایسے دلچسپ تھے کہ وہ لوگ جن کے دل دلّی اور لکھنؤ کی صحبتوں کے مزے اٹھائے ہوتے تھے وہ یہاں آکر تسکین پاتے تھے اور اُن کو یہ خاک مانوس معلوم ہوتی تھی۔ جن مشائخ علما اور حکما کے قدموں کی برکت اس سرزمین کو نصیب ہوئی ہو اگر اُن کی فہرست لکھی جائے تو اُس کو پڑھ کر ہمارا دل فخر سے اُچھلنے لگے۔ مگر افسوس کہ اب آثار اچھے نہیں اور ہر طرف سنّاٹا چھاتا جاتا ہے اور سناٹا نہ ہو تو کیا ہو۔ جب عدالتیں اور سرائیں شب و روز پٹھانوں کے دم قدم سے آباد رہیں تو اُن کے مکان کس کے دم سے آباد نظر آئیں۔

عید بقرعید شادی بیاہ میں خوشی اور چہل پہل کیسے ہو۔ یہ سارے جلوے ہیں آپس کے میل جول کے باہمی محبت و ارتباط کے اور دلوں کے انبساط کے۔ یہاں آپس کی کشمکش اور نفسانیت سے یہ عالم ہے کہ دنیا ہم پر تنگ ہو رہی ہے اور ہم خود اپنی جانوں سے بیزار بیٹھے ہیں پھر کیسی خوشی اور کہاں کا ولولہ۔

نہ چھیڑ اے نکہت بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

خاندان کے نوجوان جن پر خاندان کی زندگی منحصر ہے جس ناگفتہ بہ حالت میں ہیں وہ سب پر ظاہر ہے۔ افسوس ہم کو کھلے ہوئے طور پر معلوم ہوتا ہے کہ جوں جوں نئی نسلیں آتی اور سنبھلتی جاتی ہیں اُسی قدر لیاقت کا معیار گھٹتا جاتا ہے جو نوجوان ہوشیار ہوتے اور اپنی دنیاوی حالت سنبھالتے ہیں۔ سب سے اول جو چیز اُن کی نگاہ کے سامنے آتی ہے وہ اپنے عزیزوں سے لڑائی اور اپنے یگانوں سے خصومت ہوتی ہے۔ جس خاندان کی کل کی زندگی اس نسل پر موقوف ہو اُس کو آج ہی مردہ سمجھ لینا چاہیے اور کل جو لوگ یہاں آئیں گے وہ زندوں سے ملتے نہیں۔ بلکہ مُردوں پر فاتحہ پڑھنے آئیں گے۔ اے شروانی نسل کے نام لینے والو کیا زندگی اسی کا نام ہے کہ ہم جب تک جئیں اپنے عزیزوں سے اور یگانوں سے بیزار رہیں۔ کول ایٹہ کے راستوں کی خاک ہمارے سروں پر ہو۔ لُو چلتی ہو یا مُوسلا دھار پانی برستا ہو مگر ہم ہوں کہ بادیہ نوردی میں پریشان ہوں حالانکہ جانور بھی ایسی

حالت میں کسی سایہ میں سکھ پا لیتے ہیں۔ گھر میں بچے بیمار ہوں ماں کی جان پر بنی ہو اور ہم کہاں ہوں علی گڑھ اور ہم کو کہاں خبر پہنچے؟ الہ آباد جب صبح کو آنکھ کھلے تو کوئی نکوئی ایسی منحوس خبر کانوں میں پہنچے جس سے کلیجہ چھد کر رہ جائے۔ اور جب ہم بستر پر رات کو لیٹیں تو گھنٹوں فکر اور تشویش نیند کو پاس نہ آنے دے۔ اللہ اکبر! کیا اچھی گذران ہے اور کیسی عمدہ زندگی ہے حیف ہے اس زندگی پر اور افسوس ہے اس جینے پر۔ ہمارے اس جینے سے جانوروں کی زندگی بہتر ہے کہ آخر وہ خدا کی مخلوق کھانے پینے سونے جاگنے کا تو آرام پاتے ہیں۔ یہاں یہ بھی نہیں۔ اب غور طلب یہ امر ہے کہ یہ ساری مصیبت ہم پر کہاں سے آئی۔ خدا نے ہم کو سب سے بڑی نعمت تو یہ دی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں ہم کو پیدا کیا۔ اور پھر ایسا خاندان دیا جو صدیوں سے معزز ہے۔ پشت پناہی کو عزیز دیئے۔ کھانے کو ریاستیں دیں جائدادیں دیں عقل دی ہوش دیا۔ سلطنت نے ہم کو امن دیے کونسل میں حصہ ضلع کے انتظاموں میں شرکت۔ دربار میں کرسی۔ ایکٹ اسلحہ سے استثنا یہ سب کچھ ہم کو سرکار نے دیا ہے اور اگر ہم اس سے زیادہ لایق ثابت ہوں تو بہت کچھ دینے کو تیار ہے۔ ہمارے بزرگوں نے ہم کو ذلت وخواری ورثہ میں نہیں پہنچائی خدا اُن کو جنت میں اعلیٰ مدارج دے جب وہ دنیا سے گئے تو خاندان کا نام روشن جائداد وسیع قرض سے پاک گھر بھرا پرا چھوڑا۔ یہ سب شامت ہمارے اعمال کی بدولت ہے۔ اور ہم نے خود یہ بدبختی اپنے سر پر بلائی ہے جو کچھ خدا نے بخشا سلطنت نے دیا مورثوں نے چھوڑا (خواہ دولت تھی خواہ عقل خواہ عزت) وہ سب ہم نے اپنے عزیزوں اور یگانوں کی بربادی اور اپنی تباہی میں صرف کی۔ اور ایسے خاندان کا انجام وہی ہوتا ہے جو ہم نے دیکھا اور ابھی کیا دیکھا ہے جو آیندہ دیکھیں گے ابھی تو کچھ لفافہ درست ہے جس روز یہ لفافہ بھی خدانخواستہ نہ رہا تو اے میرے عزیزو ہم اور آپ دنیا کو بہت سخت مقام پائیں گے۔

ہاں حضرات! جب یہ شامت اعمال ہمارے ہاتھوں سے ہمارے سروں پر آئی ہے تو ہمیں کو اس کا چارہ کار سوچنا چاہیے اور اس پر عمل کرنا ضرور ہے اب علاج کیا ہے؟ اس میں بحث ہے بعض پرانے تجربہ کار لوگ جن کی دوربین آنکھوں کے سامنے پچاس برس گذشتہ کا زمانہ ہے یہ فرماتے ہیں کہ

اول تمام برادری میں اتفاق قایم ہو اور کل جھگڑے جو عدالتوں میں دائر ہیں یا تھے پنچایت سے طے ہوں اور باہم یہ عہد ہو جائے کہ آیندہ نہ جھگڑیں گے جب یہ سب کچھ ہو لے تو پھر مدرسہ بنے یا بچّوں کی تعلیم کا سلسلہ جاری ہو۔ یہ تدبیر عمدہ ہے مگر مجھ کو اس میں شبہ ہے کہ یہ تدبیر سرسبز بھی ہونے والی ہے یا نہیں۔ پنچایت کا اصول ہی باہمی اعتماد اور اعتبار ہے جب تک ایک خاندان کے افراد کو ایک دوسرے پر اطمینان نہ ہو اُس وقت تک اپنے نیک و بد کو ایک دوسرے کے اختیار میں نہیں دے سکتے۔ اور اُن میں پنچایت کا سلسلہ قائم نہیں ہو سکتا۔ جو ہمارے مقدمات حکام کی کوشش سے پنچایت میں آتے ہیں اُن کی نسبت تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل معاملہ اغیار کو پنچ بمقابلہ اپنے یگانوں کے زیادہ خوشی سے بناتے ہیں۔ یہ تجربہ سبق دیتا ہے کہ ہم میں آپس کا اعتبار جاتا رہا ہے۔ اس کے اسباب جو کچھ ہوں۔ غرض جب سب مدعی ہیں یا سمجھے جاتے ہیں تو پنچ کون ہو اور پنچ نیاؤ کہاں سے آئے۔ ایک یہ رائے ہے کہ تعلیم کے ذریعہ سے قوم کے خیالات بدلے جائیں۔ اور اس طرح پھر وہ اوصاف اہل خاندان میں پیدا ہوں جو ہمارے بزرگوں کے سبب فلاح تھے۔ بعض لوگ یہ کہہ اُٹھتے ہیں کہ ہمارے بزرگ کیا مدرسوں میں پڑھے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارے بزرگ مدرسوں میں نہیں پڑھے تھے لیکن اُس زمانہ میں خاندان کی قوت مجموعی قایم تھی اور اُس دباؤ کے اثر سے خاندان کے ہر فرد میں وہ اوصاف پیدا ہوتے تھے جو صدیوں سے خاندان میں چلے آتے تھے۔ اس مجموعی قوت کا اصل اُصول یہ تھا کہ اُس زمانہ میں بیرونی تعلقات کے ذرائع آسان نہ تھے اور خاندان کے خیالات اس وجہ سے ایک خاص دائرہ میں محدود تھے۔ وہ یا اپنے بزرگوں کو دیکھتے تھے یا بزرگو سے بزرگوں کے حالات سنتے تھے میں اگلے زمانہ کے ایسے بزرگوں کے حالات سے واقف ہوں جنھوں نے پیرانہ سالی میں کاسگنج دیکھا تھا اور وہ حیران تھے کہ اللہ اکبر دنیا میں ایسے بڑے شہر بھی ہوتے ہیں اور پھر کاسگنج بھی آج کا کاسگنج نہ تھا اگلے زمانہ کا کاسگنج تھا جس کے بازار میں چھپر پڑے تھے۔ اسی یکسوئی کا یہ نتیجہ تھا کہ اُن بزرگوں کو خاندانی حالات اور روایات ہم سے بہت زیادہ ازبر تھیں اور خاندان کی ہر ایک نقل و حرکت کو بہت غور اور دلچسپی سے دیکھتے تھے۔ دوسرا نتیجہ اس کا یہ تھا

کہ ہر ایک احتیاج کے وقت سربرآوردہ اصحاب خاندان کی طرف اہل خاندان رجوع کرتے تھے اور خاندان کا مجموعی رعب قایم تھا۔ اسی رعب کا یہ اثر تھا کہ شادی وغمی میں جو خلاف شرع و فضول رسوم تھیں وہ ایک لخت موقوف ہوگئیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ رسمیں یونہیں موقوف ہوگئیں! آپ کسی ایک چھوٹی سی رسم کو موقوف کرنے کا تذکرہ کیجیے پھر دیکھیے کہ کیا قیامت برپا ہوتی ہے۔ اس سے آپ قیاس کرسکیں گے کہ کتنے زبردست رعب واثر نے اُن بڑی مضبوط و کہنہ رسموں کو غارت کیا تھا۔ اب زمانہ نے پلٹا کھایا اور بیرونی تعلقات آسانی سے قایم ہونے لگے۔ وہ خاندانی اثر جو ان برکتوں کا سرچشمہ تھا اُس کا بڑا حصہ تو عدالتوں کے قبضے میں گیا، کچھ مہاجنوں کو ملا، کچھ وکیل لے اُڑے، خاندان اور اہل خاندان کے قبضے میں کچھ بھی نہ رہا اور کچھ رہا بھی تو وہ کافی نہیں۔ غرض تو جو بات ہمارے بزرگوں کو حاصل تھی وہ اُس تربیت کی وجہ سے تھی جو پشت در پشت سے چلی آتی تھی۔ اور وہ تربیت قایم تھی۔ مجموعی اثر کے زیر سایہ اب وہ نہ تربیت ہے نہ اثر ہے تو بدون تعلیم وہ بات حاصل نہیں ہوسکتی۔ اب تعلیم کی دو صورتیں ہیں۔ بعض صاحبوں کی یہ رائے ہے کہ حلقہ برادری میں مدرسہ قایم نہ کیا جائے۔ بلکہ کسی صدر مقام پر جہاں مدرسہ قایم ہو ایک مکان بنایا جائے، لڑکے رہیں اُس مکان میں پڑھیں مدرسہ میں۔ اُن کی یہ رائے اول اس دلیل سے ہے کہ جیسی عمدہ تعلیم بڑے مدرسوں میں حاصل ہوگی ویسی چھوٹے چھوٹے مدرسوں سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ دوسری قوی وجہ اُن کے خیال میں یہ ہے کہ خاندان کے موجودہ خیالات اور حالات پر غور کریں تو یہ ممکن نہیں کہ مدرسہ بن سکے اور چل سکے لہذا ایسی تحریک پر یہ اثر پیدا کریں گے کہ خاندان کا روپیہ بے فائدہ صرف ہوگا اور جو تحریک خاندان میں لڑکوں کے باہر بھیجنے کی پیدا ہوگئی ہے وہ رُک جائے گی۔ لیکن کثرت سے اہل برادری کی یہ رائے ہے کہ حلقۂ برادری میں مدرسہ قایم ہو اور اُس میں بچّوں کی ابتدائی تعلیم کا بندوبست کیا جائے اور جب لڑکے اس تعلیم کو ختم کرلیں تو باہر مدارس میں تکمیل کے واسطے بھیجے جائیں۔ اسی فریق کا ہمرائے میں بھی ہوں اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس رائے کے دلائل آپ کے سامنے بیان کردوں۔

میرے خیال میں اول یہ طے ہونا چاہیے کہ تعلیم سے مقصود کیا ہی؟ ہم نے اپنے ذہن میں تعلیم کا مقصد یہ قرار دیا ہی کہ اُن میں پھر باہمی ہمدردی اولوالعزمی اور راستبازی پیدا ہو اور پھر وہ اپنے باپوں کے سپوت ہوں۔ اسی کے ساتھ خاندانی صفات قایم رہیں۔ اور اسی ضمن میں اُن کو تعلیم کے اس سے کمتر درجہ کے فوائد بھی مثل ملازمت وغیرہ نصیب ہوں۔ ان مقاصد کے حصول کے واسطے ضرور ہی کہ قوم کے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دی جائے۔ میں نے ایک تجربہ کار سے اس بارہ میں بحث کی تھی انہوں نے یہ کہا کہ اگر تم دس لڑکے اعلیٰ تعلیم تک پہنچانا چاہتے ہو تو سو لڑکوں کی تعلیم کا بندوبست کرو تب اس میں سے دس لڑکے ایسے نکلیں گے جو اعلیٰ تعلیم تک پہنچیں۔ ہمارے پاس جو سرمایہ ہی اس سے سو لڑکے ہم شہر میں نہیں پڑھا سکتے لیکن حلقۂ برادری میں اُس سے سو لڑکوں کی تعلیم کا انتظام کر سکتے ہیں۔ دوسرا مقصد یہ ہی کہ ہم اول اپنے بچوں کو مذہبی تعلیم دلوالیں اُس کے بعد انگریزی پڑھائیں اور اس طرح اُس ہلاکت سے اُن کو بچائیں جن میں اکثر انگریزی طلبا پڑتے جاتے ہیں۔ میں نے دہلی میں کانفرنس کے جلسہ میں اپنے کانوں سے ایک ممبر کانفرنس کو یہ کہتے سُنا کہ پنجاب کے ایک شہر میں مولوی نورالدین صاحب نے انگریزی اسکول کے طلبہ سے نماز کی بابت پوچھا تو معلوم ہوا کہ اُن کو الحمد بھی یاد نہ تھی خود سید صاحب نے اس طوفان بے تمیزی کو تسلیم کیا ہی جب یہ عالم ہے تو کس طرح ہم اپنے لخت جگر بچوں کو آگ میں جھونک دیں؟ پس ضرور ہی کہ ہم اول اپنے بچوں کو ضروری تعلیم دینی دلوائیں، تب مدرسوں میں بھرتی کریں اور اس واسطے ضرور ہی کہ ابتدائی تعلیم کا بندوبست اپنے ہاتھوں میں رکھیں اور اگر لایق مدرس ہم پہنچیں تو ابتدائی تعلیم کا اُسی خوبی سے بندوبست ہو سکتا ہے جیسا بڑے اسکولوں میں۔ اس سے آپ سمجھ سکیں گے کہ حلقۂ برادری میں مدرسہ قایم ہونا زیادہ ضرور ہی ایک یہ رائے بھی ہی کہ انجمن اپنے سرمایہ سے اُن طلبۂ برادری کو وظائف دے جو باہر مدرسوں میں پڑھ رہی ہیں۔ یہ صورت بیشک قابل ہمدردی ہی لیکن ہمارا سرمایہ اتنا کافی نہیں کہ ہم دو کام ایک وقت میں جاری کر سکیں۔ جب ایک کام سے فراغت حاصل ہولے تو دوسرا کام شروع کریں۔ غرض ہم نے اسی خیال کی بنا پر قلعہ چھرہ میں مدرسہ بنانا شروع کیا ہی۔ اگرچہ گذشتہ فروری میں بمقام علی گڑھ

کمیٹی نے بعد بحث بسیار بکثرت رائے یہ طے کیا تھا کہ قلعہ چھرہ میں مدرسہ بنایا جاوے مگر اب تک بعض
صاحبوں کو اُس مقام کے انتخاب میں حجت ہے۔ صاحبو بات یہ ہی کہ عرصہ تک یہ امر زیر بحث رہا
کہ مدرسہ کس مقام میں بنایا جائے۔ اور مختلف دیہات کے نام لئے گئے مگر اُن مقامات میں سے کسی
ایک کے انتخاب کرنے میں اس بات کا سخت اندیشہ رہا کہ وہاں مدرسہ قایم کرنے میں خیالات
کا مجتمع رہنا اور یکساں ساعی ہونا ممکن نہ ہوگا۔ اور بدوں اتفاق کامل یہ کام ہرگز جاری نہیں ہوسکتا
انھیں اسباب سے قلعہ چھرہ پسند کیا گیا کہ وہ کسی زبردست فریق کے حلقۂ اثر میں نہیں مع ہذا قصبہ
ہونے کی وجہ سے ضروریات روزمرہ بہ آسانی بہم پہنچ سکیں گی۔ خدا کا شکر ہی کہ مدرسہ کے ارکان
اس وقت تک بہت سرگرمی سے تعمیر مدرسہ میں مصروف ہیں۔ تمام خاندان کو محمد سلیمان خاں صاحب
کا ممنون ہونا چاہیے کہ انہوں نے اپنے تمام اوقات کو اور آرام کو اس پر وقف کر دیا ہے۔
دوسری جگہ یقیناً ایسا مہتمم نہ ملتا۔ اس وقت تک مبلغ چار ہزار روپیہ چندۂ تعمیر میں تحریر ہو چکے ہیں
مبلغ تین ہزار روپیہ تعمیر مدرسہ میں صرف ہو چکے ہیں تیئس ۲۳ کمرہ بورڈنگ ہوس کے مع پختہ غلام
گردش تیار ہو چکے ہیں صرف اُن کا پٹنا باقی ہے۔ مدرسہ یعنی پڑھنے کے مکان کی بنیاد ایک گز
اونچی ہو چکی ہی اور تین جانب کی پختہ دیوار احاطہ تیار ہو چکی ہی۔ اگر قوم نے مدد جاری رکھی تو انشاء اللہ
تعالیٰ برسات تک ضروری کام ختم ہو جائے گا۔ اور سات آٹھ مہینے میں ہمارے نور نظر اُس میدان
میں مجتمع نظر آنے لگیں گے۔ اب ایک امر باقی رہتا ہی اُس کا مجھ کو عرض کرنا ضروری ہی۔ وہ یہ کہ مدرسہ
کی حالت تعمیر دیکھ کر اب یہ تو لوگوں کو یقین ہونے لگا ہی کہ مدرسہ بن جائے گا۔ مگر اب تک اس میں
قوی شبہات ہیں کہ آیا وہ چل بھی سکے گا؟ میرے خیال میں یہ صورت چندہ چلنے والی نہیں جیسے
اب دو دو اور چار چار روپیہ جمع کئے جاتے ہیں۔ یہ روپیہ جس دقت سے وصول ہو رہا ہی اُس
کو میں خوب جانتا ہوں۔ اور اس تجربہ کی رو سے میں بھی مدرسہ چلنے سے مایوس ہوں۔ مدرسہ کے
چلنے اور قایم رہنے کی صورت ایک ہی اور صرف ایک۔ اور وہ یہ کہ ارباب ہمم جتنا سالانہ چندہ
مقرر کریں اُتنی آمدنی کی زمین بنام مدرسہ وقف کر دیں یہ صورت بظاہر شاید مشکل معلوم ہو لیکن مشکل

میرے خیال میں اول یہ طے ہونا چاہیے کہ تعلیم سے مقصود کیا ہے؟ ہم نے اپنے ذہن میں تعلیم کا مقصد یہ قرار دیا ہے کہ اُن میں پھر باہمی ہمدردی اولوالعزمی اور راستبازی پیدا ہو اور پھر وہ اپنے باپوں کے سپوت ہوں۔ اسی کے ساتھ خاندانی صفات قایم رہیں۔ اور اسی ضمن میں اُن کو تعلیم کے اس سے کمتر درجہ کے فوائد بھی مثل ملازمت وغیرہ نصیب ہوں۔ ان مقاصد کے حصول کے واسطے ضرور ہے کہ قوم کے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دی جائے۔ میں نے ایک تجربہ کار سے اس بارہ میں بحث کی تھی انہوں نے یہ کہا کہ اگر تم دس لڑکے اعلیٰ تعلیم تک پہنچانا چاہتے ہو تو سو لڑکوں کی تعلیم کا بندوبست کرو تب اس میں سے دس لڑکے ایسے نکلیں گے جو اعلیٰ تعلیم تک پہنچیں۔ ہمارے پاس جو سرمایہ ہے اُس سے سو لڑکے ہم شہر میں نہیں پڑھا سکتے لیکن حلقۂ برادری میں اُس سے سو لڑکوں کی تعلیم کا انتظام کر سکتے ہیں۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ ہم اول اپنے بچوں کو مذہبی تعلیم دلوالیں اُس کے بعد انگریزی پڑھائیں اور اس طرح اُس ہلاکت سے اُن کو بچائیں جن میں اکثر انگریزی طلبا پڑ جاتے ہیں۔ میں نے دہلی میں کانفرنس کے جلسہ میں اپنے کانوں سے ایک ممبر کانفرنس کو یہ کہتے سُنا کہ پنجاب کے ایک شہر میں مولوی نورالدین صاحب نے انگریزی اسکول کے طلبہ سے نماز کی بابت پوچھا تو معلوم ہوا کہ اُن کو الحمد بھی یاد نہ تھی خود سید صاحب نے اس طوفان بے تمیزی کو تسلیم کیا ہے جب یہ عالم ہے تو کس طرح ہم اپنے لخت جگر بچوں کو آگ میں جھونک دیں؟ پس ضرور ہے کہ ہم اول اپنے بچوں کو ضروری تعلیم دینی دلوائیں، تب مدرسوں میں بھرتی کریں اور اس واسطے ضرور ہے کہ ابتدائی تعلیم کا بندوبست اپنے ہاتھوں میں رکھیں اور اگر لایق مدرس ہم پہنچیں تو ابتدائی تعلیم کا اُسی خوبی سے بندوبست ہو سکتا ہے جیسا بڑے اسکولوں میں۔ اس سے آپ سمجھ سکیں گے کہ حلقۂ برادری میں مدرسہ قایم ہونا زیادہ ضروری ہے۔ ایک یہ رائے بھی ہے کہ انجمن اپنے سرمایہ سے اُن طلبۂ برادری کو وظائف دے جو باہر مدرسوں میں پڑھ رہے ہیں۔ یہ صورت بیشک قابل ہمدردی ہے لیکن ہمارا سرمایہ اتنا کافی نہیں کہ ہم دو کام ایک وقت میں جاری کر سکیں۔ جب ایک کام سے فراغت حاصل ہو لے تو دوسرا کام شروع کریں۔ غرض ہم نے اسی خیال کی بنا پر قلعہ چھرہ میں مدرسہ بنانا شروع کیا ہے۔ اگرچہ گذشتہ فروری میں بمقام علی گڑھ

کمیٹی نے بعد بحث بسیار بکثرت رائے یہ طے کیا تھا کہ قلعہ چھرہ میں مدرسہ بنایا جاوے مگر اب تک بعض صاحبوں کو اُس مقام کے انتخاب میں حجت ہے۔ صاحبو بات یہ ہی کہ عرصہ تک یہ امر زیر بحث رہا کہ مدرسہ کس مقام میں بنایا جائے۔ اور مختلف دیہات کے نام لئے گئے مگر اُن مقامات میں سے کسی ایک کے انتخاب کرنے میں اس بات کا سخت اندیشہ رہا کہ وہاں مدرسہ قایم کرنے میں خیالات کا مجتمع رہنا اور یکساں ساعی ہونا ممکن نہ ہوگا۔ اور بدون اتفاق کامل یہ کام ہرگز جاری نہیں ہوسکتا انھیں اسباب سے قلعہ چھرہ پسند کیا گیا کہ وہ کسی زبردست فریق کے حلقۂ اثر میں نہیں مع ہذا قصبہ ہونے کی وجہ سے ضروریات روزمرہ بہ آسانی بہم پہنچ سکیں گی۔ خدا کا شکر ہی کہ مدرسہ کے ارکان اس وقت تک بہت سرگرمی سے تعمیر مدرسہ میں مصروف ہیں۔ تمام خاندان کو محمد سلیمان خاں صاحب کا ممنون ہونا چاہئے کہ انہوں نے اپنے تمام اوقات کو اور آرام کو اس پر وقف کر دیا ہے۔ دوسری جگہ یقیناً ایسا مہتمم نہ ملتا۔ اس وقت تک مبلغ چار ہزار روپیہ چندۂ تعمیر میں تحریر ہوچکے ہیں مبلغ تین ہزار روپیہ تعمیر مدرسہ میں صرف ہوچکے ہیں ۲۲ تیئس کمرہ بورڈنگ ہوس کے مع پختہ غلام گردش تیار ہوچکے ہیں صرف اُن کا پٹنا باقی ہے۔ مدرسہ یعنی پڑھنے کے مکان کی بنیاد ایک گز اونچی ہوچکی ہی اور تین جانب کی پختہ دیوار احاطہ تیار ہوچکی ہی۔ اگر قوم نے مدد جاری رکھی تو انشاء اللہ تعالیٰ برسات تک ضروری کام ختم ہو جائے گا۔ اور سات آٹھ مہینے میں ہمارے نور نظر اُس میدان میں مجتمع نظر آنے لگیں گے۔ اب ایک امر باقی رہتا ہی اُس کا مجھ کو عرض کرنا ضروری ہی۔ وہ یہ کہ مدرسہ کی حالت تعمیر دیکھ کر اب یہ تو لوگوں کو یقین ہونے لگا ہی کہ مدرسہ بن جائے گا۔ مگر اب تک اس میں قومی شبہات ہیں کہ آیا وہ چل بھی سکے گا؟ میرے خیال میں یہ صورت چندہ چلنے والی نہیں جیسے اب دو دو اور چار چار روپیہ جمع کئے جاتے ہیں۔ یہ روپیہ جس دقت سے وصول ہو رہا ہی اُس کو میں خوب جانتا ہوں۔ اور اس تجربہ کی روسے میں بھی مدرسہ چلنے سے مایوس ہوں۔ مدرسہ کے چلنے اور قایم رہنے کی صورت ایک ہی اور صرف ایک۔ اور وہ یہ کہ ارباب ہمت جتنا سالانہ چندہ مقرر کریں اُتنی آمدنی کی زمین بنام مدرسہ وقف کر دیں یہ صورت بظاہر شاید مشکل معلوم ہو لیکن مشکل

نہیں میں یہ جانتا ہوں کہ ہر ریاست اور ہر گاؤں میں خاکروب اور چماروں تک کے واسطے معافیات مقرر ہیں اور برابر پشتوں سے اُن کے قبضہ میں چلی آرہی ہیں اور غالباً چلی جائیں گی میرے دوست اور بھائی مولوی محمد یونس خاں صاحب نے بیان کیا کہ صرف قصبہ وتاولی میں بارہ سو روپیہ سال آمدنی کی اراضی معافی میں ہے اسی طرح اگر تمام برادری کی معافیوں کا حساب کیا جائے تو ہزاروں روپیہ سال کی نکلیں گی۔ پس کیا اے میرے بزرگو وہ ہمارا مدرسہ جس میں ہمارے بچے آدمیت سیکھنے اور انسانیت حاصل کرنے جائیں گے اتنی دستگیری اور اُتنی امداد کا بھی مستحق نہ ہوگا جس قدر ادنیٰ اہل خدمت بھنگی اور چمار ہیں! نہیں نہیں، ہوگا اور ضرور ہوگا جب میں ان باتوں پر خیال کرتا ہوں تو میرا دل بڑھتا ہے اور امید اپنی دلآویز صورت دکھاتی ہے۔ اے نسل شروانی اگر تیری رگوں میں کوئی قطرہ اُس خون کا باقی ہے جو ہمارے مربّی افغانستان کے پہاڑوں سے لائے تھے اور جس کے جوش نے ہندوستان میں اُن کا نام روشن کیا تو دنیا میں اس ذلت وخواری سے بسر کرنا گوارا مت کر اور اگر کوئی شمہ اُس کا اب نہیں رہا تو جس قدر جلد زمین پھٹے اور ہم اُس میں سما جائیں اسی قدر بہتر ہے کیونکہ جو نسل اپنے بزرگوں کے نام کو ڈبونے والی اور خاندان کی نیک نامی کو کھونے والی ہو وہ جتنی جلد دنیا سے غارت ہو مناسب ہے۔ والسلام

خاندان کی بی بیوں میں دو قابل نمونہ ہستیاں

دارد ہمہ چیز آدمی زاد.
افسوس کہ خرمی ندارد

(۱)

بتاریخ سیزدہم ذی قعدہ سنہ ۱۳۱ھ روز چہارشنبہ وقت ساعت دہم صباح والدہ برادرم حمید اللہ خاں سہا ورایں سرائے فانی را پدرود کردند۔ ذات ایشاں بعض صفات داشت کہ موجب امتیاز بین الاقران

سلہ کورٹ صفحہ ۲۶۰ پر ملاحظہ ہو

بود۔ قلب ایشاں رقیق واقع شدہ بود بادنے سببے گریہ بر ایشاں مستولی گشتے۔ دختراں یتیم مرحوم علی احمد خاں را چوں فرزنداں خود پروردند۔ بر مزاج ایشاں خشم غالب بود۔ بوقوع ادنی نا ملائم از جا رفتے۔ امّا دل از کینہ صاف بود چنداں کہ دیگراں را بحالت غیظ زجر می کردند ہماں قدر بحالت فرو شدن آں خود را ملامت میکردند۔ دردا کہ صبیۂ خود را ناکتخدا گزاشتند۔ چہ حسرتہا کہ بعالم پاس ازیں رہ گذر خوردہ باشند۔ اللّٰھم اغفر لہا وادخلہا روضات النعیم۔

(۲)

آج ۱۲ رجب المرجب ۱۳۱۲ھ روز پنجشنبہ آخر شب کو جناب پھوپی اماں[۲] نے تخمیناً ستر برس کے سن میں رحلت فرمائی۔ قریباً ایک سال عارضۂ بواسیر میں مبتلا رہ کر اس ہستی ناپائدار کو چھوڑا۔ جناب مرحومہ دینی و دنیوی حیثیتوں سے ممتاز بین الاقران تھیں۔ اگر دینی حیثیت سے دیکھئے تو حجن تھیں اور حافظ کلام پاک، تہجد گزار اور صبح کو نو بجے تک برابر تلاوت و اوراد و وظائف میں مصروف رہتیں۔ اپنے متوسلین کے حق میں مثل ایک مربی کے تھیں اور اُن سے غایت شفقت کا برتاؤ کرتیں۔ متعدد بے وسیلہ لڑکیوں کو پرورش کرکے اُن کی خانہ آبادی کردی۔ اخلاق نہایت وسیع تھے اور وسعت کے ساتھ ساتھ ہمدردی بھی تھی۔ دنیاوی معاملات میں عقل نہایت معاملہ فہم اور سلیم تھی۔ خانہ داری کا سلیقہ ایک قابل نمونہ حیثیت کا تھا۔ علاوہ اپنے گھر کے دوسرے گھروں کا انتظام سالہا سال فرمایا۔ اپنی جائداد کے انتظام میں بھی اُن کا ایک خاص حصہ تھا۔ اُن کے مدفون ہونے سے بھیکن پور کی ایک ثلث عظمت اور ہمارے خاندان کی عورتوں کی سرداری خاک میں مل گئی۔ فقط

---

[۱] اہلیہ جناب چودھری نور اللہ خاں صاحب مرحوم رئیس سہاور ضلع ایٹہ جن کا حال صفحہ ۴۹ اپر ہے۔ مرحومہ کا نام جمال النساء تھا

[۲] اہلیہ عنایت اللہ خاں صاحب مرحوم رئیس بھیکن پور جو نواب محمد فضل اللہ خاں مرحوم کے حقیقی چچا تھے اور سید صاحب مرحوم کے رفقاء اور علی گڑھ کالج کے معاونین میں سابقین اوّلین کے طبقہ میں تھے۔

محمد مقتدیٰ خاں شروانی

نہیں میں یہ جانتا ہوں کہ ہر ریاست اور ہر گاؤں میں خاکروب اور چماروں تک کے واسطے معافیات مقرر ہیں اور برابر پشتوں سے اُن کے قبضہ میں چلی آ رہی ہیں اور غالباً چلی جائیں گی میرے دوست اور بھائی مولوی محمد یونس خاں صاحب نے بیان کیا کہ صرف قصبہ دتاولی میں بارہ سو روپیہ سال آمدنی کی اراضی معافی میں ہے اسی طرح اگر تمام برادری کی معافیوں کا حساب کیا جائے تو ہزاروں روپیہ سال کی نکلیں گی۔ پس کیا اے میرے بزرگو وہ ہمارا مدرسہ جس میں ہمارے بچے آدمیت سیکھنے اور انسانیت حاصل کرنے جائیں گے اتنی دستگیری اور اتنی امداد کا بھی مستحق نہ ہوگا جس قدر ادنیٰ اہل خدمت بھنگی اور چمار ہیں! نہیں نہیں، ہوگا اور ضرور ہوگا جب میں ان باتوں پر خیال کرتا ہوں تو میرا دل بڑھتا ہے اور امید اپنی دلآویز صورت دکھاتی ہے۔ اے نسل شروانی اگر تیری رگوں میں کوئی قطرہ اُس خون کا باقی ہے جو ہمارے مربی افغانستان کے پہاڑوں سے لائے تھے اور جس کے جوش نے ہندوستان میں اُن کا نام روشن کیا تو دنیا میں اس ذلت و خواری سے بسر کرنا گوارا مت کر اور اگر کوئی شمہ اُس کا اب نہیں رہا تو جس قدر جلد زمین پھٹے اور ہم اُس میں سما جائیں اسی قدر بہتر ہے کیونکہ جو نسل اپنے بزرگوں کے نام کو ڈبونے والی اور خاندان کی نیک نامی کو کھونے والی ہو وہ جتنی جلد دنیا سے غارت ہو مناسب ہے۔ والسلام

خاندان کی بی بیوں میں دو قابل نمونہ ہستیاں

دارد ہمہ چیز آدمی زاد
افسوس کہ خرمی ندارد

(أ)

بتاریخ سیزدہم ذی قعدہ ۱۳۰۹ھ روز چہارشنبہ وقت ساعت دہم صباح والدۂ برادرم حمید اللہ خاں[1] سہا ورایں سرائے فانی را پدرود کردند۔ ذات ایشاں بعض صفات داشت کہ موجب امتیاز ایشاں بین الاقران

[1] نوٹ صفحہ ۲۶۰ پر ملاحظہ ہو۔

بود۔ قلب ایشاں رقیق واقع شدہ بود بادنے سببے گریہ بر ایشاں مستولی گشتے۔ دختران یتیم مرحوم علی احمد خاں را چوں فرزنداں خود پروردند۔ بر مزاج ایشاں ختم غالب بود۔ بوقوع ادنیٰ ناملائم از جا رفتے۔ اما دل از کینہ صاف بود چنداں کہ دیگراں را بحالت غیظ زجر می کردند ہماں قدر بحالت فروشدن آں خود را ملامت میکردند۔ دردا کہ صبیۂ خود را ناکتخدا گزاشتند۔ چہ حسرتہا کہ بعالم پاس ازیں رہ گذر خوردہ باشند۔ اللھم اغفر لھا وادخلھا روضات النعیم۔

(۲)

آج ۱۲ رجب المرجب ۱۳۱۲ھ روز پنجشنبہ آخر شب کو جناب پھوپی اماں[۲] نے تخمیناً ستر برس کے سن میں رحلت فرمائی۔ قریباً ایک سال عارضۂ بواسیر میں مبتلا رہ کر اس ہستی ناپائدار کو چھوڑا۔ جناب مرحومہ دینی و دنیوی حیثیتوں سے ممتاز بین الاقران تھیں۔ اگر دینی حیثیت سے دیکھئے تو حجن تھیں اور حافظ کلام پاک، تہجد گزار اور صبح کو نو بجے تک برابر تلاوت اور اوراد و وظائف میں مصروف رہتیں۔ اپنے متوسلین کے حق میں مثل ایک مربی کے تھیں اور ان سے غایت شفقت کا برتاؤ کرتیں۔ متعدد بے وسیلہ لڑکیوں کو پرورش کر کے ان کی خانہ آبادی کردی۔ اخلاق نہایت وسیع تھے اور وسعت کے ساتھ ساتھ ہمدردی بھی تھی۔ دنیاوی معاملات میں عقل نہایت معاملہ فہم اور سلیم تھی۔ خانہ داری کا سلیقہ ایک قابل نمونہ حیثیت کا تھا۔ علاوہ اپنے گھر کے دوسرے گھروں کا انتظام سالہا سال فرمایا۔ اپنی جائداد کے انتظام میں بھی ان کا ایک خاص حصہ تھا۔ ان کے مدفون ہونے سے بھیکن پور کی ایک ثلث عظمت اور ہمارے خاندان کی عورتوں کی سرداری خاک میں مل گئی۔ فقط

---

[۱] اہلیہ جناب چودھری نور اللہ خاں صاحب مرحوم رئیس سہاور ضلع ایٹہ جن کا حال صفحہ ۳۹ پر ہے۔ مرحومہ کا نام جمال النساء تھا

[۲] اہلیہ عنایت اللہ خاں صاحب مرحوم رئیس بھیکن پور جو نواب محمد مزمل اللہ خاں مرحوم کے حقیقی چچا تھے اور سید صاحب مرحوم کے رفقا اور علی گڑھ کالج کے معاونین میں سابقین اولین کے طبقہ میں تھے۔

محمد مقتدیٰ خاں شروانی

نامۂ ذوالقدر منشی غلام غوث صاحب بیخبر الہ آبادی

در آخر سال ۱۸۹۶ء برائے شرکت سالانہ جلسہ علی گڑھ کانفرنس حاضر الہ آباد شدم۔ شوق ملاقات ذی والقدر منشی غلام غوث خاں بیخبر برآں آورد کہ بعد مشورہ سید اکبر حسین صاحب اکبر الہ آبادی خطے بخدمت شان نگاشتم۔ وبعد اظہار شوق لقا از وقت ملاقات استفسار کردم۔ بجواب آن بیخبر باخبر از وقت ملاقات خبر داد۔ اکنوں بعد مرور پنجاہ سال نقل ہر دو نامہ شامل این کتاب می نمایم تا یادگارے ماند۔

(مراسلۂ اولیٰ)

مسند آرائے اریکۂ سخنوری مربع نشیں چار بالش ہنرپروری یادگار سلف افتخار خلف غیاث الکلام مولائی و مولی الانام جناب منشی غلام غوث خاں صاحب بیخبر یا رب از نیازمندی این ناچیز باخبر باد۔ سالے چند گذشتہ کہ در رسالہ عود ہندی غزل فارسی جناب کہ مصرعے ازاں اینست۔ ع

"چشم کہ باز شد ز خواب فتنہ از و بچار سوست"

مشام جانم را رشک طبلۂ عطار فرمودہ بود۔ من و یزداں کہ از اں روز آرزومند لقائے سامی بودہ ام لیکن طالعم یاور نبود کہ تا ایندم از شرف ملازمت محروم ماندم۔ بارے اکنوں ایزد بندہ نواز را سپاس گزارم کہ خاک این دیار اصفہان نشان را کحل دیدۂ ارادتم فرمود۔ تقاضائے شوق بے سروپا آں بود کہ علی الفور پا از سر ساختہ حاضر بزم سامی شدمے۔ اما خیال ہرج اوقات گرامی سدراہم گردید۔ اگر از اوقات فرصت آگاہم فرمایند پابوسی را ذریعہ سربلندی خود سازم۔ فقط

(از آخر دسمبر ۱۸۹۶ء زمانہ اجلاس سالانہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علیگڑھ منعقدہ الہ آباد)

(مکتوب منشی غلام غوث خاں صاحب بیخبر مرحوم الہ آبادی کہ بجواب مراسلۂ من نوشتند)

فقیر نواز! من نہ آنم کہ بزرگان باعز و شان مشتاق دیدنم شوند۔ اشتیاق سامی از اقتضائے اخلاق گرامی ست۔ فقیر دو وقت فرصت دارم یکے از ساعت چہار تا وقت مغرب۔ دویم از ہشت ساعت شب تا ساعت یازدہ۔ آں برائے ملاقات اجمالیست و این برائے مجالست طولانی ہر وقت کہ خواہند قدم رنجہ فرمایند۔

۵ براہ دوستیہا ہر کہ بے منت قدم ساید
بہر گامے کہ بردارد ازو پائے زمین چشمے

(مراسلۂ ثانیہ)

جناب منشی صاحب ذوالمراتب العلیہ والمناقب السنیہ دامت رافتہم۔ تسلیم پذیرا باد۔ فرا یاد خاطر فرحی مآثر بودہ باشد کہ بماہ دسمبر گزشتہ حاضر کاشانہ با زینت و شان گشتہ بودم۔ و در اثنائے محاورت التماس نمودہ بودم کہ اگر پارۂ از کلام بلاغت نظام عنایت فرمایند آں قند پارسی برائے من موجب شکر و برائے یاران وطنم بہینہ ہدیہ باشد۔ بپاسخش عطائے آں را محول بآن فرمودہ بودند کہ بوقت دیگر نامہ بطلب آں بخدمت سامی فرستم۔ بعد مراجعت از الہ آباد بسبب تحصیل انگریزی مدتے از وطن دور ماندم و من ازیں فرصتے نیافتم کہ دریں خصوص متصدع خدمت شوم۔ اکنوں ایں نامہ نیاز روانہ می کنم۔ اگر جزوی از کلام فصاحت التیام ارسال فرمایند و از اعتدال مزاج ہمایوں آگاہی بخشند ممنون الطاف و رہون اعطاف فرمودہ باشند۔

(جواب ایں نامہ نیامد۔ حبیب الرحمٰن)

متعلق وفات ہمشیرہ[۵] مرحومہ خرد غفرلہا

در قید غم خاطر آزاد کجائی
تنگ ست دلم قوت فریاد کجائی
کو ہمنفسے تا نفسے شاد بر آرم
مجنوں تو کجا رفتی و فرہاد کجائی

وہ وقت مجھ کو رہ رہ کر یاد آتا ہے جب سہاور کا سوار یہ خبر لے کر آیا تھا کہ چھوٹی بو بو کے لڑکا[۱] ہوا ہے اور دونوں تندرست ہیں۔ سب گھر میں خوشیاں ہو رہی تھیں اور ہر چہرہ سے اندرونی مسرت کی جھلک چمک رہی تھی۔ میرا دل بھی خوش تھا لیکن یہ خیال کہ دنیا کی خوشی شربت کا سا گھونٹ ہے گلے سے اترا اور کچھ نہیں اُس کی کیفیت کو دبا رہی تھی۔

---

۵ نواب صدر یار جنگ بہادر کی دو بہنیں تھیں، دونوں ان سے بڑی۔ بڑی کی بہن محمودہ بیگم جن کا انتقال (باقی نوٹ بر صفحہ ۴۶۶)

وہ بچہ اپنے دادا کے گھر میں پہلا پوتا اپنے نانا کا پہلا نواسا ہے (خدا اُس کو عمر دراز و سعادت نصیب فرمائے) دادی اور نانی نے خوب خوشیاں منائیں۔ رت جگے ہوئے چھوچک بڑی دھوم سے گیا۔ افسوس یہ کسی کو بھی خیال نہ تھا کہ بچے کی ماں کی صحت کیسی ہے۔ شاید تمام خردمند اس بات کو فرض سمجھیں گے کہ ولادت کے بعد ہر ماں کو سکون اور آرام دینا چاہیے خصوصاً اُن کو جو خلقتہً ضعیف ہوں۔ لیکن وہاں اُسی مکان میں جس میں بچہ اور اُس کی ماں رہتی تھی دیہاتی بدتمیز عورتوں نے اپنے گلے پھاڑے دھما چوکڑی مچائی ساری رات نہ خود سوئیں نہ کسی کو سونے دیا اور اس وحشت کو دیکھئے کہ اسی کا نام "رت جگا" رکھا ہے بہت سی راتیں اسی جوشِ جہالت میں بسر ہو گئیں۔ میں باوجودیکہ مرد ہوں اور خوب جانتا ہوں کہ کبھی زچہ نہ بنوں گا مگر ان نامعقول حرکتوں کو سن سن کر گھبرا اٹھتا ہوں نازک دل مریضوں پر جو گزرتی ہوگی اُس کو وہی بیچاری جانیں۔ خدا جانے ہماری عورتوں کے ناتربیت یافتہ ہونے نے کتنے مظلوموں کو جان سے کھویا ہے اور اُن کی وحشت نے کیا کیا بلائیں اُن بیچاریوں پر نازل کی ہیں جو قدرتاً اُن کی حفاظت میں رکھی گئی ہیں۔ مرد بھی جانتے ہیں کہ "ساس" اور "نند" خانگی زبان میں کیسے مہیب لفظ ہیں جو ستم رسیدہ دل ساس اور نندوں کے ہاتھوں سے زخمی ہو رہے ہیں وہ تو شاید ان لفظوں کو سنتے ہی تھرا اٹھتے ہوں گے۔ بہت کم سا سیں دنیا میں ایسی ہوں گی جو ایک وقت میں بہو نہ رہی ہوں لیکن رونے کے لائق یہ بات ہے کہ جو تکلیفیں اور آفتیں اُن پر ماتحتی کے دنوں میں گزرتی ہیں بجائے اس کے کہ وہ بااختیار ہونے پر اُن کو ہمدردی اور رحمدلی کا سبق سکھائیں وہ اپنی بہوؤں کے واسطے بھی "ساس" بنجاتی ہیں۔

یہ سب کچھ ہے مگر عورتیں ان باتوں کی جوابدہ نہیں ہیں۔ اگر قیامت کو نامۂ اعمال میرے سپرد ہو جائیں تو میں عورتوں کے اعمال ناموں سے اُن سب جرموں کو کاٹ دوں اور کس کے نامۂ اعمال میں لکھ دوں؟ مردوں کے۔ کیا عجب ہے جو احکم الحاکمین کا عدل بھی ایسا ہی حکم صادر فرمائے۔ مرد کہتے ہیں کہ عورتیں ہمارا کہنا نہیں مانتیں اُن کی دنیا نرالی ہے لاکھ سمجھاؤ ایک نہیں سنتیں۔ یہ سچ ہے کہ خود رائی کے زمانہ میں مردوں کے کہنے کو عورتیں رسم و رواج کے متعلق خیال میں نہیں لاتی ہیں مگر ہم یہ پوچھتے ہیں کہ یہ خود رائی اور "تریا ہٹ" اُن میں کہاں سے آئی؟ کوئی متعصب اور رواج کا شیدا یہ کہنے کی جرأت

ہرگز نہیں کہہ سکتا کہ عورتوں کے خمیر میں کوتہ اندیشی اور ضد ڈالدی گئی ہے کیونکہ ہر مذہب اور ملت میں صدہا عورتیں ایسی گزری ہیں جن کی روشن خیالی اور پاک نفسی کی نظیر مردوں کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ جب خلقی اور طبعی نہیں تو بالضرور اکتسابی اور عادی ہے۔ شادی سے پہلے شرفا کی لڑکیاں سوائے اپنی گھر کی چار دیواری اور ماں بہن باپ بھائی (آسودہ گھروں میں ماما اصیلوں) کے نہ کسی کو دیکھتی ہیں اور نہ کسی سے ملتی۔ شادی ہونے پر جب ہم اُن کے چال چلن کو جانچتے ہیں تو بدمزاجی اور ضد کی صفت جھلک نظر آتی ہے اور جس قدر اُن کی عمر زیادہ ہوتی جاتی ہے اُسی قدر رواج کی سرگرم طرفدار بنتی جاتی ہیں۔ ہم کو اس تفتیش میں کہ یہ عادت انھوں نے کہاں سیکھی اُن کے ماں باپ کے گھر کی طرف پھرنا چاہیے اس واسطے کہ سُسرال کی چوکھٹ پر تو قدم رکھتے ہی ہم نے اُن میں یہ عادت نقش فی الحجر کی مثل دیکھی ہے۔ کیا ہماری قوم کے ماباپوں کے سب بچے ناہموار اُٹھے ہیں؟ نہیں بیٹے تو ہمیشہ انہیں گھروں سے نیک نام اور عمدہ صفات کے پیدا ہوئے ہیں۔ یہ جواب پاکر فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر بیٹیوں پر کیا پتھر پڑ گئے! بیٹے علی العموم شائستہ اور بیٹیاں بالکل ناہموار!! اس کا کیا باعث ہے؟ اگر تعصب ہماری عقل کو سلب نہ کرلے تو صاف ظاہر ہے کہ جس چیز نے لڑکوں میں صفات عمدہ پیدا کر دیے ہیں اُس سے لڑکیوں کو اُن کے مربیوں نے محروم رکھا۔ وہ چیز کیا ہے؟ تعلیم وہ تعلیم جو خدا کی نعمت ہے، وہ تعلیم جو اللہ کی رحمت ہے، وہ تعلیم جس کے نور سے دنیا میں روشنی پھیلی ہے۔ افسوس ہزار افسوس صد ہزار افسوس اوہام اور تعصبات کے پھندے میں پھنس کر ہم ایسی بیش بہا دولت، ایسے انمول جواہرات سے اپنی لخت جگر بیٹیوں کو محروم رکھتے ہیں۔ جب ہم نے (یعنی مردوں نے) اُن کو جاہل رکھا ہے تو جتنی خرابیاں اور دشواریاں اُن کے ہاتھوں سے پیدا ہوں گی اُن کے ذمہ دار ہم ہیں (یعنی مرد) نہ عورتیں ممکن ہے کہ اس رائے کے مخالفوں کو یہ شبہ پیدا ہو کہ جب ہم عورتوں کو تعلیم یافتہ بنائیں اور اُن سے وہ غلطیاں سرزد ہوں جن کے کھٹکے سے ہم اُن کو تربیت یافتہ نہیں بناتے تو اُن غلطیوں کی بلا بھی ہمارے سر پر پڑے گی۔ نہ ہم اُن کو تعلیم دیتے نہ وہ یہ غلطیاں کرتیں۔ اس کا جواب بہت ظاہر ہے۔ جاہل لڑکیوں میں نیک و بد کا تمیز ہی نہیں ہوتا اگر وہ کوئی برائی کرتی ہیں تو بدنیتی سے نہیں

کرتیں بلکہ بے سمجھی سے کرتی ہیں، اور چونکہ ہم نے نیک و بد پہچاننے کا مادہ اُن میں پیدا نہیں ہونے دیا یا بالفاظ دیگر اُس کے پیدا ہونے کے اسباب مہیا نہیں کئے لہذا اُن کی لغزشوں کے ہم ذمہ دار ہیں اور صرف ہم۔ تعلیم یافتہ عورتوں کو اچھی چیز اچھی اور بری چیز بری معلوم ہوتی ہے اب اگر وہ اپنے واسطے بری بات کو پسند کرلیں تو یہ اُن کی شامت ہے نہ ہمارا قصور اس واسطے اُس کا وبال اُن کے سر پڑے گا نہ ہمارے سر۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ہم اندھیری رات میں اپنے کسی بچے کو گھر سے باہر کہیں بھیجیں، راستہ میں غار پڑے ہوں وہ بیچارا بچہ اگر کسی گڈھے میں گر کر چوٹ کھائے تو ہر شخص یہی کہے گا کہ کیسا بدتمیز باپ تھا جس نے اپنے بچے کو یوں بےسروسامان گھر سے نکال کر ہلاک کرڈالا لیکن اگر ہم اُس بچے کو ایک تیز روشن لالٹین دے دیں اور کہدیں کہ بیٹا راستہ خراب ہے سنبھل کر نکلنا اور پھر وہ کسی غار میں جا رہے تو سب یہی کہیں گے کہ آنکھوں کا پورا تھا جو لالٹین کے ہوتے گڈھا نہ سوجھا۔ علم چراغ ہے۔ مخدوش راستہ دنیا ہے اور اندھیری رات ہماری عمر۔ عورتوں کے تعلیم کے مسئلہ پر ایک دوسرے پہلو سے بحث کی جاسکتی ہے۔ جو لوگ تعلیم نسواں کے مخالف ہیں ہم اُن سے یہ استفسار کرتے ہیں کہ ہماری عورتوں میں خود رائی، کوتہ اندیشی، حُب رواج، اور مثل ان کے اور صفات ذمیمہ ہیں یا نہیں۔ جواب پیرایہ نفی میں تو بالضرور نہ ہوگا کیونکہ وہ خود ہمیشہ ان بری صفتوں کا خمیازہ اٹھا کر روتے جھینکتے رہتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ "تریا ہٹ" وغیرہ کلمے زبان زد ہو رہے ہیں۔ جب وہ تسلیم کریں گے کہ ہاں اُن میں یہ بری عادتیں پائی جاتی ہیں تو اب دو صورتیں ہیں یا ان عادات پر دکھیا عورتوں کی طرح صبر کریں یا مردانہ وار اُن کے ازالہ کی کوشش کی جائے۔ صبر کرنا اپنے اوپر ظلم کرنا ہے کیونکہ جاہل عورتوں سے کبھی امور خانہ داری میں راحت نصیب نہیں ہوسکتی ہے گھر کا انتظام سلیقہ کے ساتھ درست نہیں ہوسکتا۔ سلیقہ شعاری کے صرف یہ معنی نہیں ہیں کہ گھر کی چار دیواری میں جو چیزیں ڈالدی جائیں اُن کی حفاظت کرسکیں باورچی خانہ کے برتن صاف رہیں یا اور مثل ان کے خفیف جزوی امور کا سرانجام کرسکیں ہندوستانیوں میں جب کسی بیوی کی سلیقہ شعاری کی مدح سرائی ہوتی ہے تو انہیں ناچیز جزئیات سے بحث کی جاتی ہے۔ افسوس اُن کو معلوم نہیں کہ خانہ داری

کے محاورہ میں "راحت" اور "سلیقہ" کے کیا معنی ہیں۔ اگر یورپین لیڈریز کے اطوار کو وہ صاف دلی اور انصاف سے دیکھ سکیں تو وہ سمجھ جائیں کہ بیویاں اپنے شوہر کو کیا آرام دے سکتی ہیں اور اُن کے سلیقہ سے گھر پر کیا برکتیں نازل ہوتی ہیں۔ صبر کرنا اپنے معصوم بچوں پر بے رحمی ہے۔ جو مائیں تربیت یافتہ نہیں وہ اپنے بچوں کی صحت اپنے اوہام کی پیروی میں تباہ کر دیتی ہیں۔ جو مرض ہے آسیب کا خلش ہے گنڈے اور جھاڑ پھونک کے پھندے میں پھنس رہے ہیں۔ یہ ایک عام عقیدہ عورتوں کا ہے کہ بچوں کا علاج طبیب یا ڈاکٹر نہیں کر سکتے" جو خاک بلا کسی نے بتائی بچہ کے منہ میں ٹھونس دی۔ جو تریاق صحت کے مفید ایجاد ہوئے ہیں اُن سے سخت خائف ہیں دانت نکلنے پر نشتر نہیں لگانے دیتیں یہ چیچک کے ٹیکے کا نام سُن کر دم فنا ہوتا ہے۔ کھانے میں اعتدال یا مضر و مفید کی تمیز نہیں لباس کے متعلق تو ہندوستان کے مرد بھی ناواقف ہیں تا بزنان چہ رسد۔ جو مائیں تربیت یافتہ نہیں وہ اپنے بچوں کی تربیت نہیں کر سکتیں۔ اگر ہم کسی انگریز کے سات آٹھ برس کے معصوم بچے اور کسی ہندوستانی بچے کا موازنہ کریں تو صاف ظاہر ہو جائے گا کہ پہلے کے دماغ میں کتنی کارآمد معلومات جمع ہیں اور کس طرح اُس کا دماغ تعلیم و تربیت کا اثر قبول کرنے پر آمادہ ہے۔ اور پچھلے کے دل میں کتنے اوہام فراہم ہیں اور کیسے کیسے عادات ذمیمہ کا تخم بو دیا گیا ہے۔ صبر کرنا خود بیچاری عورتوں پر ظلم کرنا ہے اس لئے کہ جہالت کی بدولت وہ کمالات انسانیہ سے بالکل محروم رہ جاتی اُن کے دماغی جوہر بالکل افسردہ ہو کر کملا جاتے ہیں۔ اگر صبر کرنا مناسب نہیں تو ازالہ کی کوشش کرنی چاہئے ہم اپنے مخالفوں سے پوچھتے ہیں کہ انسان کو شائستہ بنانے کے واسطے سوائے تعلیم کے اور کون سی تدبیر ہے۔ دنیا کو جب سے پیدا ہوئی ہے اور جتنی قومیں شائستہ ہوئی ہیں سب تعلیم و تربیت سے اور غالباً قیامت تک بھی کوئی اور ذریعہ سوائے علم کے ایجاد نہ ہوگا۔ ہمارے مخالف دوست عورتوں کے شائستہ بنا لینے کے لئے کوئی منتر ایجاد کر لیتے تو بہت آسانی ہو جاتی بابا!

(غیر شائع شدہ)

(بقیہ نوٹ صفحہ ۴۶۲) فروری ۱۹۳۲ء میں ہوا۔ چھوٹی مسعودہ بیگم مرحومہ جو چودھری نور اللہ خاں صاحب مرحوم رئیس بہاولپور کے بڑے صاحبزادہ چودھری عزیز اللہ خاں صاحب مرحوم سے منسوب تھیں۔ جس لڑکے کی پیدائش کا اس مضمون میں ذکر ہے وہ یہ خان بہادر چودھری احمد اللہ خاں (عرف "ننھے میاں") ہیں جو نواب صاحب کے بڑے خویش اور ماشاء اللہ خود صاحب اولاد ہیں سلمہم اللہ تعالیٰ ننھے میاں کی ولادت کے چند ماہ بعد ہی ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ غفر لہا۔ ولادت "ننھے میاں" سلمہ ربیع الآخر ۱۳۵۱ھ مطابق دسمبر ۱۹۳۲ء۔

خازن الدولہ و ضیاء السلطنت

خاندان قاچاریہ کے چشم و چراغ فتح علی شاہ قاچار کے حرم خانہ کی تاریخ اُن کے نورنظر شاہزادہ عضدالدولہ نے لکھی ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے سے نہایت دلچسپ حالات ایک شاہی حرم کے آئین و ضبط و انتظام کے معلوم ہوتے ہیں عموماً ایشیائی سلطنتوں کی نسبت بے اصول اور غیر منتظم ہونے کا گمان کیا جاتا ہے۔ لیکن ایسی زبردست شہادتیں ایسے گمان کو بدگمانی ثابت کرتی ہیں۔ بے اصول سلاطین کا حرم خانہ سب سے زیادہ ابتری کی مثال ہونی چاہیے۔ جب ہم ایسے مشکل موقع کو آئین و ضوابط میں جکڑا ہوا پاتے ہیں تو دوسرے محکموں کے با اصول و با اسلوب ہونے کا قیاس شاید غلط نہ ٹھہرے۔ البتہ جو سلاطین خود لااُبالی ہیں اُن کو ہم اعتراض سے نہیں بچا سکتے۔

تاریخ مذکور کا ایک مقام ہم علی گڑھ منتھلی کے ناظرین کی دلچسپی کے واسطے ترجمہ کرتے ہیں۔ اس زمانے میں تعلیم نسواں کا زبانی چرچا ہم میں بہت ہو رہا ہے۔ اگرچہ نتیجہ مثل اور بہت سی ہماری تجویزوں کے ہیچ ہے تاہم تعلیم نسواں سے یک گونہ دلچسپی ضرور ہو چلی ہے۔ دوسرے غلامی کا مسئلہ اکثر زیر بحث رہتا ہے اور اُس کے نام کے ساتھ انواع و اقسام کے مصائب کا تصور ذہن کے سامنے آجاتا ہے جن کی نسبت گمان ہے کہ وہ اُن بے زبانوں پر نازل ہوتی تھیں۔ اور کس راحت و وقار کے ساتھ اُن کی زندگی بسر ہوتی تھی۔

خازن الدولہ

خازن الدولہ منجملہ اُن مستورات کے تھی جن کا پایۂ اعتبار بلند تھا۔ مرحومہ مہد علیا (حرم محترم آقا محمد خان) کی وفات کے بعد حضرت خاقانی (فتح علی شاہ) نے تمام بیگمات قاچاریہ وغیرہ کو ہدایت کی کہ بجائے مہد علیا کے حرم خانہ سلطنت میں تم منجملہ اپنے ایک کو مقتدر اور رئیس منتخب کر لو تاکہ باقی تمام بیگمات اُس کی ہدایت پر کاربند رہیں۔ اور جو نقد و جنس مقرری مہد علیا کے ذریعے سے تم کو ملتا تھا وہ اُس کے ذریعہ سے تم کو ملے۔ سب نے مشورہ کر کے کہا کہ یہ ممکن نہیں کہ ہم اپنے ہم چشموں میں سے ایک کو رئیس بنا کر اُس کی اطاعت کریں۔ البتہ اگر مہد علیا کی کنیزکوں میں سے کسی کو بجائے اُن کے مقرر کر دیا

جائے تو بلحاظ احترام مرحومہ کے ہم کو اُس کی اطاعت میں کوئی دریغ نہ ہوگا۔ اور حرم خانۂ مبارک کا اختیار اُس کے ہاتھ میں رہے گا۔ گلبدن باجی کو مہد علیا کی کنیزوں میں سے انتخاب کر کے اس منصب پر مقرر کیا۔ جو کچھ نقد و جنس و جواہر وغیرہ صندوق خانہ مبارک میں تھے وہ اُس کے تصرف میں دیئے گئے۔ اور جو قانون عہد مہد علیا میں تھا وہی رائج رہا۔ مواجب، لباس، انعام و بخشش جو کچھ جس کسی کو ملتا تھا اُسی کے توسط سے ملتا۔ صندوق دار اُس کا خطاب ہوا۔ اُس کی مہر پر حسب ذیل شعر کندہ تھا:

~~ معتبر در ممالک ایراں ~~ قبض صندوقدار شاہ جہاں

اس مہر کا اعتبار اس درجہ تھا کہ اگر کروڑ روپئے تجار وغیرہ سے طلب کئے جاتے تو وہ بے تردد حوالہ کر دیتے تھے۔ صندوقدار کے اقتدار کا یہ عالم تھا کہ کوئی عورت خواہ وہ حرم شاہی ہوتی یا کوئی بڑھیا، یا کنیز، بغیر اُس کی اجازت کے نہ حرم سے باہر جا سکتی تھی نہ اندر آ سکتی تھی۔ جب کوئی عورت اندر آنا چاہتی تھی تو صندوقدار ایک بڑے یاقوت کی انگشتری اپنے خواجہ سرا آقا الماس کے ہاتھ بھیج دیتی تھی جو اندر کی ڈیوڑھی میں آقا یعقوب گرجی کو دکھائی جاتی وہ اُس کو دیکھ کر دربانوں کو دکھاتا اور وہ فوراً جانے کی اجازت دے دیتے۔ جب کوئی باہر جانا چاہتی تو صندوقدار کی زمرد کلاں کی انگشتری دکھائی جاتی۔ گرمیوں کے موسم میں جبکہ اہل حرم مختلف ییلاقوں (سرد مقامات) کو چلی جاتی تھیں صندوقدار حرم خانہ میں موجود رہتی اور تمام اہتمام اُن سب کے محلوں کا رکھتی۔ اُس کا انتظام، عقل و دوالانتی اور خوبی دیکھ کر خاقان مرحوم (فتح علی شاہ) نے اُس کو بیگمات میں داخل کر لیا۔ اور خازن الدولہ کا لقب عطا کیا۔

شاہزادہ بہاؤ الدولہ اور سیف اللہ میرزا اُس کے بطن سے تھے۔ صندوق خانہ کے متعلق جس قدر عملہ منشیوں اور کنیزکوں کا خازن الدولہ کی ماتحتی میں تھا اگر اُس کی تفصیل کی جائے تو ہزار صفحے بھی کافی نہ ہوں گے میرزا مریم (جو صالح طہرانی کی اولاد سے تھی جن کی یادگار مدرسہ و دیگر عمارات مشہور ہیں) خازن الدولہ کی مستوفیہ (افسر خزانہ) تھی۔ میرزا پری سیما۔ میرزا فلک تاز اور دیگر چند نفر اُس کی محرر تھیں۔ اگر نفر ہائے ہمایوں میں حضرت خاقانی کسی کو خادمانِ حرم وغیرہ میں سے ایک انگشتری عنایت

کرتے، یا کوئی اور چیز عطا ہوتی تو ضیاء السلطنت خازن الدولہ کو لکھ بھیجتی کہ فلاں ساعت میں فلاں جواہر فلاں خانم کو مرحمت ہوا۔ میرزا مریم اور باقی محررائس کو درج کاغذات کرلیتی تھیں؛ نقد وجنس و جواہر وغیرہ جو خزانہ حرم سے نکلتا، خزانہ میں جمع ہوتا ناممکن تھا کہ خازن الدولہ کے دفتر میں درج نہ ہو۔ خداوند تعالیٰ نے حافظہ اور ہوش اُس کو اتنا قوی دیا تھا کہ جس وقت جو چیز حضرت خاقانی طلب فرماتے فوراً حاضر کرتی۔ جس قدر اشرفیاں اُس کے ہاتھ پر رکھ دی جاتیں یا سر بھر تھیلی دیتے تو وہ قیاس سے ان کی مقدار بتا دیتی تھی اور جب شمار ہوتا تو اُس کے اندازمیں دو سوتین سو اشرفیوں میں سے دو تین کا فرق نکلتا۔ جواہرات کو تھوڑے سے غور میں بخوبی پرکھ لیتی تھی۔ اُس کا وزن، اُس کی قیمت ایسی ٹھیک جانچ دیتی تھی کہ استاد جوہری پرکھ کر اور تول کر اس کی جانچ کی تائید کرتے۔ بغیر طلب بادشاہ کے حضور میں نہیں جاتی تھی۔ ہمہ وقت اپنے عملہ کے ساتھ صندوق خانہ کے محاسبہ اور اہل حرم کے کاروبار کے سرانجام میں مصروف رہتی تھی۔ جشن نوروز سے دو مہینہ پیشتر ضرور تھا کہ جشن مذکور کے متعلق کل خلعت تیار کرکے اور بقچوں میں باندھ کر خسرو خاں خواجہ سرا کے ہمراہ حضرت خاقانی کے ملاحظہ میں پیش کر دیے جاتے تھے۔ بقچہ پر سرنامہ میرزا مریم کے قلم کا ہوتا تھا۔ خلعت اس انتظام کے ساتھ روانہ کیے جاتے تھے کہ ہر صوبہ کے صدر مقام میں سب تحویل آفتاب میں پہنچ جائیں۔ اور حاکم صوبہ وقت تحویل اُسی خلعت کو پہنے ہو۔

بعض بانوانِ حرم محترم ایسی تھیں کہ خازن الدولہ جب اُن کے یہاں جاتی تھی تو بے اجازت بیٹھ نہیں سکتی تھی لیکن جب وہ اپنے دیوان خانے میں ہوتی (جو مہد علیا محل نشیمن تھا) تو اُس سے بالاتر کوئی بیگم نہیں بیٹھ سکتی تھی اُس موقع پر تمام بیگمات نہایت ادب اور عاجزی سے عرض مطلب کرکے جواب حاصل کرتی تھیں۔ جس قدر نذر وغیرہ عید نوروز یا دوسرے موقعوں پر دربار میں آتی ممکن نہ تھا کہ اُس میں سے آب لیمو کا ایک شیشہ یا تمباکو کا ایک کیسہ بدون اجازت و تقسیم و تعیین خازن الدولہ کے کوئی لے سکے۔ یہاں تک کہ شاہزادوں کو بھی وہی تقسیم کرتی تھی۔ لیکن باوجود اتنے اعتبار کے تھا لبا اُس نے دس تومان سے زائد نقد یا جنس بدون عرض و اجازت شہریاری اور اندراج دفتر میرزا مریم کے کسی کو عطا

نہ کی ہو گی۔

ضیاء السلطنة

شاہ بیگم خانم ملقب بہ لقب ضیاء السلطنت حضرت خاقانی کی لخت جگر تھی۔ اُس کی والدہ مریم خانم طائفہ بنی اسرائیل سے تھی۔ مہد علیا نے اُس کو پرورش کیا تھا۔ وفات مہد علیا کے بعد کل جواہرات و اسباب تجمل ضیاء السلطنۃ کو عطا ہوا۔ اُس کا تمام کارخانہ (طویلہ۔ فراش خانہ وغیرہ) دائرہ حرم خانہ سے علیحدہ تھا۔ معزز معزز آدمی اُس کی سرکار میں ملازم تھے۔ منجملہ اُن کے شعبان علی خاں اُس کا وزیر اُس زمانہ کے سرداروں میں نہایت معزز تھا۔ خاقان مرحوم کو ضیاء السلطنۃ سے بیحد محبت تھی۔ تحریروں تقریروں میں یگانہ روزگار تھی۔ بمقتضاء الاسماء تتنزل من السماء (نام آسمان سے نازل ہوا کرتے ہیں) اُس کا لقب اُس کے حسن بے نظیر و جمال کا ایک نمونہ تھا۔ احکام خاقانی کے جو دستخط ہوتے تھے اُس کے قلم سے ہوتے تھے خصوصاً محرمانہ نوشتے جس کسی کو لکھے جاتے تھے اُس کے ہاتھ کے ہوتے۔ خط نسخ خوب لکھتی تھی۔ کلام مجید، کتب ادعیہ اور زیارات کے متعدد نسخے اُس نے اپنے ہاتھ سے لکھے تھے۔ عموماً اُس کے بھائی اُس کا احترام کرتے تھے۔ ولیعہد مرحوم نے اُس کی شان میں کہا تھا:

اے ضیاء السلطنت روحی فداک　　　صد گریباں کردم از ہجر تو چاک

خاقانِ مرحوم فرماتے ہیں۔

تو نہ چنینم من ضیاء السلطنہ　　　یک شبہ ہجر تو بر ما یک سنہ

جشن میلاد خاقانی کے موقعہ پر ہر سال بادشاہ۔ اہل حرم اور کل شاہزادے اور شاہزادیاں ضیاء السلطنت کے مہمان ہوتے تھے۔ ایک عمدہ جواہر ہر سال اس موقعہ پر ضیاء السلطنت کو مرحمت ہوتا تھا۔ ایک رقم معین اُس کی تحویل میں رہتی تھی۔ جس کو شاہزادے وغیرہ بوقت ضرورت قرض لے کر صرف کرتے تھے۔ ہمیشہ سفر و حضر میں حاضر خدمت حضرت خاقانی رہتی تھی۔ اگرچہ اُس کی سفارش و شفاعت بے شبہ قابل قبول تھی۔ لیکن بمقتضائے احتیاط کبھی کسی کی سفارش نہیں کرتی تھی۔ عہد خاقان مرحوم میں بہت سے لوگوں نے اُس کے نکاح کی تمنا کی۔ لیکن اُس نے قبول نہیں

کیا - بعد رحلت خاقان ۲۷، برس کے سن میں حاجی میرزا مسعود وزیر خارجہ کے ساتھ اُس نے اپنی شادی کی - جس رات کو وہ حرم خانہ سے رخصت ہوئی تھی شاہنشاہ مرحوم محمد شاہ رخصت کرنے آئے تھے تمام شاہزادے وزیر خارجہ کے مکان تک اظہار احترام کے لئے اُس کے ساتھ ساتھ گئے - جس وقت کہ مرحوم حاجی میرزا آقاسی اور میر مہدی امام جمعہ عقد نکاح کے واسطے آئے تو خود ضیاء السلطنت نے پردے میں سے اُن کی مزاج پرسی کی - حاجی میرزا نے یہ بھی کہا کہ چونکہ تم کو عرفان کا دعویٰ ہے اور حاجی میرزا مسعود کی طرف سے وکیل بن کر آئے ہو لہذا میرے وکیل میرزا نصر اللہ صدر الممالک ہوں گے جو سالک طریقت ہیں - صاحب طبع موزوں تھی اور اشعار لطیف لکھتی تھی -

(رسالہ علی گڑھ منتھلی بابتہ ماہ مئی ۱۹۰۳ء)

برقی روشنی

شب[1] کو برقی روشنی حبیب منزل (علی گڑھ) میں آئی - اول نماز مغرب با جماعت ہوئی - امام حافظ عبد القیوم تھے - (خویش حاجی ملا احمد) بعد نماز مغرب آیہ مبارکہ "اللہ ولی الذین آمنوا یخرجھم من الظلمت الی النور" پڑھ کر میں نے سوئچ دبایا - جس وقت زبان سے الفاظ مبارک "الی النور" نکلے کوٹھی روشن ہوگئی - الحمد للہ - اس کے بعد حافظ موصوف نے بلحن عرب آیہ مبارکہ "اللہ نور السموات والارض" الخ تلاوت کی - تلاوت ختم ہونے پر اُس کریم سے حاضرین کی مدارات ہوئی - اصحاب ذیل تشریف فرما تھے - حافظ عبد القیوم صاحب - مولانا سید سلیمان اشرف صاحب - خان بہادر مولوی سید زین الدین صاحب مولوی اکرام اللہ خاں صاحب - مولوی ندیم احمد صاحب مجددی - مولوی محمد مقتدی آغا صاحب - حافظ غلام غوث خاں صاحب - مولوی عبد الحمید خاں -

(غیر شائع شدہ)

---

[1] شب مابین ۲۵ و ۲۶ صفر المظفر سنہ ۱۳۵۴ھ مطابق ۲۹ و ۳۰ مئی سنہ ۱۹۳۵ء) - محمد مقتدی خاں شروانی

جارج پی شور

اگست سنہ حال کے "زمانہ" میں جو مقالہ بہ عنوان "یورپینوں کی خدمات ادب اردو" شائع ہوا ہے اس میں جارج پی شور کا بھی ذکر ہے جو ۱۲۶۱ھ میں تھے مع ایک شعر بھی بطور نمونہ دیا ہے۔ لکھا ہے کہ آپ نے دو دیوان بھی مرتب کئے تھے لیکن اب ایک کا بھی پتہ نہیں۔ دیوان کی نایابی کا ذکر پڑھ کر خیال آیا کہ میرے کتاب خانے میں دیوان شور ہے۔ نکالا دیکھا۔ اسی سلسلہ میں منشی عبدالکریم دہلوی کا تذکرہ شعرائے ہند اور لالہ سری رام دہلوی کا تذکرہ خم خانہ جاوید دیکھا ثابت ہوا کہ دو یورپین "شور" تخلص شاعر یکے بعد دیگرے ہوئے ہیں۔ ایک وہ جن کا تذکرہ شعرائے اردو میں اور تذکرہ خم خانہ جاوید میں ہے۔ دوسرے وہ جن کا دیوان فارسی میرے یہاں ہے۔

شور نمبر اوّل

یہ وہی ہیں جن کا ذکر "زمانہ" کے مقالہ پیش نظر میں ہے۔ منشی عبدالکریم اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں "جارج پیش تخلص شور ایک صاحب رہنے والے کول (حال علی گڑھ) کے ماموں بھانجہ کے محلہ کے طبع مستقیم اور ذہن سلیم رکھتے ہیں۔ جن ایام میں کہ مشاعرہ ۱۲۶۱ ہجری میں ہوا تھا اُن کے خطوط میرے پاس معہ غزل طرح کے واسطے درج مشاعرہ آیا کرتے تھے۔ اُن خطوط سے قوت و استعداد ذہن اور طبیعت کی بھی واضح ہوتی تھی فارسی عبارت بہت اچھی لکھتے ہیں۔ مذہب میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کے ہیں۔ ملاقات خطی میری اُن کی ۱۲۶۱ ہجری میں ہوئی یہ اشعار انھوں نے کول سے میرے پاس ڈاک میں روانہ کئے تھے۔ اسی کا ایک شعر مقالہ "زمانہ" میں نقل کیا گیا ہے۔

غزل

کس شمع رو کی دل سے مرے دل کو راہ تھی | اٹھتے تھے منہ سے شعلے نکلتی ایک آہ تھی
آنکھوں سے روتے روتے جو آتا تھا خوں سیاہ | نظروں میں اپنی کس کی وہ زلفِ سیاہ تھی
کشور میں عشق کے ترے عاشق کے دم کے ساتھ | ایک فوج اشک اور علم دار آہ تھی

عاجز تھا اپنی جان سے ایسا ترا مریض | دیکھے سے جس کی حالت عیسیٰ تباہ تھی
بل بے یہ بیخودی کہ خودی سے بھلا دیا | ورنہ یہ زیست مرگ کی اپنے گواہ تھی
دیر و حرم میں تو نہ دے ترجیح زاہدا | جس طرف سر جھکا دیا بس سجدہ گاہ تھی
میری وفا و تیری جفا کی جہاں میں شوخ | سرگرم قتل آہ یہ کس کی نگاہ تھی
خونناب غم جو شورؔ تو پیتا تھا رات دن | چاہِ ذقن کی کس کے ترے دل کو چاہ تھی

ان کا ذکر تذکرۂ خم خانہ جاوید میں بھی ہے۔

"شورؔ مسٹر جارج پیش شور معروف بہ شور صاحب غدر سے قریب ۴۰ سال قبل ان کے بزرگ تواح دہلی میں آئے تھے اور اسلامی طرز معاشرت اختیار کر لیا تھا۔ گو مذہباً عیسائی رہے۔ شور صاحب اول مشق سخن مرزا رحیم بیگ ساکن میرٹھ سے مشورہ کرتے رہے۔ پھر قطب الدین مشیرؔ دہلوی اور اُن کے بیٹے میاں غلام دستگیر سے اصلاح لے کر تتمۂ استادی حاصل کیا۔ ہرچند پور ضلع میرٹھ اور علی گڑھ میں چند دیہات ان کی ملکیت تھی معاش کی طرف سے بے فکر اور بڑے زندہ دل یار باش خلیق اور متواضع تھے چنانچہ ان کی اکثر ٹھمریاں اور ہولیاں مشہور ہیں۔ اردو میں صاحب تصانیف کثیر گزرے ہیں۔ چار پانچ دیوان اپنی زندگی ہی میں چھپوا کر شائع کر دیے تھے۔ ہر دیوان جناب داغؔ دہلوی کی ہم طرح غزلوں سے معمور ہے سنہ ۱۸۸۴ء میں ۷۰ سال کے قریب عمر پا کر انتقال کیا۔"

حالات کے بعد ۲۵ شعر انتخاب میں دیے ہیں۔ اُن میں سے حسب ذیل چند شعر ہم یہاں نقل کرتے ہیں جن سے انداز سخن کا اندازہ ہو سکے گا۔ کلام صاف برجستہ ہے۔ بعض اشعار قابل داد ہیں۔

چشموں سے اشک کو دُر یکتا بنا دیا | لخت جگر کو لعل کا ٹکڑا بنا دیا
جاتی نہیں ہے اُس کی کسک عمر بھر کبھی | ہر دم کھٹکتی رہتی ہے دل پہ نظر کی چوٹ
ہم نے انگریزی تو پوشاک میں دیکھی نہ سنی | کوٹ پتلون پہ ہیں سرخ کلاہیں کیونکر
یہ بڑا دن ہے بھلا پھر در میخانہ ہے | کہ نیا دور نیا شیشہ ہو پیمانہ ہے
کہا جو میں نے وفا کر تو ہنس کے فرمایا | جفا کو چھوڑ دیں ہم آپ کی وفا کے لئے

نمک ایسا نہ حسن ایسا زباں ایسی نہ آنکھ ایسی　　غنیمت اور اقلیموں سے ہے ہندوستاں پھر بھی
اگرچہ داغ بھی مشہور ہیں شیریں کلامی میں　　مگر تم شورؔ ہو کر شور ہو شیریں زباں پھر بھی

شورؔ نمبر ۲

یہ وہ ہیں جن کا دیوان میرے یہاں ہے۔ ٹائٹل پر لکھا ہے "گلشن فرنگ المعروف بہ دیوان شورؔ فارسی" چکیدہٴ قلم پر زور یعنی جالنج بیش صاحب متخلص بہ شورؔ شیریں کلام۔

دیوانِ ہذا ۱۸۹۰ء میں بمقام میرٹھ مطبع شگوفہ فیض میں چھپا ہے۔ شورؔ نمبر ۲ ۱۸۹۰ء میں زندہ تھے، جیسا کہ اس تاریخ طبع دیوان سے معلوم ہوتا ہے۔ "دیوان فارسی شورؔ دام افضالہ" (۱۸۹۰ء) ایک تاریخ خود شورؔ نے اپنے اس دیوان کی لکھی ہے۔ "چہ بے نظیر سخن" (۱۸۹۰ء)۔

یہ دیوان چھوٹی تقطیع کے ۱۱۴ صفحوں پر چھپا ہے۔ ردیف وار مرتب ہے۔ غزلوں کے بعد رباعیات کلام صاف بے عیب ہے بہت سے اشعار لطف انگیز و ذوق آفریں بھی ہیں جن سے شاعر کی پختہ مشقی اور ذوق سلیم کا پتہ لگتا ہے۔

ہم دو تین غزلیں نمونہ کے طور پر یہاں نقل کرتے ہیں۔

خزاں کردی بہار من چہ کردی　　بگو اے گلعذار من چہ کردی
بگو با جان زار من چہ کردی　　کجا بردی قرار من چہ کردی
گرفتم بودہ رشکِ مسیحا　　بدرد انتظار من چہ کردی　　علاج
گرآلودی بخونم دست و پارا　　بجان دل فگار من چہ کردی
چرا بردی صبا از کوچہٴ یار　　ترحم با غبار من چہ کردی　　سخنہا
قرار دوستی با غیر دادی　　بجانِ بے قرار من چہ کردی
پریشاں کردہ زلفِ دوتارا　　پریشانی بکار من چہ کردی　　نصیبِ روزگار
بنا وردی یکے گل بر مزارم　　چہ کردی گلعذار من چہ کردی
نہ کردی یک نظر سوئے دل شورؔ　　نگار من بکار من چہ کردی

برائے زیبِ بدن نیلگوں قبا داری   نہاں بہ پردۂ شب صبح دلکشا داری
زمن گریزی و در بزم غیر جا داری   نہاں زمن بکسے وعدۂ وفا داری
سیاہ چساں نہ کنی روزگار ہر دم را   لبِ مسی زدہ و چشم سرمہ سا داری
خدنگ غمزہ و تیغِ ادا و خنجرِ ناز   بقتلِ جانِ غریباں چہا چہا داری
ازاں دمے کہ مرا کشتۂ تو خاموشی   خدا غلط نہ کند فکر خوں بہا داری
فدائے جور تو باشم کہ خوش دلے ہست   سرم بریدی و ہم دعوئ وفاداری

چہ کافری کہ بوقتِ نماز ہم اے شور
بدل خیالِ بت و بر زباں خدا داری

طبیبِ من جزاک اللہ خیرا   کہن دردے بدرماں تازہ کردی
بخون زد غوطہا از رشک یاقوت   تو چوں رنگِ لبِ ازیاں تازہ کردی
صبا از زلف اوبوے رساندی   دماغِ ایں پریشاں تازہ کردی
نوید وصل دادی زندہ باشی   تنِ افسردہ را جاں تازہ کردی

تو کردی شور شاداں روح مجنوں
کہ شورِ ایں بیاباں تازہ کردی

(رسالہ زمانہ کانپور بابتہ ماہ اکتوبر ۱۹۴۳ء)

محشرِ خیال

میں نے "محشرِ خیال" کو پڑھا۔ بار بار دیکھا، دونوں دیکھا، اُس پر بکثرت نوٹ کئے۔ میری ناقص فہم اس کا پتہ لگانے سے قاصر رہی کہ کیا خوبیاں اس کتاب میں تھیں جنھوں نے اس کو اس مرتبہ پر پہنچایا ہی کہ مسلم یونیورسٹی کے ایم اے کے طلبا کے درس میں داخل ہے۔ میں نے رائے قائم کرنے میں ان تحریروں سے مدد چاہی جو کتاب کے اول میں "عرض ناشر" اور "شعلۂ مستعجلہ" کے عنوان سے درج ہیں۔ مگر افسوس کوئی مدد نہ ملی۔

یہ پڑھا کہ "اہل قلم نے اس کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا"۔ اور "نوجوانوں نے مصنف کی طرز نگارش اور زاویۂ فکر کو اپنے رجحانات کے مطابق پایا" یہ نہ معلوم ہوا کہ یہ اہل قلم کون تھے اور انھوں نے کس خوبی سے متاثر ہو کر "اپنی توجہ کا مرکز بنایا"۔ اسی تحریر میں اصل نکتہ قلم سے تراوش کر گیا ہے۔ جہاں ناشر نے صاف لکھ دیا ہے کہ "میرے لئے یہ کفایت ہے کہ وہ سجاد مرحوم کا لکھا ہوا ہے"۔ یہ بھی لکھا ہے کہ "سجاد جوان مرے شعلۂ مستعجلہ (جو سجاد مرحوم کی طرز تحریر کا حقیقی خطاب ہو سکتا ہے) میں لکھا ہے کہ "سجاد نے بیشتر مضامین علی گڑھ میگزین میں اشاعت کے لئے بھیجے۔ جو بزرگ آج ادب کے آسمان پر مہر و ماہ بن کر چمک رہے ہیں ان کی شہرت سب سے پہلے میگزین ہی کے ذریعہ سے ہوئی۔ چنانچہ شاعروں میں، فانی، جگر، اصغر، سہیل، عظمت اللہ خاں، اور نثر نگاروں میں، سجاد انصاری، سجاد حیدر، اور رشید صدیقی کا نام لیا جا سکتا ہے"۔ یہ بھی لکھا ہے کہ "سجاد کا وار صرف صوفی فلسفی اور زاہد خشک ہی پر نہیں وہ مذہبی اخلاق پر بھی چوٹیں کیا کرتے تھے"۔ ان ہی چند لفظوں میں پورا ریویو "محشرِ خیال" پر آجاتا ہے۔ سجاد مرحوم کی جوان مرگی (اللہ کی رحمت اُن پر) باعث ہوئی کہ ان کے نصب العین، خیال اور ادب دونوں کو پختگی کسی معنی پر قائم ہونے کا موقع نہ ملا۔ فانی اصغر وغیرہ نامور ادیب بھی اگر خدانخواستہ جواں مرگ ہو جاتے تو وہ بھی ترقی پختگی کے اُن مراتب کو حاصل نہ کر سکتے جو انھوں نے برسوں کی جاں کاہی کے بعد بالآخر حاصل کئے اور جن کی وجہ سے آج سرمایۂ ناز ادیب ہیں۔ علی گڑھ میگزین کی جو بھی

عزت کی جائے بہرحال اُردو کے اعلیٰ میگزینوں میں نہ تھا۔ اُس میں مضامین کی اشاعت کسی بلندی خیال یا پاکیزگی ادب کی ضامن نہیں ہو سکتی۔

سخت قابلِ افسوس اور خطرناک یہ پہلو ہے کہ سجاد فلسفہ، اخلاق، مذہب، سب ہی سے بیزار ہیں فارسی ادب کی عظمت کا ایک فقرے میں بخیال خود خاتمہ کر دیا ہے۔ گویا اُن کے یہاں کوئی اصول زندگی نہیں، بے اصول زندگی محبوب و مقبول ہے۔ اُن کے یہاں تین محبوب ہیں۔ عورت کا شباب، بشرطیکہ وہ عفت و عصمت کی گندگی سے پاک و صاف ہو۔ ایک غرق شباب قحبہ جو کسی کمرے پر داد عیش پرستی دے رہی ہو وفا اور پابندی سے سخت بیزار ہو، کمال نسوانی کا بہترین اور محبوب ترین نمونہ ہے۔ اُس کی تعریف میں اُن کے تمام مضامین رطب اللسان اور گلریز ہیں۔ اگر حسین و جوان نکاح کر کے عصمت و عفت کی زندگی بسر کرے تو وہ خارج از بحث بلکہ ننگ نسوانیت ہے۔

دوسرا محبوب "معصیت لطیف" ہے۔ مگر باوجود پوری کاوش کے مجھ کو پتہ نہ لگا کہ ان لفظوں کا اصلی مفہوم مضمون نگار کے یہاں کیا ہے۔ پڑھنے والا جس گناہ کا لطف لینا چاہے اُس کو لطیف قرار دے لے۔

تیسرا محبوب ان کا، شیطان اور شیطنت ہے۔ اول سے آخر تک شیطان اور شیطنت کو سراہا ہے۔ خلاصۂ کائنات قرار دیا ہے۔ بلکہ پیدائش عالم کی اصلی حکمت۔

اس کے مقابلہ میں انبیاء کرام ملائکہ مقربین، بلکہ اُن کے ڈراما "روز جزا" کا خدا بھی پست و بے وقعت ہیں۔ حضرت جبریل اور دوسرے مقرب فرشتوں کی جس طرح اس ڈرامے میں شیطان کے مقابلے میں تضحیک کی گئی ہے اس کو پڑھ کر ڈرامانگار کی فہم و دانش پر سخت تاسف ہو سکتا ہے۔

مذہب کے استخفاف سے "محشر خیال" اول سے آخر تک بھرا ہوا ہے۔ مضامین، زلیخا، روز جزا وغیرہ میں جس طرح مضامین قرآنی کے مقابلے میں کم فہمی، جسارت، اور خیرہ چشمی کا ارتکاب ہے، قابلِ صد نفرین ہے۔

میں نے مذہبی بحث پر تین مسلم علما کی رائے بھی احتیاطاً حاصل کی ہے۔ ناظم[1] صاحب دینیات مسلم یونیورسٹی میر[2] شعبہ دینیات یونیورسٹی۔ اور مولوی[3] سید فضل احمد (شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد) تینوں میرے خیال سے متفق ہیں۔ اُن کی رائے شامل مسل ہے۔ یہ نکتہ بھی قابلِ نگارش ہے کہ ڈرامانگاری کا کمال ان

دو لفظوں میں ہے۔ "نقل کا الاصل" اس کے لئے ضروری ہے کہ ڈراما نگار اپنے موضوع کا پورا نقشہ اوّل دماغ میں قائم کرے۔ سجاد مرحوم نے جو سرسری اور سطحی خاکہ قیامت کا کھینچا ہے وہ ان کے خیال کی بے مائگی کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔

بہر حال میری رائے میں "محشر خیال" میں نہ ادب ہے اور نہ لٹریچر کی کوئی اعلیٰ خوبی اور نہ تخیل اور نصب العین کی۔ اس طرح یہ کتاب مسلم یونیورسٹی کے اعلیٰ درس میں رہنے کا اپنی کسی خوبی کے لحاظ سے حق نہیں رکھتی ہے۔ اس کے اوصاف خود اس کے قدردانوں نے دو تین لفظوں میں بیان فرمائے ہیں۔ "شعلہ مستعجلہ" "تلملاتے اور جگمگاتے" بس یہی پوری تعریف "محشر خیال" کی ہے۔ رات کو جگنو جگمگائے تلملائے تھوڑی دیر میں شعلہ مستعجلہ کی مانند گل اور خاموش ساتھ تاریکی اور اندھیرا۔

یہاں اگر یہ نہ کہا جائے تو میرا بیان ناقص رہے گا کہ اس زمانے میں فلم اس کے ڈراما نگاری کے انداز اور زہریلی نشریات نے جو تباہ کن اثر ادب اور لٹریچر پر ڈالا ہے وہ تباہی کا ایک مہیب طوفان ہے جو ادب اور لٹریچر کی خوبیوں اور صفات کو غرق آب و برباد کر رہا ہے۔ اس کی قوت تباہی میں برقی جاذبیت اس بے دریغ سرمایہ کی ہے جو اس کے ساتھ ساتھ موجزن ہے۔ ایسا ہی کچھ حال جدید نصاب ہائے تعلیم کا ہے جس کا تجربہ مجھ کو اپنے اسکول کی تعلیم کے زمانے ۱۸۶۶ء سے ہے۔ اس میں "کل جدید لذیذ" جلوہ فرما اور زرپاش و زرریز ہے۔ اگر تفصیل مطلوب ہو تو شامل مسل نسخہ "محشر خیال" واپس عنایت ہو اپنے ہر خیال کی تائید میں اس کے مضامین کے اقتباسات نقل کر کے حاضر کروں گا۔ اسی سلسلہ میں میں نے یہ بھی سنا ہے کہ زنانہ نصاب میں بعض حصے قابل اعتراض ہیں۔ اگر ایک کمیٹی مقرر ہو کر کل نصاب پر نظر ڈال لے تو بہتر ہو۔

حسب ذیل کاغذات شامل مسل ہذا ہیں (۱) رائے علمائے کرام محولہ بالا (۲) خط مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی جو باعث ہوا میرے مطالعہ "محشر خیال" کا (۳) نیز موصوف کا دوسرا خط جو میرے استدعائے تشریح مزید پر آیا (۴) چوتھا خط رشید احمد صاحب صدیقی میر شعبۂ ادب کا جو میرے اس نیاز نامہ کے جواب میں ہے جس میں میں نے اپنے مکرم دوست سے "محشر خیال" پر رائے قائم کرنے میں مدد چاہی تھی (۵) اشتہار "محشر خیال" جس کا طمطراق قابل دید ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تحریریں فی الوقت بصیغۂ راز ہیں۔

(اخبار صدق لکھنؤ ۱۹۴۷ء)

نوٹ:۔ الحمد للہ اس تحریر و تحریک کے اثر سے رسالہ "محشر خیال" مسلم یونیورسٹی کے کورس سے خارج کر دیا گیا۔ (حبیب الرحمٰن صدر یار جنگ)

[ابن] مسعود، علقمہ، اسود، شرجیل، مسروق، شریح،
[اب]راہیم، حماد، محمد، ابو یوسف) رحمہم اللہ اور خطیب
[بغد]ادی، محمد بن اسحاق، محمد بن جریر طبری اور شہر
[بغد]اد کے حالات ہیں نہایت دلچسپ کتاب ۱۰ / [۔]

[عل]مائے سلف نہایت مقبول تصنیف (جو عربی کی مستند ترین تاریخی [ک]تابوں کے تقریباً چھ ہزار صفحات کے عمیق مطالعہ [ک]ا نتیجہ ہے) اس کتاب سے ایک نظر میں معلوم ہو سکتا ہے کہ اپنے عروج کے زمانہ میں مسلمانوں کے اندر علم کا کس قدر ذوق تھا اور مسلمان علمار کی پبلک اور پرائیویٹ زندگی کی کیا کیفیت تھی۔ مختصر یہ ہے کہ ایسی کتاب دنیا کی کسی زبان میں آج تک نہیں لکھی گئی۔ عصر /

[نا]بینا علمار علمائے سلف کے سلسلہ میں یہ رسالہ ان مسلمان علمار کے حالات میں ہے جنہوں نے سر کی آنکھوں سے محروم ہونے کے باوجود علم کے نور سے نہ صرف اپنے بلکہ دوسروں کے دل و دماغ کو منور کیا۔ دنیا کی ہر زبان میں ایسے رسالے بہت کم ہیں۔ اردو زبان میں یہ سب سے پہلا اور اب تک واحد رسالہ ہے۔ ۴ /

[ا]ستاذ العلمار حضرت مفتی محمد لطف اللہ صاحب مرحوم کے سوانح جن کے ضمن میں ان کے استاذ مفتی عنایت احمد صاحب شہید اور استاذ الاستاذ مولوی بزرگ علی صاحب مرحوم کے کچھ مختصر حالات اور مفتی صاحب مرحوم کے اجل شاگردوں کے اسمار بھی شامل ہیں۔ اس رسالہ سے اب سے پہلے زمانہ کے اساتذہ اور تلامذہ کے طریق افادہ و استفادہ پر عمدہ روشنی پڑتی ہے۔ تعلیم قدیم و جدید دونوں سے تعلق رکھنے والوں کے لئے یکساں سبق آموز ہے۔ ۶ /

فقہ حنفی فقہ حنفی کی تاریخی حقیقت سے مورخانہ و محدثانہ بحث ہے اور جس میں ضمناً حضرت ابو حنیفہ امام اعظم رضی اللہ عنہ اور ان کے دو نامور شاگردوں امام ابو یوسف اور امام محمد اور بعض دیگر اساطین فقہ حنفی حضرت عبد اللہ ابن مسعود، علقمہ بن قیس، مسروق الہمدانی، اسود النخعی، عمرو بن شرجیل، شریح القاضی، ابراہیم النخعی، حماد بن ابی سلیمان رضی اللہ عنہم کے حالات سے بھی لتعارف ہے۔ ۸ /

تذکرہ بابر ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کی بنیاد رکھنے والے شاہ ظہیر الدین بابر غازی کے نہایت دلچسپ حالات جو اخلاقی اور تاریخی دونوں حیثیتوں سے نہایت دلچسپ اور

ملنے کا پتہ۔ محمد مقتدیٰ خاں شروانی، شروانی پریس و بک ڈپو علی گڑھ

قابل مطالعہ ہیں۔

۱۲ ر

حالاتِ حزیں — مشہور نازک خیال شاعر علی حزیں پر ایک پر مغز لکچر نہ صرف حزیں کے دلچسپ حالات بیان کئے گئے ہیں بلکہ اس کی شاعرانہ حیثیت پر بحث کر کے منتخب کلام بھی پیش کیا گیا ہے۔

۶ ر

۴ - اخلاق و آداب

اسلامی اخلاق — مضمون اخلاق پر دل نشین بحث کرنے کے بعد اچھے اور برے اخلاق کے متعلق کثیر التعداد حدیثوں کا اردو ترجمہ دیا ہے اور اخلاق جیسے خشک مضمون کو شگفتہ بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ بڑوں اور بچوں کے لئے یکساں مفید ہے۔

عصر

نقشِ وفا — حقوق و فرائض زوجین کے متعلق نہایت بیش بہا نصائح و مفید ہدایات دستور العمل بنانے کے قابل ہیں۔

عصر

۵ - متفرق

سرسید کی یاد — سرسید کی تعلیمی جد و جہد کا ذکر نہایت دلچسپ اور محققانہ پیرایہ میں کیا گیا ہے۔

۲ ر

غرضِ اخلاص — ایک ساتھ تقریر میں بتایا گیا ہے

کہ ... لڑکیاں ضرورت زمانہ کے مطابق ض... تعلیم پائیں۔ مگر اس طرح کہ شعائر اسلام پر ... کے ساتھ قائم رہیں اور سادہ اسلامی معاشرت ... سے نہ جانے دیں۔

مسلمانوں کی تعلیم قدیم — بتایا گیا ہے کہ مس... کی قدیم تعلیم کا نص... کیا تھا۔

برقِ تجلی — حسن و عشق ان مشہور روزگار ... کی زندگی پر بہترین تبصرہ۔

تعلیمِ اسلام کا اثر عمر و صحت پر — صدہا بزرگانِ د... عمروں کا حال بتا... قطعی نتیجہ نکالا... اسلام کی کماحقہ پابندی قیام صحت و درازی ... کا باعث ہوتی ہے۔

عہ

خطبۂ صدارت — اورینٹل کانفرنس۔ زبا... کی مکمل و دل تاریخ۔

مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں ضمیر الدین قریشی بی... پرنٹر نے چھاپی اور مولوی حاجی محمد مقتدی خاں شروانی نے شروانی پرنٹنگ پریس سے شائع کی۔

(... حاجی محمد مقتدی خاں شروانی ... شروانی بک ڈپو علی گڑھ)